ماہنامہ کرن

مارچ 2018

سالگرہ نمبر

اس شمارے کے ساتھ
کرن کتابچہ

کرن کا دسترخوان

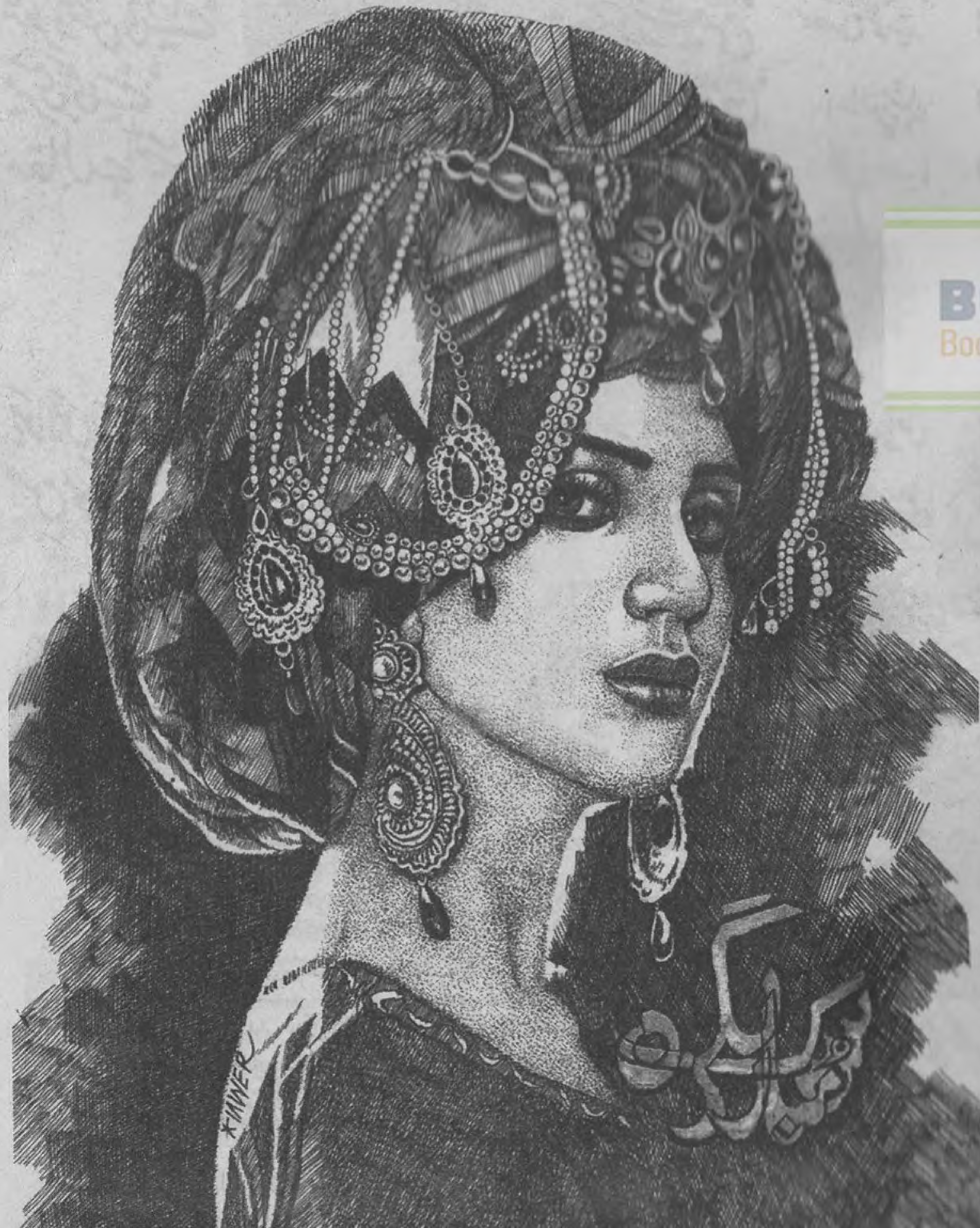


چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

بانی	محمود بابر فیصل
نگران	محمود ریاض
مدیرہ	نادرہ خاتون
مدیرِ اعلیٰ	عامر محمود
نائب مدیرہ	شعاع عمیر
مدیرہ خصوصی	امت الصبور
اشتہارات	خالدہ جیلانی
قانونی مشیر	نورالدین سرکی اینڈ کمپنی ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز





مستقل سلسلے

مارچ 2018

جلد 40 شمارہ 12

قیمت 60 روپے

خط وکتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ



افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 7000 روپے

مدیرہ

اداریہ

وقت ٹھہرتا نہیں۔ وہ اپنی رفتار سے آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ آپ کے ساتھ، آپ کی محبتوں کے ساتھ ایک اور سال کی مسافت تمام ہوئی۔

آپ کی محبتوں نے ہمیں اعتماد بخشا۔ آپ کے ساتھ نے ہمارے حوصلوں کو بڑھایا اور آج کرن کامیابی کے جس مقام پر ہے، وہ ہمارے لیے باعثِ مسرت و افتخار ہے۔

محمود ریاض صاحب جنہوں نے ایک صاف ستھرے اور معیاری پرچے کا خواب دیکھا۔ خواتین ڈائجسٹ اس خواب کی تعبیر تھی۔ خواتین ڈائجسٹ کے بعد انہوں نے ماہنامہ کرن کا اجراء کیا۔ اللہ تعالیٰ کا بے حد کرم اور مہربانی ہے کہ کرن نے ایک طویل مسافت کامیابی اور کامرانی سے طے کی۔ محمود بابر فیصل کی ادارت میں کرن نے پرچوں کی دنیا میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔

کرن نے معروف مصنفین کے ساتھ ساتھ بے شمار نئی مصنفین کو متعارف کروایا، جنہیں آج بہترین مصنفین میں شمار کیا جاتا ہے۔

ہم اپنی تمام مصنفین کے ممنون ہیں جنہوں نے کرن کو اپنی بہترین تحریریں نذر کیں۔ ہماری کچھ مصنفین ہمارے درمیان نہیں۔ ہم ان کے لیے دعاگو ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

ہم اپنے قارئین کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جن کے مشورے کرن کو خوب سے خوب تر بنانے میں ہماری رہنمائی کرتے رہے۔ دعا ہے کہ آپ کی محبتیں اسی طرح ہمارے ساتھ رہیں اور روشنی کی یہ کرن ہمیشہ دلوں میں اجالا بکھیرتی رہے۔

نیا ناول - شبِ تم کی سحر،

رُخ چودھری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا شمار قارئین کی پسندیدہ مصنفین میں ہوتا ہے۔ وہ متعدد ناول اور افسانے لکھ چکی ہیں۔ کرن میں ان کا ناول "دل کا دروازہ" شائع ہو کر پسندیدگی کی سند حاصل کر چکا ہے۔ ماہ اپریل سے ان شاء اللہ ان کا نیا ناول شروع کیا جا رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی یہ تحریر پچھلی تمام تحریروں سے بڑھ کر ثابت ہو گی۔

اس شمارے میں،

- "کیا تجھے یاد ہیں گزرے زمانے اپنے" قارئین سے سروے،
- فنکارہ "کنزہ ہاشمی" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- شعر و سخن کی دنیا سے معروف شاعر "شہزاد نیر" اس ماہ مہمان ہیں،
- اداکار "زاہد افتخار احمد" کہتے ہیں "میری بھی سنیے"
- اس ماہ مدیحہ کرن کے مقابل ہے آئینہ"
- "من مورکھ کی بات نہ مانو" آسیہ مرزا کے سلسلے وار ناول کی آخری قسط،
- نگہت عبداللہ کا سلسلے وار ناول "ہوائیں رُخ بدل گئیں"،
- "مہجور نشیمن" مصباح علی سید کے مکمل ناول کی آخری قسط،
- نگہت سیما اور امت العزیز شہزاد کے مکمل ناول، منشا محسن علی کا ناولٹ "جند ڑی"
- راشدہ رفعت، نفیسہ سعید، مریم ماہ منیر اور نادیہ احمد کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

- کرن کا دسترخوان" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت حاصل کریں۔

حمد باری تعالیٰ

حرارت نبض ہستی کی، فقط تیری رضا دیکھے
تماشا ہر قدم، بے تاب چشم آشنا دیکھے

خس جاں ڈوبنے کو ہو، اگر بے درد موجوں میں
تیرا ہی آسرا چاہے، تجھے مشکل کُشا دیکھے

حقیقت رنگ و بو کی پوچھے، چشم عشق پیشہ سے
جہاں کے ذرّے ذرّے، اسے جلوہ نما دیکھے

مقامِ بندگی یہ ہے، مٹا کر ماسوا یکسر
نظرِ احساس کی، اللہ کو حاجت روا دیکھے

گلوں کی نازکی، دشت و جبل کی داستانوں میں
جمالی شان کی جلوے زمانہ، جابجا دیکھے

جبینِ شوق میں اختر، سجا اس ذات کا سجدہ
خدا کو دیکھتا ہو تو، ترا جھکنا خدا دیکھے

اختر حسین شیخ

نعت رسولِ مقبول ﷺ

اب میری نگاہوں میں جچتا نہیں کوئی
جیسے میرے سرکار ﷺ ہیں، ایسا نہیں کوئی

اے ظرفِ نظر دیکھ مگر دیکھ ادب سے
سرکار ﷺ کا جلوہ ہے، تماشا نہیں کوئی

ہوتا ہے جہاں ذکر محمد ﷺ کے کرم کا
اس بزم میں محرومِ تمنا نہیں کوئی

اعزاز یہ حاصل ہے تو حاصل ہے زمیں کو
افلاک پہ تو گنبدِ خضرا ﷺ نہیں کوئی

سرکار ﷺ کی رحمت نے مگر خوب نوازا
یہ سچ ہے کہ خالد سا نکما نہیں کوئی

خالد محمود خالد

زندگی کے تھال میں ہر گزرتا پل سنہری سکوں کی طرح جمع ہے، جس کی جگمگاہٹ آنکھوں کو تو خیرہ کرتی ہے، دل میں بھی میٹھا سا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ جتنی بار سنہرے سکوں کو پھیلا کر دیکھو ہر بار نیا احساس چمکتا ہے جس سے تنہائی میں بھی چہرے پر مسکان بکھر آتی ہے۔ اس مسکان کو آپ کے چہرے کی رونق بنانے کے لیے کرن کی سالگرہ کے موقع پر قارئین بہنوں کے لیے ایک خصوصی سروے کا اہتمام کیا ہے، سروے کے سوالات درج ذیل ہیں:۔

1۔ زندگی کا ایک اور سال گزر جانے پر آپ کے کیا احساسات ہوتے ہیں؟

2۔ ''کرن'' پڑھنے کی ابتدا آپ نے کب سے کی؟ ماہنامہ کرن کی مصنفات نے 2017ء میں اپنی تحریروں سے آپ کو کس حد تک مطمئن کیا اور آپ نے ان تحریروں سے کیا سبق حاصل کیا؟

3۔ آپ کی سالگرہ پر موبائل فون سروس بند ہو، بجلی نہ ہونے کے سبب فیس بک پر بھی رابطہ نہ ہو، تب دلی جذبات واحساسات کیا ہوں گے؟

4۔ اپنی پسندیدہ اداکار واداکارہ، سیاست دان یا شخصیت کو ان کی سالگرہ کے موقع پر آپ کیا تحفہ دینا پسند کریں گی؟

آیئے دیکھتے ہیں، ہماری قارئین نے کیا جواب دیے ہیں۔

سالگرہ نمبر

کیا تجھے یاد ہیں گزرے زمانے اپنے

ادارہ



عامرہ زاہد......فرید ٹاؤن، ساہیوال

1۔ ہر نیا سال شروع ہونے پر یہ سوچتے ہیں کہ پچھلا سال کتنی جلدی بیت گیا۔ یوں لگتا ہے گویا وقت کو پر لگ گئے ہیں۔ زندگی کا ایک سال کم ہو جاتا ہے اور نئے سال کے لیے پلاننگ شروع ہو جاتی ہے کہ اس سال یہ کرنا ہے، وہ کرنا ہے۔ جو پچھلے سال کام نہ ہو سکا وہ کریں گے لیکن یہ نہیں جانتے کہ پتا نہیں زندگی مہلت دیتی ہے کہ نہیں۔ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ اس سال کیا ہوگا۔ انسان سوچتا کچھ ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ اس لیے میری تو اللہ سے یہی دعا ہے کہ یا اللہ! اپنی رضا میں راضی رہنے کی توفیق دے۔

2۔ میرا خیال ہے میں چوتھی کلاس میں تھی جب سے میں نے کرن پڑھنا شروع کیا اور تب سے لے

کر اب تک میرا خیال ہے چند شمارے ہی مس ہوئے ہوں گے۔ 2017ء میں کرن کی مصنفات نے بہت اچھی تحریریں لکھیں۔ ان تحریروں سے روزمرہ زندگی کے بارے میں اور بہت سے مسائل حل کرنے میں مدد ملی۔ میں نے تو ان تحریروں سے بہت کچھ سیکھا اور جو کچھ سیکھا دوسروں کو بھی اس بارے میں آگاہ کیا۔ جہاں جہاں ضرورت پڑتی ہے یہ کہانیاں ہمارے لیے بڑی سبق آموز ثابت ہوتی ہیں۔

3۔ اب تو عمر کے اس حصے میں آ گئے ہیں جہاں سالگرہ کے دن مجھے تو کم از کم ان چیزوں کے بند ہونے سے کوئی ٹینشن نہیں ہوتی۔

4۔ اپنی پسندیدہ شخصیت کو اس کی سالگرہ پر نیک تمناؤں اور دعاؤں کا تحفہ دینا پسند کروں گی۔

مسکان احزم......فیصل آباد

سب سے پہلے تو ادارہ کرن کی انتظامیہ اور اس کے تمام لوگوں کو کرن ڈائجسٹ کی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ دعا ہے کہ یہ ادارہ سورج کی روشن کرن کی طرح ہمیشہ چمکتا رہے، آمین۔

1۔ زندگی کا ایک اور سال گزر جانے پر احساسات ملے جلے سے ہوتے ہیں۔ ایک بات کی خوشی ہو رہی ہوتی ہے کہ سال کے ان تین سو پینسٹھ دنوں میں الحمدللہ بہت کچھ سیکھا۔ اللہ کی بہت سی نعمتیں ملیں، بہت سی کامیابیاں زندگی کا حصہ بنیں لیکن دکھ بھی ہوتا ہے کہ زندگی کے حساب کتاب میں سے مزید تین سو پینسٹھ دن نکل گئے اور تین سو پینسٹھ دن ہم مزید موت کے قریب ہو گئے۔

2۔ کرن پڑھنے کی ابتدا تقریباً تین سال پہلے کی۔ 2017ء میں بھی مصنفات نے اتنا ہی عمدہ لکھا جیسا شروع سے لکھتی آ رہی ہیں۔ ان کے ہر لفظ سے علم و دانائی کی کرن پھوٹتی ہے جو سیدھی دل کو روشن کرتی ہے۔

3۔ میری اور کرن کی سالگرہ ایک ہی ماہ میں ہوتی یعنی کے ہم کو انتظار ہیں۔ ہاہاہا...... اگر ایسا ہو تو میرا حال بھی یقیناً ویسا ہی ہوگا کہ باہر آپ کے لیے ایک بہت خوب صورت سرپرائز ہو اور آپ کو کمرے میں قید کر دیا گیا ہو۔ بالکل ویسے ہی احساسات ہوں گے میرے۔

4۔ میں بہت عمدہ لکھی کتابیں انہیں تحفے میں دوں گی کیونکہ آج کل سب کو بہترین کتابیں پڑھنے کی اشد ضرورت ہے۔

سیما ممتاز عباسی......لاڑکانہ

1۔ سال گزر جانے کا عمل فطری ہے اور کوئی سال بے حد خوش کر کے پورا ہو جاتا ہے اور کوئی سال اداس کر کے گزر جاتا ہے۔ اس لیے گزرنے والے سال کے احساسات کوئی خاص نہ تھے، آئے اور چلے گئے......بس۔

2۔ کرن سے پرانا تعلق ہے، کئی سالوں سے پڑھ رہی ہوں، وہ اپنے انداز و بیان سے منفرد رہا ہے، اس کی تحریریں مشرقی انداز میں ہوتی ہیں اور پھر اُن عکس کا بھی اپنا ہوتا ہے، گزشتہ بارہ مہینوں میں کرن کی مصنفات نے ہر موضوع پر لکھا اور کامیاب رہیں۔ بعض تحریریں فکر انگیز تھیں اور ان میں کوئی نہ کوئی سبق، اصلاح، قربانی، رشتوں کی پاسداری، جذبوں اور ارمانوں کا برملا اظہار ہوتا ہے یہ ان کی بڑی خوبی ہے۔

3۔ اگر اس سمے یہ سب کچھ ہو جائے تو جو گزری ہوگی یہ صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور انسان تو صرف ایسے تہوار میں خلل پڑنے پر بددعائیں دے سکتا ہے۔

4۔ اتنے بڑے لوگوں کو ہم جیسے چھوٹے کیا تحفہ دے سکتے ہیں، ہم تو ان کو صرف یہ ہی لفظوں کی مالا ہی دے سکتے ہیں۔ سالگرہ مبارک ہو...... جنم دن مبارک ہو۔ اس سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں ہے۔

انوش ابصار......قائداعظم یونیورسٹی

1۔ ہر سال کے گزرنے پر احساسات بھی مختلف ہوتے ہیں اور سوچنے کا تو موقع ہی نہیں ملتا۔ سچ تو یہ ہے، ہم اسٹوڈنٹس کا پورا سال یہ ہی سوچنے میں گزر جاتا ہے پاس ہوں گے بھی کہ نہیں یعنی خون خشک ہی رہتا ہے۔

2۔ میرا کرن کا بہت پرانا تعلق ہے کیوں کہ میری امی بھی کرن پڑھتی تھیں، دادی، نانی بھی۔ اس لیے مجھ پر کوئی روک ٹوک نہیں، جب اسکول، کالج کا کام کرلیا تو ہم اور ہمارا کرن۔ بہت پرانا تعلق ہے آپ سے اس سال کی تمام تحریروں میں سبق ہی سبق تھے۔ ''دست مسیحا'' سے یہ سیکھا کہ غلطیاں انسانوں سے ہوجاتی ہیں اور درگزر بھی انسان کو ہی کرنا چاہیے۔ ''مجبور نشین'' میں بہت سے سبق ہیں، خاص طور پر یہ کہ کسی کے لیے گڑھا کھودو گے تو پہلے خود ہی گرو گے، جیسے سبرینہ اور آئمہ گریں۔ مکمل ناولز میں بڑا درس تھا۔

3۔ بھئی اگر ظالم زمانہ چاہے گا کہ مجھے کوئی وش نہ کرے، ہر طرح کا رابطہ مٹے گا تو میں صبر کرکے ایک کینڈل جلاؤں گی اور خود کو خود وش کروں گی۔

4۔ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں، ہاں مجھے کرن کی، شعاع کی ایڈیٹرز سے ملنے کا شوق ہے اگر انہیں تحفہ دینے کا موقع ملا تو پیارا پیارا سوٹ گفٹ کروں گی، میچنگ کے ساتھ۔

سدرہ...... جھال چکیاں

1۔ آج کل کی زندگی اس قدر مصروف ہو چکی ہے، سمجھ میں ہی نہیں آتا سال بیت جاتا ہے۔ ابھی کل کی بات لگتی ہے جب ہمارے ہاتھوں میں کرن کا سالگرہ نمبر تھا اور اب پھر ایسا ہی ہے۔ بہتی ندی کی روانی کی طرح سال گزر جاتے ہیں اور اگر انسان درس وتدریس سے وابستہ ہو پھر تو ایسے ہے جیسے سال بھی کتاب کے صفحات ہوں ادھر پلٹ اُدھر پلٹ۔ البتہ اگر سال گزرتے ہوئے چند لمحے خوش گوار جھولی میں ڈال جائے جو کہ عموماً کم ہی ہوتا ہے تو احساسات بھی پرسکون، ٹھنڈے میٹھے دریا جیسے۔ ویسے میری اپنی عادت ہے کوئی بھی سال خواہ زندگی کا ہو تعلیمی ہو یا معاشی، جائزہ ضرور لیتی ہوں کہ اس میں کیا پایا کیا کھویا۔

2۔ کوئی لمبی چوڑی عمر تو ہے نہیں، نہ ہی جھوٹ بولوں گی کہ میرا کرن کا ساتھ بہت پرانا ہے۔ میں نے سیکنڈ ایر میں سب سے پہلے کرن پڑھا، جب فرحانہ ناز بہت دکھ کے ساتھ کہ اب دنیا میں نہیں، ان کی کہانی کے لیے کرن پڑھا پھر کچھ عرصہ نہیں پڑھا۔ اب ڈیڑھ سال سے تو باقاعدگی سے خرید کر پڑھ رہی ہوں اور ہر رائٹر اپنی تحریروں میں کوئی نہ کوئی پیغام ضرور دے جاتی ہیں، بہت کچھ سکھا جاتی ہیں۔ رہی بات 2017ء تو یہ کہنا غلط نہیں ہوگا اس سال کی تحریروں نے بری طرح سے جکڑ رکھا ہے ''مجبور نشین'' اسی سال کا بہترین شاہکار ہے، اس میں واضح سبق جو ملا وہ اللہ پر یقین ہے، مجھے ایسا لگتا ہے اس ناول کی بنیاد ہی یقین پر رکھی گئی ہے جیسے ازمیر مریم کا یقین مضبوط دکھایا۔ روائیہ کا یقین اس کی گواہی بن گیا۔ سبرینہ کا ٹوٹا یقین سب توڑ گیا۔

3۔ جناب مابدولت کی سالگرہ اور تمام رابطے بند ہو جائیں تو یہ ہی ہے۔ ایک تو سالگرہ پورے سال میں ایک دن آتی ہے تو میں ٹیلی کمیونیکیشن والوں کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گی۔ بھئی مجھے تو بہت شوق ہے کہ جیسے ہی تاریخ بدلے فوراً سے کوئی وش کردے اور آج تک کسی کی مجال نہیں میری سالگرہ بھول جائے اس لیے بھی میں تو اگر رابطہ نہ ہوا خود ان سب کے پاس پہنچ جاؤں گی جن کا وش کرنا مجھے خوشی دیتا ہے۔

4۔ تحفہ تو تحفہ ہے ویسے میں اپنی پسندیدہ شخصیت کو پرفیوم ہی گفٹ کرتی ہوں۔

سائرہ راؤ...... دنیاپور، لودھراں

1۔ زندگی کا ایک اور سال گزر جانے پر دل اداس اور ملال سے بھر جاتا ہے کہ بس زندگی گزرتی چلی جارہی ہے۔

2۔ کرن تو اس وقت سے پڑھ رہی ہوں جب سے ڈائجسٹ پڑھنے کی عادت پڑی مگر پہلے اس کا معیار کچھ خاص نہیں تھا مگر اب معیار بڑھنے کی رفتار بڑھ رہی ہے خاص طور پر مصباح علی سید اور صدف آصف کی کہانیاں لاجواب ہونے کے ساتھ اپنے اندر ایک مقصد رکھتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں ہمیشہ مثبت پیغامات ہوتے ہیں۔

3۔ پاکستان میں ایسا ہونا مشکل نہیں بلکہ ایسا ہوتا رہتا ہے مگر اس کا فائدہ یہ ہوگا گھر والوں کے ساتھ ہی سالگرہ منائی جائے گی۔

4۔ پھول پیش کروں گی کیونکہ اس سے اچھا تحفہ کوئی نہیں۔

سدرہ مرتضٰی...... کراچی

1۔ زندگی کے ایک سال گزر جانے پر اب تو کچھ لمحوں کے لیے ٹینشن ہوتی ہے کہ زندگی ہنستے ہنساتے ہاتھوں سے نکلتی جارہی ہے اور میں اپنی موت کے قریب ہوتی جارہی ہوں تو بس دل چاہتا ہے کہ بہت عبادت کروں اور بس کسی طرح اللہ کو راضی کرلو کہ آخرت سنور جائے اور چاہتی ہوں کہ مجھ سے جو غلطیاں ہوئیں اگلے سال دوبارہ نہ ہوا اور کوشش کروں کہ اپنے شوہر اور ماں باپ کو راضی رکھ پاؤں اور اولاد کی بہترین تربیت کروں۔

2۔ کرن پڑھنے کی ابتدا تو ساتویں کلاس سے ہوگئی تھی لیکن پھر جب امی کی اجازت سے پڑھنا شروع کیا تو ٹوٹے کے ڈائجسٹ بھی پڑھ ڈالے اور اپنے پاس جمع کرکے کلیکشن بھی بنایا۔ 2017ء کی تحریریں بہت بہترین رہیں، ہر تحریر ہی تقریباً سبق آموز تھی جہاں غیر شادی شدہ بہنوں کے لیے سبق تھا وہاں ہم شادی شدہ لڑکیوں کو بھی سیکھنے کو بہت کچھ ملا۔ 2017ء میں جہاں کرن میری پسندیدہ رائٹرز کو واپس لے کر آیا، وہیں بہت سی نئی رائٹرز کو بھی متعارف کروایا پھر چاہے تو تنزیلہ ریاض کا ''راپنزل'' ہو۔ فرح بخاری کا ''گل کہسار'' ہو یا مصباح علی سید کا ''مجبور نشین'' بے شمار تحریروں نے دل کو چھوا۔

3۔ سالگرہ اب میں نہیں مناتی بس دل یہ چاہتا ہے کہ میرا شوہر اس دن کو نہ بھولے، ویسے وہ بھولتے نہیں ہیں کیونکہ ان کی برتھ ڈے کی تاریخ بس دو دن بعد کی ہے۔

4۔ تحفہ دینے سے محبت بڑھتی ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ بہترین تحفہ دوں انہیں جن سے میں محبت کرتی ہوں۔ بہترین تحفہ دعا سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

ثناء شہزاد...... کراچی

1۔ زندگی ہر پل متحرک رہنے والی چیز ہے جب تک اس کا پہیہ گھومتا ہے، زندگی میں بھی جان محسوس ہوتی ہے۔ ایک اور سال ہماری زندگیوں میں آیا بہت سی خوشیاں، بہت سے غم دے کر بیت بھی گیا۔ جانے والے لمحے جیسے بھی تھے مگر آنے والے پلوں میں احساسات بہت خوب صورت اور پُرجوش سے ہیں۔ ہاں ۔۔ ہمارے پیارے کرن کی سالگرہ کی

کچن اور آپ

اس ماہ ''حرا ملک'' کو ''کچن اور آپ'' میں انعام کا حق دار قرار دیا ہے، ادارے کی طرف سے حرا ملک کو تین ماہ کے لیے ''ماہنامہ کرن'' مفت دیا جارہا ہے۔

حوالے سے تو فی الحال تو یہ ہی احساس ہے بہت سی پیاری کہانیاں لکھی گئیں اس سال اور نئے سال میں ان ہی جیسی دل کو خوش گوار گرفتار کر لینے والی کہانیوں کی آمد نے ان دیکھا خوب صورت خواب بخش رکھا ہے پلیز اس خواب کی تکمیل کرن کر دے۔

2۔ کرن پڑھنے کی ابتدا کا معاملہ تو ایسے ہی ہے جیسے میرے ساتھ ہی جنم لیا ہو، کرن کو میں نے ہمیشہ اپنے جڑواں وجود کی طرح ساتھ ساتھ پایا۔ کرن نے ہر موقع پر میرا ساتھ دیا ہے، کرن اور میرا اٹوٹ بندھن ہے اور جہاں تک کرن کی کہانیوں کی بات ہے تو ایسا تو کبھی ہوا نہیں، کوئی بھی تحریر بنا سبق یا مقصد کے اس میں پبلش ہوئی ہو، ہر کہانی سبق آموز رہی۔ جہاں تک تعلق 2017ء کی کہانیوں کا ہے اتنا کہنا چاہوں گی 2017ء کرن کی تحریروں کے حوالے سے بہترین سال رہا۔ تمام چھوٹی بڑی کہانیاں سپر قسم کی تھیں، جن میں بہت سی نا لج ملی اور سمجھ بوجھ بھی۔ ''راپنزل'' تنزیلہ ریاض نے رشتوں کی اہمیت سمجھاتے ہوئے اپنوں کے لیے دی جانے والی قربانیوں کی عظمت کو اجاگر کیا۔ ''من مورکھ'' ایک ایسی پیاری کہانی جس میں رات کا بھولا اگر صبح گھر آ جائے تو اسے دیکھ کر بجائے دروازے بند کرنے کے دل کے دروازے بھی کھول لینے چاہئیں۔ ''بیلا'' منشا نے بہت ہی کھنکتی کہانی لکھی۔ گاؤں اور پیرس کی فضاؤں پر، اس سے یہ پتا چلا مستقل مزاجی انسانوں کو گرا نہیں سکتی۔ ''مہجور نشیمن'' میں مصباح نے آسٹریلیا کی سیر کے ساتھ یہ پیغام دیا، پرانی رنجشوں کو اگر دل سے نہ نکالا جائے تو یہ سڑ گل کر ناسور بن جاتی ہیں پھر ہم اس ناسور کا علاج حسد کی صورت کر کے گڑھے کھودتے ہیں اور ان ہی گڑھوں میں خود گر جاتے ہیں۔ ''گل کہسار'' فرح بخاری کی کہانی کہ لڑائی در لڑائی دراصل قبائل کے بدلے نہیں نسلوں کی موت ہوتی ہے گو کہ 2017ء کی تمام تحریروں میں خوب صورتی اور سحر اور سبق ہی سبق تھا۔

3۔ اُف جی...... موبائل ہی بند اور بجلی بھی، پھر میں کیا کروں گی لیکن مجھے پتا ہے میں بہت صابر بچی ہوں، دل میں بے حد افسردہ ہونے کے باوجود اپنے گھر والوں اور چاہنے والوں کو قطعاً محسوس نہیں ہونے دوں گی اور انتظار کروں گی، کب بجلی آئے یا موبائل سروس بحال ہو۔

4۔ انسان کی سب سے پسندیدہ شخصیت اس کے والدین ہوتے ہیں، میں ان کے لیے جب بھی بہترین تحفے کا سوچتی ہوں تو دل سے ان کی لمبی صحت مند خوشیوں سے بھرپور زندگی کی دعا نکلتی ہے لیکن یہاں کرن کی بات ہو رہی ہے تو اس حوالے سے میں اپنی فیورٹ رائٹرز فرحت اشتیاق، عمیرہ احمد، فائزہ افتخار، رخسانہ نگار، مصباح علی سید، سائرہ رضا اور صدف آصف سے اگر کبھی ملنے یا دوبدو سالگرہ وش کرنے کا موقع ملا تو گلاب کے پھولوں سے لدی ٹہنی انہیں پیش کرتے ہوئے کہوں گی ''آپ کی تحریروں نے دل کو ان پھولوں کی طرح مہکا رکھا ہے یوں ہی خوشبو لٹائی رہیں اور ہمیں اپنا دیوانہ بناتی رہیں۔

سالگرہ نمبر

کنزہ ہاشمی سے ملاقات

شاہین رشید



چھوٹی سی عمر میں بڑے بڑے رول کرنے والی خوب صورت فنکارہ کنزہ ہاشمی کو آپ آج کل ''رانی'' اور ''دلدل'' اور دیگر ڈراموں میں دیکھ رہے ہیں۔ کنزہ ہاشمی کی یہ بات ہمیں بہت پسند ہے کہ باوجود بے حد مصروفیات کے بھی انہوں نے ٹائم دیا اور ہمیشہ میرا احترام کیا، آج کے نوجوانوں میں ایسی صفات کم ہی پائی جاتی ہیں۔

☆ ''کیا حال ہیں کنزہ؟''

❁ ''جی، اللہ کا شکر ہے۔''

☆ کیا آن ایر ہے کیا انڈر پروڈکشن ہے؟

❁ ''انڈر پروڈکشن میں تو آج کل ایک ''بول انٹرٹینمنٹ'' کا پروجیکٹ ہے ''ہم اسی کے ہیں'' اس کے ڈائریکٹر آصف اسد ہیں۔ ایک پروجیکٹ جس کا نام ''شرارت'' ہے ''ہم'' ٹی وی کے لیے ہے اور اس کے ڈائریکٹر دانش نواز ہیں، اسی طرح اے پلس کا بھی ایک پروجیکٹ ہے ''لمحے'' اور اس کے ڈائریکٹر عاصم علی ہیں جب کہ آن ایر میں ''رانی'' اور ''دلدل'' ہے۔ ہاں ''ہم اسی کے ہیں'' کی رائٹر صائمہ اکرم چوہدری ہیں جب کہ باقی دو کے رائٹرز کے نام میرے علم میں نہیں ہیں اور ان تینوں سیریلز میں میرا لیڈ رول ہے۔''



☆ ''ماشاء اللہ دیکھتے ہی دیکھتے آپ نے ناظرین کے دل میں جگہ بنالی ہے تو کیا امید تھی کہ جگہ بنالوں گی؟''

❁ ''ایسا نہیں ہے کہ میں نے آسانی سے جگہ بنالی ہے بلکہ جب میں نے پہلا ڈرامہ کیا تھا تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں فیمس ہوجاؤں گی مگر میرا اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا۔ پہلا چلا، ختم بھی ہوگیا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلا کہ میں اس میں تھی پھر میں نے فیمس ہونے کی امید ہی ختم کردی۔ پھر ایک پروجیکٹ کیا جو آن ایر نہیں گیا اور چھ مہینے بعد آن ائر ہوا۔ دوسرا کیا وہ بھی چھ ماہ بعد آن ایر ہوا، اس کے بعد ''مور محل'' کیا، مورسیاں کیا، من چاہی کیا اور ''تشنگی دل کی'' کیا۔ اتفاق دیکھیں یہ چاروں سیریلز آن ایر ہی نہیں جارہے تھے تو میں بہت زیادہ مایوس ہوگئی اور دل ہار چلی گئی کہ پتا نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس دوران ''فریب'' بھی کیا اور ''محبت تم سے نفرت ہے'' بھی کیا اور میری خوش قسمتی کا آغاز اس طرح ہوا کہ میرے یہ چھ کے چھ پلے ایک ساتھ آن ایر ہوگئے۔ اس میں ''سنگسار'' بھی تھا، ہر دن ہر بڑے چینل سے میرا کوئی نہ کوئی سیریل آن ایر ہو رہا تھا، جب یہ چھ سات سیریلز مختلف اوقات میں آن ایر ہوئے تو پھر میں دیکھتے ہی دیکھتے فیمس ہوگئی کیونکہ ہر بڑے سیریل میں ہی نظر آرہی تھی۔ دو سال جب کچھ بھی آن ایر نہیں ہوا تو اتنی مایوسی ہوئی کہ ڈپریشن میں چلی گئی۔ اب تو اللہ کا شکر ہے کہ جہاں جاتی ہوں لوگ پہچان لیتے ہیں۔''

☆ ''اس فیلڈ میں آپ گانا گانے کے شوق میں آئی تھیں تو یہ شوق ماند کیسے پڑ گیا؟''

❁ ''جی گانے کا شوق کس طرح ماند پڑا میں آپ کو تفصیل سے بتاتی ہوں۔ ہوا یہ کہ اس فیلڈ میں آئی تو گانے کے شوق میں تھی اور خود ہی جدوجہد کر رہی تھی کہ کوئی مجھے سن لے تو ''عمران فاروقی'' ایک سنگر ہیں ان کے والد نے جہاں اور بہت سی طرز بنائیں ان ہی میں ایک طرز ''لب آتی ہے دعا'' بھی بنائی تھی۔ ان سے میری ملاقات ہوئی تو ان سے میں نے گانا سیکھنا شروع کیا اور وہ بھی چاہتے تھے کہ میں اس فیلڈ کو سنجیدگی سے لوں۔ اس دوران ایک کمپنی تھی جو نیو ٹیلنٹ کو پروموٹ کرتی تھی، وہاں ایک صاحب ارسلان مغل تھے، انہوں نے مجھے کہا کہ تمہارے لیے ایک پلے کی آفر ہوئی ہے اور کردار بھی لیڈ ہے تم ایک بار ان سے مل لو۔ میں نے کہا کہ مجھے اداکاری کا کوئی شوق نہیں، مجھے تو گانے کا شوق ہے تو ان کی اصرار پر ہی ذوالفقار علی اور خرم رانا سے ملی تو ذوالفقار علی صاحب نے کہا کہ مجھے یہ ہی لڑکی چاہیے اپنے کردار کے لیے کیونکہ یہ ہمارے لکھے ہوئے کردار میں بالکل فٹ ہو رہی ہیں۔ بہرحال انہوں نے مجھے ڈرامے کے لیے کاسٹ کرلیا اور پندرہ دن کی ورک شاپ میں مجھے اداکاری کے بارے میں بنیادی باتیں سکھائیں اور جب اداکاری شروع کی تو اس کا شوق بڑھتا گیا اور گانا کہیں گم ہوگیا۔''



☆ ''گویا اب مزا آرہا ہے مگر شروع شروع میں تو مشکلات ہوئی ہوں گی؟''

❁ ''جی کوئی بھی نیا کام شروع کرو مشکلات تو ضرور آتی ہیں اور مجھے بھی کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہمارے کام میں ہم لوگ مینٹلی ٹارچر بہت ہو رہے ہیں اگر ہمیں کوئی رد کرتا ہے تو یہ چیز ہمارے دماغ پر بہت اثر کرتی ہے تو ایسی ہی مشکلات میرے سامنے آئیں لیکن پھر اللہ کا شکر ہے کہ راستے بنتے گئے اور مشکلیں کم ہونا شروع ہو گئیں، اب تو بہت بہتر ہو گیا ہے سب کچھ۔''

☆ ''ایکٹنگ کی طرف رجحان نہیں تھا تو کس نے بہت مدد کی، کس نے بہت سکھایا تمہیں؟''

❁ ''جب میں نے پہلا ڈرامہ کیا ''ادھورا ملن'' تو ذوالفقار علی صاحب نے مجھے بہت سکھایا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ان سے یہ کہے کہ کس نئی لڑکی کو متعارف کرا دیا اسے تو کام ہی نہیں آتا تو انہوں نے بہت سکھایا لیکن جب میں نے دوسرا سوپ ''میکے کو دے دو سندیس'' کیا جو کہ جیو سے آن ایئر ہوا تھا اس میں ہمیں سکھانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس میں یہ تھا کہ جتنا آپ کو آتا ہے آپ کریں یعنی اپنی مدد آپ والا اصول رکھا گیا، وہ ڈرامہ شاید مجھے میری شکل کی وجہ سے مل گیا تھا۔ انہیں میری شکل اچھی لگی تو انہوں نے مجھے بک کر لیا، اس کے بعد مجھے کہا گیا کہ آپ کو اداکاری ہی نہیں آتی اور جب ایسے جملے سنتی تھی تو بہت ڈپریسڈ ہوتی تھی اور سوچتی رہتی تھی کہ اب تو اداکاری نہیں آتی تو اب کیا کروں گی اور لوگ حوصلہ افزائی کے بجائے حوصلہ شکنی زیادہ کرتے تھے جس کی وجہ سے جو بچا کچھا اپنے اوپر اعتماد اور بھروسا ہوتا ہے وہ بھی ختم ہو جاتا ہے...... پھر شاید اللہ تعالیٰ کو کچھ رحم آ گیا اور مجھے ''مور محل'' سیریل مل گیا۔ اس میں مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا اور اس کے ڈائریکٹر نے مجھ پر محنت بھی بہت کی، اس کا مجھے اچھا رسپانس ملا پھر ایک ٹیلی فلم ''ہونا تھا پیار'' کی اور اس کا مجھے یہ رسپانس ملا کہ مجھے میسجز آنے لگے کہ آپ تو بہت اچھی اداکارہ ہیں۔ اس کے بعد ''صلہ اور جنت'' ملا اور یہ میں نے بہت ہی دل کے ساتھ کیا۔ یہ کافی رونے دھونے والا رول تھا اور اس کے دو تین شیڈز تھے جو کہ میں نے دیے اور کامیاب رہی، بس پھر اس کے بعد مجھے ایک کے بعد ایک کام ملنا شروع ہو گیا۔''

☆ ''گھر میں کسی نے یہ نہیں کہا کہ گئی تھیں گلوکارہ بننے اور بن گئیں اداکارہ...... گھر والوں نے حوصلہ افزائی کی؟''

❁ ''میری اماں کی خواہش تھی کہ میری بیٹی گلوکارہ بنے، انہیں اداکاری زیادہ پسند نہیں تھی لیکن میں جس میں خوش تھی اسی کے لیے وہ راضی ہو گئیں کہ ہمیں تمہاری خوشی عزیز ہے۔ البتہ بابا نے بہت روک ٹوک کی...... بہت کوشش کی کہ میں اس فیلڈ میں نہ آؤں لیکن پھر انہیں اندازہ ہو گیا کہ میری بیٹی کو یہ فیلڈ پسند آ گئی ہے اور وہ یہ کام کرے گی لیکن انہوں نے اس بات کی تاکید کی کہ پہلے اپنی پڑھائی مکمل کرو اور میں نے اپنے بابا سے وعدہ کیا کہ میں ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھوں گی۔ باقی رشتے داروں میں کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔''

☆ ''اب تنقید ہوتی ہے؟ یا اب لوگوں نے تمہیں تسلیم کر لیا ہے؟''

❁ ''اب نہیں ہوتی لیکن جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ پہلے بہت ہوتی تھی اور اب تو میں نے کسی کو موقع ہی نہیں دیا۔ اب میں اتنی محنت کرتی ہوں کہ سب کچھ اچھا اچھا ہو جاتا ہے۔ اب تو میرے پاس اپنا اسکرپٹ ہوتا ہے، وارڈروب میں خود دیکھتی ہوں اور جیسا فیل کر رہی ہوتی ہوں اس کردار کو ویسا بناتی ہوں، بعد میں سیٹ پر جا کر جو چھوٹی موٹی غلطی یا کمی ہوتی ہے وہ لوگ خود ٹھیک کروا دیتے ہیں اور جب اسکرپٹ میرے ہاتھ میں آتا ہے اور جو کردار مجھے پسند نہیں آتا، اسے میں چھوڑ دیتی ہوں اور جو کردار میں دیکھتی ہوں کہ اسٹرونگ ہے مگر سائڈ ہے تو میں اس کردار کو چیلنج سمجھ کر قبول کر لیتی ہوں کہ یہ تو لیڈ کریکٹر سے بھی زیادہ چیلنجنگ ہے تو میں کر لیتی ہوں۔ اس کی ایک مثال ''محبت نفرت ہے تم سے'' میں مجھے ایک چودہ، پندرہ سال کی لڑکی دکھانی تھی جب کہ میں بیس سال کی تھی تو بھلا بیس کی لڑکی کیسے چودہ پندرہ کی بن سکتی ہے تو یہ رول میرے لیے کافی چیلنجنگ تھا اور جب کیا تو میں واقعی اتنی ہی کم عمر لگی۔ ان دنوں میں نے اپنی ڈائٹ کو بہت کنٹرول کیا اور اپنا زیرو سائز کر دیا تو میرے اس کردار کو اور میری اس کوشش کو بہت پسند کیا گیا اور میری کافی تعریف ہوئی۔ ہماری فیلڈ بہت محنت مانگتی ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ میں محنت سے نہیں گھبراتی بلکہ محنت کے بعد جو صلہ ملتا ہے اس کا مزا ہی کچھ اور ہے۔''

☆ ''اب تک کتنے ڈرامے کر چکی ہو اور کس میں اپنا کردار بہت اچھا لگا؟''

❁ ''اب تو ماشاء اللہ کافی ہو چکے ہیں جیسے ''صلہ اور جنت، میکے کو دے دو سندیس، ہونا تھا پیار، مور محل، سنگسار، من چاہی، تشنگی دل کی، فریب، محبت نفرت ہے تم سے، رانی'' اور ''دلدل، مور سیاں'' وغیرہ...... اور سب سے اچھا کردار مجھے ''سنگسار'' میں لگا، باقی بھی اچھے تھے۔''

☆ ''نگیٹو رول کیے؟''

❁ ''جی ایک میں ہی کیا ''تشنگی دل کی'' میں، اور بہت اچھا رول تھا اور آئندہ بھی اگر نگیٹو رول ملا تو ضرور کروں گی کیونکہ ہر وقت رونے دھونے والے رول کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔''

☆ ''کیا آج کے دور میں اپنی پہچان کروانا آسان کام ہے؟''

❁ ''نہیں، میرے خیال سے یہ ایک مشکل کام ہے کیونکہ اب بہت چینلز آ گئے ہیں اور دیکھنے والوں کو روکنا کہ وہ ہمیں دیکھیں بہت مشکل کام ہے اور کسی چینل پر ہاتھ رُکنا، ریموٹ کا رُکنا بہت بڑی بات ہے اور آج کل کے دور میں اداکاری بہت مشکل کام ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم آئیں گے اور دو لفظ بول کر اداکار بن جائیں گے یہ غلط سوچ ہے۔ اپنے آپ سے نکل کر کسی اور کے کردار میں اپنے



آپ کو سمو دینا بہت مشکل ہے۔''

☆ ''کیا ہمارے ڈراموں میں اب مظلوم خواتین کچھ زیادہ ہی نہیں دکھائی جا رہی ہیں، روتی دھوتی خواتین؟''

❁ ''بے شک ڈراموں میں مظلوم خواتین دکھائی جاتی ہیں تو اسٹرونگ بھی دکھائی جاتی ہیں۔ ایک ہی ڈرامے میں دونوں طرح کی خواتین دکھائی جاتی ہیں خواہ وہ نند کی شکل میں ہو یا ساس کے روپ میں یا سوکن کے روپ میں۔ البتہ ہمارے ڈراموں میں اسٹوریز اور کانٹینٹ کی کمی ہے۔ ہمارے رائٹرز یا ڈائریکٹر ساس بہو سے آگے نکل ہی نہیں پا رہے یا پھر ہمارے ناظرین صرف ساس بہو کے جھگڑے ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر کبھی حقیقت پر مبنی ڈرامہ بن بھی جاتا ہے تو اسے بند کروا دیا جاتا ہے، اس لیے ڈرامہ انڈسٹری اسی پر کام کر رہی ہے جس کو ناظرین دیکھنا چاہتے ہیں۔''

☆ ''سیٹ پر کام کرنا آسان ہے یا آؤٹ ڈور لوکیشنز پر؟''

❁ ''آؤٹ ڈورز میں زیادہ مسئلے مسائل ہوتے ہیں کیونکہ سڑکوں پر اور دکانوں پر سین کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لوگ جمع ہوجاتے ہیں جب کہ جن گھروں میں ہم شوٹ کرتے ہیں ان میں کچھ تو بہت ہی پروفیشنل ہوتے ہیں اور کچھ بہت پیار کرنے والے، محبت کرنے والے لوگ ہوتے ہیں ان کا رویہ تو ایسا ہوتا ہے کہ بھلے آپ کچھ توڑ کر بھی چلے جائیں تو وہ آپ کو کچھ نہیں کہیں گے اور جو پروفیشنل ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ آپ نو بجے بیک اپ کر کے نکلیں، ٹائم سے آئیں اور ٹائم سے جائیں۔ ہمیں کوئی پروا نہیں ہے کہ آپ کے آرٹسٹ آرہے ہیں، جارہے ہیں، کتنا بھی بڑا ایکٹر آجائے انہیں کوئی پروا نہیں ہوتی، انہیں صرف پیسوں سے مطلب ہوتا ہے۔''

☆ ''سینئرز کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا ہے؟''

❁ ''سینئرز کا رویہ بہت اچھا ہوتا ہے، خواہ وہ صبا فیصل ہوں، لیلیٰ واسطی ہوں، ارسہ غزل، سیمی پاشا، صبیحہ ہاشمی اور جتنی بھی سینئر آرٹسٹ ہیں سب نے مجھے بہت پیار دیا ہے اور اس لحاظ سے میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ میرے سینئرز مجھے سکھاتے بھی ہیں اور مجھ سے پیار بھی کرتے ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک کسی کے ساتھ کوئی برا تجربہ نہیں ہوا مجھے۔ ہم اداکار ہیں ہمارا دل بہت نازک ہوتا ہے تو کوئی چھوٹی سی بھی بات کر دیتا ہے تو ہمارے دل پر جا لگتی ہے اور ہم اس کو پرسنلی لے جاتے ہیں، دراصل ہر وقت رونے دھونے والے کردار کر کے سچ مچ ہمارے دل چھوٹے ہوگئے ہیں اور کمزور بھی...... اور کبھی اتفاق سے کوئی ڈانٹ بھی دے تو میں سوری کر کے پوچھ لیتی ہوں کہ آپ بتائیں کہ میں نے کہاں غلطی کی ہے۔''

☆ ''کچھ نجی سوال بھی ہوجائیں...... کہ تم والدین کی اکلوتی اولاد ہو، مزے میں زندگی گزر رہی ہے یا مشکل؟''

❁ مسکراتے ہوئے...... ''اکلوتا ہونا بھی بہت مشکل کام ہے کیونکہ آپ کے والدین کے پاس وہ ایک ہی بچہ ہوتا ہے جس سے وہ پیار بھی کرتے ہیں اور جس کو وہ ڈانٹتے بھی ہیں، جس کی وہ کیئر بھی کرتے ہیں اور جس کے لیے وہ ضرورت سے زیادہ حساس بھی ہوجاتے ہیں اور میری مما میرے لیے ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ ہر وقت فون پر رابطہ رہتا ہے، دن میں پتا نہیں کتنی کالز آتی ہیں اور اگر میں ایک کال نہ اٹھاؤں تو پھر دوسری کال میں دعا پڑھ کے اٹھاتی ہوں کہ مجھے بس اب ڈانٹ پڑنے والی ہے...... تو اکلوتے بچے کو ہینڈل کرنا بہت مشکل ہے مگر میں پھر بھی اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے بہت ہی پیار کرنے والے ماں باپ دیے ہیں ''تھینک یو اللہ میاں''۔

☆ ''شادی کب کرنی ہے...... اور ''دلال'' جیسا سسرال ملا تو؟''

❁ ''میرے خیال سے شادی نصیب کی بات ہے لیکن ان شاء اللہ تین ساڑھے تین سال میں شادی ہوجائے گی کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ لڑکی کی شادی اچھے ٹائم پر ہوجانی چاہیے۔ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے کہ پچیس، چھبیس کے بعد یا تیس سال کی ہونے کے بعد کروں یا یہ کہ پہلے کچھ بن جاؤں تو پھر شادی کروں۔ ہر کام اپنے وقت پر ہی ہوجائیں تو اچھا ہے اور اگر ڈرامہ سیریل ''دلال'' جیسا خاندان مل گیا تو بھئی اگر آپ اچھے ہیں تو سب اچھے ہیں۔ ہاں یہ بات میں نے ضرور محسوس کی کہ لڑکوں کی مائیں بہت حساس ہوتی ہیں اور وہ بچوں کے ساتھ یا بیٹوں کے ساتھ شیئرنگ برداشت نہیں کرسکتیں مگر قصور ان کا نہیں کیونکہ یہ رشتہ ہے ہی بہت نازک، مگر اگر بہوئیں اچھی ہوں گی تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''

☆ ''گڈ...... بندہ اس فیلڈ کا ہوگا یا کوئی اور...... اور تمہاری پسند کو کتنا عمل دخل ہوگا؟''

❁ ''اس فیلڈ سے تو بالکل بھی نہیں چاہوں گی۔ یہ میری سوچ ہے اور ایک سوچ اور بھی ہے اور



وہ یہ کہ میں اپنے لیے کسی کو بھی خود سے پسند نہیں کر پاؤں گی۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ میرے ہم سفر کا انتخاب میرے والدین ہی کریں کیونکہ ان کا تجربہ وسیع ہوتا ہے اور ویسے بھی جو تقدیر میں لکھا ہوگا وہ ہی ہوگا۔''

☆ ''اگر اس فیلڈ کو چھوڑنا پڑا تو؟''

❀ ''یہ فیلڈ اب میری پہچان بن گئی ہے اور جب بھی میں اس فیلڈ کو چھوڑنے کی بات کرتی ہوں یا سوچتی ہوں تو مجھے میری جدوجہد یاد آجاتی ہے جو میں نے اس فیلڈ میں آنے کے لیے کی...... اور اگر چھوڑ دیتی ہوں تو میری کیا پہچان رہے گی۔ جیسے اگر لوگ مجھے کنزہ کہنا چھوڑ دیں تو میری کیا پہچان رہے گی۔ اس طرح عام لوگوں میں میری پہچان میری فیلڈ ہے، اس کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ مجھے اگر کسی سے پیار ہوا ہے تو وہ میری یہ فیلڈ ہے اس کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

☆ ''کامیابی کا کیا پیمانہ ہے تمہاری نظر میں؟''

❀ ''میری نظر میں کامیابی کا پیمانہ یہ ہے کہ چھوٹوں سے پیار کریں، بڑوں کی عزت کریں۔ سخت محنت کریں اور دل سے کام کریں۔ میں نے کبھی بڑوں کو جواب نہیں دیا، ہمیشہ سب کی عزت و احترام کیا۔''

☆ ''غصہ نہیں آتا؟''

❀ ''عموماً نہیں آتا...... مگر آ بھی جاتا ہے اور پھر آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتی ہوں مگر کوشش کرتی ہوں کہ کول رہوں۔''

☆ ''لوگوں میں کس چیز کی کمی دیکھتی ہو؟ کیا کہنا چاہیں گی لوگوں سے؟''

❀ ''میں لوگوں میں ''احساس'' کی کمی دیکھتی ہوں، ہم جو کچھ بھی سوچتے ہیں اپنے لیے سوچتے ہیں۔ دوسروں کے بارے میں نہیں سوچتے، جس کی وجہ سے آپس میں دوریاں پیدا ہو رہی ہیں، ہمارے ماں باپ ہم سے بہت پیار کرتے ہیں لیکن ہمیں ان کے پیار کا احساس نہیں ہوگا تو ہم ان کے پیار کی بھی قدر نہیں کر سکیں گے۔ احساس کرنا سیکھیں کیونکہ جس دن احساس ختم ہو جائے گا سمجھیے کہ دنیا ختم ہو جائے گی۔''

☆ ''آخر میں کوئی بات جو ضرور کہنا چاہو گی؟''

❀ ''جی، بالکل...... میں اس فیلڈ میں آئی ہوں تو مجھے اپنی ماں کے بعد ''ماں'' والی جو فیلنگز آتی ہیں وہ ارسہ غزل صاحبہ سے آتی ہے مجھے ایسا لگتا ہے کہ میری ماں کے بعد کوئی اگر ہے تو وہ ارسہ غزل ہیں۔ اللہ میری ماں کو سلامت رکھے اور لمبی عمر دے، وہ جب پاکستان میں نہیں ہوتیں تو میں ارسہ غزل صاحبہ کے قریب ہوتی ہیں۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی ہوں اور دل سے کرتی ہوں اور میں ہمیشہ ان سے یہ کہتی ہوں کہ آپ میرے دل کے بہت قریب ہیں اور وہ ہمیشہ کہتی ہیں کہ بس بس رہنے دو۔ مجھے پتا ہے کہ میں تمہارے دل کے کتنے قریب ہوں۔ اگرچہ ان سے ملاقات بہت کم ہوتی ہے، مگر ایک ملاقات بھی برسوں پر بھاری ہوتی ہے خدا میری ماں اور ارسہ غزل صاحبہ کو بہت لمبی عمر دے، آمین۔''

☆ ''اور اس کے ساتھ ہی ہم نے کنزہ ہاشمی سے اجازت چاہی۔''

☆☆

میری بھی سنیئے

زاہد افتخار احمد

شاہین رشید



☆ ''پورا نام؟''

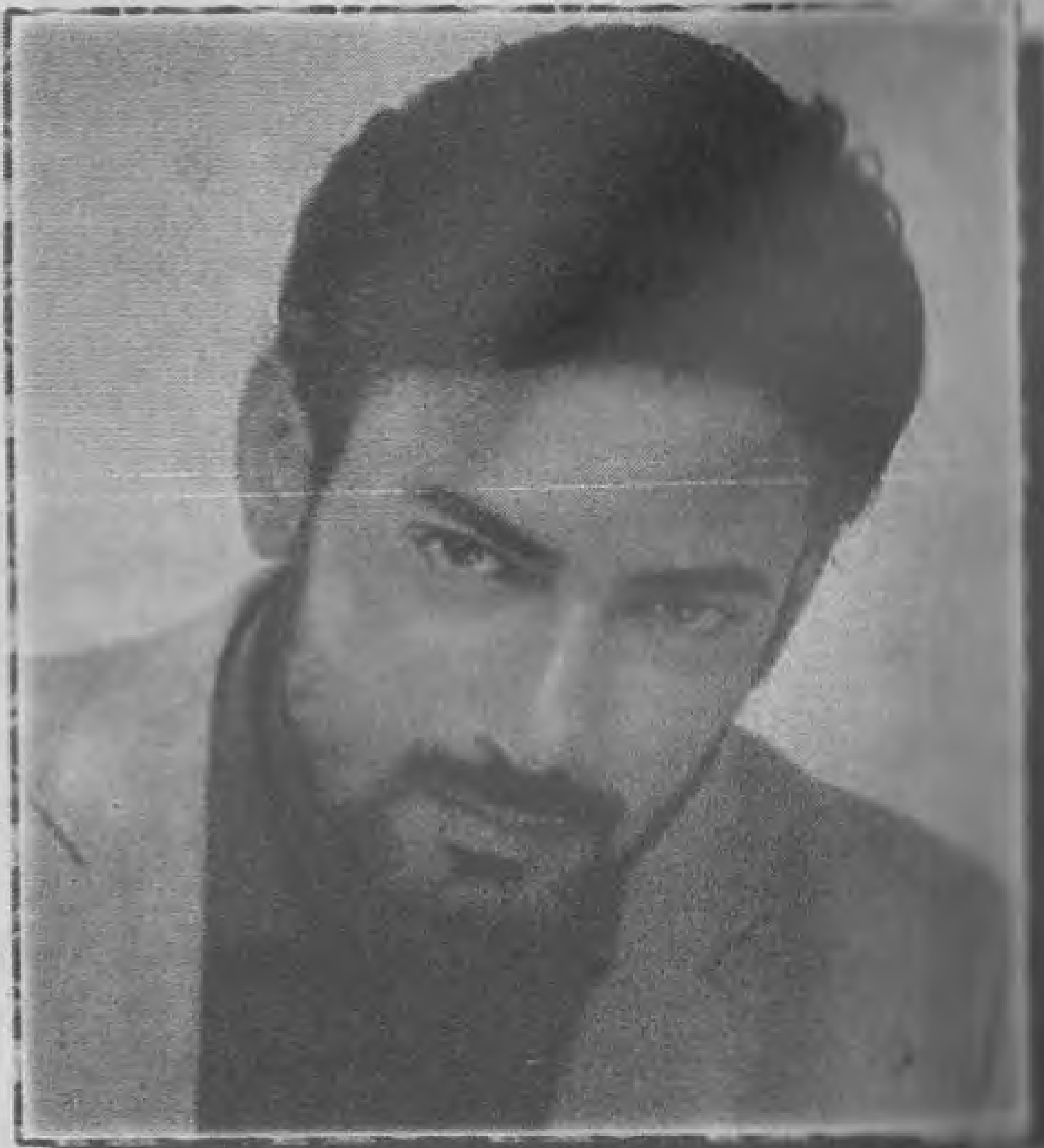
❀ ''زاہد افتخار احمد۔''

☆ ''پیدائش؟''

❀ ''راولپنڈی۔ 20 ستمبر 1983ء۔''

☆ ''بہن بھائی؟''

❀ ''ہم تین ہی بھائی ہیں، بہن نہیں ہے۔ بہن کی کمی محسوس ہوتی ہے۔''



☆ ''تعلیم؟''

❀ ''ایم بی اے، پرسٹن یونیورسٹی۔''

☆ ''فیلڈ میں آمد؟''

❀ ''اتفاقاً ہوئی۔ ایک حادثے نے مجھے آرٹسٹ بنا دیا' پہلے ریڈیو جوائن کیا پھر تھیٹر اور اس کے بعد ٹی وی۔''

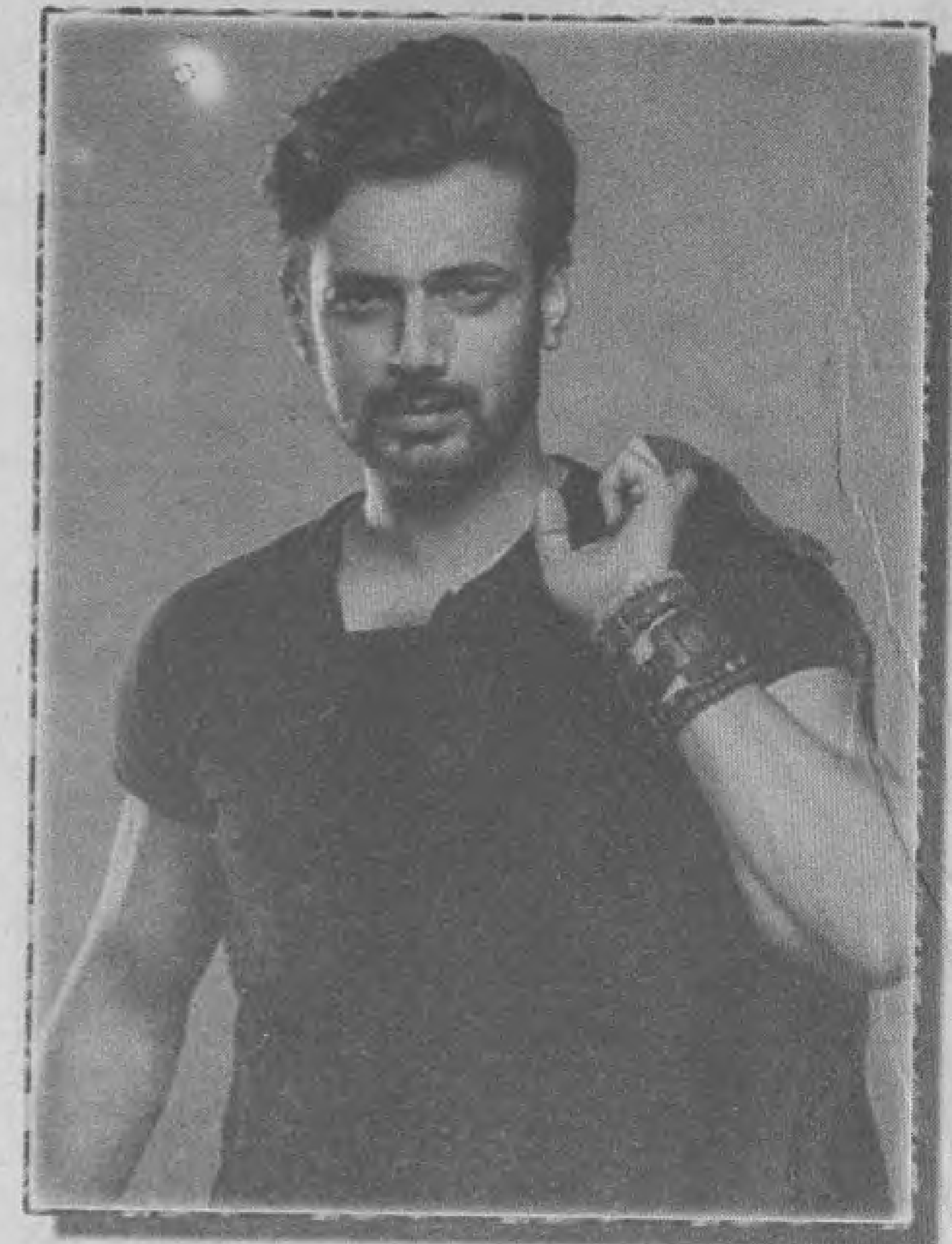
☆ ''برا وقت جو آپ نے گزارا؟''

❀ ''بہت برا وقت گزارا میں نے، ایک حادثے میں معذور ہو گیا۔ جہاں جاب کی وہ کمپنی فراڈ نکلی، حادثے کا شکار ہوا تو آمدنی کا ذریعہ ختم ہو گیا۔ بڑی مشکل سے ایک ایف ایم میں جاب ملی، اپنی معذوری کی وجہ سے زمین پر لیٹ کے پروگرام کرتا تھا، پھر کسی دوست نے ایک سرجن سے ملوایا انہوں نے کہا کہ تمہاری سرجری ہوگی تو ان شاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گے اور اللہ کا کرم ہوا کہ سرجری سے میں ٹھیک ہو گیا اور اللہ کا کرم ہو گیا، ٹھیک ہونے کے بعد تھیٹر کیا اور تھیٹر سے ٹی وی پر آیا۔''

☆ ''بیماری میں کیا سوچتے تھے؟''

❀ ''ریڑھ کی ہڈی بھی ٹوٹ چکی تھی، نوکری بھی چلی گئی تھی۔ ہر وقت فرش پر لیٹا رہتا تھا، تو بھلا کیا سوچ سکتا تھا۔ کبھی روتا تھا تو کبھی اللہ سے دعائیں کرتا تھا اور شکر کہ اللہ نے دعائیں قبول کیں۔''

☆ ''اس سارے کرائسس میں سب سے زیادہ کس کو یاد کیا؟''



❁ ''اللہ کو...... کیونکہ وہ ہی مجھے اس کرائسس سے نکال سکتا تھا۔''

☆ ''فیلڈ میں آ کر سکون کا سانس لیا یا......؟''

❁ ''بہت زیادہ...... کیونکہ بہت مشکلات کے بعد مجھے کوئی ڈھنگ کا کام ملا تھا۔''

☆ ''اب فیوچر میں اپنے آپ کو کہاں دیکھتے ہیں؟''

❁ ''اپنے آپ کو بڑی اسکرین پر لیڈنگ رول کرتے ہوئے...... یہ میرا خواب ہے جو ضرور پورا ہوگا۔''

☆ ''رول جو آپ چاہتے ہیں؟''

❁ ''میں ایسا رول کرتا ہوں جو میرے کیریئر کے لیے سنگ میل ثابت ہو، مجھے بہت اچھی اچھی آفرز ہیں۔''

☆ ''زندگی بہت حسین لگنے لگی جب......؟''

❁ ''جب میرا بیٹا اس دنیا میں آیا، ایک یادگار دن تھا وہ میری زندگی کا۔''

☆ ''غصہ آتا ہے؟''

❁ ''لاپروائی پر...... چیزیں ادھر اُدھر بکھری ہوں تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔''

☆ ''غصہ نکالتے ہیں؟''

❁ ''نکالتا نہیں......بس اظہار کر دیتا ہوں کہ یہ کام ٹھیک نہیں ہوا، چیختا چلاتا نہیں ہوں۔''

☆ ''صحیح مشورہ کون دیتا ہے دل یا دماغ؟''

❁ ''میرے خیال میں دل کا مشورہ زیادہ بہتر ہوتا ہے نسبتاً دماغ کے۔''

☆ ''بیماری میں کس نے ساتھ دیا؟''

❁ ''میری بیگم نے اور اسی کی وجہ سے میں کامیاب انسان بنا۔''

☆ ''ہر کامیاب مرد کے پیچھے؟''

❁ ''جی ایک عورت کا ہی ہاتھ ہوتا ہے خواہ وہ عورت بیوی ہو، یا ماں ہو۔''

☆ ''کن حسین اداکاراؤں کے ساتھ پرفارم کر کے اچھا لگا؟''

❁ ''یمنیٰ زیدی اور صبا قمر۔''

☆ ''میرے والٹ سے آپ کو ملے گا ہمیشہ؟''

❁ ''مختلف کارڈز، والدہ کی تصویر اور کچھ پیسے۔''

☆ ''میری ایک عادت سے گھر والے بےزار رہتے ہیں؟''

❁ ''بھرم بہت دکھاتا ہوں، جب گھر میں ہوتا ہوں۔''

☆ ''برتھ ڈے یاد رہتی ہے؟''

❁ ''صرف میری بیگم کو، وہ ہی اہتمام کرتی ہے جیسا کہ آپ کو بتایا کہ 20 ستمبر میری سالگرہ کا دن ہے۔''

☆ ''اپنے فیصلے خود کرتے ہیں یا مشورہ لیتے ہیں؟''

❁ ''ویسے تو مشورہ لے لینا چاہیے مگر اپنی زندگی کے زیادہ تر فیصلے خود ہی کیے اور اس کا مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔''

☆ ''کب دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے؟''

❁ قہقہہ...... ''جب بیگم ناراض ہوتی ہے تو دل کی دھڑکن بہت تیز ہو جاتی ہے۔ ڈر جاتا ہوں کہ اگر نہ منایا تو بیگم کی ناراضی لمبی ہو جائے گی۔''

☆ ''شادی پسند سے کی؟''

❁ ''پسند بھی اور ارینج بھی۔ میں نے اپنی پسند کو ارینج بنا دیا۔ آمنہ کو والدین سے ملوایا، انہیں پسند آئی تو پھر دونوں خاندانوں کی مرضی سے رشتہ طے پایا۔''

☆ ''زندگی میں آج بھی تشنگی ہے؟''

❁ ''بالکل ہے......ابھی بہت سی خواہشات ادھوری ہیں، ابھی بہت کچھ پانا ہے، ابھی بہت آگے جانا ہے۔''

☆ ''زندگی کیا ہے؟''

❁ ''جدوجہد......اور خواہشات کی تکمیل کرنا ہی زندگی ہے۔''

☆ ''لوگ رشک کرتے ہیں؟''

❁ ''ہماری آئیڈیل ازدواجی زندگی پر کیونکہ ہم دونوں میں بہت ذہنی ہم آہنگی ہے۔''

☆ ''شادی کے بعد تبدیلی آئی؟''

❁ ''کہ میں جو بھی کام کرتا ہوں اپنی بیگم سے مشورہ کر کے کرتا ہوں۔ ہمارے سب کام باہم مشورے سے ہوتے ہیں۔''

☆ ''محبت ایک بار ہوتی ہے؟''

❁ ''میرے حساب سے محبت ایک بار نہیں بلکہ بار بار ہوتی ہے۔''

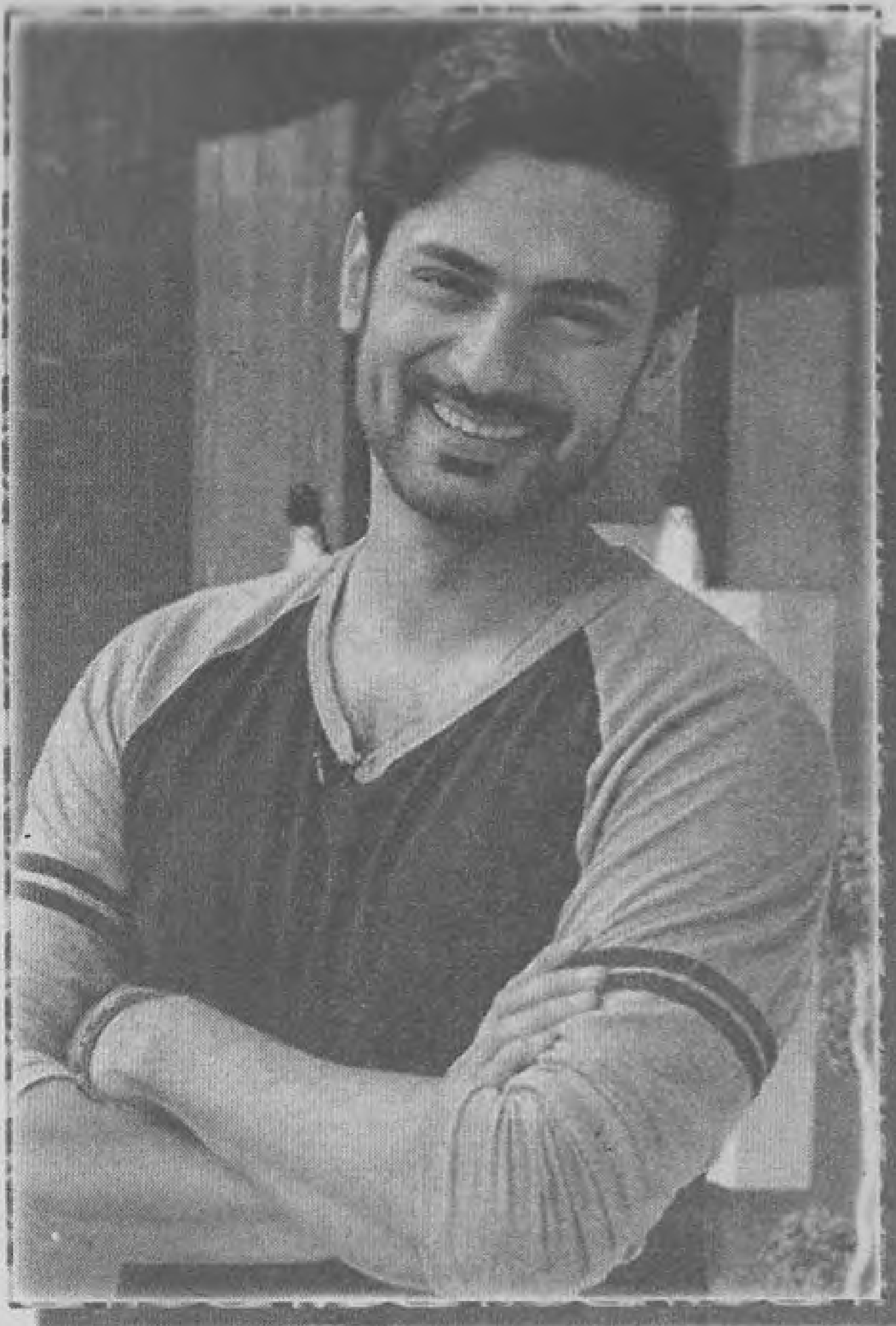
☆ ''بیگم کس کام سے آزاد ہے؟''

❁ ''کچن کے کام سے، اسے کھانا پکانے سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ ہی مجھے ہے۔ ایسے موقع پر کیا ہوتا ہے، ظاہر ہے کک ہی ہوتا ہے۔''

☆ ''شوٹ کی دوران مس کرتا ہوں؟''

❁ ''اپنے دونوں بیٹوں کو زاویار اور زیان کو۔ دونوں ابھی بہت کم عمر ہیں، اس لیے جلدی گھر جانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

☆ ''میری محنت کا محور؟''



❁ ''میرے بچے اور بیگم۔ دل چاہتا ہے کہ دنیا جہاں کی ساری نعمتیں ان پر لٹا دوں اور اس کے لیے مجھے بہت زیادہ محنت کرنی ہے۔''

☆ ''کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟''

❁ ''والٹ، سیل فون اور پرفیوم۔''

☆ ''ملک میں کون سا نظام حکومت ہونا چاہیے؟''

❁ ''اپنے ملک میں اسلامی طرز حکومت ہونا چاہیے۔ جمہوریت کے خلاف ہوں کیونکہ دیکھ لیا کہ جمہوریت نے ملک کو خراب ہی کیا ہے۔''

☆ ''میوزک سے میرا لگاؤ؟''

❁ ''بہت زیادہ لگاؤ ہے اور میرے چاہنے والے عنقریب مجھے ایک گلوکار کی حیثیت سے بھی دیکھیں گے۔''

☆ ''فلمیں جو پسند آتی ہیں؟''

❁ ''سچ بتاؤں...... میں انڈین فلمیں نہیں دیکھتا، مجھے اپنے ملک کی فلمیں دیکھنا پسند ہیں اور وہ

ہی دیکھتا ہوں، چاہے جیسی بھی ہوں۔"

☆ "میرے پسندیدہ فنکار؟"

۞ "سمعیہ ممتاز، نعمان اعجاز، فیصل قریشی، یمنیٰ زیدی اور صبا قمر۔"

☆ "پسندیدہ تہوار؟"

۞ "رمضان المبارک، عید اور پھر بقرہ عید۔"

☆ "بیگم کو پسند نہیں؟"

۞ "کہ میں کسی کے ساتھ رومانٹک سین کروں، اس لیے جب کسی ڈرامے میں میرے رومانٹک سین ہوتے ہیں تو وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔"

☆ "بیگم شکی مزاج ہے؟"

۞ "نہیں...... ایسا کچھ نہیں، وہ اس فیلڈ کو سمجھتی ہیں۔"

☆ "اب احساس ہوتا ہے کہ......؟"

۞ "کہ ہمارے والدین نے ہماری پرورش کس طرح کی ہوگی کیونکہ میں اب خود باپ بنا ہوں اور مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ والدین بچوں کے لیے کتنی قربانیاں دیتے ہیں۔"

☆ "اس فیلڈ کے کس شعبے سے لگاؤ نہیں؟"

۞ "ریمپ پر واک کرنے سے...... حالانکہ میں ریمپ پر واک کر چکا ہوں اپنے قد کاٹھ کی وجہ سے مگر مجھے مزا نہیں آیا۔"

☆ "میری زندگی کا یادگار رول؟"

۞ "قائد اعظم کا رول...... جو میں نے تھیٹر کے لیے کیا تھا جو 14 اگست کے موقع پر ہوا تھا جس کا نام "پونے 14 اگست" تھا۔"

☆ "اس رول کے لیے کوئی خاص بات؟"

۞ "جی...... خاص بات یہ ہے کہ جب مجھے یہ رول آفر ہوا تو میں اچھا خاصا بھاری بھرکم انسان تھا لیکن اس کردار کے لیے مجھے دبلا ہونا تھا لہٰذا ڈائٹ کنٹرول کے ذریعے الحمدللہ میں وزن کم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔"

☆ "کوئی ایسا سین جسے کرتے وقت سچ مچ رو پڑا؟"

۞ "جی...... ایک ڈرامہ سیریل ہوا تھا "ذرا یاد کر" اس کے آخری سین میں سچ مچ رویا تھا اور میں اپنے ڈرامے کے جذباتی سین کے ساتھ سچ مچ جذباتی ہو جاتا ہوں۔"

☆ "اپنے کیے ہوئے چند کردار جو مجھے بہت پسند ہیں؟"

۞ "دلال" میں شجاع کا رول۔ "بے شرم" میں حیدر کا رول۔ "الوداع" میں رمیز کا رول۔ "ذرا یاد کر" میں ہادی کا رول اور "سنگت" میں شاویز کا رول...... ان کے لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ یادگار رولز تھے۔"

☆ "میں نادم ہوتا ہوں؟"

۞ "ایسا کچھ نہیں کیا لیکن پھر بھی رات کو سونے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ضرور کرتا ہوں کہ اگر جانے ان جانے میں کسی کا دل دکھایا دیا ہو تو معاف کر دینا۔"

☆ "میری ایکسٹرا صلاحیت؟"

۞ "میرا خیال ہے میری حاضر دماغی، برجستہ جواب دیتا ہوں۔"

☆ "کام کا مزا کہاں آتا ہے؟"

۞ "کراچی میں...... باقی شہر بھی اچھے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ کراچی میں پروفیشنلزم بہت ہے۔"

☆ "میری عادت ہے کہ......؟"

۞ "رات کو مطالعہ کر کے سوتا ہوں، مطالعہ کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔"

☆ "عام زندگی میں کیسا ہوں؟"

۞ "ڈراموں میں آپ کو سنجیدہ نظر آتا ہوں، درحقیقت ایسا نہیں ہوں۔ میں ایک خوش مزاج اور فرینڈلی ہوں۔"





انسان میں بہت کم صلاحیتیں ایسی ہوتی ہیں جو خداداد ہوتی ہیں۔ اداکاری ہو یا گلوکاری سیکھی جاسکتی ہے بلکہ سیکھنے کے بعد ہی انسان اس شعبے میں باکمال ہوتا ہے اور پھر باکمال ہونے کے لیے باقاعدہ ادارے ہیں جہاں آپ اس فن میں مہارت حاصل کر سکتے ہیں لیکن "شاعری" وہ واحد صلاحیت ہے جو خالصتاً خداداد ہوتی ہے اور اس کے لیے کوئی تربیتی ادارہ بھی نہیں ہے کیونکہ شاعری دل سے نکلتی ہے اور "وحی" کی طرح نازل ہوتی ہے اس لیے اس کے لیے کسی تربیتی ادارے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

ہمارے سالگرہ نمبر کے لیے ہمارے مہمان شہرہ آفاق شاعر شہزاد نیر صاحب ہیں جو پیشے کے اعتبار سے آرمی میں میجر کے عہدے پر فائز ہیں۔ شہزاد صاحب نہ صرف بہترین شاعر ہیں بلکہ محقق اور نقاد بھی ہیں۔ اب تک ان کی شاعری کی تین کتابیں "برفاب" "چاک سے اترے وجود" اور "گرہ کھلنے تک" منظر عام پر آچکی ہیں۔

☆ "جی کیسے ہیں آپ؟"

◉ "جی شکریہ...... اور میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

شعر و سخن کی دنیا سے

شہزاد نیر

شاہین رشید

☆ "کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟"

◉ "میرا نام شہزاد نیر ہے اور نیر عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی "زیادہ چمک دار ستارہ" کے ہیں۔ نیر سورج کو بھی کہتے ہیں۔ میں 4 اپریل 1973ء کو گوجرانوالہ کے ایک قصبے "گوندلانوالہ" میں پیدا ہوا اور ابتدائی تعلیم بھی اپنے آبائی گاؤں سے ہی حاصل کی۔ میٹرک کرنے کے بعد ایف سی کالج لاہور سے ایف ایس سی کیا اور پھر عسکری ملازمت اختیار کی اور مختلف جگہوں پر تعینات رہا۔ دوران ملازمت بلوچستان یونیورسٹی سے "ایم اے اردو" فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور اس کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے "ماس کمیونیکیشن" میں



ماسٹرز کیا اور ساتھ ہی نمل اسلام آباد سے فارسی و ادب میں ڈپلومہ کیا اور اب ابلاغ عامہ میں ایم فل کر رہا ہوں۔ میرے والد محترم حیات ہیں اور صنعت کار ہیں۔ والدہ کا انتقال ہو چکا ہے، کافی عرصہ پہلے۔ ہاؤس وائف تھیں اور دانش ور تھیں، ادب سے بہت لگاؤ تھا انہیں۔ پنجابی کے اشعار اور اقوال کا استعمال بہت کرتی تھیں۔ میری شادی میری پسند سے ہوئی اور ماشاء اللہ میرے پانچ بچے ہیں اور جہاں جہاں میری پوسٹنگ ہوتی ہے، ہم ساتھ ہی رہتے ہیں۔ ہم سات بہن بھائی ہیں اور میرا دوسرا نمبر ہے۔ چار بہنیں ہیں اور تین بھائی ہیں اور ہم سب شادی شدہ ہیں اور صرف میں جاب کرتا ہوں، باقی سب بھائی بزنس کرتے ہیں۔ بہنیں ہاؤس وائف ہیں سوائے ایک بہن کے، باقی سب بہنیں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ شعر و ادب کا شوق بس معمولی ہے۔"

☆ "تعلیم سے آپ کو کافی شغف ہے یہ اپنا شوق تھا آپ کا یا گھر والوں کی وجہ سے پڑھا؟"

◉ "تعلیم انسان کو حاصل کرتے رہنا چاہیے اور میں ان لوگوں میں سے ہوں جو "علم" کو "تعلیم" سے وابستہ نہیں کرتے کیونکہ علم اور چیز ہے اور تعلیم اور چیز ہے۔ تعلیم میں نے اپنے شوق سے حاصل کی اور جس جاب میں یا جس فیلڈ میں ہوں اس میں اس تعلیم کا کوئی عمل دخل نہیں ہے...... ہوسکتا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد یہ میرے کام آئے چونکہ مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق ہے تو میں نصاب کی کتابیں پڑھ کر امتحان دے دیتا ہوں اور نمبر بھی بہت اچھے آجاتے ہیں چونکہ ڈگری کا اتنا شوق نہیں ہے اس لیے جو پڑھتا ہوں ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ اب ایم فل بھی مکمل ہونے والا ہے، گھر والوں کی وجہ سے نہیں اپنے شوق کی وجہ سے تعلیم حاصل کی ہے۔"

☆ "آرمی جاب اور شعر و ادب سے لگاؤ دو مختلف چیزیں ہیں۔ آرمی میں جانے کا شوق کیسے ہوا اور کن مراحل سے گزر کر اس عہدے پر آئے؟ کیونکہ ٹریننگ بڑی سخت ہوتی ہے۔"

◉ "جی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ آرمی میں انتخاب کے معیار بہت کڑے ہیں اور میں بھی ان ہی معیارات سے گزر کر منتخب ہوا۔ آرمی کی تربیت بہت سخت ہے جو ملٹری اکیڈمی کاکول (ایبٹ آباد) میں ہوتی ہے۔ مجھے آرمی میں آنے کا بہت شوق اور لگن تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں دفاع وطن کا حصہ بنوں اور یہ فریضہ میں نے اس جاب تک پہنچنے تک انجام بھی دیا ہے۔ کشمیر میں لائن آف کنٹرول پر بھی رہا ہوں۔ سیاچن گلیشیر میں بہت زیادہ وطن کے لیے خدمات انجام دیں، تقریباً دو سال جنوبی وزیرستان میں دہشت گردوں اور دہشت گردی سے پاک کرنے کے لیے اپنے وطن کا حصہ رہا۔ فوج مجھے پسند ہے کیونکہ یہ قربانی کا راستہ دکھاتی ہے، محبت کا راستہ دکھاتی ہے اور ہم بعد میں کچھ ہیں، پہلے ہمارا وطن ہمارے لیے سب کچھ ہے۔ میجر کے عہدے تک پہنچنے کے لیے تمام جسم و جان کی کڑی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد یہ مقام حاصل کیا۔ ہمارے امتحانات اور مختلف جگہوں پر پوسٹنگ بھی ہوتی ہیں اور ہارٹ ایریا میں بھی ہماری پوسٹنگ ہوتی ہے۔ ہارٹ سے مراد سخت علاقے جیسے سیاچن، وزیرستان، بلوچستان اور دور دراز علاقے شامل ہیں۔"

☆ "والدین نے اس جاب کے لیے یا آرمی میں آنے کے لیے سپورٹ کیا یا خوف کا اظہار کیا؟"

◉ "والد صاحب نے تو بہت سپورٹ کیا جب کہ والدہ نے خوف کا اظہار کیا کہ بڑی خطرناک سروس ہوتی ہے مگر پھر خوشی سے اجازت دے دی اور جب میں ٹریننگ پر گیا تو اس دوران مجھ سے ملنے بھی آتی تھیں۔ والد بھی آتے تھے، دو سال کی ٹریننگ تھی تو والدین سپورٹ کرتے تھے، فخر بھی کرتے تھے۔"

☆ "شہزاد صاحب کی پہچان آپ کی شاعری



ہے، آپ کا یہ دل نہیں چاہتا کہ آپ اپنے عہدے اور آرمی میجر کی حیثیت سے پہچانے جائیں؟"

◉ "یہ میرے لیے باعث فخر ہے کہ میں دفاع پاکستان کا حصہ ہوں لیکن مجھے اپنے شاعر ہونے پر بھی بہت فخر ہے۔ شاعری میرا ذاتی جوہر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے خود اس کی پرورش کی ہے اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنی شاعری کو زندہ رکھا ہے، اپنے اندر کے شاعر کو زندہ رکھا اور اس شناخت پر مجھے زیادہ فخر ہے۔ شاعر کو علامہ اقبال نے قوم کا "دیدۂ بینا" کہا ہے۔ میں ایک طرف محافظ ہوں تو دوسری طرف شاعر ہوں اور سچ پوچھیں تو مجھے اپنے شاعر ہونے پر زیادہ ناز ہے۔ شاعری میرا ایک ایسا کام ہے جو میرے اندر سے پھوٹتا ہے۔ میرے باطن سے شاعری نکلتی ہے اور اس کو بھی اسی دیانت اور لگن کے ساتھ قلم بند کرتا ہوں جس طرح میں اپنی جاب کو دیانت اور لگن کے ساتھ سرانجام دیتا ہوں۔ میرا ایک شعر ہے کہ......

میں دونوں محاذوں پر لگاتار لڑا ہوں
آواز اٹھانا ہو کہ تلوار اٹھانا ہو

تو ان دونوں محاذوں پر برسر پیکار ہونے پر مجھے فخر ہے تاہم میری خواہش ہے کہ مجھے شاعر کی حیثیت سے جانا اور پہچانا جائے۔"

☆ "کہتے ہیں کہ ایک ناکام عاشق ایک اچھا شاعر ہوتا ہے آپ کیا کہیں گے اس بارے میں؟"

◉ "پہلی بات تو یہ کہ میں نہیں سمجھتا کہ عاشق ناکام ہوتا ہے۔ عاشق ناکام ہو ہی نہیں سکتا اگر "وصل" ہو تو بھی کامیاب ہے اور اگر "ہجر" ہے تو بھی کامیاب ہے۔ وصل ایک اور کیفیت ہے اور ہجر ایک اور کیفیت ہے۔ اگر وصل میں آپ اپنی ذات کو محبوب کی ذات میں مدغم کر دیتے ہیں تو ہجر میں آپ اپنی ذات کی گہرائی میں اتر کر کچھ اور طرح کے جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ایک اور طرح کی روشنی ملتی ہے تو عاشق کبھی ناکام نہیں ہوتا اور شاعری خداداد صلاحیت ہے اور دنیا کو الگ سے دیکھنے کا ایک زاویہ نظر ہے۔ تفکر اور گہرائی شاعر میں ہوتی ہے، شاعر ہر ایک چیز کو تخلیقی انداز میں دیکھتا ہے۔"

☆ "کیا شاعری روزگار کا ذریعہ ہوسکتی ہے؟"

◉ "میرا نہیں خیال کہ آج کے زمانے میں شاعری روزگار کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ میری معلومات کے مطابق شاعری کے ذریعے سے گزر بسر کرنے والے شاعر منیر نیازی آخری شاعر تھے۔ انہوں نے ابتدا میں نوکری کی مگر بہت جلد چھوڑ بھی دی۔ منیر نیازی نے بھی نیوی میں نوکری کی تھی اور وہ بھی افواج پاکستان کا حصہ رہ چکے ہیں اور پھر کچھ ہی عرصے بعد انہوں نے نوکری کو خیرباد کہہ دیا اور شاعری کے ذریعے ہی اپنی گزر بسر کی، اسی طرح کچھ لوگ شاعری کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی وابستہ ہوتے ہیں اور کالم نگاری بھی کرتے ہیں تو یہ ان کا سلسلہ روزگار بن جاتا ہے۔ شاعری کے ذریعے سے شاعر کبھی بھی آسودہ حال زندگی نہیں گزار سکتا کیونکہ شاعری کی کتابوں کی فروخت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔"

☆ "آپ کی ماشاء اللہ تین کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، کچھ ان کے بارے میں بتائیں؟"

◉ "جی میرا پہلا مجموعہ کلام "برفاب" 2006ء میں شائع ہوا جس نے بقول میرے چاہنے والوں کے کہ ادبی منظر نامے پر ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ میری اس کتاب کے اب تک

کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ ''برفاب'' پر اب تک درجنوں مقالات لکھے جا چکے ہیں اور کئی ایک لکھے جا رہے ہیں۔ میرے اس مجموعہ کلام کو انگلینڈ سے ''پین انٹرنیشنل ایوارڈ'' بھی مل چکا ہے۔''

''میری دوسری کتاب جو نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے ''چاک سے اترے وجود'' 2009ء میں شائع ہوئی۔ جسے دیگر کئی ادبی ایوارڈز کی علاوہ ''پروین شاکر ایوارڈ'' بھی مل چکا ہے اور میرا تیسرا مجموعہ کلام ''گرہ کھلنے تک'' 2013ء میں شائع ہوا اور اس کتاب پر تنقیدی مضامین رقم کرنے والوں میں یوسف حسن اور جلیل عالی کے نام بھی شامل ہیں اور اس کتاب پر بہت سے شعراء و ادباء اور ناقدین کی داد و تحسین اور آراء آ چکی ہیں اور مختلف ادبی تنظیموں کی جانب سے اس کتاب کو ایوارڈز بھی مل چکے ہیں۔ مجھے اب تک ''پین انٹرنیشنل ایوارڈ'' ''فیض امن ایوارڈ'' ''ایوان اقبال ایوارڈ دبئی'' اور ''پروین شاکر عکس خوشبو ایوارڈ'' مل چکے ہیں۔''

☆ ''آپ کا ایک مجموعہ کلام ہے ''برفاب'' اس کے معنی کیا ہیں؟''

◉ ''فارسی کا ایک قاعدہ ہے کہ دو الفاظ کو جب ملاتے ہیں تو ایک آدھ حرف کو حذف کر دیتے ہیں۔ برفاب دراصل ''برف اور آب'' کا مجموعہ ہے۔ بالکل اس طرح جیسے سیلاب ''سیلے آب'' کا مجموعہ ہے اس طرح غرقاب ''غرق آب'' کا مجموعہ ہے، تو جناب برفاب ''برف کا پانی''۔

☆ ''بہت مصروف رہتے ہوں گے، فیملی کو کتنا ٹائم رہتے ہیں آپ؟ دیگر مشاغل؟''

◉ ''جی...... میں اپنی فیملی میں اپنے بچوں اور بیگم کو بھرپور ٹائم دیتا ہوں اور اپنے بچوں کو فزکس، کیمسٹری اور انگریزی، اردو خود ہی پڑھاتا ہوں۔ مجھے اچھا لگتا ہے اپنے بچوں کو خود پڑھانا، اور فیملی کے ساتھ ادھر اُدھر گھومنے پھرنے بھی جاتے ہیں۔ ٹی وی میں خبریں ضرور دیکھتا ہوں، نیشنل جغرافک بہت پسند ہے۔ کبھی کبھار فلم بھی دیکھ لیتا ہوں اور چونکہ میری جاب ایسی ہے تو گھومنے پھرنے کے تو بہت مواقع میسر آتے ہیں۔ گلگت بلتستان سے لے کر گوادر، تربت تک...... کراچی سے لے کر پشاور تک، تتا پانی آزاد کشمیر، مظفر آباد سے لے کر کشمیر، پنج گور اور تفتان تک، پاکستا کا چپا چپا اور کونا کونا تک دیکھا ہے میں نے اور جہاں بھی گیا ہوں وہاں کی ثقافت زبان پر معلوم حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ فیملی کو ساتھ لے کر بھی ٹرپ پر نکلتے ہی رہتے ہیں۔ جیسے راولاکوٹ چلے گئے، مری، ایوبیا، نتھیا گلی وغیرہ سب کچھ دیکھا ہے میری فیملی نے۔ اپنے پیارے پاکستان کے بارے میں اپنے بچوں کو سب کچھ بتاتا ہوں۔''

☆ ''کھانا کھانے اور پکانے سے کتنا لگاؤ ہے آپ کو؟''

◉ ''کھانا کھانے سے بہت لگاؤ ہے کیونکہ میرا تعلق گوجرانوالہ سے ہے اگرچہ زیادہ نہیں کھاتا مگر ذائقہ کے معاملے میں اچھا خاصا حساس ہوں۔ ہر چیز خوش ذائقہ اور خوب پکی ہوئی ہونی چاہیے۔ چٹخارے دار لذیذ کھانے پسند ہیں جن میں مٹن، مچھلی اور دال چاول پسند ہیں۔ اپنے روایتی کھانے، ساگ، مکئی کی روٹی، مکھن گھر کا نکلا ہوا اور لسی بہت پسند ہیں۔ آج کل کے جدید زمانے کی چیزیں بالکل پسند نہیں ہیں، جیسے پیزا، پیسٹری، ڈونٹ، برگر اور کریم کیک بھی پسند نہیں۔ پکانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بس انڈا ابالنا آتا ہے۔''

☆ ''مزاجاً کیسے ہیں آپ...... نرم گرم؟''

◉ ''میرے مزاج کے ساتھ ایک معاملہ ہے یا یوں کہیں کہ میرے دو موڈ ہیں، ایک طرف تو میں فوجی افسر ہوں۔ وہ بھی توپ خانے کا اس حوالے سے ایک درشتی یا سختی مزاج میں آتی ہے وہ بھی ہے اور دوسری طرف میں شاعر ہوں اور شاعر نازک احساسات کا مالک ہوتا ہے۔ کومل جذبات ہوتے ہیں تو میرے اندر جو غالب کیفیت ہے وہ نرمی کی

ہے۔ نرمی اور شائستگی کی ہے، مٹھاس ہے میرے لہجے میں، میں کرخت لہجے میں بات کرنا پسند نہیں کرتا مگر یونیفارم میں ایک مجاہد اور آفیسر کا جو لہجہ ہوتا ہے وہ ہوتا ہے۔ گھر میں مجھے بہت کم غصہ آتا ہے، اوور آل دیکھیں تو میں بہت خوش مزاج ہوں اور رومانوی بھی ہوں بحیثیت شاعر کے۔''

☆ ''کھیلوں سے لگاؤ رہا آپ کو، ڈرامے دیکھتے ہیں اور میوزک سے لگاؤ ہے؟''

◉ ''اسپورٹس بھی بھی لگاؤ رہا اور اسپورٹس تو ہماری فوجی زندگی کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔ والی بال بہت زیادہ کھیلی، بیٹ منٹن کھیلی اور فٹ بال بھی مگر کم۔ مقابلوں میں بھی حصہ لیا، کرکٹ کم کھیلی اور صرف دل لگی کے لیے...... ڈرامے بالکل نہیں دیکھتا، فلمیں کبھی کبھار دیکھتا ہوں اور کوئی کہے کہ یہ آپ کے دیکھنے والی فلم ہے تو ضرور دیکھتا ہوں۔ میوزک کا تو بہت زیادہ شوقین ہوں، میں کبھی بھی کوئی کام کرتے وقت موسیقی نہیں سنتا، میں جب موسیقی سن رہا ہوتا تو آنکھیں بند کر کے مکمل طور پر اپنی آپ کو موسیقی کی لہروں کے حوالے کر دیتا ہوں اور تان اور سُر مجھے جس طرف لے جائیں، میں چلا جاتا ہوں۔ مجھے نیم کلاسیکل اور کلاسیکل اور غزل بہت پسند ہے اور زیادہ موسیقی وہ اچھی لگتی ہے جو کسی نے کلاسیکل انگ میں خوب گایا ہو، جیسے نصرت فتح علی، طفیل نیازی مرحوم مجھے بہت پسند تھے۔ استاد حامد علی خان کی گائیکی بہت پسند ہے، اسد امانت علی، ان کے والد امانت علی خان، آج کل حسین بخش گلو کو بہت سنتا ہوں۔ بڑے غلام علی خان کی ٹھمری سنتا ہوں، آج کل کی شور شرابے والی میوزک مجھے پسند نہیں۔''

☆ ''اور کچھ کہنا چاہیں گے آپ؟''

◉ ''ایک سوال مجھ سے اکثر کیا جاتا ہے کہ شاعری کا اور فوجی ملازمت کا آپس میں کیا تعلق ہے تو میں انہیں بتاتا ہوں کہ پہلے میں شاعر تھا اور بعد میں میں نے آرمی جوائن کی۔ جب میں ساتویں جماعت میں تھا تو میں نے شعر کہنے شروع کر دیے تھے اور میٹرک سے پہلے میں نے کافی شاعروں کو پڑھ لیا تھا۔ خاص طور پر ''پریتم'' کو، ان کی نثر بھی اور ان کی شاعری بھی۔ اس طرح عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کی کچھ تحریریں میں نے میٹرک سے پہلے ہی پڑھ لی تھیں اور فوج میں میں ایف سی کے بعد آیا...... تو دونوں جذبوں کو اپنے اندر پالنے میں مجھے کوئی دشوار پیش نہیں آئی۔ نئی نسل کو میرا پیغام ہے کہ وہ شعروادب سے اپنا تعلق مضبوط کریں، کتاب کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑیں کیونکہ کتاب ہمارے ذہن کی آبیاری کرتی ہے۔ سوشل میڈیا یا پردہ اسکرین کبھی بھی کتاب کا نعم البدل نہیں ہو سکتا، جو بھی پڑھا لکھا بندہ ہے اس کے گھر میں ایک چھوٹی سی لائبریری ضرور ہونی چاہیے۔ اس کی اپنی پسند کی کتابیں ہوں تاکہ پتا چلے کہ یہ پڑھا لکھا گھرانہ ہے۔ شاعری دوسروں کو سمجھنے میں ہماری معاونت کرتی ہے اور شعور اور شائستگی آتی ہے، شاعری کو دل کے قریب رکھنا چاہیے تاکہ ہماری قوم شائستہ اور مہذب ہو۔ دھیمے لہجے میں بات کرے، لڑائی جھگڑے سے دور رہے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کو برداشت کرے، اختلافات کو کھلے دل سے تسلیم کرے، صفائی پسندی، ٹریفک کے قوانین کی پابندی ایک دوسرے کے نظریات کا احترام، ایک دوسرے کی پسند اور ناپسند کا احترام کریں۔ مادی ترقی تو بہت ہے ہمارے یہاں، مہنگی سے مہنگی گاڑیاں چل رہی ہیں مگر ان گاڑیوں کو چلانے والا شخص گاڑی کا شیشہ نیچے کرتا ہے اور سڑک پر سب کے سامنے تھوک دیتا ہے یا دیگر لوگ سڑک پر کچرا پھینک دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی تربیت صحیح نہیں ہوئی تو تعلیم بھی بہت ضروری ہے آگے بڑھنے اور ترقی یافتہ کہلانے کے لیے۔''

اس کے ساتھ ہی ہم نے شہزاد نیّر صاحب سے اجازت چاہی، اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

☆☆





نگہت عبداللہ

ہوائیں رخ بدل گئیں

پانچویں قسط

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے، چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا بھاوج اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔

حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھی، وہ جتنے نرم خو تھے حمیدہ بیگم اس قدر تیز وطرار اور کسی حد تک بدزبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخرہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔

حیدر علی کی تین بیٹیاں سبینہ، خزینہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔

سبینہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزینہ اپنے باس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزینہ کا خالہ زاد شرجیل اس کو چاہتا ہے۔

حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حمیدہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں، ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔



نارنجی گولا دور سمندر کی وسعتوں میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس منظر کی دلکشی صدیوں سے یوں ہی قائم و دائم تھی۔ دیکھنے والوں کے لیے گو کہ یہ منظر نیا نہیں تھا پھر بھی چند ثانیے کو پلکیں ساکت ہو گئی تھیں۔ دل بھی ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا بالکل اسی طرح جیسے نارنجی گولا ڈوب رہا تھا۔

''کیا ہوا......؟'' اپنے بازو پر ناخنوں کی چبھن محسوس کر کے حمزہ، شہرینہ کو دیکھنے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اس کا بازو تھامے بیٹھی تھی۔

''خوب صورتی اتنی خوف ناک کیوں ہوتی ہے حمزہ؟'' وہ ڈوبتے سورج میں کھوئی ہوئی تھی۔

''تاکہ ہم اس کے قریب نہ جائیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں کسی انہونی خواہش کا عکس دیکھ رہا تھا۔

''کیوں......؟''

''کیونکہ۔'' حمزہ کو جواب نہیں سوجھا تو پوچھنے لگا۔ ''تم کیا چاہ رہی ہو......؟''

''ہیں۔'' وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''بتاؤ۔ کیا دل چاہ رہا ہے تمہارا؟'' حمزہ کے اصرار پر وہ ذرا سا مسکرائی پھر کہنے لگی۔

''میرا دل چاہ رہا ہے حمزہ میں تمہارا ہاتھ تھام کر ان لہروں پر چلتی ہوئی اس نارنجی گولے تک پہنچ جاؤں۔''

''ہاہا......!'' وہ گہری سانس کھینچ کر رہ گیا۔

''اچھا تم بتاؤ تم کیا سوچ رہے تھے؟'' شہرینہ اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھی۔

''کچھ نہیں میرا مطلب ہے میں تمہاری طرح نہیں سوچتا۔'' وہ اس کی ناک چھو کر بولا تب ہی خزینہ ان کے سر پر آن کھڑی ہوئی۔

''اگر لیلیٰ مجنوں کی باتیں ختم ہو گئی ہوں تو چلیں۔''

''ہائے نہیں خزی ابھی تو آئے ہیں۔''

''ہاں ابھی تو آئے ہیں۔'' حمزہ نے فوراً شہرینہ کی ہاں میں ہاں ملائی تو خزینہ کی پوری آنکھیں کھل گئیں۔

''ہائیں پچھلے دو گھنٹے سے اکیلی ٹہل ٹہل کر میری ٹانگیں شل ہو گئی ہیں اور تم لوگ؟''

''تو تم بیٹھ جاؤ ناں۔ کیوں خود کو تھکا رہی ہو۔'' شہرینہ فوراً بولی تھی۔ حمزہ نے پھر اس کی تائید کی۔

''ہاں بیٹھ جاؤ ناں۔''

''نہیں بس اب میں مزید یہاں نہیں رک سکتی اور تم لوگوں کو بھی سمجھنا چاہیے گھر پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔ امی الگ پریشان ہوں گی۔ چلو اٹھو۔'' خزینہ یکدم نروٹھی بن گئی تھی۔

''پلیز خزی! ہم کون سا روز روز آتے ہیں۔'' شہرینہ کی منت کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''شادی کے بعد روز روز آ جانا۔''

''ہاہ شادی......!'' حمزہ کو موقع مل گیا۔ ''مجھے دور دور تک اپنی شادی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اور اس کی ذمہ دار تم ہو۔''

''میں......!'' خزینہ نے اس کی طرف جھک کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''میں کیوں......؟''

''انجان بننے کی ضرورت نہیں ہے خزینہ ڈیئر۔ تم اچھی طرح جانتی ہو جب تک تمہاری شادی نہیں ہو جاتی ہماری باری نہیں آئے گی اور تم جان بوجھ کر ہمیں لٹکائے ہوئی ہو۔ اتنا اچھا رشتہ موجود ہے کیوں منع کر رہی ہو؟'' حمزہ ایک ہی سانس میں بول گیا تھا۔

''اچھا رشتہ، کون کس نے کہا تم سے؟'' خزینہ نے ٹھٹک کر پوچھا حمزہ سے لیکن تیز نظروں سے دیکھا

شہرینہ کو جس سے وہ سٹپٹا گئی۔

''میں نے کچھ نہیں کہا قسم لے لو اور مجھے تو پتا ہی نہیں ہے حمزہ کس کی بات کر رہا ہے۔''

''میں شرجیل کی بات کر رہا ہوں۔'' حمزہ فوراً بولا تھا۔

''شرجیل......! تم کیسے جانتے ہو شرجیل کو......؟'' جرح سے زیادہ لڑنے کا انداز تھا۔

''یہ کیا بات کی تم نے۔ مجھے پتا ہے شرجیل تمہاری خالہ کا بیٹا ہے اور ابھی اس کی بہن کی شادی میں تم لوگوں کے ساتھ جاتا رہا ہوں تو وہاں ٹھیک سے اسے دیکھنے اور بات کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ اچھا ہینڈسم لڑکا ہے اور مجھے لگتا ہے تمہیں پسند بھی کرتا ہے۔'' حمزہ اب ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ آخر میں پوچھنے لگا۔ ''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

خزینہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور یوں سر جھٹکا جیسے شرجیل کے بارے میں کچھ نہ کہنا چاہتی ہو۔ مزید سمندر کی طرف رخ موڑنا چاہتی تھی کہ حمزہ اس کی کلائی تھام کر کہنے لگا۔

''پلیز خزینہ! اپنا نہیں تو تائی جان کا خیال کرو۔ وہ تمہارے لیے اتنی پریشان ہیں۔''

''او......اب سمجھی۔ تمہیں امی نے شرجیل کی وکالت کرنے کو کہا ہے۔'' خزینہ کے درست اندازے پر وہ سٹپٹا گیا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''نہیں ہے تو تم بس اپنی فکر کرو۔ اپنے بارے میں، میں خود امی سے بات کر لوں گی۔ اب چلو۔'' وہ کہہ کر چل پڑی تو حمزہ نے شہرینہ کو دیکھا۔

''کچھ نہیں سنے گی اب وہ۔ کیا ضرورت تھی تمہیں شرجیل بھائی کا نام لینے کی۔'' شہرینہ نے جھنجلا کر اسے ٹوکا۔ تو وہ صاف گوئی سے بولا۔

''مجھے واقعی تائی جان نے کہا تھا کہ میں اسے سمجھاؤں۔''

''بے کار ہے۔ چلو اٹھو اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر دیکھے۔'' شہرینہ کہتے ہوئے اٹھی تو وہ بھی اٹھ گیا۔

☆☆☆

اس نے بے شک معاملہ تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود اب وہ ہر پہلو پر سوچنے لگا تھا۔ اور کسی بھی ممکنہ بات کو جو ہو گا دیکھا جائے گا کہہ کر ٹال نہیں سکتا تھا۔ پھر بات صرف ماما اور بابا کی نہیں تھی وہ سارا کو دکھ نہیں دے سکتا تھا۔ ابھی بھی جو وہ کر رہا تھا اسی کی خاطر کہ وہ اسے مکمل آسودہ دیکھنا چاہتا تھا۔ البتہ یہ اس کی اپنی مجبوری تھی کہ وہ کسی اور کا بچہ قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا دل ہی نہیں مانتا تھا جب ہی اس نے خود کو دوسری شادی پر آمادہ کر لیا تھا۔

تو اب اس میں الجھا ہوا تھا۔ کہ وہ اس شادی کو کتنا پوشیدہ رکھ سکے گا۔ اگر جو راز فاش ہو گیا تو......اور اس تو کے ساتھ ہی اسے پہلا خیال سارہ کا آتا اور اس کا ردعمل سوچ کر وہ خائف ہو جاتا تھا۔ جبکہ خزینہ کی طرف ابھی تک اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ جو اس کا ردعمل سوچتا۔ شاید اس لیے کہ وہ اسے ایک مکمل زندگی دینے کا اہل تھا اور اس کے خیال میں وہ اسی میں خوش رہے گی۔

بہرحال اب یہ تھا کہ اسے بھی انتظار تھا کہ کب خزینہ اس کے بارے میں اپنے گھر میں بات کر کے اسے آگاہ کرتی ہے۔ حد درجہ احتیاط کے باعث اس نے اپنا سیل نمبر خزینہ کو نہیں دیا تھا اور ساتھ کہہ بھی دیا تھا کہ وہ صرف آفس نمبر پر اس سے رابطے میں رہے گا۔ جس پر اس نے کوئی احتجاج یوں نہیں کیا کہ وہ ہر بات اس پر واضح کر چکا تھا۔

اس وقت وہ کچھ دیر کو فارغ ہوا تو سگریٹ سلگاتے ہوئے اس کی نظریں ٹیلی فون سیٹ پر ٹھہر گئیں۔ پھر لاشعوری طور پر وہ اس کے بجنے کا انتظار کرنے لگا اور جب لاشعور نے شعور میں گھنٹیاں بجائیں تو اس نے پہلے سر جھٹکا پھر کچھ سوچ کر خود ہی اس کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

''السلام علیکم......!'' دوسری بیل پر ہی کال ریسو کرتے ہی خزینہ نے سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام! کیسی ہو......؟'' وہ پورا دھیان اس کی طرف منتقل کر کے جیسے اس کے اطراف کو بھی کھوجنے لگا تھا۔

''بہت اچھی......'' خزینہ کی کھنکتی آواز نے اسے چونکایا ہی نہیں باور بھی کرایا کہ وہ اس سے لیے دیے انداز میں بات نہیں کر سکتا۔

''گڈ! مجھے اچھی خبر کب سنا رہی ہو......؟''

''اس کے لیے آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔'' خزینہ نے کہا تو وہ قصداً سانس کھینچ کر بولا تھا۔

''اب انتظار ہی تو نہیں ہوتا۔'' پھر پوچھنے لگا۔ ''تم نے گھر میں بات کی؟''

''ابھی نہیں...... جلدی کروں گی۔''

''ہوں میں یہی چاہتا ہوں۔''

''اچھا اور کیا چاہتے ہیں آپ......؟'' ادھر قدرے شوخی تھی۔ تیمور غزنی نے گھبرا کر فون بند تو کر دیا لیکن پھر احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کر گیا ہے۔ کچھ دیر خود کو سرزنش کرتا رہا پھر تلافی کا سوچنے لگا تھا۔ کیونکہ مجبوری کا سودا بھی وہ ایمان داری سے نباہنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

ایک دم فون بند ہو جانے سے خزینہ یہی سمجھی کہ اچانک کوئی روم میں آ گیا ہو گا جب ہی غزنی نے فون بند کر دیا۔ اس لیے اس نے کال بیک نہیں کی نہ اس کی طرف سے بدگمان ہوئی۔ بلکہ روزمرہ کے کام نمٹاتے ہوئے اس کا دھیان مسلسل اپنے سیل فون کی طرف تھا کہ جب غزنی فارغ ہو گا تو پھر اسے کال کرے گا اور اس کی کال تو نہیں آئی حمیدہ بیگم پکارنے لگی تھیں۔

''آئی امی......!'' وہ چولہا دھیما کر کے حمیدہ بیگم کے پاس آ گئی۔

''جی امی......!''

''کیا کر رہی ہو......؟''

''سالن چڑھا رہی تھی۔ آپ بتائیں کیا کام ہے......؟'' اس پر خواہ مخواہ عجلت سوار تھی۔

''کام کیا ہونا ہے۔ میں یہ پوچھ رہی تھی تم نے نوکری چھوڑ دی......؟'' انہوں نے پوچھا تو وہ بے ساختہ بولی تھی۔

''چھڑوا دی گئی۔''

''چھڑوا دی...... کس نے؟'' حمیدہ بیگم کی ناسمجھی میں تشویش بھی تھی۔ جسے محسوس کر کے وہ ان کے پاس آ بیٹھی اور سنبھل کر کہنے لگی۔

''کسی نے نہیں امی بس وہ ایسا ہے کہ باس کو میں پسند آ گئی ہوں اور وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' حمیدہ بیگم فوراً کچھ نہیں بولیں۔ بس اسے دیکھے گئیں۔ تو وہ نظریں چرا کر گویا ہوئی۔

''پتا نہیں امی، ابھی یہ بات کرنی چاہیے یا نہیں لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ میں شرجیل کے رشتے کو اسی لیے منع کرتی رہی ہوں کہ مجھے بھی تیمور غزنی پسند ہے۔''

''کیا کرتا ہے؟'' حمیدہ بیگم کے منہ سے بلاارادہ نکلا تھا ورنہ ان کا ذہن بالکل خالی تھا۔

''مالک ہے۔ میرا مطلب ہے اسی فرم کا۔ غزنی انٹرپرائز اس کے نام سے ہے۔'' اس کی تمنا صرف غزنی تھا وہ اس کی حیثیت سے مرعوب نہیں تھی جب ہی یوں بتا رہی تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ جبکہ حمیدہ بیگم یہیں ٹھٹکی تھیں۔

''اتنا بڑا آدمی اس کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی......؟''

''کوئی کمی نہیں۔ اس کے اپنے خاندان میں بہت رشتے موجود ہیں جن کے لیے اس کے والدین اسے فورس بھی کر رہے ہیں لیکن......'' وہ خاموش ہو کر حمیدہ بیگم کا چہرہ دیکھنے لگی۔ صاف لگ رہا تھا انہیں یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔ پھر بھی وہ مزید گوہرفشانی سے باز نہیں آئی۔

''اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں امی کہ غزنی کے گھر والے اسے مجھ سے شادی کی اجازت نہیں دیں گے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ خودمختار ہے۔ اس کی اپنی......''

''بس چپ ہو جاؤ۔'' حمیدہ بیگم کا ڈپریشن یکلخت عود کر آیا تھا۔ ''خودمختار ہے۔ من مانی کرے گا تو کتنے دن چلے گی اس کی من مانی۔ یہ نہیں سوچا تم نے۔''

''امی آپ تو پہلے ہی بدگمان ہو گئیں، وہ ایسا نہیں ہے۔ دل لگی کرنے والا، کردار کا اچھا اور سچا ہے۔ اس نے مجھ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔'' وہ زچ انداز میں بولی تھی۔

''تو اس کے سچ میں کون سے لال جڑے ہیں۔ ماں باپ کی مرضی کے بغیر شادی کی بات کر رہا ہے اور جو کل کو ماں باپ کی باتوں میں آ گیا تب تم کیا کرو گی۔ نا بابا میں ایسے رشتوں کی قائل نہیں ہوں اچھا سچا ہے تو ماں باپ کو لے کر آئے ورنہ ادھر کا رخ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' حمیدہ بیگم نے بیٹھے بیٹھے فیصلہ سنا دیا تو وہ بھی غصے میں آ گئی۔

''ٹھیک ہے وہ نہیں تو پھر کوئی بھی نہیں آئے گا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ جھٹکے سے اٹھی اور پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئی تو حمیدہ بیگم تلملانے لگیں۔ بے شک ان کا اس پر بس نہیں چلتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ جو مرضی کرتی پھرے۔ وہ اسے کبھی ایسی نادانی کی اجازت نہیں دیں گی۔ سوچ سوچ کر حمیدہ بیگم کے اندر غبار اٹھ رہے تھے۔

دوپہر میں شہرینہ کالج سے لوٹی تو وہ کوئی ناول پڑھنے میں مصروف تھی۔ اس کے سلام کا جواب بھی ناول سے نظریں ہٹائے بغیر دیا تھا۔

''کھانے میں کیا ہے......؟'' شہرینہ نے اپنا بیگ الماری میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''جو بھی ہے جا کر کھا لو......'' بادل ناخواستہ جواب دیا تھا۔

''کھا لو مطلب تم نہیں کھاؤ گی؟'' شہرینہ الماری بند کر کے اسے دیکھنے لگی۔

''میں کھا چکی ہوں اور اب تم میرا سر مت کھاؤ۔'' اس نے سختی سے کہا۔ شہرینہ کندھے اچکا کر کمرے سے نکل گئی۔ تو اس نے ناول بند کر کے تکیے میں منہ چھپا لیا لیکن دھیان حمیدہ بیگم کی طرف تھا۔ کہ جانے وہ شہرینہ سے کیا کیا کہیں گی۔ لیکن کھانے کے بعد جب شہرینہ آئی تو اس سے پوچھنے لگی۔

''خزی! کوئی بات ہوئی ہے کیا؟'' وہ تکیے سے منہ نکال کر شہرینہ کو دیکھنے لگی۔

''بتاؤ ناں خزی کیا ہوا ہے؟ امی غصے میں لگ رہی ہیں اور تم...... تم بھی منہ چھپائے پڑی ہو۔'' شہرینہ پوچھتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''تو تم امی سے پوچھ لیتیں۔'' وہ تنک کر بولی تھی۔

"امی سے پوچھ لیتی۔" شہرینہ اس کی نقل اتار کر بولی۔ "امی نے مجھے کبھی کسی قابل سمجھا ہے۔ صرف ڈانٹتی ہیں مجھے۔ خیر تم بتاؤ تمہیں کیا کہا ہے......؟"

"کچھ نہیں میں نے انہیں تیمور غزنی کے بارے میں بتایا تو اسی پر ناراض ہو رہی ہیں۔" خزینہ کو پھر غصہ آنے لگا تھا۔

"تیمور غزنی...... وہی۔" شہرینہ کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

"ہاں وہی پرپوز کیا ہے اس نے مجھے۔" خزینہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی اور تفصیل سے بتانے لگی۔ تو شہرینہ کے چہرے پر بھی اشتیاق پھیلتا بھی خائف ہو رہی تھی۔

☆☆☆

عجیب بے بسی تھی۔ حمزہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔ جاب کے لیے وہ ہر جگہ سے مایوس لوٹ رہا تھا ادھر مہینہ ختم ہونے کو آ رہا تھا۔ وہ سیلری کا فاخرہ سے کیا بہانا کرے گا۔ سوچ سوچ کر پریشان تھا مزید ربیکا اسے پریشان کر رہی تھی۔ مسلسل میسج کرتی رہتی کیونکہ وہ اس کی کال اٹینڈ نہیں کرتا تھا۔ ایسے میں موبائل فون اسے عذاب لگنے لگا تھا۔

اگر گھر میں پی ٹی سی ایل ہوتا تو وہ موبائل سے چھٹکارا پا لیتا۔ مسئلہ یہ تھا کہ کانٹیکٹ نمبر اب ضرورت بن چکا تھا۔ اس وقت وہ ربیکا کی میسج دیکھ کر دل ہی دل میں اسے گالیاں دے رہا تھا کہ وہ سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"کم از کم ریپلائی تو کر دیا کریں۔" ربیکا نے کہا تو وہ جو اسے دیکھ کر مزید سلگ گیا تھا کوئی لحاظ نہیں کیا۔

"دیکھو ربیکا! میں پہلے ہی پریشان ہوں۔ تم خدا کے لیے مجھے مزید پریشان مت کرو۔"

"ارے تو مجھے بتائیں کیا پریشانی ہے؟" وہ ایک نمبر کی ڈھیٹ تھی۔

"تمہیں بتاؤں۔ کیا کرو گی تم!" بس نہیں چل رہا تھا اس کا گلا دبا دے۔

"کیا کروں گی۔ جو تم کہو گے۔ آئی مین......"

"بس تم مجھ پر اتنا احسان کرو کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ پلیز!" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا تھا۔

"سوری حمزہ! میں تمہیں پریشانی میں نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے؟" وہ اپنے لیے اس کی نفرت جانے محسوس نہیں کر رہی تھی یا جان بوجھ کر نظر انداز کر رہی تھی۔

"سب سے بڑی پرابلم تم ہو اور جو باقی پرابلمز ہیں وہ بھی تمہاری وجہ سے آئی ہیں۔ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے تم کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی ہو۔" ضبط کی سعی میں وہ چبا چبا کر بول رہا تھا۔

"کم آن حمزہ!" یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں بالکل نہیں سمجھ رہی۔ شاید تم کسی اور کا غصہ مجھ پر نکال رہے ہو۔ پہلے ریلیکس ہو جاؤ پلیز۔" چلو کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" حمزہ جتنا غصہ دکھا رہا تھا وہ اتنی ہی نرم تھی۔

"یا اللہ......!" اس نے دور کھڑی بائیک کو دیکھا پھر اس سمت دوڑنا چاہتا تھا کہ ربیکا اس کا ارادہ بھانپ کر بولی تھی۔

"سنو حمزہ! تم مجھ سے بھاگ نہیں سکتے۔ جہاں جاؤ گے میں تمہیں وہیں ملوں گی۔"

"ضرور ملو میں نے کب منع کیا ہے۔" انتہا تھی۔ حمزہ نے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے اور یوں پوز کرنے لگا جیسے اسے کوئی پروا نہیں ہے۔ ربیکا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر پوچھنے لگی۔

"اب بتاؤ تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے؟"

"کوئی پرابلم نہیں۔ نو، نو پرابلم۔" وہ مسخرے پن سے بولا۔ ربیکا ہنسنے لگی۔

"اچھی ایکٹنگ کر لیتے ہو۔"

"تھینک یو؟ اب میں چلوں۔"

"کہاں جاؤ گے؟" ربیکا کی بے ساختگی پر وہ بھی بے ساختہ بولا تھا۔

"اپنی جان کے پاس۔"

"ہاہا۔ جیسے تم جان کہہ رہے ہو اسے دینے کے لیے تمہارے پاس اپنی جان کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ زہرخند سے بولی تھی۔

"ٹھیک کہا تم نے لیکن تم یہ نہیں جانتی کہ اسے کسی چیز کی حاجت بھی نہیں ہے۔ میں اسے تر نوالہ کھلاؤں یا روکھی سوکھی وہ ہر حال میں میرے ساتھ خوش رہے گی۔" وہ چبھتے لہجے میں اس پر جتا رہا تھا۔

"واہ حمزہ! تم خوش فہم ہی نہیں خود غرض بھی ہو محبت جتا کر اس لڑکی کو تپتی دھوپ میں جھلسانا چاہتے ہو۔ یہ ہے تمہاری محبت نہیں۔ میں اسے محبت نہیں مانتی۔ یہ خود غرضی ہے سراسر خود غرضی۔" وہ بے حد تلخ ہو گئی تھی۔ حمزہ کا دل چاہا پوچھے جو تم کر رہی ہو وہ کیا ہے لیکن سرراہ وہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا اس لیے سر جھٹک کر بولا تھا۔

"تم جو بھی سمجھو......"

"تمہیں بھی سمجھنا چاہیے۔" ربیکا نے فوراً ٹوکا تو اس نے اپنی بائیک کی طرف قدم بڑھا دیے۔ پھر پلٹ کر نہیں دیکھا۔ دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن اس کی آواز کی بازگشت سے پیچھا نہیں چھڑا سکا جو اس کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی تھی۔

"تم خوش فہم ہی نہیں خود غرض بھی ہو۔ محبت جتا کر اس لڑکی کو تپتی دھوپ میں جھلسانا چاہتے ہو۔"

"نہیں......" بار بار سر جھٹکنے پر بھی اسے چھٹکارا نہیں ملا۔ ذہن اس بری طرح چیخنے لگا تھا کہ تیز ترین ٹریفک میں بائیک سنبھالنا مشکل ہو گیا پھر بھی وہ کہیں نہیں رکا سیدھا گھر آ گیا۔ وہ بھول گیا تھا کہ یہ آفس سے واپسی کا ٹائم نہیں ہے۔ جب فاخرہ نے جلدی آنے کا پوچھا تب وہ چونکا لیکن اب وہ کوئی بہانہ نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ روز روز کی آوارہ گردی سے تھک گیا تھا۔ اس لیے کوئی جواب دیے بغیر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

"بیٹا! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" فاخرہ اس کے پیچھے آ گئی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں امی!" وہ بے اختیار اپنی کنپٹی دبانے لگا۔

"خاک ٹھیک ہو۔ شکل دیکھی ہے اپنی۔ کہاں سے آ رہے ہو۔" فاخرہ کو اس کے پریشان چہرے نے ہولا دیا تھا۔

"وہ...... ایک دو جگہ جاب کے لیے گیا تھا۔" اس کے نظریں چرانے پر فاخرہ ٹھٹکی تھیں۔

"جاب کے لیے؟"

"جی وہ پہلی جاب ختم ہو گئی۔ بلکہ میں نے خود چھوڑ دی۔ بہت مسئلے تھے اس میں۔" وہ تنگ پڑ کر بول رہا تھا۔ "کسی دن میں بھی کسی بڑے مسئلے میں پھنس جاتا تو مجھے کون بچاتا۔ اس لیے میں نے......"

"اچھا کیا بیٹا، اچھا کیا۔" فاخرہ بڑا مسئلہ سوچ کر ہی پریشان ہو گئی تھیں۔ پھر اسے تسلی دینے لگیں۔ "اللہ مالک ہے اس سے بہتر روزگار عطا کرے گا۔ تم پریشان مت ہو۔"

"پریشان کیسے نہ ہوں۔ جاب آسانی سے تو نہیں ملتی۔ پہلے بھی کتنا خوار ہوا۔ اب پھر وہی خواری۔" وہ دل برداشتہ تھا۔ فاخرہ دکھی ہو گئی ماں تھیں اور ماں اپنی جان پر سب سہہ لیتی ہے اولاد کی پریشانی برداشت نہیں ہوتی۔ [illegible] کر کے اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں۔

"اللہ مسبب الاسباب ہے ایک در بند ہوتا ہے تو وہ دس اور کھول دیتا ہے۔ تم نماز پڑھو۔ در در بھٹکنے

کے بجائے ایک اللہ کا در پکڑو وہ مایوس نہیں کرے گا۔"
وہ سر جھکا کر خاموشی سے سنتا رہا۔ دل ٹھہرنے لگا تھا۔

☆☆☆

حمیدہ بیگم گو کہ فطرتاً لالچی تھیں اور بیٹیوں کے لیے اونچے گھروں کے خواب دیکھتی تھیں۔ لیکن اس طرح نہیں جیسے خزینہ نے انہیں تیمور غزنی کا بتایا تھا کہ وہ ماں باپ کی مرضی کے خلاف شادی کرے گا۔ یہ انہیں سراسر فراڈ لگ رہا تھا۔ اس لیے انہوں نے خزینہ کو منع کر دیا۔ کہ وہ اس رشتے کے حق میں نہیں ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے جب بھی سوچا انہیں کسی پہلو سے یہ رشتہ مناسب نہیں لگا اور انہوں نے خزینہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کی ایک ہی رٹ تھی۔

"میری شادی ہو گی تو غزنی کے ساتھ ورنہ نہیں۔" آخر تنگ آ کر حمیدہ بیگم نے سبینہ کو بلا لیا اور اسے ساری بات بتا کر خزینہ کو سمجھانے کے لیے کہا تو سبینہ نے اپنے انداز میں خزینہ کے لتے لیے جس پر وہ رونے لگی۔

"نہیں کرنی مجھے شادی کسی سے بھی نہیں۔ منع کر دوں گی میں غزنی کو بھی۔"

"بیٹا! ہم تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہے ہیں۔" حمیدہ بیگم اس کے رونے سے واقعی پریشان ہو گئیں کیونکہ وہ کبھی اس طرح نہیں روتی تھی۔

"میں کوئی نادان ناسمجھ نہیں ہوں۔ اپنا برا بھلا سوچ سکتی ہوں اور سامنے والے کو بھی پرکھ سکتی ہوں۔ غزنی اگر فلرٹ کرنے والا ہوتا تو مجھ سے شادی کی بات کیوں کرتا۔ وہ ایسے ہی مجھے بہکا سکتا تھا۔" وہ تواتر سے بہتے آنسو پونچھتے ہوئے بول رہی تھی۔

"تو اور کیسے بہکایا جاتا ہے۔" سبینہ تڑخ کر بولی تھی۔

"بس کریں آپا۔ اس کے آفس میں کام کرنے والی میں اکیلی لڑکی نہیں ہوں اور بھی ہیں۔ اس نے اور تو کسی لڑکی کو نہیں بہکایا۔"

"اور تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہوں گی۔" سبینہ پر اس کے رونے کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

"ہاں میں بے وقوف ہوں پاگل ہوں۔" وہ چیخ کر کہتی اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ سبینہ جو منہ میں آیا بولتی چلی گئی آخر حمیدہ بیگم نے مٹھی بند کر کے اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا تو وہ ان پر بگڑ گئی۔

"کوئی ضرورت نہیں آپ کو اس کی باتوں میں آنے کی۔ آپ خود سوچیں ان کے سر پر باپ ہے نہ کوئی بھائی۔ کل کلاں کو کوئی بات ہو گئی تو کون دیکھے گا۔"

"یہ ہی تو میں سوچتی ہوں۔ خزینہ کو بھی یہی سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ سننا ہی نہیں چاہتی۔" حمیدہ بیگم بے حد فکرمند تھیں۔

"یہ نہیں سنتی تو آپ اسے......" سبینہ کو خود نہیں پتا تھا کہ وہ کیا کہنے جا رہی ہے ایک دم خاموش ہو کر سوچنے لگی تو حمیدہ بیگم چند لمحے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہیں پھر اس کا بازو ہلا کر پوچھنے لگیں۔

"کیا کہہ رہی ہو تم۔ چپ کیوں ہو گئیں۔"

"ہاں...... میں یہ کہہ رہی ہوں۔" سبینہ کو گویا حل سوجھ گیا تھا۔ ان کے قریب ہو کر کہنے لگی۔ "آپ ایسا کریں امی! خزینہ کو سمجھانے کے بجائے اس لڑکے سے بات کریں اور اس کے سامنے یہ ہی شرط رکھیں کہ وہ اپنے ماں باپ کو لے کر آئے گا تب ہی رشتے کی بات ہو گی۔"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔" حمیدہ بیگم کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

"بس اب یہ ہی کریں اور اس بات کی خبر خزینہ کو مت ہونے دیں میرا مطلب ہے اسے مت بتائیے گا کہ

آپ لڑکے سے کیا بات کریں گی۔ سمجھ رہی ہیں ناں۔"

"ہاں ہاں...... سمجھ رہی ہوں۔ اب اتنی پاگل نہیں ہوں۔ شرجیل یا حمزہ سے بھی کہوں گی لڑکے کا آگا پیچھا پتا کر کے دیں۔" حمیدہ بیگم کو حل سوجھ گیا تھا تو متحرک ہو گئی تھیں۔

"پھر کب بلا رہی ہیں لڑکے کو......؟" سبینہ نے کہا تو وہ سر جھٹک کر بولیں۔

"تم ہی کہو خزینہ سے بلا لے کسی دن اسے......"

"وہ تو میں کہہ دیتی ہوں لیکن آپ تو اپنا رویہ ابھی سے نہ خراب کریں اور لڑکے سے بھی طریقے سے بات کیجیے گا۔" سبینہ کے ٹوکنے پر وہ بگڑ گئیں۔

"اب تم مجھے سمجھاؤ گی کہ مجھے کیسے بات کرنی چاہیے۔"

"اوہو امی! میں کیوں سمجھاؤں گی۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں......"

"اچھا بس...... جاؤ خزینہ سے بات کرو۔" حمیدہ بیگم اسے بھیج کر خود نئے سرے سے سوچنے لگی تھیں۔ کچھ دیر بعد انہیں خزینہ کے کمرے سے ہنسنے بولنے کی آوازیں آنے لگیں تو چونکنے کے ساتھ ہی ان کی سوچوں نے رخ بدل لیا تھا۔

☆☆☆

حسان صاحب کے دیرینہ دوست مسعود صاحب ربیکا کے لیے آج تیسری بار اپنی مسز کے ساتھ ان کے ہاں آئے تھے۔ حسان صاحب اور ثمرہ کو بھی ربیکا کے لیے یہ رشتہ دل سے پسند تھا اور ان کا بس نہیں چلتا تھا فوراً ہامی بھر لیں لیکن ربیکا کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ اس لیے وہ اگر ہامی نہیں بھر رہے تھے تو صاف منع بھی نہیں کر رہے تھے۔

"آخر آپ کو کس بات یا کس وقت کا انتظار ہے؟" اس وقت مسز مسعود نے انہیں شش و پنج میں محسوس کر کے پوچھا۔

"کسی خاص وقت کا نہیں بھابھی بس وہ......" ثمرہ کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہیں تو حسان صاحب کو دیکھنے لگیں۔

"بس وہ میں چاہتا ہوں پہلے ہمارے بچوں میں تھوڑی انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے۔" حسان صاحب بات سنبھالتے ہوئے کہنے لگے۔ "پھر ابھی تو آپ کا بیٹا کیا نام ہے اس کا؟"

"حسن......!"

"ہاں حسن وہ بھی شاید یہاں نہیں ہے۔"

"وہ یہیں ہوتا ہے حسان صاحب۔ ابھی پچھلے ہفتے جرمنی گیا ہے نئی فیکٹری کے لیے مشینری پرچیز کرنے دس پندرہ دنوں میں آ جائے گا۔" مسعود صاحب نے بتایا تو حسان صاحب سر ہلانے لگے۔

"اچھا اچھا...... ماشاءاللہ بہت ہونہار لڑکا ہے۔"

"وہ تو ہے۔ دیکھا نہیں ان دو سالوں میں اس نے بزنس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اسی چکر میں شادی ٹال رہا تھا لیکن اب میں سمجھتا ہوں اس کی شادی ہو جانی چاہیے۔" مسعود صاحب خوب صورتی سے بات وہیں لے آئے تھے۔ حسان صاحب نے سر ہلانے پر اکتفا کیا تو مسز مسعود پوچھنے لگیں۔

"ربیکا کے لیے آپ کا ارادہ کہیں اور ہے کیا......؟"

"نہیں بھابھی! اصل میں ابھی تک میں نے ربیکا کے بارے میں سوچا نہیں۔ اب آپ کہہ رہی ہیں تو ان دونوں کو کچھ وقت دیں اور جیسا میں نے کہا ربیکا اور حسن کو بھی ایک دوسرے کو دیکھنے اور سمجھنے دیں اس کے

بعد ہی ہم کوئی قدم اٹھائیں تو میرا خیال ہے وہ زیادہ بہتر ہوگا۔" حسان صاحب نے بہت طریقے سے بات سنبھالی تھی۔

"بات آپ کی ٹھیک ہے اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ پھر کیا خیال ہے حسن کے آنے پر کوئی پارٹی وارٹی رکھ لی جائے۔" مسعود صاحب نے تائید کے ساتھ کہا تو حسان صاحب کو ہامی بھرنی پڑی۔

یوں بھی زیادہ ٹال مٹول مناسب نہیں تھا۔ ایسی صورت میں کہ وہ خود اس رشتے کے حق میں تھے اور حق میں تو ثمرہ بھی تھیں لیکن ربیکا کا سوچ کر پریشان ہو رہی تھیں جب ہی مہمانوں کے جاتے ہی کہنے لگیں۔

"حسان آپ خود ربیکا سے بات کریں ناں۔ اس سے اچھا پرپوزل اس کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ تم پہلے ربیکا کو اس کے بارے میں بتاؤ دیکھو وہ کیا کہتی ہے۔" حسان صاحب نے کہا تو ثمرہ زچ ہو گئیں۔

"میں جانتی ہوں وہ کیا کہے گی۔" اس لیے میں اب اس سے بات نہیں کروں گی۔"

"تو پھر اسے میرا فیصلہ سنا دو۔ کہہ دو میں نے حسن کے ساتھ اس کی شادی طے کر دی ہے۔" حسان صاحب قدرے غصے میں کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے تو ثمرہ مزید پریشان ہو گئیں۔

"آپ تو یوں کہہ رہے ہیں حسان جیسے وہ آپ کے فیصلے پر آرام سے سر جھکا دے گی۔"

"پھر تم بتاؤ میں کیا کروں۔" وہ جھنجلائے تھے۔

"آپ اسے آرام سے سمجھائیں کہ جیسا وہ چاہ رہی ہے ممکن نہیں ہے۔ ایک معمولی آدمی کے ساتھ وہ کبھی ایڈجسٹ نہیں ہو سکتی۔ مذاق بن کر رہ جائے گی۔"

"یہ باتیں تم نے اسے نہیں سمجھائیں؟"

"مجھے تو وہ بات ہی نہیں کرنے دیتی۔ فوراً اٹھ کر چلی جاتی ہے۔ کم از کم آپ کے ساتھ ایسا تو نہیں کرے گی۔ سن لے گی آپ کی بات اور جب سنے گی تو ہو سکتا ہے سوچنے پر بھی آمادہ ہو جائے۔" ثمرہ ٹھیک کہہ رہی تھیں جب ہی انہوں نے مزید بحث نہیں کی اثبات میں سر ہلا کر پوچھنے لگے۔

"کیا وہ لڑکا ربیکا کے ساتھ رابطے میں ہے؟"

"پتا نہیں آپ نے تو بتایا تھا وہ آفس چھوڑ کر جا چکا ہے۔"

"ہاں آفس سے تو جا چکا ہے لیکن......" ربیکا کو آتے دیکھ کر انہوں نے نہ صرف بات ادھوری چھوڑی بلکہ موڈ بھی بدل لیا تھا۔

"آؤ بیٹا! میں ابھی تمہارا ہی پوچھ رہا تھا۔ آؤ میرے پاس بیٹھو۔" انہوں نے جس محبت سے ربیکا کو اپنے ساتھ بٹھایا اس سے ثمرہ یہی سمجھیں کہ وہ ابھی اس سے حسن کے پرپوزل سے متعلق بات کریں گے۔ جب ہی بظاہر انجان بن گئیں۔

"میرے دوست مسعود شیروانی کو تو جانتی ہو تم بلکہ شاید مل بھی چکی ہو ان سے؟"

"جی...... کیا ہوا ہے انہیں......؟" ربیکا نے بے نیازی سے پوچھا تو وہ ایک نظر ثمرہ پر ڈال کر کہنے لگے۔

"انہیں کچھ نہیں ہوا۔ میں ان کے حوالے سے ان کے بیٹے حسن کا بتانا چاہ رہا ہوں۔ ان دو سالوں میں اس نے بزنس کو بہت پھیلا لیا ہے اور بہت کامیابی سے چل رہا ہے۔ اگر اس کی یہی رفتار رہی تو سب کو پیچھے چھوڑ جائے گا۔"

"ہو سکتا ہے۔" ربیکا کی بے نیازی ہنوز تھی۔

"نہیں یہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے ہمارا بزنس متاثر ہوگا بیٹا۔" انہوں نے کہا تو اب ربیکا پوری طرح ان

کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ کیونکہ بزنس سے اس کی دلچسپی قائم تھی۔

"ابھی پچھلے دنوں ہمارا ایک کانٹریکٹ اس کی وجہ سے منسوخ ہوا ہے۔" وہ مزید گویا ہوئے۔ "میں نہیں جانتا وہ کس پالیسی کے تحت کام کر رہا ہے جس میں وہ بے شک کامیاب ہے لیکن مجھے اپنے لیے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔"

"خطرے کی بات تو ہے ڈیڈی آپ نے کچھ سوچا نہیں۔" ربیکا کے لیے یہ بات جتنی اہم تھی ثمرہ اسی قدر بد دل ہو کر پہلو بدلنے لگیں۔

"سوچا ہے بلکہ مسلسل سوچ رہا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمیں سب سے پہلے حسن کی پالیسی معلوم کرنی چاہیے۔ اس کے لیے میری سمجھ میں نہیں آ رہا کس پر اعتبار کروں۔" حسان صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

"کیا سوچنے لگے ڈیڈی۔ آپ مسعود انکل کے ساتھ بزنس ڈسکس کر سکتے ہیں۔ کسی اور کو درمیان میں لانے کا کیوں سوچ رہے ہیں۔ بلکہ ایسا کرتے ہیں ہم نیا پروجیکٹ حسن کے ساتھ ڈیل کرتے ہیں۔ اس کی ڈیلنگ سے ہی اس کا طریقہ کار پتا چل جائے گا۔" ربیکا نے کہا تو وہ پرجوش ہو کر بولے۔

"گڈ...... میں جانتا تھا میری بیٹی فوراً کوئی حل نکال لے گی۔" "بس حسن جرمنی سے آ جائے پھر ہم اس سے ملتے ہیں۔ ٹھیک۔" انہوں نے ربیکا کا کندھا تھپکتے ہوئے ثمرہ کو دیکھا وہ ان کی حکمت عملی پر مسکرا رہی تھیں۔

☆☆☆

تیمور غزنی ابھی اپنی چیئر پر بیٹھا ہی تھا کہ ٹیلی فون بجنے لگا۔ وہ سمجھ گیا خزینہ ہوگی کیونکہ براہ راست کال صرف وہی کر سکتی تھی۔ اس نے ٹائم دیکھتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔

"کیسی ہو۔"

"سوری میں نے صبح صبح آپ کو ڈسٹرب کیا۔" خزینہ نے کہا تو وہ گہری سانس سینے میں دبا کر بولا تھا۔

"اول تو یہ صبح صبح نہیں ہے یعنی دس بج رہے ہیں دوسرے ڈسٹرب کو مزید کیا ڈسٹرب کرو گی۔"

"اب اس کا جواب نہیں ہے میرے پاس۔" وہ ہلکا سا ہنسی تھی۔

"تو چلو وہ کہو جو کہنے کے لیے صبح صبح فون کیا ہے۔" وہ حتی الامکان خود کو اس کی طرف مائل رکھ کر بول رہا تھا۔

"یہ صبح صبح تو نہیں ہے۔" وہ اس کی بات لوٹا کر پھر ہنسی تھی۔

"ہوں......" تیمور غزنی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ غالباً محظوظ ہوا تھا۔

"ہیلو......"

"سن رہا ہوں میڈم آپ کہیئے تو۔" اس کے دلنشیں لہجے نے غالباً خزینہ کو کنفیوز کیا تھا۔

"جی وہ میں یہ کہہ رہی تھی کہ میری مدر آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"اچھا کب...... میرا مطلب ہے کب آؤں۔" اب اس پر گھبراہٹ سوار ہو گئی تھی۔

"جب چاہیے۔ آپ شام میں آ جائیں۔" خزینہ نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"آج شام...... نہیں آج نہیں آ سکوں گا۔ شام میں ایک میٹنگ ہے۔ پھر میں تمہیں بتا دوں گا۔ کل، ...سوں ٹھیک ہے۔" وہ اگلے ایک دو دن کی مصروفیت سوچتے ہوئے بول رہا تھا۔

"ہوں...... جیسے آپ کو ٹھیک لگے۔ میں نے بہر حال اپنی مدر سے بات کر لی ہے۔"

"صرف بات کی ہے یا انہیں میرے بارے میں اور بھی سب بتایا ہے۔" وہ پوچھ کر خود ہی کہنے لگا۔ "دیکھو ...انہیں نے تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھا اور میں چاہتا ہوں تمہاری مدر کو بھی سب معلوم ہونا چاہیے۔"

"جی، میں نے ہر بات ان پر واضح کر دی ہے، اس کے باوجود میرا خیال ہے وہ اس سلسلے میں آپ سب سے سوال جواب ضرور کریں گی۔" خزینہ صاف گوئی سے بول رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ یہ ان کا حق ہے۔ وہ اپنا اطمینان کر لیں۔ او کے میں پھر تمہیں اپنے آنے کا بتا دوں گا۔" اس نے کہہ کر فون رکھ دیا۔ اور پھر اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بن گیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ وہ بالکل اکیلا تھا۔ سونیا اسے ایک راہ دکھا کر الگ تھلگ ہو گئی تھی، اس لیے اب وہ اس کے ساتھ کوئی بات شیئر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے آپ سوچتا رہا کہ وہ خزینہ کی والدہ کو کیسے مطمئن کرے گا۔ پتا نہیں وہ کیسی خاتون ہیں۔ سیدھی سادی یا بال کی کھال نکالنے والیں۔ سارا دن کام کے دوران بھی اس کا ذہن ان ہی باتوں میں الجھتا رہا۔ خزینہ سے اس نے آج میٹنگ کا بہانا کیا تھا اصل میں وہ خود کو ہر صورت حال کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا۔

شام میں وہ گھر لوٹا تو ماما کے پاس بیٹھ گیا۔ گو کہ یہ روز کا معمول تھا لیکن صرف پانچ یا دس منٹ پھر وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا اور اب اس کا دل ہی نہیں چاہا ان کے پاس سے اٹھنے کو کیونکہ وہ کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ کہ وہ اتنا بڑا قدم اٹھانے جا رہا ہے اور اس کی ماں کو خبر ہی نہیں۔ کاش وہ اس کی ہمراز ہوتیں تو وہ ان کی دعائیں لے کر جاتا۔ فطرتاً وہ سعادت مند بیٹا تھا۔ جب ہی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

"تیمور......" ماما نے پکارا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

"جی ماما۔"

"بیٹا سارہ سے کوئی ناراضی ہے کیا؟" انہوں نے پوچھا تو وہ قدرے حیران ہوا۔

"نہیں ماما آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟"

"کیونکہ تم اتنی دیر سے یہاں بیٹھے ہو اور سارہ کا پوچھا بھی نہیں اور کچھ الجھے ہوئے بھی لگ رہے ہو۔" ماما یقیناً اسے نوٹس کر رہی تھیں۔

"او ماما...... آپ صاف کہہ دیں کہ میں چلا جاؤں۔ آپ کے پاس نہ بیٹھوں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب بیٹھ گیا۔

"ضرور بیٹھو...... بیٹھنے کو منع نہیں کر رہی۔ سارہ کو بھی یہیں بلا لو۔ یا تمہیں کوئی ایسی بات کرنی ہے جو سارہ کے سامنے نہیں کرنا چاہتے۔" ماما کی بات پر وہ جز بز ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ بھی پتا نہیں کیا کیا سوچ لیتی ہیں۔ میں جا رہا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی وہ ان کے کمرے سے نکل آیا تھا۔

☆☆☆

آج دن کا آغاز ہی کچھ اچھا نہیں ہوا تھا۔ خلاف معمول وہ بہت دیر تک سوتا رہا تھا۔ جب اٹھا تو سر بوجھل اور درد بھی کر رہا تھا۔ نہانے سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ اس لیے اس نے کہیں بھی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ لیکن پھر ایک جگہ سے انٹرویو کال آ گئی تو اس نے ہمت باندھ لی تھی۔ اور اب انٹرویو دے کر نکلا تو اسے ٹمپریچر بھی محسوس ہو رہا تھا۔ تیز دھوپ میں آنکھیں مزید جلنے لگی تھیں۔ اور جو اس نے سوچا تھا کہ انٹرویو کے بعد شہرینہ کی طرف جائے گا تو اب ہمت نہیں ہوئی شہرینہ کو اپنی طبیعت خرابی کا میسج سینڈ کر کے سیدھا گھر آ گیا۔

فاخرہ کی عادت نہیں تھی کہ فوراً سوال جواب شروع کر دے۔ ابھی بھی انہوں نے پہلے کھانے کا پوچھا تو وہ منع کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں اماں ابھی کھانا نہیں کھاؤں گا۔ بیلا سے کہیں ایک کپ چائے بنا دے۔"

"میں بنا دیتی ہوں۔ بیلا ابھی کالج سے آئی ہے۔" فاخرہ کہتے ہوئے پلٹ گئیں تو وہ جوتوں سمیت نیم دراز ہو گیا۔ اچانک بخار سے اسے کوفت ہو رہی تھی۔ کبھی بالوں میں انگلیاں پھیرتا کبھی جلتی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتا۔

"کیا ہوا بیٹا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" فاخرہ چائے لے کر آئی تو پوچھنے لگیں۔

"ہاں بخار ہو رہا ہے۔" اس نے چائے کا کپ تھام لیا۔

"تو بیٹا ڈاکٹر کے پاس چلے جاتے۔"

"ابھی ہمت نہیں ہو رہی۔ شام میں چلا جاؤں گا۔ آپ جائیں کھانا کھالیں۔ میں چائے پی کر لیٹوں گا۔" اس نے کہا تو فاخرہ جاتے جاتے پلٹ آئیں۔

"بیٹا تمہارے آفس سے کوئی لڑکی آئی تھی۔"

"میرے آفس سے۔" وہ حیران ہوا "میرا کون سا آفس ہے۔"

"وہ جہاں تم جاب کر رہے تھے۔ وہ لڑکی کہہ رہی تھی آفس میں کوئی مسئلہ نہیں ہے تم جاب پر واپس آجاؤ اور وہاں تمہاری ترقی بھی ہونے والی ہے۔" فاخرہ مزید بھی کچھ کہہ رہی تھیں لیکن اس کے اندر ایسا غبار اٹھا کہ چائے کا کپ میز کے کارنر پر پنخ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا.....؟" فاخرہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگیں۔

"کچھ نہیں میں ابھی آتا ہوں۔"

"ہائیں...... بیٹا تمہاری طبیعت......" اس نے فاخرہ کی سنی ہی نہیں۔ تیزی سے باہر نکلا اور پھر اسپیڈ سے بائیک بھگانے لگا۔ وہ اس وقت بالکل آپے میں نہیں رہا تھا کہ وہ لڑکی جس سے وہ پیچھا چھڑانا چاہتا تھا وہ اس کے گھر تک پہنچ گئی تھی۔

"آخر سمجھتی کیا ہے خود کو....." ایک تو بخار کی حدت دوسرے غصہ اسے پاگل کر رہا تھا۔ آفس میں داخل ہو کر وہ یہاں وہاں کہیں نہیں رکا سیدھا حسان صاحب کے روم میں داخل ہو گیا کیونکہ اب وہ ان کا ملازم نہیں تھا اس لیے بنا کسی لحاظ کے شروع ہو گیا۔

"حسان صاحب میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ نے مجھ سے جو کچھ کہا بلکہ گھٹیا الزام لگایا تھا مجھ پر میں نے اس کا جواب نہیں دیا اور خاموشی سے آپ کا آفس چھوڑ دیا لیکن آپ کی بیٹی میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔ میں جہاں جاتا ہوں وہ وہیں موجود اور آج میرے گھر تک آ گئی کیوں...... آپ اپنی بیٹی کو لگام کیوں نہیں دیتے۔ میں اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔" حسان صاحب ہونٹ بھینچے ایک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔

"میں غریب ضرور ہوں حسان صاحب لالچی نہیں۔ جیسا آپ نے مجھے سمجھ لیا تھا اور آپ کی بیٹی بھی مجھے ہر طرح کا لالچ دیتی ہے۔ نہیں ضرورت مجھے کسی چیز کی۔ میں جہاں ہوں جیسا ہوں ٹھیک ہوں اور میں کوئی چھڑا چھانٹ نہیں ہوں۔ مجھ پر ایک نہیں دو گھروں کی ذمہ داریاں ہیں۔ مجھے میری ذمہ داریاں نبھانے دیجیے اور خدا کے لیے اپنی بیٹی کو....."

"بیٹھ جاؤ حمزہ۔" حسان صاحب اچانک بولے تھے۔ لہجے میں تحکم نہیں تھا پھر بھی کچھ ایسا تھا کہ وہ اگر بیٹھا نہیں تو ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" حسان صاحب نے دوبارہ کہا تو وہ بیٹھ گیا تب اس پر سے نظریں ہٹا کر انہوں نے پہلے انٹرکام پر چائے کا کہا پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

حمزہ کو لگا جیسے اب وہ کچھ نہیں بول سکے گا۔

☆☆☆

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ سونے کا ارادہ کر رہی تھی کہ تیمور غزنی کا فون آ گیا۔ زیادہ بات نہیں کی یہی بتایا کہ وہ پانچ بجے تک اس کے ہاں آئے گا۔ بس پھر تو اس کے اندر بجلی دوڑ گئی۔ پہلے حمیدہ بیگم کو بتایا پھر شہرینہ جو سونے کے لیے لیٹ چکی تھی اسے اٹھا دیا۔ اور اس کے بڑبڑانے پر ٹوک بھی دیا۔

"من من کرنے کی ضرورت نہیں ہے فوراً کام سے لگ جاؤ۔ ایسا کرو پہلے ڈرائنگ روم کی اچھی طرح جھاڑ پونچھ کرو۔"

"صبح کی تو تھی جا کر دیکھو ہر شے چمک رہی ہو گی۔" شہرینہ نے سستی بھگانے کی خاطر انگڑائی لیتے ہوئے کہا تو وہ دانت پیس کر بولی۔

"سنو وقت بہت کم ہے اسے فضول بحث میں ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو جاؤ۔"

"جا رہی ہوں یہ تو بتا دو وہ اکیلے آ رہے ہیں یا ساتھ کوئی اور بھی ہے۔" شہرینہ کا اشتیاق جاگ اٹھا تھا۔

"اکیلے ہی آ رہے ہیں۔" خزینہ نے بتا کر الماری کھول لی اور پرس میں سے پیسے نکالنے لگی۔

"تم کیا کر رہی ہو؟" شہرینہ نے رک کر پوچھا۔

"میں ناشتے کا سامان لا رکھوں۔"

"میرے لیے پیسٹری ضرور لینا۔" شہرینہ کہہ کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ تو اسے ہنسی آ گئی۔

پھر مقررہ وقت تک سب کام نمٹ گئے تھے اور تیمور غزنی نے بھی مقررہ وقت پر ہی بیل کا بٹن دبا کر اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ خزینہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا اور اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی تب اس نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

"کیسی ہو......؟"

"جیسی آپ کو نظر آ رہی ہوں۔" سادہ لیکن دلفریب انداز تھا۔

"اگر میں کہوں میری نظر کمزور ہے تو......" آنکھوں میں ہلکی شوخی چھلکی تھی۔

"تو میں مان لوں گی۔" وہ فوراً بولی تھی۔

"کیوں......؟"

"یہ بعد میں بتاؤں گی۔ ابھی آپ تشریف رکھیں میں امی کو لے کر آتی ہوں۔" وہ کہہ کر ڈرائنگ روم سے نکل آئی۔ آگے حمیدہ بیگم اس کے انتظار میں کھڑی تھیں۔

"آ گیا۔"

"جی، آئیں چلیں۔"

"تم یہیں رکو۔" حمیدہ بیگم نے کڑی نظروں سے اسے گھور کر ڈرائنگ روم کی طرف قدم بڑھا دیے کیونکہ وہ سوچ چکی تھیں کہ اگر لڑکا ان کی سمجھ میں نہ آیا تو وہ اس کی طبیعت صاف کر دیں گی۔ اس لیے خاصے جارحانہ انداز میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھیں۔

☆☆

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

سالگرہ نمبر



جنڈری

منشا محسن علی

ناولٹ

بنارسی جوڑے کے دوپٹے کے ساتھ گھر چھوڑتے سمے اماں نے ایک سرگوشی باندھی تھی۔

''عاشی...... جنڈری رول دینا وہاں، مگر پلٹ کر اس در کی چوکھٹ پر مت آنا...... پہلے ہی تیرے باپ کے سینے پر باقی چھ بوجھ لدے ہیں۔'' میں نے اماں کے آنسو روکنے کی کوشش کی تھی اور عجیب طور سے مسکرا دی تھی۔

''عاشی جنڈری رول دے گی۔'' اور بس یہیں آ کر اماں کے آنسو خود بخود رک گئے تھے۔ اچھی طرح جانتی تھیں کہ عاشی کی باتیں پتھر کی لکیر ہوتی تھیں۔ ابا کے سینے کے چھ بوجھ قطار میں کھڑے تھے سر جھکائے، زمین کو ٹکٹکی باندھ کر گھورتے...... ایسی بت ہو کر کھڑی تھیں کہ سانس لیتی ہوئی تو نہ لگتی تھیں۔ میں ان کے پاس چلی آئی تھی اور ان کے جھکے سر ایک ایک کر کے اٹھانے لگی تھی۔

''بہنو...... بیٹیاں، باپ کی چوکھٹ پر صدا نہیں چھوڑ کر جاتیں کہ پلٹ کر واپسی کی راہ نکل آئے...... میں بھی نہیں چھوڑ کر جا رہی...... میرا شہزادہ کہانیوں سے نکل کر میرے لیے آگیا ہے، تم سب کے شہزادے بھی جلد کہانیوں کے اوراق پھاڑ کر تمہارے لیے نکل آئیں گے۔ تب تک تمہیں ابا کی عزت کی پگڑی کی جی جان سے حفاظت کرنی ہوگی...... اور مجھے یقین ہے تم سب ایسا ہی کرو گی...... تمہاری ''چپ'' ہی تمہارا مجھ سے وعدہ ہے......اور کریم بخش کی بیٹیاں وعدوں سے نہیں پھرا کرتیں۔'' وہ چھ راج کماریاں میری آواز کے طلسم سے آزاد ہو گئی تھیں اور وہ ہمیشہ ہی ہو جاتی تھیں، اب تو تعجب بھی نہیں ہوتا تھا۔ میں نے انہیں اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر ان کے کندھے کے پیچھے اس آنگن پر نظر ڈالی تھی۔ اب وہ پرایا دیس تھا۔

آم کے پیڑ پر ٹوٹ کے اداسی برس رہی تھی۔ املی کے بوٹے کی کوئل آواز کا رس جانے کہاں بھول آئی تھی، تو یہ طے تھا، اب اس گھر کی کسی، بہار یا خزاں کا واسطہ عاشی سے نہیں رہے گا...... اینٹوں والے فرش پر آم کے خزاں رسیدہ پتے بکھرے تھے۔ دل چاہا جھاڑو اٹھا کر سارے آنگن کی صاف صفائی کر دوں...... رابیل کے پودے کی قینچی سے کانٹ چھانٹ کروں، آب خوروں میں پانی بھر کے رنگ برنگی چڑیوں کو پیاس بجھاتا دیکھوں...... اب تو سب خیال کی باتیں تھیں۔ پھر پھراتی نظریں آنسو پیتے ابا کی طرف اٹھی تھیں، میں ان کی طرف آ گئی تھی اور آج میرا حق تھا کہ ساری بارات میرا انتظار کرے۔ سالوں کی ڈور لمحوں میں کیسے توڑ دی جائے بھلا۔

''ابا...... میں نے ان چھ کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ آپ کو ہمیشہ کلف لگی پگڑی ہی ملے گی۔ کھسے پر گرد ڈھونڈتے رہ جائیں گے۔ چھوٹی کے ہاتھ کا بنا قہوہ پی کر عاشی کو بھول جائیں گے۔ سفید کرتوں کو احتیاط سے نیل لگائیں گی، رنگ نہیں بھٹکے گا۔'' ان کے ہاتھ کا بوسا لے کر پلٹتے ہوئے مجھے یاد آیا تھا۔

''اپنی ہاتھ کی گھڑی کا سیل نیا ڈلوا لیجیے گا۔ رات کو چلتے چلتے اچانک بند ہو گئی تھی۔'' آخری الفاظ کہہ کر میں آگے بڑھ آئی تھی...... اور میں نے پلٹ کر بالکل بھی نہیں دیکھا تھا، کیوں کہ مجھے ''پتھر'' نہیں

ہوتا تھا۔ وہ گھر جہاں ہم سات بہنیں رہتی تھیں...... اور سچ کہوں تو ہم مالا میں پروئے موتیوں کی طرح تھیں...... ایک ساتھ جڑی ہوئی' قطار در قطار' کریم بخش کے آنگن کی لاڈلی چڑیاں...... اور بقول ابا کے ''میرے گھر کی جنت ہیں یہ۔'' حقہ گڑگڑاتی دادی کڑواہٹ بھرے لہجے میں کہتی تھیں۔

''بوجھ ہیں پتر بوجھ...... سینے پر لدی ہیں، کیسے اتارے گا۔'' اور ہم دادی کے گرد جھرمٹ ڈال دیتیں۔

''نا دادی...... ہم تو کریم ابا کی جنت ہیں۔'' دادی جھنجلا کر اٹھ جاتیں۔ ''دادی حقہ تو لیتی جائیں۔''

چھوٹا سا گھر تھا۔ دو کمرے، ایک اسٹور، باورچی خانہ اور غسل خانہ۔ گھر انگریزوں کے زمانے کا تھا۔ سرخ اینٹوں پر مہریں لگی تھیں جواب وقت کی دھول تھیں۔ صحن کے وسط میں ٹھگنے آم کا پیڑ تھا، چوڑے پتوں والا...... گرمیوں میں پھل کی بہاریں ہوتی تھیں، تب ابا تو دیسی گھی اور آم سے روٹی کھاتے تھے۔ ابا کی دیکھا دیکھی ہم بھی کھانے لگی تھیں۔ املی کا پودا بھی تھا، جس پر شام کے وقت کوئل جیسے ملہار گاتی تھی، ہر شام ہم اس کوئل کا انتظار ساون کی بارش کی طرح کرتے تھے۔ آب خوروں کو لبالب بھرتے تھے۔ چڑیاں بڑی آس سے منڈیروں پر آ کر بیٹھتی تھیں اور کبھی مایوس نہیں ہوئی تھیں۔ دادی ضعیف ہوگئی تھیں، ہم نے ان کی خدمت میں دن رات ایک کر دیا تھا۔ گرمیوں کی ایک رات جب ہم سب کھلے صحن میں سو رہے تھے تو دادی نے ابا سے سرگوشی میں کہا تھا۔

''کریمے...... تیری لڑکیاں تو واقعی تیری جنت ہیں۔'' اور اگلے صبح ہی دادی اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔ صدیوں کی زندگی لمحے چپ چاپ نگل جاتے ہیں۔ ''ہم بیٹیاں بھی کیسی عجیب ہوتی ہیں، آنکھ کھولتے ہی سن لیتی ہیں کہ جہاں پہلی سانس لی ہے، پردیسی ٹھکانا ہے، جب جوانی کو پہنچیں گی اپنے دیس روانہ ہو جائیں گی۔ بابل کا انگنا تو چھوڑنا ہی پڑتا ہے نا...... میں نے بھی چھوڑ دیا ہے۔ کریم ابا کی جنت کی مالک اب میری چھ بہنیں ہیں، میں تو ایک مسافرہ تھی۔

☆☆☆

''میں نہیں چاہتا کہ میرے بارے میں کوئی بھی بات تم کسی تیسرے شخص سے سنو اور تمہیں تکلیف ہو، اس لیے پہلے سے ہی تمہیں بتانا اپنا فرض سمجھتا ہوں...... امید ہے تم میری ہر بات کو سمجھ لوگی۔'' کہانیوں سے نکل کر میری زندگی میں شامل ہونے والا وہ شہزادہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے آج تک کسی شخص کی اتنی کشادہ پیشانی، سنجیدہ گہری آنکھیں اور ستواں ناک نہیں دیکھی تھی جو ساجد بلال کی تھی...... وہ تو کوئی پری زاد تھا جیسے......

نظر لگ جانے کے ڈر سے میری نگاہیں پھر اس کی طرف نہیں اٹھی تھیں۔

''میں اس رشتے کی بنیاد کسی جھوٹ، فریب پر نہیں رکھنا چاہتا۔ تمہیں دینے کے لیے میرے پاس محبت نہیں ہے۔'' گلاب کی باس میرے نتھنے میں گھسی تھی، وہ کیا کہہ رہا تھا، میرے دل کی آواز سماعتوں میں دھڑکنے لگی تھی۔

''مگر میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ تم میرے لیے اپنا گھر چھوڑ کر آئی ہو...... میرے گھر کو، میری معذور ماں کو، میری جوان ہوتی تین بہنوں کو تمہاری ضرورت ہے...... اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کروگی...... تم ایک اچھی لڑکی ہو عائشہ۔'' گلاب کی مہک نے میرا سانس لینا دوبھر کر دیا تھا۔

''آپ کسی اور سے محبت کرتے تھے؟'' ساجد بلال کو شاید مجھ سے اس سوال کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ چند فٹ کے فاصلے پر بیٹھا وہ پہلی بار میری طرف متوجہ ہوا تھا۔ ''مگر اسے مجھ سے محبت نہیں تھی۔'' اور میں......؟ میرے دل میں تو بس سامنے بیٹھے شخص

کے نام کا شور تھا...... اور ایک شور باہر ہوا تھا۔ کانچ کی کوئی شے کسی دیوار پر ماری گئی تھی۔

''آدھی رات کو بھی میں آپ کی خدمت پر لگی رہوں، زندگی عذاب ہوگئی ہے میری۔ ہر روز نیا ڈراما، اب میں بھی آزادی سے اپنی زندگی جینا چاہتی ہوں۔'' ساجد اٹھ گیا تھا...... کچھ دیر بعد میں نے ساجد کی ٹھہری ہوئی آواز سنی تھی۔

''عالیہ! وہ ماں ہیں تمہاری، تم ان کے ساتھ ایسے کیسے بات کرسکتی ہو۔ انہوں نے تمہارے لیے راتیں گزاری ہیں، آج یہ تم کروگی تو آگے آسانیاں پاؤ گی۔'' بپھری ہرنی کی آواز پھر آئی تھی۔

''ساری مائیں اولاد کے لیے جاگتی ہیں۔'' دھاڑ سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تھی اور پھر سناٹا چھا گیا تھا۔ سفید چونے کی دیواروں پر ٹنگے وال کلاک پر رات کے دو بج رہے تھے۔ میں نے ہتھیلیوں پر رچی مہندی کو دیکھا تھا۔ تب ہی آہٹ ہوئی تھی، وہ اندر آ گیا تھا۔

''کیا تم باہر آسکوگی؟ تکلیف کے لیے معذرت چاہتا ہوں، اصل میں نوشی اور رخسار سو رہی ہیں اور عالیہ غصے میں دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی ہے۔ امی کو واش روم جانا ہے۔'' یہ میرا دیس تھا اور یہاں کی ہر ذمہ داری میری تھی جنہیں مجھے پورا کرنا ہی تھا۔ میں نے بیڈ سے اترتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے دو منٹ دیں، میں آتی ہوں۔'' دلہناپے والا لباس تبدیل کر کے میں تیسرے منٹ میں امی کے کمرے میں موجود تھی۔ وہ ان کے ہاتھ چوم رہا تھا۔ وہ رو رہی تھیں۔ مجھے ان پر بے تحاشا ترس آیا تھا۔ وہ سرخ و سفید رنگت کی سوبرسی خاتون تھیں جنہیں بیماری اور بڑھاپے نے گوشہ نشین کر دیا تھا۔ کمرے میں ہی اٹیچ باتھ روم تھا۔ ساجد کی مدد سے میں نے انہیں کرسی پر بٹھایا تھا اور باتھ روم کی طرف ان کی وہیل چیئر گھسیٹتی لے آئی تھی۔ حاجت سے فارغ ہو کر میں نے ان کا منہ اور ہاتھ اچھے سے دھلوا دیے تھے اور ان کے ساتھ باہر آ گئی تھی۔ الماری سے ان کا نیا لباس نکالا اور میڈیسن دیکھتے ساجد سے مخاطب ہوئی تھی۔

''پلیز...... آپ ذرا دیر کو باہر جایے۔ امی کا لباس تبدیل کرنا ہے۔'' وہ چپ چاپ باہر چلا گیا تھا۔ میں نے امی کے کپڑے تبدیل کروا کر میلے کپڑے ڈبے میں رکھے اور ان پر خوشبودار پاؤڈر چھڑکنے لگی۔ وہ بے آواز رونے لگی تھیں۔

''کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ بڑھاپے اور بیماری نے مجھے لاچار کر دیا ہے۔ میں اپنی اولاد پر بوجھ بن گئی ہوں۔ شرمندہ ہوں میں ان کے لیے۔ میری بیٹیاں میری وجہ سے پابند ہوگئی ہیں۔ بس اللہ جلدی سے مجھے اپنی طرف بلا لے۔'' میں نے ساکت ہو کر انہیں دیکھا تھا، وہ بچوں کی طرح سسکیاں بھر رہی تھیں۔ کھڑکیوں کے باہر اندھی رات تھی۔ میں نے جانے کس جذبے کے تحت انہیں خود سے لپٹا لیا تھا۔

''ہم سب آپ سے محبت کرتے ہیں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ آپ بوجھ نہیں ہیں، آپ تو دعا ہیں اور دعائیں کبھی بوجھ نہیں ہوتیں۔ آپ ماں ہیں اور مائیں تو باعث فخر ہوتی ہیں۔'' وہ رونا بھول گئی تھیں، پلکوں پر موتی رکے تھے۔

''تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟'' میں نے آنکھوں کے کونے صاف کیے تھے اور سر اثبات میں ہلایا تھا۔ میں ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھتی رہی۔ کیسی معصومیت تھی اور نور تھا، جلد ہی وہ پرسکون ہو کر سو گئی تھیں۔ میں ان پر کمبل برابر کرتی باہر آ گئی تھی۔

سامنے ہی وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا، زرد بلبوں کی روشنیوں میں اس پری زاد کا جمال اب بھی نمایاں تھا۔ چاند آسمان پر نظر نہیں آ رہا تھا، کوئی اکا دکا تارے تھے۔ میں ہولے ہولے چلتی ہوئی صحن میں آ گئی تھی۔ اب سارا گھر میرے سامنے تھا۔ وہ اب میرا گھر تھا۔ مجھے اسے بنانا سنوارنا تھا۔ تین کھلے کمروں کے آگے تین پلروں والا برآمدہ تھا۔ داہنی جانب باتھ روم اور بائیں ہاتھ پر کچن تھا۔ دیواروں پر اریو کیریا اور بوگن ویلیا کی بیلیں چڑھی تھیں جن کے پتے صحن میں جابجا بکھرے ہوئے تھے۔ گملوں میں لگے پودے مرجھا رہے تھے۔ وہ سیڑھیوں سے اٹھ کر میرے پاس آن کھڑا ہوا تھا۔ میرے بالکل پاس...... اس کے لباس سے اٹھتی خوشبو تک مجھے محسوس ہو رہی تھی۔

''جب تک ابا زندہ رہے زندگی بہت سیدھی اور آسان تھی، دو کے پہاڑے کی طرح ابا کے جانے کے بعد زندگی ویسی نہیں رہی...... امی بستر سے لگ گئیں۔ عالیہ، نوشی اور رخسار کی ذمہ داری بھی مجھ پر آن پڑی...... اس عرصے میں، میں نے زندگی کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھا ہے۔ میں نے اپنے فائنل ایگزام بھی نہیں دیے۔ اب بھی تین چار اکیڈمیز میں پڑھاتا ہوں۔ گھر کا خرچ چل جاتا ہے۔ کہتے ہیں نا انڈا پھوہڑ سے پھوہڑ عورت بھی مزے کا بناتی ہے۔'' وہ ہنستا تھا اور میں بغور اسے سن رہی تھی۔

''مجھے لگا تھا انڈا بنانا اتنا آسان ہوگا، مگر میں غلط تھا نہ تو میں انڈا بنا سکا اور نہ ہی پہلی روٹی...... پھر آہستہ آہستہ میں نے سب کیا، کھانا بنانے سے لے کر کپڑے دھونے تک، زندگی سب سکھا دیتی ہے عائشہ! میں بھی سیکھ گیا، اب میں تھکنے لگا ہوں زندگی سے، لوگوں سے...... اسی لیے امی کی ایک دوست کے کہنے پر میں نے تم سے شادی کی اور مجھے نہیں معلوم کہ میرا یہ فیصلہ کہاں تک درست ہوگا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، میں نے بہت خودغرضی دکھائی ہے اس معاملے میں...... ہر انسان شاید کسی نہ کسی حوالے سے خودغرض ہوتا ہے۔'' وہ آگے قدم بڑھا رہا تھا اور اس کا ہر قدم میرے دل کی ہر سرزمین پر پڑ رہا تھا۔ شرعی رشتے نے مجھے اس کے کتنا قریب کر دیا تھا۔ جانے کہاں سے آسمان کی چادر پر چاند اگ آیا تھا۔ سفید روشنی پھیل گئی تھی۔ سیڑھیاں چڑھتے وہ رکا تھا۔

''شکریہ۔''

میں نے فرش پر بکھرے پتوں پر چلتے ہوئے سوچا تھا۔ ''مائیں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔'' سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے اس رات میں نے فجر کی اذان سنی تھی۔ بلاوا آ گیا تھا۔

☆☆☆

سورج کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ میں نے جب کچن میں قدم رکھا تو رخسار اور نوشی ایک دوسرے کی مدد کر رہی تھیں۔ رخسار کٹنگ بورڈ پر سبزیاں کاٹ رہی تھی اور نوشی فرائنگ پین میں تیل گرم کر رہی تھی۔ وہ دونوں جڑواں تھیں اور شکل و صورت میں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر مسکرا دی تھیں، وہ ایک شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔

''کیا کر رہی ہو تم دونوں؟'' میں ان کے قریب چلی آئی تھی۔

''آپ کے لیے ناشتا بنا رہی ہیں۔'' میں نے حیرت سے ان پانچویں جماعت میں پڑھنے والی

بچیوں کو دیکھا تھا جو گھر میں آنے والی نئی دلہن کے لیے ناشتا بنانے کی کوششوں میں تھیں۔ میں نے ان کے ہاتھ پکڑ کر انہیں پاس پڑی کرسیوں پر بٹھا لیا تھا۔

''بیٹا! یہ تم لوگوں کے کرنے کے کام نہیں ہیں۔ میں کر لوں گی، تم دونوں آرام سے بیٹھو۔'' میں نے جلدی جلدی سبزیاں کاٹ کر پین میں ڈالیں اور انڈے بھی توڑ کر ڈال دیے تھے۔ آٹا گوندھ کر پراٹھے بھی بنا لیے تھے۔

''آئندہ میں تمہارے لیے کھانا بنایا کروں گی۔'' میں نے ان کے سامنے ٹرے سجا کر پیش کی تھی۔ وہ دونوں مجھے دیکھ رہی تھیں۔

''عالیہ آپی کہتی ہیں ہمیں سارے اپنے کام خود کرنے چاہئیں۔'' ان کے معصوم چہروں پر ایک الجھن سی تھی۔

''آپ کی عالیہ آپی ٹھیک کہتی ہیں، مگر ابھی تم دونوں کا پڑھائی کرنے کا وقت ہے۔ یہ سب بعد میں ہوتا رہے گا۔'' چھوٹی سی عمر میں ہی پریشانیاں ان کے چہروں پر نظر آنے لگی تھیں۔ ابھی تو ان کے ہنسنے گانے کے دن تھے۔ مجھے بابل کے آنگن میں رہتی اپنی چھوٹی راج کماریاں یاد آ گئی تھیں۔ تب ہی عالیہ نے قدم اندر رکھا تھا۔

''السلام علیکم بھابھی۔'' میں نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

''وعلیکم السلام، آؤ، ناشتا کر لو۔'' وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی پاس آ گئی تھی۔

''میں بنا دیتی ناشتا بھابھی! آپ کا پہلا دن ہے آج۔'' وہ مجھے تھوڑی سی شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ شاید رات والے واقعے کا اثر تھا یا کچھ اور......

''کوئی بات نہیں عالیہ! آخر آگے بھی تو یہ سب کرنا ہے نا۔'' وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

میں امی کے کمرے کی طرف آ گئی تھی۔ وہ تسبیح پڑھ رہی تھیں، مجھے دیکھا تو مسکرا دیں۔ کھڑکیوں کے پردے اٹھے ہوئے تھے۔ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ امی نے مجھے گلے سے لگا لیا تھا۔

''جیتی رہو۔ تم ابھی سے کچن میں کیوں گھس گئیں؟ عالیہ سنبھال لیتی۔''

میں نے جھینپ کر انہیں دیکھا تھا۔ ''کوئی بات نہیں امی جی۔'' انہوں نے تسبیح سائڈ ٹیبل پر رکھی تھی۔

''تمہیں ایک بات بتاؤں عائشہ؟'' انہوں نے جیسے سرگوشی کے سے انداز میں مجھے متوجہ کیا تھا۔

''آدھی رات کو ننگے پاؤں میرے کمرے میں آئی تھی روتے ہوئے، پیر چوم رہی تھی اور معافیاں مانگ رہی تھی۔ تھوڑی سی خودسر اور پاگل ہے، مگر دل کی بری نہیں ہے۔'' میں نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

''جی امی، جانتی ہوں۔ اس کے چہرے پر لکھا ہے کہ وہ کتنے صاف دل کی ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنی غلطیوں کا احساس بہت جلد ہو جاتا ہے۔ میں آپ کے لیے ناشتا لاتی ہوں۔'' انہوں نے میری پیشانی چوم لی تھی۔ میں نے وجود میں ٹھنڈک سی اترتی دیکھی تھی۔

تب ہی دروازہ بجا تھا اور میں ہمیشہ کی طرح پہچان گئی تھی کہ وہ دستک ابا کی تھی اور کچھ دیر بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی تھی جب ساجد اندر آیا تھا۔

''ابا آئے ہیں، انہیں مل آؤ۔ باقی عالیہ دیکھ لے گی۔'' عالیہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''آپ جائیں بھابھی! میں دیکھ لوں گی۔'' میں باہر آ گئی تھی۔ میں نے صحن میں ابا کو کھڑے دیکھا تھا، وہ اکیلے آئے تھے۔ میں بھاگ کر ان کے گلے لگ گئی تھی۔

''کیسی ہو عاشی؟'' وہ چارپائی پر بیٹھ گئے تھے۔

''میں ٹھیک ہوں ابا! اماں اور بہنیں نہیں آئیں؟'' میں نے استفسار کیا تھا، وہ ہنس دیے تھے۔

''ساری تیار کھڑی تھیں بیٹا! مگر میں چھوڑ آیا ہوں کہ کسی اور دن ہو آنا۔ یوں اچھا نہیں لگتا۔'' ابا

کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھے ساجد نے انہیں دیکھا تھا۔

''آپ کا اپنا ہی گھر ہے۔'' وہ میرے باپ کا احترام کر رہا تھا اور احترام سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں ہوتا...... وہ اٹھ کر اندر گیا تھا اور ٹرے لے کر باہر آیا تھا...... ابا گھبرا گئے تھے۔

''ارے ساجی پتر! میں ناشتا کر کے آیا ہوں۔'' وہ کپ میں چائے انڈیل رہا تھا۔

''میری خوشی کی خاطر'' ابا نے اس کے ہاتھوں سے کپ لے لیا تھا۔

''اپنے بیٹے کو تو میں ناراض نہیں کر سکتا نا۔'' وہ ہولے سے مسکرا دیا تھا اور میں نے اسے پہلی بار مسکراتے دیکھا تھا۔ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میری زندگی میں کوئی ایسا شخص آئے گا۔ کتنی سنجیدگی تھی اس کے دلکش چہرے پر...... اور عجب سی بے نیازی تھی۔ اسے شاید میری نظروں کی تپش کا احساس ہوا تھا اور اس نے مجھے دیکھا تھا۔ میں نے سٹپٹا کر چہرہ موڑ لیا تھا۔

عالیہ، نوشی اور رخسار ابا سے ملنے آئی تھیں، ابا نے دعائیں دی تھیں، امی سے شاید وہ آتے ہی اندر جا کے مل چکے تھے۔ ساجد اندر گیا تو ابا نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''عاشی...... تو خوش تو ہے نا؟'' ان کی آنکھوں میں ہزاروں وسوسے اور ڈر تھے۔ میں نے اپنے سارے آنسو اندر کہیں روک لیے تھے۔

''جی ابا...... میں خوش ہوں۔'' میں نے غور سے اپنے بوڑھے باپ کو دیکھا تھا۔ کلف لگی پگڑی پہنے، نیل والا کرتہ پہنے اور ڈھیروں عطر لگائے، وہ کتنا پرسکون لگنے لگے تھے...... ابا نے تھیلا میری طرف بڑھایا تھا۔

''یہ لو...... تمہارے لیے ہے۔'' میں نے تھیلا تھام لیا تھا۔

''یہ کیا ہے ابا؟'' وہ مسکرائے تھے۔

''تیری بہنوں نے دیسی گھی والی سوجی کی پنجیری بھیجی ہے۔'' مجھے ان پر بے ساختہ پیار آ گیا تھا۔ کتنی کمی محسوس کی ہو گی انہوں نے میری۔ ابا نے میری ٹھوڑی اوپر اٹھائی تھی۔

''اور تو کون سی نصیحتیں کر کے آئی تھی انہیں، کل رات سے میرے آگے پیچھے پھر رہی ہیں۔ میری ساری پگڑیاں کلف کے لیے اکٹھی کیے بیٹھی ہیں اور کرتوں کے لیے نیل گھولا ہوا ہے۔ کھسے فجر کی نماز کے وقت ہی چمکا کر رکھ دیے ہیں اور قہوہ تو کل سے چار، پانچ بار پلا چکی ہیں۔'' ابا کی بوڑھی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''ابا...... رو کیوں رہے ہیں اب؟'' ابا نے رومال سے آنکھیں پونچھی تھیں۔

''تم بیٹیاں جو ہوتی ہو نا، بوڑھے ماں باپ کی عادتیں بگاڑ دیتی ہو۔ پھر ہم بوڑھے مرتے دم وہ عادتیں نہیں سدھار پاتے۔'' میں نے بچوں کی طرح اپنے باپ کو روتے دیکھا تھا۔ ابا نے کچن کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''یہ تینوں بھی تمہاری بہنوں کی طرح ہیں۔ کبھی اونچی آواز میں ان سے بات بھی نہ کرنا اور صدیقہ خاتون کو ماں کا درجہ دینا۔ یہ ہی تمہاری جنت ہے۔ اب تمہیں یہیں رہنا ہے۔'' اور میں نے ابا کی کہی یہ بات ہمیشہ کی طرح گرہ سے باندھ لی تھی۔

اور میں نے ان دنوں میں نوشی، رخسار اور عالیہ کو جانچا تھا۔ عالیہ ناریل جیسی سخت نظر آتی تھی، مگر تھی نہیں...... وہ میٹرک کی طالبہ تھی اور ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ نوشی اور رخسار پانچویں جماعت میں پڑھتی تھیں، دونوں میں اعتماد کی کمی تھی۔ ان کا بچپن ماں کی بیماری کی نذر ہو گیا تھا۔ امی اپنی جگہ مجبور تھیں، معذوری نے انہیں کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ ساجد بلال کو میں نے آنے والے دنوں میں بے نیاز ہوتا دیکھا تھا۔ وہ وقت ضرورت ہی مجھ سے مخاطب ہوتا تھا۔ اکثر پریشانی کے عالم میں سگریٹ پھونکتا رہتا تھا۔ میں نے شروع کے کچھ ہفتے ساری روٹین سمجھنے میں گزارے تھے۔ سب کو میں نے اپنے طریقے

وینڈل کرنا تھا۔ وہ سارے قریب ہو کر بھی پاس کہیں تھے۔ جانے کیسی دوریاں تھیں، فاصلے تھے ہو کر سمٹتے ہی نہیں تھے۔ دن سہمے سہمے اور راتیں اکھڑی اکھڑی سی تھیں۔

ساجد بلال نے ایک رات مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ''ترس آتا ہے مجھے تم پر...... تمہاری شکل ہی ایسی ہے۔ محبت نہیں ہو سکتی تم سے، میرے دل میں محبت کے لیے اب کوئی خانہ نہیں۔ محبت کرنا میں بھول چکا ہوں۔ تم بیوی ہو اور بیوی بن کر ہی رہو۔'' اور اس رات میں نے کھڑکی میں کھڑے کھڑے سوچا تھا۔

''زندگی جینے کے لیے کیا محبت ضروری ہوتی ہے؟'' اور پھر میں نے اپنی سیانی ماں کے سامنے سوال رکھا تھا۔

''اماں...... محبت کیسے ملتی ہے؟'' اماں کی ایک نظر نے پوری عمارت پرکھ لی تھی۔

''عاشی......'' لہجے میں سرسراہٹ تھی۔ ''جندڑی رول دے عاشی! اپنا آپ فنا کر کے ہی دوسرے دل کی کنجی ہاتھ آتی ہے۔ اپنا آپ خاک میں ملانا پڑتا ہے۔'' میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی، جانتی تھی کہ میری آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

''عاشی جندڑی رول دے گی اماں! اپنا آپ فنا کر دوں گی۔ تب ساجد بلال کے دل کی کنجی ہاتھ لگے گی۔'' آتش دان میں چٹختی گیلی سیلی لکڑیاں جلتی رہی تھیں اور چھ راج کماریوں والا گھر زہریلے دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ راکھ وہیں سو گئی تھی۔

☆☆☆

اور پھر میں نے اپنی جندڑی رول دی، صرف ساجد بلال کی ایک نظر کی خاطر...... محبت بڑی بھاری شے ہوتی ہے، ککھ (تنکے) سے بھی ہلکا کر کے رکھ دیتی ہے۔ میں نے گھر کے سارے کام اپنے ذمے لے لیے تھے۔ رخسار اور نوشی کے بورڈ کے امتحانات ہونے والے تھے۔ میں ساتھ ساتھ ان کی تیاری بھی کروا رہی تھی۔ جانے کیوں مجھے وہ ابا کے آنگن میں چھوڑی اپنی بہنوں جیسی لگی

تھیں۔ ویسی ہی معصوم اور فرشتہ صفت...... میں انہیں عاد اعظم اور ذو اضعاف اقل کے سوال کروا رہی تھی، جب نوشی نے پنسل کا نوکیلا حصہ تراشتے ہوئے مجھے مخاطب کیا تھا۔

"بھابھی! آپ کو ایک بات بتاؤں؟" شاید وہ کوئی انتہائی دلچسپ بات بتانے والی تھی، میں اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"ہاں...... ہاں بتاؤ۔" وہ پنسل کی نوک کو ٹھوڑی کے گڑھے پر رکھ کر گول گول گھمانے لگی تھی۔

"پتا ہے میری سہیلی کیا کہتی ہے؟"

"کیا کہتی ہے؟"

"وہ کہتی ہے، یہ جو بھابھیاں ہوتی ہیں نا، چڑیلیں ہوتی ہیں۔" میں حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

"اور وہ ایسا کیوں کہتی ہے؟" نوشی تفصیل سے سارا قصہ بیان کرنے لگی تھی۔

"اس کی بھابھی بہت بری ہے، اس کے ساتھ سختی کرتی ہے، کھانے کو بھی اسے کچھ نہیں دیتی۔ گھر کے سارے کام اسی سے کرواتی ہے، کھانا بھی پکواتی ہے۔ صدف کا ایک بار ہاتھ بھی جل گیا تھا، اس نے مجھے دکھایا تھا۔ صدف نے مجھ سے آپ کا پوچھا تھا۔" اس کی لانبی پلکیں بے خیالی میں مجھ پر جمی تھیں۔

"تو تم نے کیا جواب دیا تھا؟" وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

"میں نے کہا کہ میری بھابھی تو بہت اچھی ہیں، ہمیں کام نہیں کرنے دیتیں، وقت پر کھانا دیتی ہیں، پڑھاتی بھی ہیں۔ سب کا خیال رکھتی ہیں۔" وہ معصوم سی لڑکی اٹھی تھی اور جھٹ سے میری ناک کی نوک چوم لی تھی۔ کیسا عجیب احساس تھا۔

میں کتنی خود غرض تھی کہ ساجد بلال کی نظر میں آنے کے لیے وہ بھی اس وجہ سے کہ میں اس سے جڑے رشتوں کا خیال رکھ رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر نیلے آسمان کو دیکھا تھا اور گہری سانس لی تھی۔

"انسان کی نظر میں آنے کے لیے بھی انسان کیا، کیا جتن کرتا رہتا ہے۔"

ساجد صبح کا گیا سہ پہر کو آتا تھا اور پھر شام کو پھر اکیڈمی پڑھانے چلا جاتا تھا، کبھی کبھی تو مجھے اس پر کسی مشین کا سا گمان ہوتا تھا۔ رات کو کھانے کے بعد بھی دیر تک پیپرز چیک کرنے میں مگن رہتا تھا، مجھے کبھی بھی روشنی میں نیند نہیں آتی تھی، اسی وجہ سے میں اس کے فارغ ہونے اور روشنی بند کرنے تک جاگتی رہتی تھی یا پھر کبھی کوئی کتاب پڑھنے کو اٹھا لیتی تھی۔ خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر میری پسندیدہ تھیں اور اکثر میرے ہاتھوں میں پروین شاکر کی ہی کوئی کتاب ہوتی تھی۔ جوانی میں شاعری اور رومانوی کہانیاں کتنا ہانٹ کرتی ہیں۔ تخیل کے دیس میں رومانویت سی بھر جاتی ہے۔

عکس خوشبو ہوں، بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی
کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی
جس طرح مرے ہوگئے خواب ریزہ ریزہ
اس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی
میں تو اس دن سے ہراساں ہو کہ جب حکم ملے
خشک پھولوں کو کتابوں میں نہ رکھے کوئی
اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں
اب کس امید پہ دروازے سے جھانکے کوئی
کوئی آہٹ، کوئی آواز، کوئی چاپ نہیں
دل کی گلیاں بڑی سنسان ہیں، آئے کوئی

"روشنی بجھا دوں یا تم ابھی پڑھو گی؟" اس کی سنجیدہ آواز پر میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور کتاب بند کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ وہ روشنی بند کر کے میری طرف پیٹھ کر کے ہمیشہ کی طرح بیڈ کے دوسرے کنارے پر سو گیا تھا۔ جگہ کے فاصلے تو شاید کچھ معنی نہیں رکھتے اور اگر یہ ہی فاصلے دلوں میں آ جائیں تو...... ایک آنسو میری آنکھ سے لڑھک کر میرے گالوں پر آن ٹھہرا تھا۔

جب بھی گھر جاتی تھی وہ چھ شریر ٹولے میں

سوال و جواب کرنے آ جاتی تھیں۔

"ساجی بھائی تو بہت محبت کرتے ہوں گے آپ سے؟" میری نظریں آم کا بور گراتی چڑیوں پر ہوتی تھیں۔

"بہت عزت کرتے ہیں میری اور مجھ سے وابستہ سارے رشتوں کی۔" وہ معنی خیز انداز میں کھلکھلائی تھیں۔

"اور آپ کیا کرتی ہیں؟"

"میں......" میں نے سرخ اینٹوں والے فرش پر پڑے بور کے ڈھیر کو دیکھا تھا۔

"میں محبت کرتی ہوں ان سے اور ان سے جڑے ہر رشتے سے۔"

سچ تو یہ بھی تھا کہ آج تک میں محبت اور عزت کو کسی ترازو میں نہیں تول پائی تھی، جانے محبت کا وزن زیادہ تھا یا پھر عزت کا وزن کم تھا۔ میں نے گھر کے نقشے کو بدلنے کی کوشش کی تھی۔ عالیہ، نوشی اور رخسار نے بھی میرا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ سب سے پہلے تو سیڑھی لگا کر صحن کی دیواروں پر سفیدی کی تھی۔ پھر ہم چاروں نے قینچیاں لے کر ایرو کیریا کی بیل اور بوگن ویلیا کی اچھی طرح کانٹ چھانٹ کی تھی۔ گملوں کی مٹی بدلی تھی، سارے پودے مرجھا رہے تھے۔ مسالوں والے ڈبوں پر مسالوں کے نام کی چٹیں چپکائی تھیں۔ شیلفوں کو ہم نے اخباروں سے آراستہ کیا تھا اور سہ پہر کو ہم چاروں برآمدے میں رکھے قالین پر ڈھیر پڑی تھیں۔ میں بریانی کو دم لگا آئی تھی۔

"آخر یہ دم کب کھلے گا؟" یہ منمناتی ہوئی آواز رخسار کی تھی۔

"پانچ منٹ صبر کرو۔" نوشی نے الگ دہائی دی تھی۔

"اف...... پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں اور سارا جسم درد کر رہا ہے۔" عالیہ صحن میں کھڑی گول گول گھومتی ہوئی چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

"آج سب کتنا پیارا لگ رہا ہے نا۔" رخسار نے آئینے میں شکل دیکھی تھی۔

"اور ہم سب بھوت لگ رہے ہیں۔"

میں امی کی وہیل چیئر باہر لے آئی تھی۔ انہوں نے خوش گوار حیرت سے سفید دیواروں، دھاگوں سے سلیقے سے بندھی بیلوں اور گملوں میں پانی ٹپکاتے سدابہار پودوں کو دیکھا تھا۔

"ارے...... یہ کس نے کیا ہے؟" نوشی نے بانہیں ان کے گلے میں ڈالی تھیں۔

"ہم سب نے کیا ہے، بھابھی کا آئیڈیا تھا۔" میں مسکراتی ہوئی کچن میں آ گئی تھی۔ دم کھلا تو بریانی کی اشتہا انگیز خوشبو سارے میں پھیل گئی تھی۔ چٹنی میں نے پہلے ہی بنا لی تھی۔ ڈشوں میں بریانی نکال کر میں نے برآمدے کے قالین پر لگا دی تھی۔

تب ہی دروازہ دھکیلتا وہ گھر میں قدم رکھ رہا تھا۔ اسے کسی تبدیلی کا احساس ہوا تھا، وہ چند ثانیے نئی تبدیلیوں کو دیکھتا رہا اور پھر ہم چاروں کے حلیے دیکھ کر شاید سب سمجھ گیا تھا۔ امی نے ہی اسے مخاطب کیا تھا۔

"ارے آ گئے ساجی بیٹا! کپڑے بدل لو اور گرم بریانی کھا لو۔ عائشہ نے بہت مزے کی بنائی ہے۔" وہ سر ہلاتا اندر کی طرف چلا گیا تھا۔ میں بھی اپنی پلیٹ چھوڑتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ارے بھابھی! آپ کہاں جا رہی ہیں۔"

"تمہارے بھائی کو کپڑے نکال کر دے دوں۔" سہ پہر کے سائے پھیل رہے تھے۔ خوش گوار ہوا کے جھونکے بھلے لگ رہے تھے۔ شاید کسی جگہ بارش ہوئی تھی۔ میں اندر آئی تو وہ ساری الماری کے کپڑے باہر نکال کھڑا تھا، میں نے آج ہی سیٹنگ کی تھی۔

"میری بلیو شرٹ کہاں ہے؟" میں آگے بڑھی تھی۔

"یہیں کہیں ہو گی۔ آپ کوئی اور پہن لیں۔" میں نے مشورہ دیا تھا۔

"مجھے وہی پہننی ہے۔" اس کے لہجے میں

عجب سی ضد تھی۔ میں ٹھہر گئی تھی، جانے کیوں وہ لہجہ مجھے بہت سخت لگا تھا۔ میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ میں نے کپڑوں کے نیچے دبی بلیو شرٹ اسے تھما دی تھی اور آنکھیں پونچھتی باہر آ گئی تھی، مجھے پشت پر نگاہوں کی تپش محسوس ہوئی تھی۔

''تو یہ طے ہوا کہ میں کسی بند گلی میں آ گئی ہوں، جس کا کوئی بھی راستہ تمہارے دل تک نہیں آتا۔''

وہ دن دبے قدموں اپنی چاپ چھوڑے گزر گیا تھا اور رات سر پر چلی آئی تھی۔ ہوا میں خنکی تھی۔ زرد بلبوں کی روشنی صحن میں بکھری ہوئی تھی۔ میں اور عالیہ چائے کے کپ تھامے سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے یہ ہم دونوں کا معمول بن گیا تھا، ایک دن عالیہ چائے بناتی تھی اور اگلے روز میری باری ہوتی تھی۔ میں چائے کے سپ لے رہی تھی اور عالیہ کپ تھامے ماضی پھرول رہی تھی۔

''وہ ہماری زندگی کا بہت مشکل وقت تھا۔ ابا کے گزرنے کے بعد ہم نے بہت مشکل حالات دیکھے۔ امی کی بیماری، فاقے اور رخسار، نوشی کا بچپن...... تب زندگی سے خوف آتا تھا، دل چاہتا تھا کہ اگلے روز آنکھ نہ کھلے، موت آ جائے، بھائی نے اپنی پڑھائی چھوڑ دی، نوکری بھی نہ ملی۔ مزدوری کی اور ہمیں کھلایا۔ واپس آتے تھے تو سارا بدن سوج رہا ہوتا تھا، میں ٹکور کرتی تھی اور روتی تھی۔ بھائی پہلے بھی سنجیدہ تھے، مگر اس کے بعد تو اور بھی سنجیدہ ہوتے گئے۔ بس مطلب کی بات کرتے تھے۔ مجھ پر تو امی اور دونوں چھوٹیوں کا بوجھ آن پڑا تھا۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی، جس نے مجھے آہستہ آہستہ تھکانا شروع کر دیا تھا۔ میرے لہجے میں بھی نہ چاہتے ہوئے کڑواہٹ آتی گئی۔ زندگی یوں ہی گزرتی چلی جا رہی تھی۔ تب کہیں جا کر بھائی کو اکیڈمیز میں پڑھانے کی جاب مل گئی تو آہستہ آہستہ حالات بدلنے لگے۔ تب بھائی نے علیزے سے شادی کی بات کی تو اس نے انکار کر دیا کہ وہ ہماری معذور ماں اور تین بہنوں کی چاکری نہیں کر سکتی۔ تب بھائی اپ سیٹ رہنے لگے، پھر صغریٰ خالہ کے کہنے پر بھائی شادی پر راضی ہو گئے اور بھائی کی آپ سے شادی ہو گئی۔'' میری چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ جانے کیوں مجھے فضا میں گھٹن بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ بادلوں کے ساتھ چاند گپ چپ کھیل رہا تھا۔

میں نے کپ میں چائے پر جمی تہ کو دیکھا تھا اور کپ سیڑھی پر رکھتے ہوئے عالیہ سے مخاطب ہوئی تھی۔ ''علیزے کون تھی؟''

☆☆☆

''میں علیزے ہوں۔'' میرے سامنے کچن میں رکھی کرسی پر بیٹھی وہ لڑکی مجھے بتا رہی تھی۔ موٹی آنکھیں، گھنی پلکوں اور سفید رنگت والی اس طرح دار سی لڑکی نے اپنا تعارف پیش کیا تھا۔ میں نے بھاپ اڑاتا چائے کا کپ اس کے سامنے میز پر رکھا تھا جس کے کناروں پر وہ اپنی مخروطی انگلیاں پھیر رہی تھی۔

''مجھے لگا تھا ساجی نے تم سے میرا تعارف کروایا ہوگا مگر تمہارے چہرے کی حیرانی بتا رہی ہے کہ اس نے میرا نام تک نہیں لیا ہوگا تمہارے سامنے، خیر یہ تعجب کی بات بھی نہیں...... مرد اکثر اپنی پہلی محبت کا ذکر چھپا لیتے ہیں۔ فطرت کی بات ہوتی ہو گی، میں ساجی کی چچا زاد کزن بھی ہوں اور پہلی محبت بھی۔ بقول ساجی کے آخری محبت بھی...... اور تمہیں دیکھ کر تو مجھے اس کی یہ بات سچ لگ رہی ہے۔ تم عام سی ہو، کچھ بھی تو خاص نہیں تم میں...... لیکن مجھے تمہارا نام بہت پسند آیا ہے۔

عاشی...... میں آج کل کے زمانے کی لڑکی ہوں، صرف محبت سے زندگی نہیں گزرتی، اچار ڈالنا ہے کیا ایسی محبت کا جو آپ کو اچھا کھانا پینا اور برانڈڈ پہناوا تک نہ دے۔ میں تو ایسی محبت سے بھلی، یہ ہی وجہ تھی کہ میں نے ساجی کا پرپوزل ریجیکٹ کر دیا تھا۔ میں کوئی نوکرانی بن کر تو ہرگز نہیں رہ سکتی تھی، زندگی میرے لیے تو برتن مانجھنے اور جھاڑ دلگانے سے آگے کی چیز ہے۔ زندگی پر ہمارا بھی حق ہے، جیسے چاہیں جس طرح چاہیں گزاریں اور سچ کہوں تو مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ معذور چچی کے ڈائپر تبدیل کرتی اور جوان ہوتی تین لڑکیوں کو گود میں لے لیتی۔ میں مر کر بھی ایسی زندگی کے بارے میں نہیں سوچتی۔ تمہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بہت بھولی ہو اور تمہیں تمہارے ماں باپ نے جان بوجھ کر اس اندھے کنویں میں دھکیلا ہے۔ ساری عمر بھی چاکری کرتی رہو گی ناں تو تب بھی ساجی کے دل کی کنجی ہاتھ نہیں لگے گی۔'' چائے کا آخری گھونٹ بھرتی طرح دار سی علیزے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے لانبے ناخن بلیک برن سے سجے تھے، وہ مسکراتے ہوئے بہت خوب صورت لگتی تھی۔ عجب بے نیازی ٹپکتی تھی اس کے لہجے سے، میں نے پندرہ منٹ مسلسل بولنے والی گڑیا کو پہلی بار مخاطب کیا تھا۔

''کیا آپ کے یہاں تشریف لانے کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟'' وہ زور سے ہنستی ہوئی میرے مقابل آن کھڑی ہوئی تھی اس کی ہنسی سچے کانچ کے ٹکرانے جیسی تھی۔

''تمہیں حیرت ہوئی ہے یا پریشانی؟ تو سنو میں یہاں صرف اور صرف تمہیں دیکھنے آئی تھی۔ ایسی فیل ہو رہی تھی کہ جو میری زلفوں کا اسیر تھا وہ تمہارا دیوانہ تو نہیں بن بیٹھا مگر یہاں تو سب پہلے جیسا ہے...... کچھ بھی نہیں بدلا، گھر بدل ڈالو گی عاشی صاحبہ! مگر ساجی کا دل کیسے بدلو گی؟ دل آسانی سے نہیں پھرتے۔ چلتی ہوں...... اور ہاں ساجی کو میری آمد کی خبر مت دینا، کھرنڈ لگے زخم رسنے لگیں گے تو تمہیں ہی تکلیف ہوگی۔'' وہ کوئی ساحرہ تھی یا جادوگرنی تھی۔ اس نے میری جان نکال لی تھی، میرے سارے الفاظ گونگے تھے، پریشر ککر کی سیٹی بج رہی تھی، وہ دروازے سے باہر جاتے جاتے آخری بار پلٹی تھی۔

''ویسے تم چائے بہت اچھی بناتی ہو۔'' میں نڈھال سی کرسی پر ڈھے گئی تھی، سارے وجود میں سوئیاں چبھو کر وہ ساحرہ جا چکی تھی، میں نے دل پر ہاتھ رکھا تھا۔

''ہائے عاشی! تمہارے حصے میں تو آدھا چاند بھی نہیں آیا۔'' افسوس...... مجھے لگا جیسے میں کچن میز پر صدیاں گزار بیٹھی تھی۔ کچن کی گھڑی کی ٹک ٹک دماغ پر ہتھوڑے کی مانند لگ رہی تھی، نوشی جانے کب اسکول سے آئی تھی اور اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔

''بھابھی! بھوک لگی ہے۔'' میں نے بے خیالی میں اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

''ہاں بیٹھو، دیتی ہوں۔'' میں نے کھانا اس کے سامنے رکھا تھا اور فریج سے پانی کی بوتل نکالنے لگی تھی، وہ کھانا کھاتی مگن سی اپنی باتیں کیے جا رہی تھی۔

''پتا ہے بھابھی! آپ نے جو حساب کے سوال سمجھائے تھے ان کا آج ٹیسٹ ہوا اور میرے فل مارکس آئے اور اسٹوری سے بھی صرف ایک نمبر کٹا ہے۔'' میں نے گلاس میں پانی ڈال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے اس کے خوشی سے معمور چہرے کو دیکھا تھا۔

''کتنا سکون اور اطمینان ہے ناں نوشی کے چہرے پر...... اسے پتا ہے کہ اس کی ساری چھوٹی چھوٹی پریشانیاں بانٹ لی جائیں گی، اس کا بھائی، اس کی بہنیں، ماں ہیں جو اس کو تسلی دیں گے، پیٹھ تھپکیں گے۔'' میں نے سر جھٹکا تھا اور میں...... میری پریشانیاں، میرا دل...... میرے دکھ...... میری کہانی کا شہزادہ تو پہلے ہی کسی کی قید میں تھا۔ نوشی نے اچانک سر اٹھایا تھا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

''کچھ بھی نہیں...... کچھ بھی تو نہیں۔''

''آپ کو کہیں چوٹ لگی ہے اور آپ بتا نہیں رہیں...... ہیں ناں؟'' اسے اپنی بات پر جیسے پورا یقین تھا۔

"ہاں نوشی! چوٹ تو لگی ہے۔"

"کہاں لگی ہے؟"

"دل پر......" میری بڑبڑاہٹ رخسار کی ہاہوکار میں دب گئی تھی، وہ تمتماتے چہرے کے ساتھ کچن کے دروازے پر کھڑی تھی۔

"میں آپ کے لیے کچھ لائی ہوں۔" وہ ہاتھ پیچھے کیے کچھ چھپائے ہوئے تھی۔ مجھ سے زیادہ نوشی اتاؤلی ہورہی تھی، میں دلچسپی سے رخسار کے پاس آئی تھی۔

"دکھاؤ تو...... کیا لائی ہو؟" رخسار نے وہ رنگ برنگے پانیوں والا شیشے کا ڈبا کچن ٹیبل پر رکھ دیا تھا جس میں رنگ برنگی چار مچھلیاں تیر رہی تھیں، نوشی اس ڈبے پر جھک گئی تھی۔

"ہائے اللہ...... کتنی پیاری ہیں۔" رخسار نے جوش سے بتانا شروع کیا تھا۔

"سرخ مچھلی بھابھی کی ہے، گولڈن میری، بلیو عالیہ کی اور پرپل نوشی کی۔" میں نے وہ ڈبا احتیاط سے تھاما تھا۔ جگ مگ کرتے پانی میں وہ رنگ برنگی مچھلیاں بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ وہ مچھلی کا ڈبا برآمدے کے اونچے چھجے پر رکھ دیا گیا تھا۔ وقفے وقفے سے اس کا پانی بھی بدلا جاتا تھا اور خوراک بھی پہنچائی جاتی تھی۔ سارا دن وہ آدھے آدھے گھنٹے بعد اس مچھلی ڈبے کو دیکھ آتی تھیں۔

شام کو میں سلاد بنا رہی تھی جب رخسار میرے پاس آئی تھی۔

"بھابھی آپ کی مچھلی تو جلدی جلدی بڑی ہورہی ہے۔" مجھے بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔

"پگلی...... مچھلیاں اتنی جلدی کہاں بڑی ہوتی ہیں۔" وہ باہر بھاگ گئی تھی۔

☆☆☆

موسموں کے کھیل جاری تھے، کبھی دھوپ کبھی چھاؤں اور کبھی بادل کبھی بارش۔ میں کھڑکی میں کرسی ڈالے بیٹھی تھی اور ہاتھوں میں دیوان غالب تھا جس کی ورق گردانی کر رہی تھی اور وہ ہمیشہ کی طرح بے نیاز بنا پیپرز کا طوفان پھیلائے بیٹھا تھا۔ بلب کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور ہمیشہ اسے دیکھ کر میرا دل دھڑکنا بھول جاتا تھا۔

"آج علیزے آئی تھی۔" میں نے سرسری انداز میں اس خاموشی کو توڑا تھا جو رات کے اس پہر ہمیشہ کی طرح موجود تھی۔ ساجد بلال کا چلتا ہاتھ اک پل کو رکا تھا، وہ مجھے دیکھتا رہا۔

"کیوں آئی تھی؟" اس سوال کا جواب کتنا تکلیف دہ تھا، یہ بات صرف اور صرف میں جانتی تھی۔

"مجھ سے ملنے آئی تھی۔"

"تم سے؟"

"ہاں، مجھ سے اور کچھ یاد دلانے بھی آئی تھی۔" میں یہ سب کہتے ہوئے کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے پین شاید رکھ دیا تھا۔

"مجھے یاد دلانے آئی تھی کہ ساجد بلال کی پہلی اور آخری محبت علیزے ہے۔" چند ثانیے خاموشی رہی تھی پھر ہنکارا ابھرا گیا تھا۔

"تم نے کیا جواب دیا؟"

"میرے پاس جواب تھا ہی نہیں۔" میں نے اپنے لہجے کو طنزیہ ہوتا محسوس کیا تھا۔

"تم بھی کہہ دیتیں کہ عائشہ، ساجد بلال کی پہلی اور آخری بیوی ہے۔" اب خاموش ہونے کی شاید میری باری تھی۔ میں نے اپنے لہجے کو بھیگتا محسوس کیا تھا۔ دیوان غالب میں نے سامنے میز پر رکھ دیا تھا۔

"یہ جو ہم لڑکیاں ہوتی ہیں ناں، بہت ہی چھوٹی سی عمر میں خواب بننے لگتی ہیں، کہانیاں پڑھنے لگتی ہیں اور انتظار کرتی ہیں کہ کب ہمارا شہزادہ، ہماری زندگی میں آنے والا شخص محبت کی کہانی سے نکل کر حقیقت کی کہانی میں قدم رکھے گا مگر کہانیوں میں تو جھوٹ ہوتے ہیں، فریب ہوتے ہیں اور ہم

لڑکیاں ان جھوٹوں کو فریبوں کو سچ سمجھ لیتی ہیں۔ میں نے بھی یہی کیا ایک ان دیکھے شخص سے محبت کر لی، جو میرا ہیرو تھا جو میرے لیے محبت کی کہانی سے نکلا تھا۔ اب جاکے سمجھ آیا کہ اس محبت کی کہانی کا تو میں ثانوی کردار تھی، مرکزی کردار تو آج میرے سامنے آیا۔ میں نے بھی فریب کھالیا، میں تو ساجد بلال کی ضرورت ہوں۔ ضرورتیں وزن میں بڑی ہلکی ہوتی ہیں، میری ذات بھی ہلکی ہی رہی۔ پہلے رونا آیا پھر ہنسی آئی کہ آپ کی زندگی میں، آپ کے دل میں آج بھی علیزے ہے۔ میں وہ راہ بھٹکنے والی شہزادی ہوں جو واپسی کا رستہ تو جانتی ہے مگر ابا کریم کی جنت کی چھ شہزادیاں اب بھی کنواریاں بیٹھی ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ کنواری ہی بیٹھی رہیں، میری کسی بات کا یہ مطلب اب مت لیجیے گا کہ آپ کی محبت حاصل کرنے کے لیے آپ کے گھر والوں کے آگے پیچھے پھرتی ہوں۔ ایسی کوئی بھی امید آج میں نے چھوڑ دی ہے، جو کچھ کر رہی ہوں اپنے لیے کر رہی ہوں کیونکہ مجھے مرتے دم تک اسی گھر میں زندہ رہنا ہے۔ دیواروں سے دوستی کرنے سے بہتر ہے اس گھر کے مکینوں کے دل جیت لوں۔ چاہے لاکھ آنکھ بچاؤں مگر ہر بار میرے سامنے دلوں کے معاملے ہی رکھ دیے جاتے ہیں۔" وہ بالکل میرے پاس آن کھڑا ہوا تھا، وہی خوشبو میرے اردگرد پھیل گئی تھی، میں کھڑکی کے پار آسمان پر کوئی تارا ڈھونڈنے لگی تھی، اس نے ریڈنگ ٹیبل سے دیوان غالب اٹھالیا تھا اور میری طرح ورق گردانی کرنے لگا تھا۔

"تمہاری ساری باتیں سچ ہیں، تم نے جو بھی کہا حقیقت ہے۔ ذرا بھی جھوٹ نہیں۔ رہی بات محبت کی تو یہ اختیار سے پرے کی چیز ہوتی ہے، اگر میں دوسری محبت کرتا تو تم سے کرتا مگر میں تمہاری دل سے عزت کرتا ہوں عائشہ! تم نے مجھے حیران کیا ہے تم ایک اچھی بیوی ہو۔ میں واقعی ایک خودغرض سا انسان ہوں مگر میں تم سے ایک آخری فیور چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے تم مجھے انکار نہیں کروگی۔" شاید واقعی اسے مجھ پر یقین تھا، میں نے آسمان کے وسط میں چمکتا ہوا وہ تارا ڈھونڈ لیا تھا اور پلٹ کر ساجد بلال کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"اس گھر کے مستقبل کے لیے، اس گھر کے افراد کے لیے، تمہارے لیے میں نے ایک فیصلہ کیا ہے امید ہے تم میرا ساتھ ضرور دوگی۔" وہ کس فیصلے کی بات کر رہا تھا، مجھے خدشات نے گھیر لیا تھا۔

"کیسا فیصلہ؟"

"میں بیرون ملک جارہا ہوں۔" اس نے ہولے سے میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ میرے لیے اس سے دوری کا سوچنا بھی سوہان روح تھا چاہے میں اس کی عزت تھی مگر وہ تو میری محبت تھا اور محبت تو دن کے پورے چوبیس گھنٹے آنکھوں کے سامنے چاہیے ہوتی ہے۔

"یہ گھر، امی، رخسار، نوشی اور عالیہ...... ان سب کو کس کے سہارے چھوڑ کر جارہے ہو؟ کون سنبھالے گا یہ سب کچھ؟" میری آواز ہرگز بھی میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ پہلی بار شاید میرے لیے مسکرایا تھا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"اللہ کے سہارے چھوڑ کر جارہا ہوں...... اور تم سنبھالوگی سب کچھ۔" اور میں نے صرف اس کی وہ "مسکراہٹ" دیکھی تھی جو میرے لیے تھی اور میں نے سر جھکا دیا تھا۔ کھڑکی بند ہوگئی تھی، باہر چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔ میں ننگے پاؤں باہر بھاگی تھی، برآمدے کے چھجے پر رکھا مچھلی ڈبا گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ وہ چار رنگ دار ننھی مچھلیاں میرے سامنے اس رات تڑپ تڑپ کر مرگئی تھیں اور میں چاہ کر بھی انہیں بچا نہ سکی تھی، مچھلی جل کی رانی تھی۔

☆☆☆

وہ چلا گیا تھا، کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔

نیوز چینلز پر زوروشور سے پروگرام ہوتے رہے کہ غیر قانونی طریقے سے بیرون ملک جانے والا گروہ وہیں ایئر پورٹ پر دھرلیا گیا تھا۔ ان ہی دنوں

میرے وجود میں اک اور ننھا وجود سانسیں لے رہا تھا۔ ایسی سرخ آندھی چلی تھی کہ سب کچھ تہس نہس ہو کر رہ گیا تھا، امی سے تو یہ خبر چھپالی گئی تھی مگر ہم چاروں اس شام پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں۔ اس دن ہم چاروں نے ایک دوسرے کو حوصلے دیے تھے، ایک سوال پھن پھیلائے ہمارے آگے کھڑا تھا، آگے کیا ہوگا؟

زندگی نے بساط الٹ دی تھی، ہر شام جیسے شام غریباں تھی مگر یہ جو انسان ہوتا ہے ناں، یہ ہر طرح کے حالات میں سمجھوتا کرنا سیکھ جاتا ہے شاید تب ہی تو اشرف المخلوقات کا درجہ پاتا ہے۔ ہر دستک پر اس کا گماں ہوتا تھا اور ہمارے سب گماں سچ کبھی نہ ہوئے تھے۔ زندگی ہمارے ساتھ کھیل رہی تھی، وہ تینوں ڈر کر مجھ سے لپٹ جاتی تھیں۔

"بھابھی...... بھیا کسی دن چپکے سے آجائیں گے ناں؟"

"ہاں......انہیں آنا ہوگا۔"

"آگے زندگی کیسے گزرے گی؟"

"اللہ کے سہارے چھوڑ کر گیا تھا اور اللہ سے بڑھ کر تو کوئی سہارا نہیں ہوتا ناں......" رات پھن پھیلائے آتی تھی۔

"ہم آپ کے پاس سو جائیں؟" میں ان تینوں کو مرغی کی طرح پروں میں سمیٹ لیتی تھی، امی کو راتوں کو اٹھ اٹھ کر دیکھتی تھی، بوڑھی آنکھوں کا انتظار کلیجہ پھاڑتا تھا۔

"عاشی...... کیا کہہ کر گیا تھا؟" میرے اندر کہیں ساون برستا تھا۔

"ہمارے لیے اچھی زندگی کے خواب دیکھ رہا تھا، کسی دن اچانک آئے گا اور آپ کی آنکھوں پر چپکے سے ہاتھ رکھ دے گا۔" بوڑھی آنکھوں میں آس کے دیپک جل اٹھے تھے۔

"سچ کہہ رہی ہو ناں، قسم کھاؤ؟"

"عاشی کے سر کی قسم۔" وہ غنودگی میں چلی جاتی تھیں۔ میں راتوں کو آنگن میں ٹہل رہی تھی اور ہر بار عالیہ کو اپنے ساتھ پاتی تھی۔

"بھابھی...... سب ٹھیک ہو جائے گا ناں؟"

وہ سرسوں سی لڑکی سیاہ پڑ جاتی تھی، میں اس کے دونوں ہاتھ تھام لیتی تھی۔

"عالیہ! ہم دونوں سب ٹھیک کرلیں گے۔" مرتی ہوئی آس تناور درخت بن جاتی تھی۔ ہم اکیلے نہیں تھے جس کے سہارے ساجد بلال ہمیں چھوڑ گیا تھا وہ ہمارے ساتھ ہے......اور وہی تو ہوتا ہے جب کوئی نہیں ہوتا۔"

مجھے اس کا انتظار تھا وہ کبھی تو لوٹے گا، وہ میرا دیس تھا میں اس دیس کی ملکہ تھی۔ گھر کی نیم پلیٹ "ستارہ اکیڈمی" سے سج گئی تھی، ہم نے گھر میں اکیڈمی کھول لی تھی۔ بہت سے بچے پڑھنے آتے تھے جنہیں میں اور عالیہ پڑھاتی تھیں۔ عالی اب بی۔ ایس کی طالبہ تھی اور نوشی، رخسار میٹرک میں تھیں۔ اریو کیریا اور بوگن ویلیا کی بیلوں پر اب بھی پھول آتے تھے، دیواروں کی سفیدی اکھڑی تو ہم تینوں نے نئے سرے سے دیواروں کو سفید رنگ میں رنگا تھا۔ ہم نے زندگی کو بہت مصروف کرلیا تھا، چاروں طرف شور ہی شور...... مگر راتیں ہم چاروں کی سر جوڑے ہی گزرتی تھیں۔

زندگی کے اس موڑ پر ابا اور اماں نے ہمارا بہت ساتھ دیا تھا، اگر ہم چاروں کے زندہ رہنے کی کوئی مشترکہ وجہ تھی تو وہ پانچ سالہ عمار ساجد تھا۔ جس دن اس نے دنیا میں آنکھ کھولی تھی، اسی شام امی نے ہمیشہ کے لیے دنیا سے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ مجھے آج بھی وہ زہریلی شام یاد تھی، اس دن گھر گھر کر بادل آئے تھے، میں دردِ زہ سے تڑپ رہی تھی اور ادھر عمار نے آنکھ کھولی اور اُدھر امی نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اس رات پہلی بار بلبوں کی زرد روشنی میں، میں نے رخسار اور نوشی کو غور سے دیکھا تھا اور میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

"یہ...... یہ کل کی بچیاں اتنی جلدی کیسے بڑی ہوگئیں؟" دیوار سے لگی پھوٹ پھوٹ کر روتی وہ

[illegible] مجھے اب خوف میں مبتلا کر گئی تھیں۔ میں نے وحشت کے عالم میں عالیہ کو جھنجوڑا تھا۔

"عالیہ......ان کے سر پر دوپٹے ڈالو۔"

زندگی میں پہلی بار میں نے دادی کی بات کو سوچا تھا جو وہ اکثر ابا سے کہتی تھیں۔

"کریم بخش......لڑکیاں بڑا بھاری بوجھ ہوتی ہیں، بانس کے پودوں کی طرح اٹھان پکڑتی ہیں۔"

ابا کے گھر سے تین راج کماریاں اپنے اپنے دیس جا چکی تھیں اور میرے آنگن کی راج کماریاں اٹھان پکڑ رہی تھیں۔ میں رخسار اور نوشی کو پاس بٹھا کر سمجھاتی تھی۔

"دوپٹے اچھی طرح اوڑھا کرو اور گلیوں سے گزرتے وقت نظریں نیچے رکھا کرو۔" زندگی کبھی کبھی ہمیں وقت سے پہلے بوڑھا کردیتی ہے۔ میرے آنگن کی وہ تینوں چڑیاں بوڑھی تھیں۔

"بھابھی...... ہم آپ کی عزت پر آنچ نہیں آنے دیں گے، آپ کا بھروسا کبھی نہیں ٹوٹے گا۔"

ان ہی دنوں وہ طرح دار سی کانچ کی گڑیا عرف علیزے آئی تھی، وہی کچن ٹیبل تھی، چائے کا کپ تھا اور ہم دونوں تھیں۔

"عاشی! تم نے تو ساجد بلال کے پیچھے اپنا آپ رول دیا، تمہارے ہاتھ کیا آیا؟" میں نے اٹھ کر کچن کی کھڑکی کھول دی تھی، صحن میں وہ تینوں بچوں کو پڑھا رہی تھیں۔ میں نے مڑ کر علیزے کو دیکھا تھا۔

"میرے ہاتھ کیا آیا......؟ میرے ہاتھ جنت آئی ہے، عائشہ کریم کی جنت۔ ان تینوں کو دیکھ رہی ہو، وہ تینوں میری جنت ہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ آج چائے کا کپ ویسے کا ویسا پڑا رہا تھا اور علیزے نے ایک گھونٹ تک نہ بھرا تھا۔

"ساجی کو تو تم سے محبت بھی نہ تھی تو پھر کیوں تم نے اس کے پیچھے اپنی زندگی برباد کردی عاشی؟" جانے کیوں مجھے لگا تھا کہ وہ سوال علیزے کے آنسو تھے، کھارے...... نمکین......

"اس کو مجھ سے محبت نہیں تھی مگر مجھے تو تھی ناں...... اور میری محبت کامل تھی علیزے! اس میں خود غرضی کا کھوٹ کیوں شامل کردیتی۔ ایک بات سے واقف ہوں اللہ اسے سلامت رکھے، آج اگر کہیں بھی ہوگا ناں نیند میں بھی میرا نام لیتا ہوگا اتنا یقین ہے مجھے۔" علیزے لڑکھڑائی تھی تب ہی کچن کے دروازے پر ننھے عمار ساجد نے قدم رکھا تھا اور اس نے علیزے کو مخاطب کیا تھا۔

"آنٹی! کیا آپ کو ہمٹی ڈمٹی والی پوئم آتی ہے؟" وہ عمار کی طرف جھک کر بیٹھ گئی تھی۔

"نہیں بیٹا! تمہاری آنٹی کو کچھ بھی نہیں آتا...... کچھ بھی نہیں۔" وہ آنسو چھپاتی باہر نکل گئی تھی اور مجھے یقین تھا وہ ہماری زندگی میں اب کبھی نہیں آئے گی۔

☆☆☆

نیلی جینز پر کالی شرٹ پہنے، ہیوگو باس میں نہایا وہ خوب صورت اور نروس سا لڑکا احمر علی تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے بیٹھا مجھے کافی کنفیوز سا لگا تھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"تو تم عالیہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" میں نے اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہوتے دیکھے تھے۔

"جی...... جی ہاں۔" میں نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا تھا جو اس نے شکریہ کے ساتھ تھام لیا تھا۔

"عالیہ سے کیوں شادی کرنا چاہتے ہو؟" وہ دلکش شخصیت کا مالک لڑکا مجھے پسند آیا تھا

"میں محبت کرتا ہوں عالیہ سے۔"

"عالیہ کو صرف محبت نہیں چاہیے احمر علی!" میری بات پر پہلی بار اس نے جھکا سر اٹھایا تھا۔

"جی......؟"

"صرف محبت سے بات نہیں بنتی، مجھے عالیہ کے لیے تم سے عزت بھی چاہیے۔" وہ ہولے سے

مسکرایا تھا۔

"عزت بھی کرتا ہوں میم!" میں نے کچھ سوچ کر اسے جواب دیا تھا۔

"اگلے اتوار اپنے والدین کو بھیجنا۔" خوشی سے بے قابو ہوتا وہ چلا گیا تھا اور جاتے جاتے ٹشو سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھنا وہ نہیں بھولا تھا۔

اگلے اتوار احمر علی کے والدین سے میں نے اور ابا نے ملاقات کر کے رشتے کے لیے ہاں کر دی تھی۔ ابا پہلے ہی ان کے بارے میں معلومات لے چکے تھے، وہ ایک متوسط طبقے کا عزت دار گھرانہ تھا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ میں جو "محبت" کی باتیں کرتی تھی آج میں نے عالیہ کے لیے "عزت" بھی چاہی تھی۔ زندگی کے سفر میں محبت اور عزت دونوں ضروری ہیں۔

رات کے وقت آنگن میں ٹہلتے ہوئے میں نے عالیہ کو روک کر اس کی ٹھوڑی اونچی کی تھی۔

"تم خوش تو ہو ناں عالیہ؟" وہ سرسوں سی روشن لڑکی میرے گلے لگ گئی تھی۔

"بھابھی! آپ نے جو ہمارے لیے کیا ہے، وہ کوئی بھی کسی کے لیے نہیں کرتا۔" میں نے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

"پگلی...... یہ تو میرا فرض تھا، میں نے تم تینوں میں اور اپنی بہنوں میں کبھی بھی فرق نہیں سمجھا۔ مجھے بہت اچھا لگا کہ تم نے احمر علی سے میری ملاقات کروائی۔ اپنی محبت کے سلسلے میں مجھ پر اعتبار کیا، وہ ایک اچھا لڑکا ہے تمہیں خوش رکھے گا۔" میں نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں، میں نے اپنا زیور عالیہ کو دے دیا تھا۔

"نہیں میں یہ کیسے لے سکتی ہوں۔" اس نے انکار کیا۔

"یہ سب تمہارا ہے عالیہ! میں دل سے دے رہی ہوں۔" رخسار اور نوشی کچن میں زردہ بنا رہی تھیں۔

"جانے بھیا کہاں ہوں گے؟" میرے دل سے جیسے ہوک سی اٹھی تھی۔

"عالیہ دعا کرو، جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔" میں دیوار پر لگے کلینڈر کی طرف آ گئی تھی۔

چھ سال ہو گئے تھے، جانے وہ کہاں تھا؟ کیسا تھا؟ کس حال میں تھا؟ میں کبھی بھی ان تینوں کے سامنے نہیں روئی تھی، میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ کمزور پڑ جائیں۔ میں رات کے پچھلے پہر اپنے "سہارے" کے سامنے سجدہ ریز ہو کر روتی تھی اور پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔ ان چھ سالوں میں اس نے مجھے کبھی بھی تو تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ ان تینوں کے سامنے میں پہلی بار عالیہ کی رخصتی سے ایک دن پہلے روئی تھی اور ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"میں نے پوری کوشش کی ہے کہ وہ وعدہ اچھے سے نبھاؤں جو میں نے تمہارے بھائی سے کیا تھا، اگر کہیں ذرا سی کوتاہی ہوئی ہو تو میری بہنوں! مجھے معاف کر دینا۔" میرے آنگن کی چڑیاں مجھ سے لپٹ گئی تھیں۔

"ایسا مت کہیں بھابھی! ہمیں شرمندہ مت کریں۔"

اگلی شام برقی قمقموں سے سجی ہوئی تھی، گیندے کے پھولوں کی مہک تھی اور دیواروں کی منڈیروں پر زندگی بیٹھی تھی۔ بنارسی جوڑے میں ملبوس وہ سرسوں سی روشن دلہن میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور اس کا سارا وجود لرز رہا تھا، رخسار اور نوشی میرے پیچھے زمین کی طرف دیکھتی بُت بنی کھڑی تھیں۔ برسوں پہلے کا منظر تھا مگر کردار بدل چکے تھے، میں نے ایک سرگوشی عالیہ کے دوپٹے سے باندھی تھی۔

"جہاں جا رہی ہو وہ تمہارا دیس ہے۔ تم وہاں کی ملکہ ہو گی، اپنی جنڈری رول دینا عالیہ! اگلے گھر کی اینٹ اینٹ سنوارنے میں اور اس گھر کے مکینوں کی دل جیتنے میں...... اب وہی گھر تمہارا ہے۔"

میرے آنگن کی ایک جنت دہلیز پار کر گئی تھی

اور باقی دو کو میں نے اپنے بازوؤں میں چھپا لیا تھا، عمار خالی کمروں میں عالیہ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

"مما! عالیہ کہاں ہے؟" وہ ان تینوں کو ان کے ناموں سے بلاتا تھا۔

"وہ اپنے گھر چلی گئی ہیں بیٹا!" میں نے سارے آنگن میں پھیلی اداسی کو دیکھا تھا۔

"ان کا گھر کہاں ہے؟ دور...... بہت دور۔"

"ہاں...... بہت دور۔" فرش پر ابھی تک گیندے اور گلاب کے مسلے ہوئے پھول پڑے تھے۔

"تم انہیں کیوں ڈھونڈ رہے ہو؟" میں نے نوشی کی آواز سنی تھی۔ عمار کہہ رہا تھا۔

"مجھے کہانی سننی ہے۔" وہ منہ بسور رہا تھا، رخسار نے اسے پکڑا تھا۔

"آؤ...... میں تمہیں سناؤں۔" عمار نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"رخسار سے نہیں سننی۔"

"ارے کیوں؟"

"رخسار ہمیشہ چوہوں والی کہانی سناتی ہے اور مجھے چوہے نہیں پسند۔" مجھے بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔

"اور عالیہ کون سی کہانیاں سناتی تھیں؟" وہ مسلے ہوئے گیندے اور گلاب کی پتیاں اکٹھی کرنے میں مگن تھا۔

"عالیہ تو فیری ٹیلز سناتی ہیں۔" میں چاہ کر بھی عمار ساجد کو نہیں سمجھا سکتی تھی کہ فیری ٹیلز سنانے والی وہ پری اب کبھی اس دیس واپس نہیں آئے گی۔ اس رات دیر تک ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہیں اور ہم وہیں سیڑھیوں پر بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ میری گود میں ہی سو گیا تھا، ہم تینوں کے چائے کے کپ سیڑھیوں پر پڑے تھے جن سے ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ بہار کی ایک گیلی سیلی شام تھی۔ پرندوں کے غول اپنے آشیانے کی طرف اڑے جا رہے تھے، ایروکیریا اور بوگن ویلیا کے پھول آنگن میں بکھرے ہوئے تھے۔ میں کچن میں کھڑی چائے دم پر رکھ رہی تھی، جب میں نے بیرونی دروازے پر دستک کی آواز تھی۔ وہ دستک تو جیسے کسی تھکے ہوئے مسافر کی تھی۔ میرا دل دھڑکنا بھول گیا تھا، کچن کی کھڑکی میں نے جھٹکے سے کھولی تھی، ہمیشہ کی طرح دروازے پر عمار ہی گیا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

"میرا نام عمار ہے...... آپ کا کیا نام ہے؟" جانے اس شخص نے کیا جواب دیا تھا۔ میں نے عمار کو اپنی طرف آتے دیکھا تھا۔

"مما...... کوئی انکل آئے ہیں۔" وہ مجھے ہمیشہ کی طرح ذمہ دار بنا مطلع کر رہا تھا۔

"کیا نام ہے ان کا؟" میں نے اپنے لہجے کو کپکپاتا ہوا محسوس کیا تھا۔

"ساجد بلال نام ہے۔" اور اس بہار کی شام نے شہزادی کے وجود سے ساری سوئیاں نکال دیں، میں پتھر ہو گئی تھی اور وقت تماش بین...... ہمیشہ وقت میرا تماش بین ہوتا تھا۔ میں بھاگ کر عمار کو اک طرف ہٹاتی صحن میں آئی تھی۔ میرے سامنے میری کہانی سے نکلا شہزادہ کھڑا تھا۔ وہ میرا پری زاد تھا، شادی کے دن میں اسے دیکھ کر پتھر ہوئی تھی اور آج پھر اس نے مجھے بُت کر دیا تھا۔ وہ ہر بار ایسا کرتا تھا، میں نے صحن کے بیچوں بیچ کھڑے ساجد بلال کو دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا تھا۔

"عاشی......" وہ بڑھی ہوئی شیو، کمزور سا شخص میرا محبوب تھا۔

میں نے وقت کے ہاتھوں میں جادو کی چھڑی دیکھی تھی، میں آخری سیڑھی پر کھڑی تھی، آٹھ سال دو ماہ کے بعد ہم آمنے سامنے تھے۔ وہ آستین سے آنسو پونچھتا لڑکھڑاتا ہوا میرے قریب آ گیا تھا۔ گزرے سالوں کی تھکن میرے آنسوؤں میں بہنے لگی تھی۔ ساجد بلال نے ایڑیوں پر کھڑے ہو کر میری پیشانی چوم لی تھی اور آٹھ سال دو ماہ ہمارے

درمیان سے غائب ہو گئے۔

"میں نے ہر فجر اور ہر شام تمہیں یاد کیا...... کیا میں تمہیں یاد آیا؟" اس سوال کی گنجائش تھی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ چوم لیے تھے۔

"میں نے آپ کو ہر وقت کے ہر لمحے میں یاد کیا۔"

عمار ہمارے پاس کھڑا حیرت سے تک رہا تھا، اس کے معصوم چہرے پر الجھن تھی۔

"یہ تمہارا بھانجا ہے؟" ساجد عمار کی طرف جھکا ہوا تھا۔

"یہ آپ کا بیٹا ہے۔" میں ہنستے ہنستے رو دی تھی۔

وہ فورِ جذبات سے چٹاچٹ عمار کو چومنے لگا اور بار بار پلٹ کر مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"عاشی! یہ ہمارا بیٹا ہے؟" میں نے بار بار اس کے اس سوال کی تصدیق کی تھی، مجھے وہ وقت کے چکر سے نکلا ہوا شخص لگا تھا۔

پچھلے تین گھنٹوں سے پلاسٹک بورڈ پر تاش کے پتوں کا گھر بناتی رخسار اور نوشی وہ گھر گرا بیٹھی تھیں۔ برآمدے کے فرش پر تاش کے پتے بکھر گئے تھے۔ وہ بھاگ کر بھائی سے لپٹ گئی تھیں، وہ دونوں کے ماتھے چوم رہا تھا۔

"عالیہ کہاں ہے؟"

"وہ بہت دور چلی گئی ہیں۔" جواب عمار کی طرف سے آیا تھا۔

"اس کی شادی کر دی ہے۔" میں نے ہولے سے کہا تھا۔ "اور اماں ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔" میں نے سسکی لی تھی، ساجد نے رخسار اور نوشی کو خود میں بھینچ لیا۔

وہ شام اس گھر میں آنے والی سب سے خوب صورت شاموں میں سے ایک تھی۔ وہ میرے پاس ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا تھا۔

"تم نے یہ سب کیسے کر لیا عاشی؟" وہ سوال میری زندگی تھا اور اس کا جواب ساجد بلال۔

"میں نے تمہاری محبت میں نہیں کیا، میں نے یہ سب اس لیے کیا کہ میرا فرض تھا اور مجھے ادا کرنا ہی تھا۔ یہ میرا گھر ہے اور اس گھر کے لوگ بھی میرے ہیں اور اپنے گھر اور گھر میں بسنے والوں کی تو جان دے کر بھی پروا کی جاتی ہے۔ میں نے تمہارے لیے نہیں کیا ساجی!"

وقت کی چال میں آیا وہ شخص ہمیشہ کی طرح بول رہا تھا اور میں سن رہی تھی۔

"کبھی کبھی جو کچھ ہم سوچتے ہیں وہ ہوتا نہیں، میرے ساتھ بھی نہیں ہوا۔ میں تم سب کے لیے یہ گھر چھوڑ کر بیرون ملک گیا تھا، میرا طریقہ غلط تھا اور غلط راستے زندگی برباد کر دیتے ہیں۔ جیل میں گزرے یہ آٹھ سال مجھے کبھی نہیں بھولیں گے۔ ان آٹھ سالوں میں اگر میں نے اللہ کے بعد کسی کو یاد کیا ہے تو وہ تم ہو۔ ان آٹھ سالوں میں، جانے کیسے تمہیں سوچتے سوچتے میں تم سے محبت کر بیٹھا، مجھے تم سے محبت ہو گئی عاشی!" میرا دل دھڑکنا بھول گیا تھا، مجھے اماں کی بات یاد آ گئی تھی۔

"جندڑی رول دے عاشی! تب ساجی کے دل کی کنجی ہاتھ لگے گی۔"

اور اس رات میں نے سوچا تھا میں تو صرف عزت کے سہارے جی رہی تھی ناں تو میرے حصے میں "محبت" کیسے آ گئی؟

"جب آپ ہر رشتے کو عزت، مان اور محبت دیتے ہیں تو یہ سب جذبے پلٹ کر ہمیں واپس ضرور ملتے ہیں۔" وہ میری گود میں سر رکھے سیڑھیوں پر ہی سو گیا تھا۔

"بہت تھک گیا ہوں عاشی! زندگی نے تھکا دیا ہے۔" میں نے اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں گھمائیں۔

"زندگی آگے ہمارے لیے خوشیاں لے کر کھڑی ہے۔" پھولوں کی خوشبو فضا میں ٹھہر گئی تھی۔

"تم نے میرے لیے، میرے گھر والوں کے لیے اتنا کچھ کیا۔"

"میں نے ہمارے لیے یہ سب کیا۔"

"تمہیں ڈر نہیں لگا؟"

"بہت ڈری ہوں ان کالی راتوں میں مگر جس کے سہارے چھوڑ گئے تھے ناں...... اس نے ہر رات، ہر لمحہ، ہر پل میرا ساتھ دیا۔"

"کیا مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے؟" وہ سر اٹھا کر پوچھ رہا تھا میں نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"شکریہ کی ضرورت نہیں۔" میرے دل میں اک خدشے نے سر اٹھایا تھا۔

"ساجی......؟"

"ہوں......"

"تم کہیں اس وجہ سے تو مجھے محبت کا نہیں کہہ رہے کہ تمہارے جانے کے بعد میں نے یہ سب کیا۔"

میرے خدشے پر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی، بہار کے پھولوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ ساجد بلال نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"میری آنکھوں میں دیکھو...... اپنے آپ کو دیکھو، تم نے مجھے حیران کیا ہے۔ تم ایسی ہو کہ تم سے تمہاری وجہ سے محبت کی جائے۔"

میں اپنے محبوب کے لیے محبتوں کی شاعرہ کی غزل گنگنانا چاہتی ہوں تاکہ ہم پچھلے آٹھ سالوں کی تھکن بھول کر بہار کی اجلی صبح کا نیا سویرا دیکھیں۔

سبز موسم کی خبر لے کے ہوا آئی ہو
کام پت جھڑ کے، اسیروں کی دعا آئی ہو
لوٹ آئی ہو وہ شب جس کے گزر جانے پر
گھاٹ سے پائیلیں بجنے کی صدا آئی ہو
اسی امید میں ہر موج ہوا کو چوما
چھو کے میرے پیاروں کی قبا آئی ہو
گیت جتنے لکھے ان کے لیے اے موج صبا!
دل یہ ہی چاہا کہ تو ان کو سنا آئی ہو
آہٹیں صرف ہواؤں کی دستک نہ بنیں
اب تو دروازوں پر مانوس صدا آئی ہو
یوں سر عام، کھلے سر میں کہاں تک بیٹھوں
کسی جانب سے تو اب میرا ردا آئی ہو
جب بھی برسات کے دن آئے، یہ ہی چاہا
دھوپ کے شہر میں بھی گھر کے گھٹا آئی ہو
تیرے تحفے تو سب اچھے ہیں مگر، موج بہار
اب کے میرے لیے خوشبوئے حنا آئی ہو

☆☆



راشدہ رفعت

جیسی ماں ویسی

پورے چار مہینے بعد دادی گھر واپس آرہی تھیں۔ ارحم کی شادی پر چھوٹی پھوپھو آئیں تو زبردستی انہیں اپنے ساتھ پنڈی لے گئیں۔

"صرف بھائی جان ہی آپ کی اولاد نہیں ہیں اماں!

ہم بیٹیوں کی بھی ماں ہیں۔ آپ دس برس پہلے عروہ کی پیدائش پر آپ میرے ہاں آئی تھیں پھر تو نہ آنے کی قسم ہی کھالی۔ بس اب میں آپ کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔ خیر سے آپ کے لاڈلے پوتے کی شادی بھی نمٹ گئی ہے۔" پھوپھو نے ماں پر مان بھری دھونس جمائی تھی۔ دادی نے بھی اس بار بیٹی کا دل توڑنا مناسب خیال نہ کیا اور ان کے ساتھ جانے پر راضی ہوگئیں۔ دو ماہ وہ چھوٹی پھوپھو کے پاس پنڈی رہی تھیں۔ پھر منجھلی پھوپھو نے ذیشان کو انہیں لینے بھیج دیا۔

"جب چھوٹی کے پاس اتنے دن رک گئیں تو میرا کیا قصور اب آپ نے میرے ہاں قیام کرنا ہے۔" سو یوں دادی منجھلی پھوپھو کے پاس لاہور پہنچ گئیں۔ وہاں بھی دو ماہ قیام کیا۔ منجھلی پھوپھو تو ابھی دادی کو مزید روکنا چاہ رہی تھیں ذیشان کے لیے لڑکی ڈھونڈو مہم جاری تھی اور انہیں اس مرحلے پر جہاندیدہ ماں کی رہنمائی درکار تھی۔ خود دادی کا بھی یہاں دل لگا ہوا تھا لیکن پھر اچانک ہی انہوں نے جانے کا فیصلہ کرلیا۔

"بس آپ خیر سے ذیشان کی شادی پر ہی آؤں گی۔ بہت دن رہ لی یہاں۔ اب رضا کے بچے یاد آرہے ہیں۔"

"ہاں جی بھیا اور بھیا کے بال بچوں میں تو جان ہے آپ کی اب فیصلہ کرلیا ہے تو بدلیں گی تھوڑی۔ ذیشان سے کہتی ہوں ٹکٹیں کروالے چھوڑ آئے گا آپ کو۔" پھوپھو نے ماں کو زبردستی روکنا مناسب خیال نہ کیا۔ یوں پورے چار مہینے بعد دادی گھر لوٹی تھیں۔ پوتے، پوتی دادی کو چمٹ گئے تھے اور ان سے کہہ دیا تھا کہ آئندہ وہ اتنے دنوں کے لیے کہیں جانے کا سوچیں بھی مت۔ دادی مسکراتی رہیں۔ کرن خوش گوار حیرت کے ساتھ دادی اور پوتے، پوتیوں کا لاڈ پیار دیکھتی رہی۔

"ارے دُلہن تم وہاں دور کیوں کھڑی ہو۔ پاس آؤنا۔" دادی کی نگاہ اس پر پڑی تو محبت سے اسے پاس بلایا۔ وہ جھجکتے شرماتے ان کے قریب جاکر بیٹھ گئی۔

"اور خوش تو ہو، دل لگ گیا یہاں پر، اماں باوا خیریت سے ہیں تمہارے۔" دادی نے پوتے کی نئی نویلی دُلہن سے ایک ہی سانس میں کئی سوال کرڈالے۔ کرن کو یہ فرینڈلی سی دادی بہت اچھی لگیں۔ خود اس کی نانی، دادی تو اس کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی اللہ کو پیاری ہوچکی تھیں سو وہ ان مٹھاس بھرے رشتوں سے ناواقف تھی۔ اسے دادی سے مل کر بہت اچھا لگا۔ کھانے کی میز پر دادی نے اس کے ہاتھ کے بنے مٹر قیمہ اور فیرنی کی بھی خوب ہی تعریف کی بلکہ انعام کے طور پر اسے دوسو روپے سے بھی نوازا۔ کرن نہال ہوگئی لیکن دو چار دن گزرنے کے بعد اسے محسوس ہونے لگا کہ سب کے ساتھ دوستانہ مزاج رکھنے والی دادی کا برتاؤ اپنی بہو یعنی کرن کی ساس کے ساتھ اتنا دوستانہ نہیں بلکہ وہ اپنی بہو پر تنقید کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھیں حالانکہ کرن کی ساس میمونہ بیگم خاصی بھلی مانس

خاتون تھیں۔ شادی کے بعد ان چار مہینوں میں انہوں نے کرن کے ساتھ مثالی رویہ اختیار کیا تھا۔ کرن بھی ان کا دلی احترام کرتی تھی لیکن اب دادی اس بات کا لحاظ کیے بنا کہ میمونہ خود ساس بن چکی ہیں ان کی بہو کے سامنے ہی انہیں کسی نہ کسی بات پر ٹوک دیتیں۔ میمونہ آنٹی کی بے چاری سی شکل دیکھ کر کرن خود عجیب سی خفت میں مبتلا ہوجاتی۔

اس روز کرن کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھی جب میمونہ آنٹی ساس کے لیے، چائے بنانے کچن میں آئیں۔ ذرا دیر بعد ہی دادی بھی ان کے پیچھے چلی آئیں۔

"بہو چائے بنانے لگی تھیں یا پائے۔" انہوں نے طنز کیا۔

"بس اماں لا ہی رہی تھی۔" میمونہ ذرا دھیرے سے بولیں یقیناً بہو کے سامنے اس عزت افزائی نے انہیں خفیف سا کردیا تھا۔

"اور میمونہ یہ تم نے کچن کا کیا حشر کردیا ہے۔ چار مہینے میں اس گھر سے کیا دور رہی گھر کا تو ستیاناس ہی ہوگیا۔" دادی نے مزید کڑے تیور اپنائے۔

"کیوں اماں اب ایسا بھی کیا ہوگیا۔" اس بار میمونہ بھی ذرا خفا ہوکر بولیں۔ "لو بھلا اب ایک ایک چیز کا میں بتاؤں، تمہاری تو جیسی آنکھیں نہیں ہیں۔ چولہا دیکھو چکنائی سے اٹا پڑا ہے۔ سلیب کا بھی یہ ہی حشر ہے۔ کل رات کو میں نے اپنے ہاضمے کا چورن ڈھونڈنے کے لیے کیبنٹ کھولا تو چکرا کر رہ گئی اس بے ترتیبی سے چیزیں ٹھونس رکھی تھیں کہ حد نہیں اور صرف ایک، کیبنٹ پر کیا موقوف، ساری کیبنٹیں الم غلم سامان سے بھری پڑی ہیں۔ فریج کا دروازہ کھولتے ہی عجیب ناگواری سی مہک آرہی ہے۔ کئی، کئی دن کے باسی سالن فریج میں پڑے ہیں اور ارایہ فریج کا دروازہ تو باہر سے دیکھو کتنا میلا ہورہا ہے۔ فروٹ اور سبزیوں کی باسکٹ میں بھی تازہ اور پرانا فروٹ ایسے گتھم گتھا ہوئے پڑے ہیں کہ



گلے سڑے پھلوں کی مہک کی وجہ سے تازہ پھل کھانے کو بھی جی نہیں مانتا۔" دادی نے تو گویا ایک ہی سانس میں چارج شیٹ پڑھ کر سنادی۔

"بس اماں پچھلے دنوں جوڑوں کے درد نے عاجز کر رکھا تھا بس اس لیے ان چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کی طرف دھیان نہیں گیا۔" میمونہ شرمندہ سی ہوکر بولی تھیں۔

"ارے بس کرو بہو بیگم! ہم جیسے جانتے نہیں تمہیں۔ پہلے بھی میں ہی تمہارے پیچھے پڑکر، کہہ سن کر یہ کام کرواتی تھی۔ تم خود کتنی سگھڑ اور سلیقہ مند تھیں ہمیں خوب علم ہے۔ اب مان لیا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تو خیر سے کسی سے کہہ سن کر تو یہ کام کرواسکتی ہو۔ ایسی فرمانبردار بہو ملی ہے تمہیں۔ اللہ اسے خوش رکھے۔ کسی دلجمعی سے کھانا بناتی ہے۔ ذائقے دار اور لاجواب، بچی ابھی کم عمر ہے۔ گھر داری کے دوسرے جھمیلوں کا اسے کیا علم، پڑھائی کا سلسلہ ختم ہوتے کے ساتھ تو اس کی شادی کی تاریخ ٹھہرادی گئی تھی۔ تمہیں چاہیے تھا قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرتیں۔ ارے اپنا وقت بھول گئیں کیسے ہم نے تمہیں گھرداری کی نزاکتیں سمجھائی تھیں۔ ماں کے

گھر سے کیا سیکھ کر آئی تھیں تم کھانا پکانا۔ سینا پرونا۔ سلیقہ، قرینہ، سب کچھ میں نے سکھایا کہ نہیں۔" دادی کڑے تیوروں سے استفسار کرتے ہوئے انہیں بیتا وقت بھی یاد کروا رہی تھیں۔

"اچھا اماں اب بس بھی کریں۔" میمونہ بہو کے سامنے اس عزت افزائی، پر یقیناً شرمندگی محسوس کر رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے میں تو بس کہے دیتی ہوں لیکن تم بھی اپنی ذمہ داری پہچانو۔ بہو کو پرایا مت سمجھو۔ بیٹی سمجھ کر اس کی تربیت اور رہنمائی کرو۔ ایسے اچھے مزاج کی بچی ہے۔ اگر کسی تیز طرار لڑکی سے پالا پڑتا تمہیں پتا چلتا۔" دادی نے فراخ دلی سے کرن کی تعریف کی تھی۔ وہ جھینپ کر رہ گئی۔

چائے کا کپ لے کر دادی کچن سے نکلیں تو میمونہ نے سکون کا سانس لیا۔ پھر بہو کی طرف مڑیں۔

"بیٹا آج کڑھی بنانے کا پروگرام ملتوی کردو۔ کافی ٹائم لگ جائے گا۔ مونگ کی دال بنالینا جلدی سے بن جائے گی۔ پھر ہم ماں، بیٹی مل کر ذرا کچن کی تفصیلی صفائی کرلیتے ہیں۔ اماں کے مزاج کا تو تمہیں اندازہ ہوگیا ہوگا۔ صفائی ستھرائی کے معاملے میں ذرا وہمی ہیں اور خصوصاً باورچی خانہ تو انہیں لشکتا، چمکتا ہی چاہیے ہوتا ہے۔ پھر دوبارہ کوئی مین میکھ نکالیں ہم کچن چمکا ہی کیوں نہ لیں۔" انہوں نے بہو کو دوستانہ انداز میں مخاطب کیا۔

"امی آپ آرام کریں۔ میں کرلوں گی خود۔ کرن نے انہیں منع کرنا چاہا۔ "ارے تم کب تک لگو گی۔ میں تمہاری ہیلپ کروا دیتی ہوں۔ انہوں نے رسانیت سے بہو کو مخاطب کیا پھر کرن کو ساتھ لگا کر کچن تفصیلی صفائی میں جت گئی تھیں۔ ڈھائی تین گھنٹوں کی محنت کے بعد کچن لشکارے مار رہا تھا۔

"آج تو تفصیلی صفائی کی وجہ سے اتنی دیر لگ گئی۔ آئندہ ہم ماں، بیٹی ساتھ کے ساتھ ہی پھیلاوہ سمیٹ کر ہر چیز طریقے، سلیقے سے رکھ لیں گے۔ اماں کو اعتراض کا موقعہ ہی کیوں ملے۔ تمہاری تو خیر ہے تم ان کے لاڈلے پوتے کی دُلہن ہو لیکن میری گوشمالی کرتے ہوئے وہ منٹ نہیں لگاتیں۔" میمونہ نے مسکرا کر بہو کو مخاطب کیا۔ اس نے فرمانبرداری سے اثبات میں سر ہلادیا۔ جی ہی جی میں ساس پر ترس بھی آیا اس عمر میں بھی وہ اپنی ساس سے کتنا ڈرتی تھیں۔

☆☆☆

رات کو جب سب اہلخانہ سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے تو میمونہ نے دو کپ چائے بنا کر ساس کے کمرے کا رخ کیا حسب توقع وہ جاگ رہی تھیں اور میمونہ کی ہی منتظر تھیں۔

"یہ لیں اماں گرم گرم چائے۔" انہوں نے ساس کو محبت سے مسکرا کر دیکھا اور انہیں چائے کا کپ دے کر خود بھی ان کے بستر میں بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لینے لگیں۔

"بس اتنی سی بات خوامخواہ تم نے ہوا بنا رکھا تھا"۔ دادی نے مسکرا کر انہیں مخاطب کیا۔

ارحم کی شادی کے بعد دادی فوراً یہاں سے چلی گئی تھیں انہیں نئی دُلہن کے رنگ، ڈھنگ، دیکھنے کا موقعہ ہی نہ مل سکا۔ بعد میں میمونہ سے جب بھی بات ہوئی وہ کچھ بجھی بجھی سی لگیں۔ دادی کے کریدنے پر وہ ہمیشہ کی طرح دل کی بات ان سے چھپا نہ پائیں۔

"ارحم کی دُلہن کی وجہ سے پریشان ہوں اماں"۔ ٹھنڈا سانس بھر کر انہوں نے جواب دیا۔

"ہائیں کیا ہوا شکل سے تو بچی بھولی بھالی لگتی تھی۔ کیا ابھی سے ہی پر پرزے نکالنے شروع کردیے۔" دادی بھی فوری تشویش میں مبتلا ہوئیں۔

"ارے نہیں اماں مزاج کی تو اچھی ہے۔ باادب اور فرمانبردار لیکن ذرا بھی سلیقہ مند نہیں خوشی خوشی کچن کا چارج تو سنبھال لیا۔ کھانا بھی اچھا بنالیتی ہے لیکن کھانا بنانے کے سوا باورچی خانے سے کوئی سروکار نہیں۔ اب باقی گھر میں تو صفائی کے لیے ماسی آتی ہے میں ماسی کے سر پر کھڑے ہو کر صفائی کرواتی ہوں۔ باقی گھر چمکتا دمکتا رہتا ہے اور کچن میں داخل ہوتے کے ساتھ ہی جی الٹ جاتا ہے۔ میں خود سے کچن کی صفائی ستھرائی کرتے ڈرتی ہوں کہ کہیں کرن یہ نہ سمجھ لے کہ میں اسے اس کی بدسلیقگی جتا رہی ہوں اور وہ خود بھی مجھے کچن میں نہیں گھسنے دیتی۔ چائے بنانے بھی چلی جاؤں تو کہتی ہے امی آپ بیٹھیں میں دو منٹ میں چائے بنا کر لائی۔ اپنی دانست میں تو بے چاری نے خوش اسلوبی سے کچن کی ذمہ داری اٹھائی ہوئی ہے۔ میں اسی شش و پنج میں مبتلا ہوں کہ اگر اسے کوئی طریقہ، قرینہ سکھاؤں تو یہ نہ سمجھے کہ ساس نکتہ چیں ہے اور ابھی سے ہی کاموں پر ٹوکنے لگی۔ خوش مزاج لڑکی ہے لیکن ہے تو نئی نسل کی نمائندہ اور آج کل کے بچوں میں برداشت کا مادہ ذرا کم ہوتا ہے۔ گھر کے سکون کی خاطر فی الحال تو لب سیے ہوئے ہوں لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ میرا ذہنی خلجان بڑھتا جارہا ہے"۔ میمونہ نے بے بس سے لہجے میں سب کچھ کہہ سنایا تھا۔

"ارے بہو تمہیں تو بلاوجہ پریشان ہونے کی عادت ہے۔ میں بس واپس آرہی ہوں۔ پھر نکالتی ہوں تمہاری پریشانی کا کوئی حل۔" اکلوتی لاڈلی اور چہیتی بہو کی پریشانی اماں سے برداشت نہ ہو پائی تھی۔ میمونہ نے زندگی بھر انہیں ماں کا رتبہ دیا تھا تو دادی نے بھی ان پر ہمیشہ شفقت لٹائی تھی۔ وہ ان کے اکلوتے نورِ نظر کی شریک حیات تھیں، اس حوالے سے دادی کو عزیز تر تھیں تو اپنی تابعداری اور فرمانبرداری کی وجہ سے بھی شوہر کے ساتھ ساتھ انہوں نے ساس کے دل پر بھی راج کیا تھا۔

بیتے برسوں میں انہوں نے اس گھر کو امن و سکون کا گہوارا بنا کر رکھا تھا۔ بچوں کی بے مثالی تربیت کی تھی۔ پھر بہت ارمانوں سے اپنے بڑے بیٹے کے سر پر سہرا سجایا تھا۔ بیٹے کی شادی کے بعد وہ بہو کے طرزِ عمل سے کچھ پریشان تھیں تو دادی سے ان کی پریشانی برداشت نہ ہو پائی۔ وہ فوراً واپس آئی تھیں۔ یہاں پہنچ کر بہو کے بیان کی صداقت خود بھی جانچ لی۔

کرن کی ماں نے یقیناً بیٹی کو امور خانہ داری میں اس حد تک طاق کردیا تھا کہ وہ کھانا بہترین پکاتی تھی لیکن سگھڑاپے کے متعلق کوئی شعور نہ دیا تھا۔ میمونہ بے بنیاد خدشات سے خائف ہو کر بہو کی تربیت کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھیں، تب دادی نے عقل لڑائی اور کس خوبی سے بہو کا مسئلہ حل کر ڈالا تھا۔

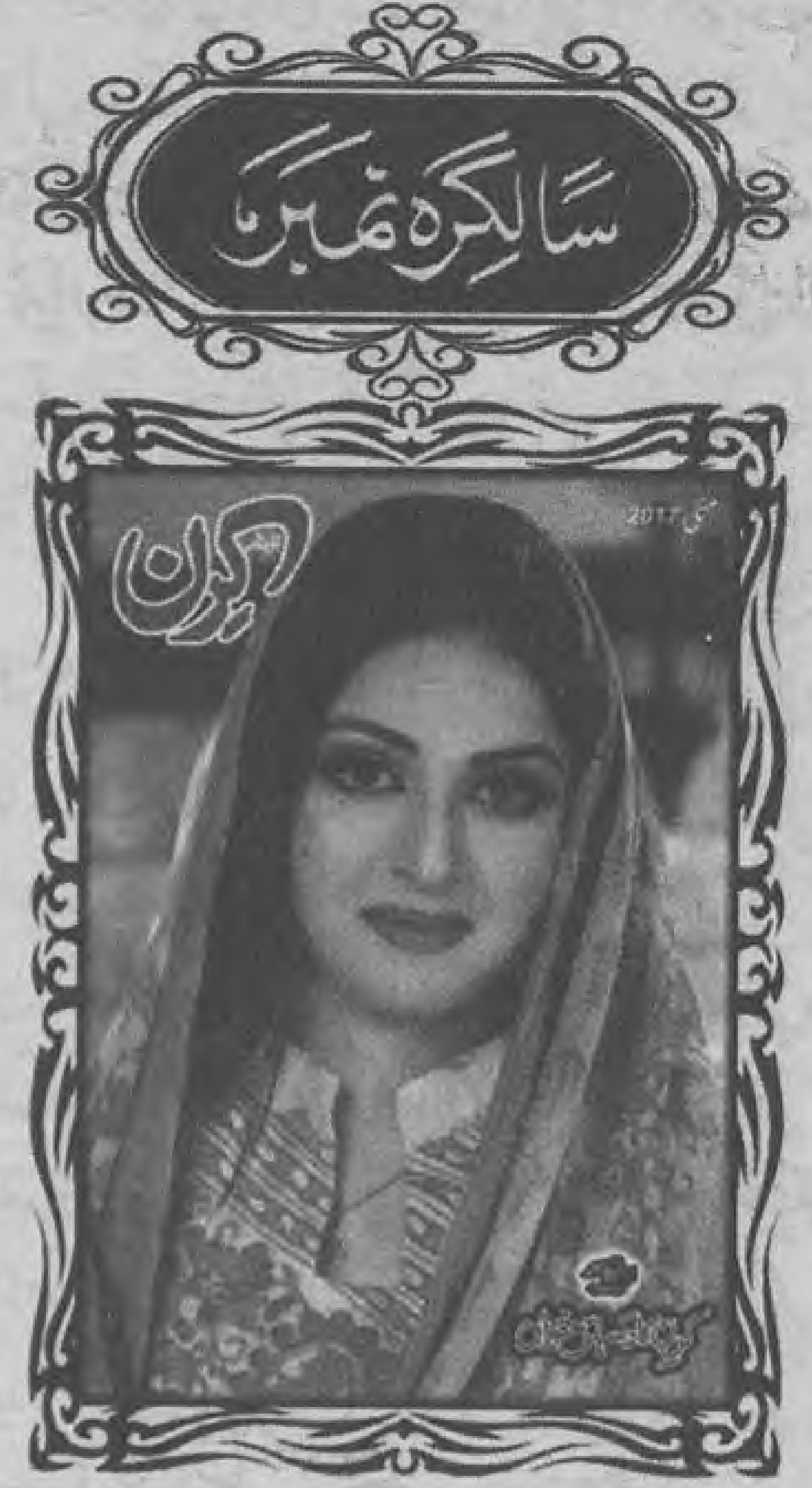
"آپ جیسی عقل مجھ میں کہاں اماں۔ مجھے تو اس عمر میں بھی زندگی کے ہر قدم پر آپ کی رہنمائی درکار ہے۔ اللہ آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سر پر سلامت رکھے۔" ان کے کہنے پر دادی مسکرائی تھیں۔ "ایک دن یہ الفاظ تمہاری بہو بھی تمہارے لیے کہے گی۔ اتنا یقین رکھو کہ اس بچی کے ساتھ ہمیشہ پرشفقت رویہ اپناؤ گی تو بدلے میں بھی ہمیشہ عزت واحترام ہی ملے گا۔ باقی پریشان مت ہو اس گھر کے رنگ، ڈھنگ وہ وقت کے ساتھ سیکھ ہی لے گی۔" انہوں نے بہو کو تسلی دی۔ میمونہ نے مطمئن انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا تھا اور اپنے بیڈ روم میں نائٹ کریم کا مساج کرتے ہوئے کرن ارحم کو آج کے دن کی روداد سنا رہی تھی۔

"دادی سب کے ساتھ کتنی مہربان ہیں لیکن انہوں نے امی کی جوانی میں انہیں ضرور بہت ٹف ٹائم دیا ہوگا۔" کرن کی بات پر ارحم نے حیرانی سے اسے دیکھا وہ اس کی غلط فہمی رفع کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی ماں اور دادی کی بے مثال انڈر اسٹینڈنگ کے بارے میں بتانے والا ہی تھا کہ کرن نے جزئیات کے ساتھ آج کا قصہ کہہ سنایا تھا ارحم نے بہت مشکل سے مسکراہٹ ضبط کی۔ وہ ذہین دادی کا ذہین پوتا تھا۔ بیوی کی غلط فہمی دور کرکے دادی کی پلاننگ برباد کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

"چلو امی نے تو جیسے تیسے وقت گزار لیا۔ تم کوشش کرکے دادی کی گڈ بکس میں جگہ بنالینا۔ امی یقیناً تمہیں گائیڈ کرتی رہیں گی۔" اس نے بیوی کو مشورے کے ساتھ تسلی بھی دی۔ کرن نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆

سالگرہ نمبر



مصباح علی سید

محورِ آشتی

مکمل ناول

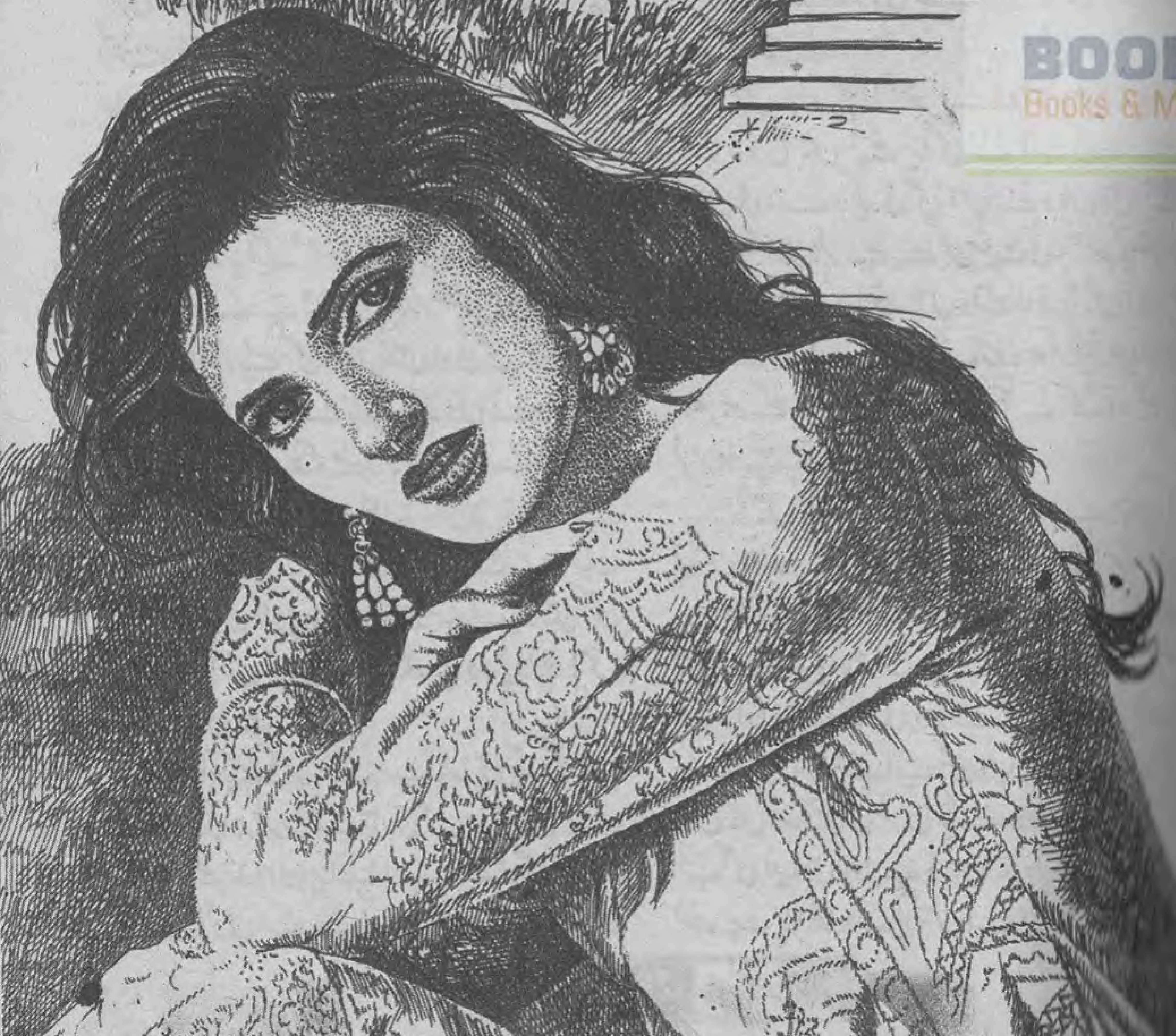
ازمیر اور مریم آسٹریلیا کے شہر وکٹوریہ میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی روائیبہ شادی کے گیارہ سال بعد پیدا ہوئی۔ غیر معمولی خوب صورت اور معصوم روائیبہ کی سالگرہ جندب نے وہاں کے مشہور نیشنل گرین فورسٹ میں ارینج کی۔ جندب ازمیر کے پرانے دوست رضا حیات کا بیٹا ہے۔ جو آسٹریلیا میں پڑھ رہا ہے' جندب اور روائیبہ کی پرخلوص دوستی ہے۔ جندب اسے پسند بھی کرتا ہے' مگر اظہار نہیں کرتا۔

میرز کا فیصل آباد کے نواحی گاؤں میں مانے ہوئے زمیندار اور اہم سیاسی شخصیت ہیں۔ بیوی وفات پاچکی ہے۔ ان کے دو بیٹے خیام زکا' حنبل زکا ہیں۔ خیام کی دو بچے اعشال اور اذلان ہیں۔ ان کی بیوی آئمہ روایتی زمینداری اور حویلی پر حکمران ہیں۔ میرز کا کی والدہ ماں جان فالج کی مریضہ ہیں۔

زینب حویلی میں جدی پشتی خدمت گزار ہے' لیکن حنبل کی پرکشش شخصیت کے سحر میں بری طرح جکڑی ہے اسی لیے اپنے ہر آنے والے رشتے کو ٹھکراتی رہتی ہے۔

بارہویں اور آخری قسط





باریک شیفون کی پاؤں تک آتی سلیولیس سفید میکسی' سفید جالی کے سلور کٹ ورک کے ساتھ سجے دستانے تھے جو اُس نے ہاتھوں سے کہنیوں تک چڑھا رکھے تھے۔ لمبا سا سفید دوپٹا جس کی آرائش میں سلور اسٹونز جا بجا لگے تھے، کچھ اس سے ہم آہنگ ایک حجاب سا تھا جس سے اس نے میک اپ سے مزین چہرہ چھپانے کی کوشش کر رکھی تھی بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا اس حجاب نے اس کے ڈھکے چھپے حسن کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ سرخ لپ اسٹک سے بھرے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلے' نیلی آنکھوں میں سیاہ کاجل کی لائن کسی گہرے خواب کی طرح چمکتی' اس کی گردن میں پڑی نگینے والی چین سے زیادہ دلکش لگ رہی تھی۔

سیاہ ڈریس سوٹ میں ملبوس سیاہ فام اسمتھ معمول سے ہٹ کر دلکش لگ رہا تھا' اس کے دل میں بھری شفاف محبت اس کی رنگت پر چھا گئی تھی' اپنی دلہن میرڈین کا ہاتھ پکڑے وہ بہت فخر اور اعزاز کے ساتھ اپنے احباب کے درمیان سے گزرتا اسٹیج پر کھڑے پاپ کی جانب بڑھ رہا تھا۔

اسی چرچ میں پاپ نے بہت سے بندھن باندھے تھے' یہ ایک معمول تھا لیکن اس جوڑے کے قول و قرار کے لہجے میں جس قدر لفظوں کی سچائی کی حرارت تھی وہ پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ دونوں کو مبارک باد دیتے ہوئے پاپ کے دل سے دعائیں نکلی تھیں۔ اسمتھ کے میرڈ رنگ پہناتے ہی بے ساختہ میرڈین کے منہ سے نکلا۔

''تھینک یو۔'' اور اس کے کندھے پر سر ٹیک لیا۔ احباب کی بھرپور تالیوں اور مبارک باد میں بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسمتھ پر وہ پورا پورا حق حاصل کر چکی ہے۔

چھ ماہ پہلے کی بات تھی سب کچھ اپنی جگہ صحیح جا رہا تھا' شادی کی ہر طرح سے تیاری مکمل ہو چکی تھی یہاں تک کہ طے شدہ دن پر اپنے احباب کو مدعو بھی کر چکے تھے۔ انسانوں کے طے ارادوں سے کیا ہوتا ہے' وقت تو اللہ کے ہاں طے ہوتے ہیں اور اللہ کے ہاں طے وقت وہ نہیں تھا۔ اسمتھ حسب معمول اپنے ہوٹل پیزا ہٹ پر مصروف تھا۔ دن بہ دن بڑھتی گہما گہمی کے سبب رات کو بہت بہت دیر اسے وقت دینا پڑتا تھا، اس دن بھی آدھی رات سے زیادہ وقت بیت چکا تھا جب تین کسٹمرز داخل ہوئے تھے' سفید فام مگر لمبے چوڑے مضبوط جثے کے مالک تھے۔ کچھ دیر بیٹھ کر کھانے کا آرڈر دیا پھر ٹہلنا شروع ہو گئے۔ ان میں سے ایک تانک جھانک کرتا کچن کی جانب بڑھ گیا تھا۔ دوسرا اسمتھ سے ملنے اس کے آفس میں گھس گیا اور تیسرا باہر لاؤنج میں الرٹ بیٹھا رہا' آفس والے نے ہی گڑبڑ شروع کی تھی۔ اسمتھ پر گن تان کر زیادہ سے زیادہ کیش کی ڈیمانڈ کر رہا تھا جب کہ کچھ دیر پہلے ہی اسمتھ بینک (اے ٹی ایم) ہو کر آیا تھا' جس پر تلخ کلامی ہونے لگی۔ اسمتھ نے غصے میں اس کے منہ پر کھینچ کر تھپڑ مارا پھر ریی کھاتے ہوئے اس کے ہاتھ سے گن چھین لی۔

اس سے پہلے اسمتھ اسے ڈراتا' دھمکاتا یا فائر کرتا لاؤنج میں بیٹھے ساتھی نے اندر کی کارروائی گلاس ڈور سے دیکھ لی تھی' اس نے وہاں ہی بیٹھے بیٹھے غیر محسوس طریقے سے گن سیٹ کی' اسمتھ کا نشانہ لے کر فائر کھول دیا تھا۔ اس وقت لاؤنج میں اکا دکا افراد تھے' دو چار ویٹرز جو خوف زدہ ہو کر خود ہی ادھر اُدھر ہو گئے۔ موبائل پولیس کے آنے تک وہ تینوں فرار ہو چکے تھے۔

ہمیں ہمیشہ پاکستان سے شکوہ رہا ہے یہاں کی پولیس وقوعہ کے اتنی دیر بعد پہنچتی ہے کہ ملزم آسانی سے بھاگ سکے حالانکہ ترقی یافتہ ممالک میں حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہیں' بے شک وہ اپنے سسٹم اور سزاؤں کے نفاذ کی وجہ سے مجرم تک پہنچ ضرور جاتے ہیں لیکن اب ایسے بھی الہام نہیں اترتے کہ بوتل میں بند جن کی طرح جائے حادثہ پر پہنچ جائیں تب بھی ایسا ہی ہوا اپنے آفس میں اسمتھ خون میں لت پت پڑا تھا جب پولیس اسے اسپتال لے کر گئی

بہت سا خون بہہ چکا تھا۔

اسمتھ اپنے باپ کے اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں تھا اس کی ٹانگیں بری طرح چھلنی ہو گئی تھیں اور میرڈین ویٹنگ لاؤنج میں بلک بلک کر روتی اسمتھ کی زندگی مانگ رہی تھی۔ ڈاکٹرز کا خدشہ یہی تھا وہ ٹانگوں سے مفلوج ہو چکا ہے' میرڈین کو مفلوج اسمتھ بھی قبول تھا بس وہ زندہ ہو۔

وہ ایک کامیاب آپریشن ضرور رہا تھا اس کی دونوں ٹانگوں میں راڈ ڈالے تھے لیکن چلنے پھرنے کے قابل وہ کئی ماہ بعد ہوا' کئی بار اس نے میرڈین کو چھیڑنے کے لیے مذاق کیا تھا۔

''میرڈین اگر میری دونوں ٹانگیں واقعی کٹ جاتیں ...... تو تم کیا کرتیں یقیناً میرا ساتھ چھوڑ دیتیں۔'' میرڈین نے ایک دو بار تو اس کا مذاق ہنس کر ٹال دیا مگر جب تواتر سے کہنے لگا تو وہ پرانے انداز میں لوٹ کر بولی تھی۔

''دماغ خراب نہیں تھا تمہیں چھوڑتی' تمہاری ٹانگوں کی جگہ ڈنڈے فکس کروا کر ٹکٹ لگا دیتی اچھی خاصی انکم ہو جانی تھی۔''

اسمتھ جب چلنے پھرنے میں بہتر محسوس کرنے لگا تو اس نے التوا میں پڑا شادی کا کام سرانجام دیا تھا' دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ سے خوش تھے چرچ میں بھی' کمرے میں بھی۔

☆☆☆

جیسے جیسے جون قریب آیا آسٹریلیا میں توں توں برف باری تیز ہونے لگی' جون ختم ہونے تک آسٹریلیا کے بہت سے حصے مکمل طور پر برف سے ڈھک گئے تھے۔ یہاں تک کہ دریائے برسبن پر برف کے بڑے بڑے سے ٹکڑے تیرنے لگے۔ دیکھنے والوں کے لیے یہ منظر بڑی دلکشی رکھتا تھا جب بڑا سا سفید تختہ نیلے پانی پر تیرتا آگے ہی آگے بڑھ رہا اور پھر اچانک سے ایک لہر آئے تختے میں دراڑ ڈالے درمیان سے چیر دے' جہاں سے نیلا پانی مسکرا کر جھانکنے لگے۔

اسمتھ اور میرڈین اپنے ہنی مون ٹرپ پر برسبن آئے تھے اس شہر کو دیکھنے کے لیے نگاہ میں فطری مناظر کا ذوق لازمی ہے یہاں پر نہ تو تاریخی عمارت ملیں گی نہ ہی جدید طرز پر بنائے تفریح مقامات' سبزہ ہی سبزہ' بس قدرتی جنگلات اور شہر کے تقریباً ہر حصے سے ہو کر گزرتا دریائے برسبن' ہوائی جھولے پر بیٹھ کر ان دنوں میں دریائے برسبن کا نظارہ اور ہی طرح کا سرور دیتا ہے' کسی حسین ناگن کی طرح لہر کی کروٹیں بدلتا سفید جمی پرتوں کے نیچے سے جھانکتا کہیں سبز کہیں نیلا۔

دن ابھی ڈھلا نہیں تھا' ہلکی برف باری کی وجہ سے دن میں بھی سفید شام کا سماں بندھا تھا۔ دریائے برسبن کے کنارے اسمتھ اور میرڈین پوری توجہ سے ایک اسنومین بنانے میں مشغول تھے' بہت سے کپلز وہاں آئے ہوئے تھے اور اکثریت کا مشغلہ یہی تھا لیکن جس طرح وہ دونوں محظوظ ہو رہے تھے شاید ہی کوئی اور ہو رہا ہو۔ میرڈین اسنومین کے اعضا کی تراش خراش کرتے جتنی فالتو برف اتارتی چپکے سے اسمتھ کے کوٹ میں ڈال دیتی اور اسمتھ اٹھا کر گولا اس کے منہ پر مارتا۔

میرڈین نے اپنا زرد رنگ کا گرم مفلر اتار کر سنومین کے لپیٹا اسمتھ نے ایک چاکلیٹ اسنومین کے منہ میں پھنسائی اور دونوں اس کی اطراف کھڑے ہو گئے۔ چاکلیٹ کھاتے ہوئے اسنومین سے سر جوڑے تصویر اتارنے لگے تھے' اچانک زور سے آ کر اسنومین کو ایک بھاری سی فٹ بال لگی تھی۔ آن واحد میں برف کا پتلا درمیان سے کھسک جانے پر دونوں بھوچکا ہو گئے تھے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا پھر فٹ بال کو اور پھر فٹ بال کی جانب بڑھتی ایک چھوٹی سی بچی کو۔

گرم کپڑے لونگ کوٹ' مفلر' ٹوپی' لونگ بوٹ پہنے وہ بچی سردی سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ بھاگ کر فٹ بال کی جانب بڑھی اور جھک کر اٹھانے لگی۔ میرڈین نے اس سے پہلے گیند اچک لی' اسے

قدرے غصہ بھی تھا یقیناً وہ اسے اچھی خاصی سنا بھی دیتی کئی گھنٹے کی محنت سے بنایا گیا پتلا بنا تصویر اتارے پل میں توڑ دیا۔ بال اچک جانے پر بچی نے جیسے ہی سر اٹھا کر میرڈین کو دیکھا' وہ تو اسے نہیں پہچان پائی لیکن میرڈین نے فوراً پہچان لیا۔

''رابی......''

اسمتھ بھی چونکتے ہی برفیلے پتلے پر پاؤں رکھ کر بچی کے قریب ہوگیا' انہیں بے حد حیرت تھی۔ یہ یوں اچانک سے مل جائے گی' چھ ماہ پہلے جب وہ ایک مال میں ملے تھے اس کے بعد روائیبہ کا کوئی اتا پتا نہیں تھا' جندب کے بار بار اصرار پر بھی وہ اسے تلاش نہیں کر پائے تھے پھر اسمتھ کے ساتھ تو حادثہ ہوگیا تھا لیکن میرڈین کو ہر ویک اینڈ پر مختلف جگہ جانے کی ہدایت دیتا مگر وہ کسی سوئی کی طرح گم ہوگئی تھی اب ملی تو یوں اچانک روائیبہ اور فلوریہ رابی کو پکارتیں ادھر ہی آرہی تھیں۔

آسٹریلیا آکر رابی کو کچھ خاص اچھا نہیں لگا تھا چھ ماہ ہوچکے تھے مگر اس کی اجنبیت ہنوز برقرار تھی' اسکول فیلوز کے ساتھ بھی کوئی خاصی دوستی نہیں ہوئی' ان کی شکلیں' بولی' عادات و انداز کچھ بھی پسند نہیں آرہا تھا۔ آج ویک اینڈ تھا اور فلوریہ نے اپنا ویک اینڈ یہاں اکیلے پلان کر رکھا تھا۔ روائیبہ کو پتا چلا تو وہ رابی کو لے کر اس کے ساتھ ہوگئی کہ اس کی بھی تفریح ہوجائے گی۔ وہ تینوں بوٹنگ کے بعد اب واپسی کے لیے نکل رہے تھے جب رابی نے اپنی فٹ بال سے کک لگائی اور ٹھاہ...... سنومین کے۔

روائیبہ تو معذرت کرنے کے لیے نیوکپل کی جانب بڑھی تھی لیکن وہاں اسمتھ اور میرڈین کو دیکھ کر ٹھٹک گئی' اس کی گہرے آنکھوں' وا ہوئے گلابی ہونٹوں سے واضح ہو رہا تھا وہ انہیں دیکھ کر صرف حیران نہیں بلکہ خوف زدہ بھی ہوئی ہے۔ میرڈین کو تو اس کے دل کی دھڑکن تک محسوس ہوئی تھی جیسے پسلیاں توڑ دینے کی حد تک کھٹ کھٹ کر رہا ہو' اسے پورا یقین تھا وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اندھا دھند یہاں سے بھاگ جائے گی لیکن یہ میرڈین کبھی نہیں کرنے دے گی اور یہ تب ہی ممکن تھا وہ اس پر کچھ ظاہر نہ ہونے دے اپنی پرانی دوستی کا مان بخشے۔ اس کی بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے انجان بنتے ہوئے وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر ملی تھی۔

''ہائے روائیبہ! کہاں غائب ہوگئی تھیں تم...... ہم نے اس بلڈنگ میں تمہیں تلاش کیا مگر تم وہاں نہیں تھیں' ہماری شادی میں ہی شامل ہوجاتیں۔''

''کیسی ہو تم؟'' روائیبہ نے اس سے الگ ہوتے ہوئے صرف یہ ہی پوچھا اور وہ چہک کر بولی۔

''بہت خوش...... لگ نہیں رہی؟''

''لگ رہی ہو۔'' وہ پھیکا سا مسکرائی۔ ''شادی ہوگئی تم لوگوں کی؟'' اس کے سوال پر وہ آنکھیں دکھاتے ہوئے بولی تھی۔

''اے بڈی! ہم ہنی مون ٹرپ پر ہیں' کیا تمہیں لگ نہیں رہا۔'' وہ شوخ ہوتے ہوئے جیسے اسمتھ کی جانب بڑھنے لگی روائیبہ نے اسے روکا تھا۔

''ہاں ہاں لگ رہا ہے۔''

''اور تم بتاؤ' تمہارا شوہر کہاں ہے' ملواؤ اس سے۔''

''وہ پاکستان چلا گیا' رابی یہاں رکنا چاہ رہی تھی سو اس لیے......''

''یہ تو تم نے کمال کیا۔'' وہ روائیبہ کا ہاتھ پکڑ کر ایک جانب بیٹھ گئی تھی اور اسمتھ کو ایسا خاموش اشارہ کیا وہ غیر محسوس طریقے سے فلوریہ کی جانب بڑھ گیا' جو ایک خالی کرسی پر جا کے بیٹھ گئی تھیں۔

''رابی کو ہم خوب گھمائیں گے' سارا آسٹریلیا دکھائیں گے' ٹھیک ہے ناں؟'' جواباً روائیبہ نے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔ میرڈین بہت دیر تک اپنی اور اسمتھ کی باتیں کرتی رہی شادی سے پہلے کی' شادی کے بعد کی پھر ہلکا سا استفسار کیا تھا۔

''تم بھی تو کچھ بولو' پاکستان...... پاکستان کے لوگ کیسے لگے؟'' درد کا ایک سایہ روائیبہ کے چہرے سے ٹکرا کر اس کی جلد میں جذب ہوگیا میرڈین نے خود ہی اگلی بات کر ڈالی۔

''پتا کیا' میرا بہت دل کرتا ہے پاکستان جانے کو' ہم جندب کی شادی پر وہاں کا ٹرپ پلان کر رہے ہیں۔''

''جندب شادی کر رہا ہے؟'' روائیبہ کے چونکنے پر وہ استہزائیہ ہنسی تھی۔

''کبھی تو کرے گا' وہ کنوارہ مرنے کا عہد کر کے نہیں آیا۔'' سر جھٹکتے ہوئے روائیبہ بھی مسکرا دی۔

''میں نے سنا ہے وہاں کے لوگ بہت محبت کرتے ہیں' بہت مہمان نواز' خیال کرنے والے' عزت دینے والے...... کیا خیال ہے؟''

''نہیں...... بے اعتبار ہوتے ہیں۔'' ایک جملے کی ادائیگی نے ہی روائیبہ کے چہرے کو کسی زلزلہ شدہ عمارت میں بدل دیا تھا پھر توقف سے غیر مرئی نقطے پر نگاہ مرکوز کرتے ہوئے بولی۔

''مت جانا...... وہ لوگ دماغ سے نہیں ناک سے فیصلے کرتے ہیں' اپنی انا' اپنی ناک بہت عزیز ہے انہیں۔ پھانسی پر لٹکا کر گرہ کھینچتے نہیں ہیں' نکالتے بھی نہیں ہیں۔'' اس نے نگاہ اٹھا کر کچھ اس طرح سے میرڈین کو دیکھا تھا اس کا سارا دل مٹھی میں سمٹ گیا تھا اور روائیبہ کو بھی احساس نہیں ہوا کب اس کی آنکھوں میں پانی بھرا اور چہرے پر امڈنے لگا۔ میرڈین نے پیار سے اس کی پشت کے گرد بازو پھیلاتے اسے اپنے قریب کیا تھا۔

''کیا ہوا روائیبہ! تم رو رہی ہو' پلیز بتاؤ' ہوا کیا ہے...... پلیز۔'' وہ نفی میں سر ہلاتی اس کے کندھے سے جا لگی' جس کندھے کی بہت عرصے سے تلاش تھی ملتے ہی وہ بلک بلک کر روئی تھی' بہت سارو لینے کے بعد اپنے آنسو پونچھتے ہوئے وہ اس سے الگ ہوئی تب میرڈین نے پوچھا تھا۔

''اب بتاؤ' کیا بات ہے؟''

''کچھ رہا ہی نہیں بتانے کو بلکہ کبھی کچھ تھا ہی نہیں صرف ایک رابی ہے اور وہ ساتھ ہے۔'' رابی برف کے بڑے بڑے گولے سمیٹتے ہوئے سنومین کو کھڑا کرنے کی کوشش میں سرگرداں تھی۔ میرڈین نے ایک نظر اسے دیکھ کر استفسار کیا تھا۔

''صرف ایک رابی ہی ہے؟ مطلب اور کوئی نہیں ہے...... کوئی بھی نہیں۔'' جس طرح سے میرڈین نے ایک ایک جملہ زور دے کر کہا تھا روائیبہ کو لگا اس کے چہار اطراف گہرے آنکھیں آکر کھڑی ہوگئی ہوں' جن میں بہت سا استفسار ہو' وہ بنا جواب دیے گردن پھیر کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

اسمتھ ہاتھوں میں کافی کے ڈسپوزایبل کپ پکڑے ان کی جانب بڑھ رہا تھا' اتنی دیر میں اس نے فلوریہ سے جو معلومات لینی تھیں بنا محسوس ہوئے لے چکا تھا۔ فلوریہ کو روائیبہ کے دونوں فرینڈز بہت اچھے لگے تھے بلاتعامل انہوں نے اظہار بھی کیا تھا۔

''تم سے عقل مند تمہارے دوست ہیں' کم از کم انہوں نے لائف پارٹنر کا انتخاب بہت سوچ کر کیا ہے۔'' روائیبہ کچھ نہیں بولی تھی صرف مسکرا کر رہ گئی' اس کے چہرے کی شکستگی اسمتھ' میرڈین دونوں نے محسوس کی اور بات بدل ڈالی۔

''ہم تو ہیں ہنی مون ٹرپ پر' ہماری پرائیویسی ڈسٹرب ہو رہی ہے۔'' اسمتھ نے کافی کا آخری گھونٹ پی کر خالی کپ قریب نصب ڈسٹ بن میں اچھالا۔

''اور بہت اچھا لگے گا رابی! اگر ہم بعد میں بھی ملیں۔'' میرڈین نے بھی رابی کے گال کو چھوا اور ''بائے'' کرتی اسمتھ کے پیچھے چل پڑی وہ تینوں بھی کچھ دیر ہی وہاں رکیں پھر گھر کو نکلیں۔

☆☆☆

مسلسل جاگتے دو دن ہوچکے تھے' نیند اس کے قریب بھٹکتی بھی نہیں تھی' ذہن اتنا الجھ رہا تھا کہ نیند کی ادویات بھی اثر چھوڑ رہی تھیں۔ بیڈ پر لیٹے وہ مسلسل عدن کے بارے میں سوچ رہا تھا' اس نے اپنی زندگی کی شاید کبھی اس طرح خواہش کی ہو جیسے ان دنوں کر رہا تھا۔ وہ جینا چاہتا تھا عدن کے لیے اور شاید

روائیبہ کے لیے۔ وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا' اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا لیکن کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسا لگتا تھا سب راستے کسی بند گلی میں آ کر ختم ہو گئے ہوں۔

اس رات اس کی طبیعت جس طرح خراب ہو رہی تھی وہ بار بار غنودگی میں جانے لگا تھوڑی سی ہمت مجتمع کر کے اس نے ریسکیو ٹیم کو کال کی تھی جنہوں نے کچھ ہی دیر میں اسے ہسپتال پہنچا دیا۔ ایمر جنسی ٹریٹمنٹ ملنے پر اس کی طبیعت بہت جلد سنبھل گئی تھی لیکن جب رپورٹس آئیں الجھ کر رہ گیا۔ اس کے دونوں گردے بری طرح متاثر ہو چکے تھے بلکہ ڈاکٹرز کا کہنا تھا اگر فوراً ڈائیلاسز نہ ہوئے تو مکمل طور پر ختم ہو جائیں گے۔ ڈائیلاسز اتنا مسئلہ نہیں تھا پچھلے چھ ماہ سے اس کے ڈائیلاسز ہو رہے تھے شروع میں ہفتے میں ایک بار اور اب دو بار ہونے لگے تھے۔

جس دن اسے ڈائیلاسز کے لیے جانا ہوتا عدن کو اپنے مینیجر کے پاس چھوڑ دیتا مگر دھیان اس کا عدن میں ہی رہتا۔ وقت بھرے بادل کی مانند قطرہ قطرہ نچڑ رہا تھا' حنبل کی طبیعت ٹھیک ہونے کے بجائے مسلسل خراب ہوتی جا رہی تھی اور اب دو دن پہلے جب ڈائیلاسز ہوئے تو ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا۔

''ڈائیلاسز سے اب کوئی فائدہ نہیں' ٹرانسپلانٹ کرنا ہوگا' وہ آپ جلد سے جلد کروالیں۔''

یہ دنیا سے ہٹ کر کوئی انوکھا کام نہیں تھا بلکہ ہر آنے والے گھنٹے میں دنیا کے کسی کونے میں کہیں نہ کہیں گردے کا ٹرانسپلانٹ ہو رہا ہوتا ہے' مسئلہ عدن کا تھا۔

اچھے خاصے دن اسپتال میں لگ جاتے ہیں اتنا عرصہ عدن کہاں رہے گا اور اس کا اپنا وجود بھی جیتا جاگتا ہے' وہ کوئی روبوٹ نہیں ہے جس کی بیٹری بدل کر نئی فٹ کر دو اور ایک منٹ میں ہی روبوٹ پھر سے ویسا ہی کام کرنے لگے۔ کھلونے' سیل بدلنے سے نہیں ٹوٹتے لیکن انسان اس دوران ٹوٹ بھی جاتے ہیں' ختم بھی ہو جاتے ہیں اگر ایسی کوئی صورت حال ہو گی تو عدن کہاں جائے گا۔

یہ سوچ آتے ہی اس کی نیند اڑ جاتی تھی' حنبل کسی صورت بھی نہیں چاہتا تھا عدن حویلی جائے یا سبرینہ کے پاس اور ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا ٹھکانہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ ان ہی سوچوں میں ڈوبا پاس لیٹے عدن کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا اسے روائیبہ شدت سے یاد آنے لگی۔

''حنبل! اگر کوئی اپنی غلطی کی معافی مانگے' کیا اسے معاف کر دینا چاہیے؟''

''ہاں کر تو دینا چاہیے...... لیکن ہر غلطی کی معافی نہیں ہوتی کچھ کی سزا ہونی چاہیے۔''

اپنے ہی ادا کیے جملے سے اسے اچھی خاصی تکلیف محسوس ہوئی اس نے تکلیف سے آنکھیں موند لیں۔

''میری بے اعتباری' میرا جرم ہے' مجھے سزا ملنی چاہیے...... لیکن میرے بچے کا کیا قصور ہے اللہ!'' دکھ سے اس نے آنکھیں کھولیں سامنے عدن کا بے فکر چمکتا چہرہ تھا اسے اس پر بے حد پیار آیا۔

اس کی سوچوں کا ارتکاز اس کے سیل فون کی آواز نے توڑا تھا۔ فون اٹھا کر اسکرین کو دیکھا' خیام ذکا لکھا جگمگا رہا تھا۔

''ہیلو......'' اسکرین ٹچ کرتے ہی فون کان سے لگایا تھا' دوسری جانب خیام رسمی جملوں کے بعد اس کی طبیعت کا پوچھنے لگے۔ جن دنوں حنبل ذکا کے ڈائیلاسز شروع ہوئے ان کا بزنس خاصا متاثر ہوا تھا اور اسی وجہ سے خیام ذکا کو پتا چلا تھا۔ حنبل تو شاید اپنی بیماری کا پاکستان میں کسی کو بھی نہ بتاتا لیکن ان کے مینیجر نے خیام ذکا کو ساری تفصیل بتا دی۔ خیام ذکا نے جب حنبل سے استفسار کیا اس نے بہت مطمئن انداز میں کہا تھا۔

''زیادہ پرابلم نہیں ہے' کڈنیز تھوڑی متاثر ہیں' ایک دو ماہ کے ڈائیلاسز سے ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں' کیوں ہوا ایسا؟''

''کیوں ہوا ڈاکٹرز کب بتاتے ہیں؟''

''پھر بھی؟''

''ہو جاتا ہے' ڈاکٹرز پرامید ہیں آپ پریشان نہ ہو اور پلیز بابا کو مت بتایے گا۔'' حنبل کے کہہ دینے سے پریشانی کم تو نہیں ہوئی تھی' اس کی طبیعت باقاعدگی سے پوچھتے رہتے تھے' وہ مطمئن کر دیتا تھا لیکن آج حنبل کے اندر کی کیفیت اس کی آواز سے جھلک رہی تھی۔

''خیریت...... تم اتنا ڈھیلا کیوں بول رہے ہو؟''

''ایک دو ماہ کے اندر ٹرانسپلانٹ کا کہا ہے ڈاکٹرز نے۔'' سنتے ہی خیام کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''کیا...... لیکن تم تو کہہ رہے تھے اب بہتر ہو رہا ہوں۔''

''جھوٹ بولتا تھا۔''

''حنبل...... تم فوراً پاکستان آ جاؤ' یہاں بہت اچھے اسپتال ہیں' بہت اچھا علاج ہو رہا ہے۔''

''علاج یہاں بھی ٹھیک ہو رہا ہے۔''

''خاک ٹھیک ہو رہا ہے' چھ ماہ تو ہو گئے سنتے ہوئے اور وہاں تم اکیلے ہو۔''

''کچھ نہیں ہوتا اور پلیز بابا کو پتا نہ چلے۔''

''کیسے پتا نہ چلے۔'' خیام ذکا اتنے درد سے بولے تھے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھی اعشال پوری طرح متوجہ ہو گئی تھی۔ میر ذکا اپنے کمرے سے نکل کر باہر آ رہے تھے' خیام کے چہرے کے اڑے رنگ دیکھ کر بری طرح چونک گئے' خیام اپنی دھن میں بولتے رہے۔

''بابا سے کیسے چھپ سکتا ہے' ان کے بازو کٹ کٹ کر گر رہے ہیں اور انہیں پتا نہ چلے' حنبل کیسی باتیں کرتے ہو یار تم...... میں آ رہا ہوں جرمنی' تمہیں کسی سے لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ٹیسٹ کرواتا ہوں یقیناً میرا میچ کر جائے گا۔''

''آپ رہنے دیں' میری یہاں ایک ڈونر این جی او سے بات ہو رہی ہے۔''

''اوہ بھاڑ میں گئی ڈونر این جی او...... میں بھائی ہوں تمہارا۔'' خیام ذکا کی گفتگو سے میر ذکا کو اپنا بدن بری طرح لرزتا ہوا محسوس ہوا' وہ بمشکل کہہ پائے تھے۔

''کیا ہوا ہے حنبل کو......؟'' خیام نے فون بند کرتے گردن پھر کر دیکھا' میر ذکا کی حالت خراب ہو رہی تھی' گردن اور جبڑے کے پٹھے عجیب انداز میں ابھر کر اکڑ رہے تھے' ان کی کپکپاتی آواز سے نکلا۔

''بتاتے کیوں نہیں...... کک...... کیا ہوا میرے......'' میر ذکا لڑکھڑا کر گر پڑے' اعشال چلاتی ہوئی میر ذکا کی جانب لپکی تھی۔

☆☆☆

فیصل آباد اسپتال کا کمرا تھا' میر ذکا مریض بیڈ پر لیٹے کسی پتھر کی مانند لگتے تھے' دوران خون کا تیز دباؤ پڑنے سے ان کا دایاں حصہ مفلوج ہو چکا تھا۔ خیام ذکا کچھ ہی فاصلے پر بیٹھے ان کی لڑھکی گردن پر نگاہیں گاڑھے ہوئے تھے۔

''میرے اللہ ابھی کون کون سا حساب باقی ہے۔'' ان کی نگاہ کے سامنے اپنے باپ کی جگہ ماں جان کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ خیام ذکا کو بہت اچھی طرح یاد آتا تھا جب ان کی شادی کی تیاریاں بہت زوروں پر تھیں۔ ایک دن ماں جان نے بہت پرامید مگر ڈرتے ڈرتے میر ذکا سے کہا تھا۔

''ذکا! گھر میں برسوں بعد خوشی کا موقع آ رہا ہے' ازمیر کو بھی بلا لو۔''

''کیوں فوتگیوں پر میں نے اسے دعوت نامے بھیجے تھے تب تو آ گیا تھا' اب آتے موت پڑتی ہے۔'' ان کے کرخت لہجے کی کاٹ سے یک دم ماں جان کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا اور آنکھوں میں پانی۔ خیام ذکا۔ تب کچھ نہیں بول پائے صرف تاسف سے باپ کی سنگ دلی دیکھتے رہے البتہ حنبل بہت غصے میں اٹھا تھا حالانکہ بہت چھوٹا سا تھا مگر ان ہی کے لہجے میں بولا تھا۔

''آپ نے نہیں بلانا مت بلائیں' غصہ کیوں

کررہے ہیں ماں جان پر۔'' اس نے ماں جان کا ہاتھ پکڑا انہیں کمرے کی جانب لے جاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''انہیں کیوں کہتی ہیں خود فون کرلیں' بابا کو تو تب پتا چلے گا جب ان کے بچے ان سے دور ہوں گے۔''

خیام کو یاد آرہا تھا اس رات ماں جان کی طبیعت بہت خراب ہوئی تھی اور اگلی صبح فالج کا اٹیک بہتر علاج' خوراک' خیال سے خاصی اچھی ہوگئی تھیں مگر پھر بھی ساری زندگی وہیل چیئر پر گزری تھی' بستر پر لیٹے میر ذکا کی شکل خیام کو بالکل ماں جان جیسی لگ رہی تھی کیا یہ مکافات عمل ہے۔ مائیں بددعائیں تو نہیں دیتیں لیکن دل تو رکھتی ہیں' جو دکھتے بھی ہیں اور دکھی دل کی ہلکی سی آہٹ بھی عرش ہلا دیتی ہے۔ ماں باپ کے آگے تو اُف کہنے کا حکم نہیں ہے' کیا کہ ان پر ضرب لگائی جائے' ضرب کھا کر چیزیں بڑھ جاتی ہیں' دکھ ہوں' سکھ ہوں یا آہیں......

☆☆☆

کئی دنوں بعد میر ذکا گھر شفٹ ہوگئے تھے لیکن ان کی حالت بدستور تھی' فزیوتھراپسٹ انہیں ایکسرسائز کروانے کے بعد جیسے ہی نکل کر گیا عشال ان کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ شان سے چلنے والے دادا کو ایسی حالت میں دیکھ کر اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ آئمہ کے ٹھیک ہونے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے کہ گھر میں ایک اور معذور شامل ہوگیا۔ وہ کچھ دیر ہی ان کے پاس بیٹھ سکی پھر باہر نکل آئی۔

خیام ذکا فون پر کسی سے بات کررہے تھے' ان کی بات سے اندازہ ہوتا تھا وہ کہیں جانے کے لیے اپنی سیٹ کنفرم کروا رہے ہیں۔ اعشال نے ان کے پاس بیٹھ کر کال ختم ہونے کا انتظار کیا تھا۔

''ہوں......'' خیام نے فون بند کرتے ہی اسے پوچھا۔

''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

''ہاں کہو۔''

''آپ جرمنی جارہے ہیں؟''

''ہاں......لیکن کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''مجھے بھی آپ کے ساتھ جانا ہے۔'' خیام ذکا کو اس کی فرمائش پر حیرت ہوئی تھی۔

''تم وہاں جاکر کیا کرو گی۔''

''جو آپ کریں گے۔''

''میرا بھائی بیمار ہے' اسے کڈنی کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے میرا میچ ہوجائے لیکن تم وہاں کیا کرو گی۔''

''میرے چاچو بیمار ہیں' مجھے ان سے ملنا ہے۔ مجھ سے دادا ابو اور امی کی حالت نہیں دیکھی جارہی' مجھے وہاں جاکر ان سے اپنی ماں کے لیے معافی مانگنی ہے پلیز بابا مجھے لے جائیں۔''

''بیٹا تمہاری یہاں زیادہ ضرورت ہے' تم جانتی ہو گھر کے دونوں فرد بیمار ہیں اگر کسی کو کچھ ہوگیا تو......''

''نہیں ہوتا کسی کو کچھ...... آپ کسی بہتر اٹینڈنٹ کا بندوبست کردیں پلیز...... پلیز بابا میں آپ کے ساتھ جاؤں گی ورنہ میں یہاں رو رو کر پاگل ہوجاؤں۔ مجھے ایک بار چاچو سے ملوادیں پلیز...... پلیز......'' وہ کہتے ہوئے باپ سے لپٹ گئی اور آنسو ہچکولوں میں نکلنے لگے۔ خیام ذکا نے اس کا سر تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی تھی۔

''اچھا......چلو دیکھتے ہیں۔''

''نہیں بابا! آپ پرامس کریں مجھے لے کر جائیں گے۔'' اس کے بارہا اصرار پر خیام ذکا کو اس کی بات ماننا ہی پڑی تھی۔

☆☆☆

روائیبہ سے اس روز اچانک ہوئی ملاقات کے بعد اسمتھ نے ہوٹل پہنچتے ہی جو پہلا کام کیا تھا وہ جندب کو فون کرنے کا تھا کیوں کہ جس پریشانی سے وہ اس کا اکثر پوچھتا رہا تھا' بہتر تھا اسے فوراً اس کی خیریت بتادی جائے۔ اسمتھ نے جب اسے بتایا تو وہ زیادہ حیران نہیں ہوا تھا بس اتنا پوچھا تھا۔

''وہ ٹھیک تو تھی ناں......اور رانی وہ کیسی تھی؟''

''ہاں ہاں ٹھیک ہے' اپنی آنٹی کے ساتھ رہ رہی ہے برسبن میں۔''

''او کے...... لیکن تم اسے مت بتانا مجھے اس کے بارے میں کچھ بتایا ہے' جیسے وہ بہتر سمجھے زندگی گزارے اور پلیز میر ڈین سے کہنا کہ وہ رابطے میں رہے اس سے۔''

''ہم صرف رابطے میں ہی نہیں بلکہ کوشش کریں گے' وہ ہم سے کچھ شیئر کرے تاکہ اسے سمجھایا جاسکے۔'' اسمتھ نے بہت اچھے طریقے سے جندب کو مطمئن کردیا تھا۔

☆☆☆

دن تھے کہ نچڑتے بادل کی طرح قطروں کی صورت پھسلتے اور سمندر کی بے رحم لہروں کا رزق بن جاتے۔ لہریں پورے جوش سے ابھر ابھر کر آتیں اور ساحل پر اپنی نمی چھوڑ کر پھر سمندر میں اتر جاتیں۔ حنبل باقاعدگی سے اپنی میڈیسن لے رہا تھا اس کے ٹرانسپلانٹ کی ڈیٹ آچکی تھی۔ حنبل اس حد تک مطمئن تھا اگر تو ٹرانسپلانٹ کامیاب ہوتا ہے تو سب ٹھیک ہے لیکن اگر ایک نس بھی ٹس سے مس ہوگئی تو ساری کہانی ختم ہوجائے گی۔ صرف اس کا بدن ہی مٹی میں نہیں اترے گا بلکہ بہت سے پچھتاوے' بہت سے کاش اس کے ساتھ مٹی بن جائیں گے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کوئی ایک کاش' کسی ایک پچھتاوے کا مداوا ہوسکے۔ اس کی اپنی زندگی جتنی تباہ ہونی تھی ہوچکی مگر عدن کی تو ساری زندگی پڑی ہے۔ عدن کی زندگی کے لیے روشنی کا کھوج لگاتے لگاتے اسے صرف ایک روزن دکھائی دیتا تھا وہ کسی طرح جندب سے بات کرے۔ جندب ہی ایسا ہے جو روائیبہ تک عدن کو پہنچا سکتا ہے۔

اپنے اور بابا کے جانے کی تیاری مکمل کرنے کے بعد وہ عجیب سی بے چینی میں گرفتار تھی' خیام ذکا کے ساتھ جانے کا اٹل فیصلہ وہ کرچکی تھی بلکہ خیام نے بھی اس کے انتظامات کردیے تھے۔ میر ذکا کو حنبل کی تفصیلی طبیعت کا بتا کر وہ ان کا اتنا ذہن بنا چکے تھے کہ اچانک سے اعشال کا جرمنی جانا انہیں متاثر نہ کرے۔ میر ذکا اپنی وہیل چیئر پر لڑھکی گردن کے ساتھ سب سنتے رہے' بند لبوں پر صرف حنبل کی زندگی کی دعائیں تھیں۔

اعشال کو لے جانے پر انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ کسی حد تک خوشی تھی۔ حنبل اپنوں کو دیکھ کر شاید اپنے اندر جینے کی ہمت پیدا کرے اور جینے کے لیے تو ہمت بے حد ضروری ہے۔ ہمت ٹوٹ جائے تو زندگی ٹوٹ جاتی ہے' اعشال نے فون پر حنبل کی بہت ہمت بندھائی تھی اور اپنے آنے کا یقین بھی دلایا لیکن اب جیسے جیسے دن قریب آرہے تھے۔ دل رک رک کر دھڑکتا تھا۔

جانے کیا ہونے والا ہے پھر آئمہ کون سا سکون لینے دے رہی تھیں حالانکہ خیام ذکا نے آئمہ کے لیے فی میل اور میر ذکا کے لیے میل اٹینڈنٹ کا بہت اچھا بندوبست کردیا تھا۔ میر ذکا تو ہلنے جلنے سے معذور تھے سو اٹینڈنٹ کو صرف ان کے کام کرنے پڑتے تھے لیکن آئمہ بیگم انہیں ایک جگہ روکے رکھنا بہت دشوار تھا اگر کمرہ باہر سے بند کردیتے تو پیٹ پیٹ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتی تھیں۔ اگر باہر نکل آتیں تو کچھ بعید نہیں کیا کر ڈالیں' بہت دیر سے گھر میں خاموشی سی تھی اور اسی خیال سے اعشال باہر نکلی کہ دیکھے وہ کہاں ہے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ پچھلے صحن میں نکل آئی جہاں آئمہ کرسی پر بیٹھی تھیں۔

اذلان کا بیٹ اپنی گود میں دبوچ رکھا تھا اور ایک ہاتھ سے اپنے جلے چہرے کے زخم چھیل چھیل کر کسی سے باتیں کررہی تھیں' اعشال آہستہ آہستہ چلتی ان کے قریب قدموں میں آبیٹھی اور دھیمے سے بولی تھی۔

''کس سے باتیں کررہی ہیں آپ......اور یہ بیٹ کیوں پکڑ رکھا ہے۔'' اس نے ان کی گود سے بیٹ اٹھانے کی کوشش کی' آئمہ نے اس کے ہاتھ پر ''ہش ہش'' کرکے ہاتھ مارا۔

"اذلان کی انگلیاں کٹ گئی ہیں ناں...... اس سے بیٹ پکڑا نہیں جارہا' رو رہا ہے وہ...... اسے کھیلا رہی ہوں...... تو جا۔" ماں کے چہرے سے رستا خون دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو گئے اور وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔

"ظلم کرتے وقت ہم سوچتے ہی نہیں اس کا کفارہ کتنا بھاری ہو سکتا ہے' پوری زندگی سود میں دے کر بھی ادا نہیں ہوتا۔ کاش...... کاش میں اپنی ماں کے ظلم کا کفارہ ادا کر سکوں۔" اعشال سوچتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی تھی اور نرس کو آئمہ بیگم کے پاس بھیجا تھا تاکہ بہلا پھسلا کر انہیں اندر لے جائے۔

اعشال آکر سٹنگ روم میں بیٹھی ہی تھی جب خالہ گلزاری زینب کا پوچھنے آئی تھی۔ زینب نے جب سے دوبارہ حویلی آنا شروع کیا تھا پھر چھوڑا نہیں تھا حالانکہ حنبل ذکا دوبارہ جرمنی چلا گیا تھا لیکن وہ ایک تواتر سے آتی رہی اور جب سے اسے یہ پتا چلا کہ حنبل کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی' گردے کا آپریشن ہونا ہے اس نے اپنے گھر تو بالکل جانا چھوڑ دیا تھا۔ حویلی کے کام کاج بھگتا کر مصلا لے کر بیٹھ جاتی یا کوئی ورد کرتی رہتی۔ خالہ گلزاری نے اسے کئی بار گھر بلایا تھا' وہ موچی نذیر کے بیٹے سے اس کا نکاح کرنا چاہ رہے تھے اور وہ گھر ہی نہ جاتی۔ آج گلزاری خود آئی اور اعشال کے پاس بیٹھ گئی اس سے سب کی خیر خیریت پوچھنے اور اپنے لمبے چوڑے مسائل بتا کر بڑی لجاجت سے کہا تھا۔

"اعشال بی بی کسی کا رشتہ کروانا حج کے برابر ثواب ہے...... اور کسی بیوہ' مطلقہ کا کروانا تو شاید بڑے حج جیسا ہی ہو۔ زینب حنبل صاحب کی بہت مانتی ہے' میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" خالہ گلزاری نے بے بسی سے اپنے ہاتھ اعشال کے سامنے جوڑے۔

"بی بی! تم حنبل صاحب سے کہہ دو' اسے ایک بار سمجھا دیں یہ مان جائے گی۔ اللہ بدلے میں تمہیں بہت خوشیاں دے گا' حنبل صاحب کو صحت تندرستی دے گا۔" اک شان سے رہنے والی اعشال کو ایک بڑھیا کا اپنے آگے ہاتھ جوڑنا شرمساری میں مبتلا کر گیا تھا اس نے ان کے ہاتھ پیچھے کیے تھے۔

"خالہ ایسے نہیں کرو...... اور بے فکر رہو' میں زینب سے بات کروں گی' چاچو بھی کہہ دیں گے۔" گلزاری کو اعشال کی بات پر پورا بھروسا تھا اور اس کا بھروسا اعشال نے توڑا بھی نہیں۔ دو دن بعد کی بات تھی جب زینب کاموں کو بھگتا کر سورۃ یٰسین پڑھنے لگی تھی اعشال نے اسے متوجہ کیا۔

"زینب ایک بات کہوں۔" زینب نے سوالیہ نگاہ اٹھائی' اعشال اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"نماز' قرآن' باقی تمام عبادتیں ہم پر فرض ہیں ان سے ہمارا رب خوش ہوتا ہے لیکن انسان کے پیدا کرنے کا مقصد صرف سجدوں پر سجدے کرنا یا تلاوت کرتے رہنا ہی نہیں ہے۔ اللہ پاک نے یہ دنیا اپنے بندوں کے بسنے کے لیے بنائی تھی جہاں ایک دوسرے کے لیے تعاون ہو' خیال ہو' ایک دوسرے کے لیے آسانی پیدا کی جائے اور ان سب کے شکرانے پر سجدہ...... لیکن کتنی عجیب بات ہے ہم اللہ کی دنیا کو بسانے کے لیے نہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں' نہ خیال کرتے' نہ آسانی پیدا کرتے ہیں۔ ہاں البتہ عاجز بندہ بننے کے لیے سجدے پر سجدہ ضرور کر لیتے ہیں۔ کیا اس طرح اللہ پاک خوش ہوتا ہے۔" وہ لمحہ بھر چپ ہوئی زینب اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی' آج اسے اعشال بی بی اپنی عمر سے کافی بڑی لگ رہی تھی۔

"تمہارے ماں باپ تمہاری طرف سے کتنے پریشان ہیں اور تم اللہ کو راضی کرنے میں لگی ہو۔ اللہ کی مخلوق پر رحم کھاؤ' اللہ خود راضی ہو جائے گا اور تمہیں پتا ہے' کل حنبل چاچو کا بھی فون آیا تھا۔" حنبل کا نام سنتے ہی زینب کی آنکھوں میں روشنی لہر کر چھپی تھی۔

"تمہارا پوچھتے ہوئے انہوں نے پیغام دیا تھا کہ تم نذیر کے بیٹے اصغر سے شادی کر لو۔ ایک بے ماں کے بچے کو ماں مل جائے گا اور تمہیں گھر......" زینب

نگاہ بھر کا لی تھی۔

اعشال نے حنبل کے فون کا جھوٹ بولا تھا' اس کا ذاتی خیال تھا جہاں بہت کچھ غلط کرنے کے لیے ہم دن رات جھوٹ بولتے ہیں تو کیا کسی کی زندگی کو صحیح کرنے کے لیے کچھ جھوٹ نہیں بول سکتے اور اعشال کی جھوٹ کا یہ فائدہ ہوا تھا چند دن بعد یہ بات سن لی گئی تھی۔ زینب کا نکاح اصغر سے ہو گیا' اب اصغر کا معصوم بیٹا ہر وقت ماں کے لیے نہیں روتا۔

☆☆☆

وہ آفس جانے کی تیاری میں مگن تھا' سارے کمرے میں اُدھم مچا رکھی تھی۔ اتنا بے ترتیب وہ تب نہیں رہا تھا جب تنہا آسٹریلیا میں تھا لیکن اب چند مہینوں سے اس نے زندگی کو عجیب ہڑبونگ میں بدل لیا تھا۔ ایک تو صبح جلدی اٹھنا چھوڑ دیا تھا' آفس جانے سے بمشکل پندرہ بیس منٹ پہلے اٹھتا پھر بھگدڑ مچا دیتا۔ عائشہ اس کے پیچھے ناشتا لیے پھرتی تھیں' کبھی وہ بھاگتے بھاگتے چائے کی پیالی اٹھا کر تقریباً منہ میں انڈیلنے کے انداز میں پیتا تو کبھی سادہ سلائس کھاتا آفس کے لیے نکل جاتا تھا۔

عائشہ، رضا حیات جیسی نہیں تھیں جو تاسف سے دیکھ کر درگزر کر دیتیں جو اُن کے منہ میں آتا وہ سناتی ضرور تھیں بھلے وہ سامنے ہو یا آفس۔ اس وقت بھی وہ تیزی سے اپنے کمرے سے نکلا تھا ایک بازو پر اپنا کوٹ اور ٹائی ڈال رکھی تھی' ہاتھ میں والٹ' موبائل اور چابیاں پکڑ رکھی تھیں۔ چہرے پر نیند پوری نہ ہونے کے اثرات تھے' عائشہ ہاتھ میں اس کے ناشتے کی ٹرے پکڑے اس کے کمرے کی جانب بڑھنے لگیں تب وہ باہر آیا اور متلاشی نگاہیں دوڑاتے ان سے پوچھا تھا۔

"ممی! میرے جوتے کہاں ہیں؟" اس کے بے تکے پن پر عائشہ تلملائیں۔

"میرے سر پر......" اسے ڈپٹتے ہوئے ٹرے قریب رکھی چھوٹی سی میز پر رکھ دی۔ "خدا کے واسطے جندب کوئی ترتیب لاؤ اپنی زندگی میں...... اور کتنی بدنظمی پیدا کرو گے۔" وہ اس کے جوتے ادھر اُدھر تلاشتے مسلسل بول رہی تھیں۔ "تم باپ بیٹا نے مجھے مشین سمجھ لیا ہے' سارا دن گھومتی رہوں...... ہے کسی کو میرا خیال' کس قدر اکیلی ہو جاتی ہوں میں گھر میں۔" عائشہ کی تلاش بے کار نہیں گئی تھی صوفے کے نیچے سے اس کے جوتے مل گئے تھے۔ نکال کر باہر کیے' جندب نے ان میں رکھیں کل والی جرابیں نکال کر چڑھانی شروع کر دیں' عائشہ دیکھتے ہی پھر سے شروع ہوئی تھیں۔

"رہنے دو یہ...... دوسری لا کر دیتی ہوں' کیوں آفس والوں کو سڑانا ہے۔"

"ٹائم نہیں ہے...... میرے پاؤں سے بدبو نہیں آتی۔"

"اپنی بدبو خود کو نہیں آتی...... دوسروں کو آتی ہے۔" ابھی وہ مزید بولنے لگی تھیں' جب جندب نے چائے کی جانب اشارہ کیا تھا۔

"اچھا چائے دیں' باقی باتیں گھر آؤں گا تب کر لیجیے گا۔" جندب نے چائے کی پیالی ابھی منہ کو لگائی اس کا موبائل پورے زور و شور سے تھرتھرانے لگا تھا۔ اس نے چائے رکھ کر موبائل اٹھایا' عائشہ نے فون کرنے والے کو دل میں کوسا تھا۔

"ٹھہر کر نہیں کر سکتا تھا...... کم از کم چائے ہی پی لیتا۔" چمکتی اسکرین پر نام دیکھ کر جندب کو قدرے حیرت ہوئی تھی' موبائل کان اور کندھے کے درمیان رکھ کر کوٹ پہننا شروع کیا تھا۔ رسمی جملوں کے بعد پوچھا جانے والا لفظ "خیریت" تھا جو جندب نے خاصا حیرانی سے ادا کیا تھا کیوں کہ وہ یوں فون کرتا نہیں تھا اور پھر اس وقت تو بالکل بھی نہیں۔

"ہاں یار خیریت ہے' مجھے تم سے بات کرنا تھی جندب کس وقت فری ہو گے۔"

"ہاں ہاں بھائی آپ کریں' میں سن رہا ہوں۔" کہاں جندب نے تیزیاں مچا رکھی تھیں' اب ایک دم سے رک کر فون پر متوجہ ہو گیا' عائشہ کو اچنبھا ہوا وہ اشاروں سے پوچھ رہی تھیں۔

''کون ہے...... کون ہے......؟'' جندب نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بتایا تھا۔

''حنبل ہے۔'' اس کے فون کی عائشہ کو خاص خوشی نہیں ہوئی تھی لیکن پوری توجہ سے بات سننے کے لیے کان لے کر جندب کے قریب ہو گئی تھیں۔

''جندب! روائیہ سے کوئی رابطہ ہے تمہارا؟'' حنبل نے بہت ٹھہر ٹھہر کر جملہ ادا کیا تھا جیسے انسان کسی شرمساری سے بولنا ہی بھول جائے۔

''نہیں، رابطہ تو نہیں ہے لیکن یہ پتا ہے وہ کہاں رہ رہی ہے لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں' خیریت ہے ناں؟''

عائشہ نے اب ''کیا کہہ رہا ہے...... کیا کہہ رہا ہے......'' کے اشارے شروع کر دیئے تھے' جندب کو کوفت محسوس ہوئی اس نے ایک بار حنبل کو روکا۔

''ایک منٹ بھائی۔'' مائیک پر ہاتھ رکھ کر عائشہ سے مخاطب ہوا تھا۔

''بات کرنے دیں گی آپ مجھے۔''

''ناشتا تو کر لیتے' بعد میں کر لینا بات۔'' وہ مدھم سا شکوہ کر رہی تھیں اس نے مدھم جواب دیا۔

''کر لیتا ہوں پلیز بات کرنے دیں۔'' اور پھر حنبل سے کہا۔

''جی کیا کہہ رہے تھے آپ۔'' وہ فون پر متوجہ تھا' عائشہ سامنے بیٹھی مسلسل اسے گھور رہی تھیں۔

''یار مجھے اس سے بہت ضروری کام ہے' ٹھیک ہے وہ مجھے سننا' دیکھنا نہیں چاہتی مگر میرے بچے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں عدن اسے دینا چاہتا ہوں پلیز......'' اس کی بات سن کر جندب کے چہرے پر اک استہزا سا پھیل گیا تھا اور دل میں خیال ابھرا۔

''ہونہہ...... اپنے بچے سے چھ ماہ میں تنگ آ گئے اور اس کی ہمت دیکھو وہ غیر کے بچے کو سالوں سے تنہا پال رہی ہے۔ لے کر تو ایسے گئے تھے جیسے صرف تم اس کے وارث ہو۔'' ابھی جانے جندب اور کیا کیا سوچتا لیکن اس کی سوچوں کو بریک حنبل کی اس اطلاع نے لگائی جو بتانے کے لیے اس نے فون کیا تھا۔ جندب کی آنکھیں سن کر پھیلتی جا رہی تھیں' اسے اپنی سوچ پر شرمندگی ہوئی۔

''کب...... کب سے مسئلہ ہے آپ کے ساتھ' پہلے تو آپ نے ذکر نہیں کیا۔''

''مسئلہ تو بہت عرصے سے چل رہا تھا' بس میں نے توجہ نہیں دی۔ اصل میں' میں ٹرانسپلانٹ سے نہیں گھبرا رہا' مجھے عدن کی فکر ہے۔ بالفرض اگر مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو اس کا کیا بنے گا' ہماری علیحدگی میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے یار!''

''نہیں نہیں...... آپ بالکل پریشان مت ہوں' اپنا ٹریٹ منٹ کروائیں ٹھیک ہو جائیں گے اور عدن کی جانب سے ریلیکس رہیں۔ میں کرتا ہوں کچھ بلکہ آج...... آج ہی اس سے رابطہ کرتا ہوں۔'' اس نے حنبل کو بہت سے تسلی آمیز جملے کہہ کر فون بند کیا اس کی نگاہ عائشہ پر گئی جو اچھی خاصی ناراض دکھائی دے رہی تھیں۔

''اب آپ کو کیا ہوا' خفا کیوں ہیں؟''

''میرے اکلوتے بیٹے کے پاس' صرف میرے لیے وقت نہیں ہے باقی تو سارے جہاں کے لیے ہے۔ کیا اب خفا بھی نہ ہوں۔''

''اوہو ممی...... میرا سارا ٹائم آپ کا ہے بس یہ ایک دو کام نمٹ جائیں پھر جیسے آپ کہیں گی ویسے کروں گا' آئی پرامس۔'' عائشہ نے چہرہ ایسے پھیرا جیسے کہا ہو ''دیکھوں گی......'' جندب ابھی بھی کہہ رہا تھا۔

''مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔ پلیز آپ ایسا کر دیں میرے لاکر سے میرے ڈاکومنٹس اکٹھے کر دیں۔ مجھے آسٹریلیا کے لیے اپلائی کرنا ہے پلیز......''

''تم آسٹریلیا جا رہے ہو' خیریت؟'' اپنے کمرے سے نکلتے رضا حیات اچھا خاصا چونک گئے تھے۔

''ہاں ابھی تک تو خیریت ہے لیکن وہاں جا کر نہیں ہو گی۔'' وہ چبا کر بولا تھا۔

''کیا مطلب ہے' میں سمجھا نہیں' کیوں جا رہے ہو یوں اچانک......''

''اس کا دماغ ٹھیک کرنے جا رہا ہوں۔'' دونوں میاں بیوی نے چونک کر اسے دیکھا تھا یک دم جندب کے چہرے پر بہت سا غصہ آ گرا تھا۔

''جانے خود کو سمجھتی کیا ہے' جو چاہے گی اپنے ساتھ کرتی رہے گی۔ اسے کوئی روک ٹوک والا نہیں ہے' میں نے جتنا برداشت کرنا تھا کر لیا اب ڈیڈی! میرے برداشت کی حدیں جواب دے گئی ہیں۔ اس نے زندگی کو تماشا بنا رکھا ہے' خود بڑے بڑے فیصلے کرتی پھرتی ہے اگر وہ اس وقت میرے سامنے ہوتی رکھ کے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارتا' جب فیصلے کرنے نہیں آتے' کرنے ضرور ہیں۔''

''ہوا کیا ہے بھائی۔'' جندب کو اتنے غصے میں پہلی بار انہوں نے دیکھا تھا اس کا دہکتا سرخ رنگ دیکھ کر عائشہ کی تو سٹی گم ہو گئی' رضا حیات قریب آئے تھے۔

''خیریت بھی ہے' کیوں صبح ہی صبح اس پر غصہ ہو رہے ہیں۔''

''نہیں ہے خیریت۔'' جندب نے گردن جھٹکے سے گرم پڑتے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور گہرا سانس لے کر کہا تھا۔

''حنبل کی سیریس کنڈیشن ہے' عدن کو شیلٹر چاہیے۔'' وہ کہہ کر آفس کے لیے نکلا جاتے جاتے ایک بار پھر عائشہ کو اپنے پیپرز کی یاددہانی کروا گیا تھا۔

☆☆☆

رضا حیات حنبل کا سنتے ہی گم صم ہو گئے تھے۔

''عدن کو شیلٹر چاہیے...... یعنی ازمیر کے لاڈلے کو...... اتنی منتوں مرادوں سے ہونے والی ازمیر کی اولاد' بے سروسامانی کی حد پر ہے۔'' ان کا دل اب ڈوب جا رہا تھا' انہوں نے فون پر جندب سے ساری تفصیل پتا کر لی تھی پھر حنبل کو بھی فون کر کے تسلی دی۔

''اللہ سب بہتر کرے گا بیٹا...... اور عدن کی طرف سے بالکل پریشان مت ہو۔ میں تمہارے پاس جرمنی آنے کی کوشش کرتا ہوں' اکیلے نہیں ہو تم۔''

''نہیں نہیں انکل...... آپ اتنا تردد مت کریں' بس دعا کر دیجیے گا۔''

''تم نہیں سمجھ سکتے حنبل! تم کس کا حوالہ ہو' میری کوئی دعا ایسی نہیں ہے جس میں ازمیر کی مغفرت اور اس کی اولاد کی خوشیاں نہ شامل ہوں۔'' رضا حیات کے لہجے کی حلاوت نے سمندروں پار بیٹھے حنبل کو ایک بار پھر سے شرمندگی کی دلدل میں اتارا۔

''کتنا غلط سوچتا رہا تھا وہ اس فیملی کے بارے میں' جب آخری کال رضا حیات نے کی' کس طرح فون توڑ کر کرچی کرچی کر دیا تھا۔ کاش وہ ان کی بات سن لیتا شاید پھر کچھ بھی ایسا نہ ہوتا۔''

☆☆☆

اعشال کو پتا چل چکا تھا انہیں پاکستان آئے تین مہینے سے زیادہ ہو چکے ہیں' سب لوگ جا کر مل آئے تھے' عیادت کر آئے تھے اور ان کی کنڈیشن بہت صدمے سے بتاتے بھی تھے پھر بھی کچھ ایسا تھا وہ ابھی تک فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔ اسے ان سے ملنا جانا چاہیے یا نہیں اور اگر وہ جائے گی تو کیا افسوس کر پائے گی؟ اس نے جب جب آئمہ کو الٹی سیدھی حرکتیں کرتے دیکھا ہر بار یہی سوچا تھا۔

''یہ سب تو سلوئیٰ خالہ آپ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔'' لیکن اب جب ان کے ساتھ اتنا کچھ ہو چکا تھا تو ہمت نہیں کر پا رہی تھی ان کے پاس جا کر انہیں اس حال میں دیکھنے کی۔ اعشال کو فیصلہ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا آئمہ بیگم اپنے کمرے سے نکلیں عجیب مضحکہ خیز میک اپ کر کے فینسی سوٹ پہنے چادر اوڑھے باہر کی جانب جانے لگیں' اعشال نے آگے بڑھ کر روکا تھا۔

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''اذلان کی شادی کا کارڈ دینے جا رہی ہوں سلوئیٰ کی طرف' وہ عمرہ سے ہی واپس آ گئی ہے' حج پر بھی جانا ہے اس نے یہ نہ ہو چلی گئی ہو۔'' آئمہ کی

احمقانہ بات پر اسے ہنسنے کے بجائے رونا آ گیا۔ حج کوئی ہر ماہ تھوڑا ہوتا ہے جاؤ' جا کر' کر آؤ۔ یہ بھی سچ تھا ازلان کی شادی پر وہ عمرہ پر سے آئی تھیں اور تین ماہ بعد حج پر انہوں نے جانا تھا۔ اس قدر ذہنی ابتری میں بھی آئمہ کو یہ بات یاد تھی' بس یہ نہیں پتا تھا اپنا کیا حلیہ بنا کر پھرتی ہیں۔ اعشال نے ان کی نرس کو آواز دے کر انہیں سنبھالنے کا کہا اور خود اٹھ کر سلویٰ سے ملنے چلی گئی۔

''اس کی ماں کو اس حال تک پہچانے والی کا حال تو جا کر دیکھے۔''

☆☆☆

وہ سلویٰ کا عالی شان محل کا پر آسائش کمرہ تھا جس کے بہترین بیڈ پر وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ سلویٰ بہت حسین تو نہیں لیکن اس کی اٹھان میں ایک تمکنت ضرور ہوا کرتی تھی جو اس وقت سانولے بدن میں زردی گھلے وجود میں مفقود لگ رہی تھی۔ اعشال مدھم سا سلام کر کے ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ سلویٰ کی نرس اعشال کو آتا دیکھ کر باہر نکل گئی۔

اس وقت دونوں بھانجی خالہ — کمرے میں تھیں اور ان کے بیچ صرف خاموشی' کسی وقت میں وہ بہترین دوست رہ چکی تھیں ایک دوسرے کے درد کو اپنی دل پر محسوس کرتی تھیں لیکن وقت نے بہت کچھ بدل دیا تھا۔ احساسات' جذبات یہاں تک کہ خلوص بھی' سلویٰ نے اعشال کو دیکھ کر خفگی سے چہرہ دوسری جانب موڑا۔ اعشال نے دکھ بھری سانس کھینچی تھی۔

''سلویٰ خالہ یہ مت سمجھنا میں نے آپ کو بددعا دی تو یہ سب ہوا' یہ سب سزا ہے۔ ہمیں بچپن میں بتایا جاتا ہے اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے' ہم بھی ایسے ڈھیٹ ہیں اس بات کو تب تک نہیں سمجھ پاتے جب تک کہ ہم اس لاٹھی کی دھمک سن نہ لیں۔'' سلویٰ نے میکانکی انداز میں اسے دیکھا تھا اعشال کی آنکھوں میں بہت سا پانی بھر آیا۔

''تمہیں اس لاٹھی کو اکسانا نہیں چاہیے کہ وہ اندھا دھند ہم پر برسنی شروع ہو جائے پھر اس بے آواز لاٹھی کا ارتعاش ہمارے کانوں کے پردے تک پھاڑ دیتا ہے خالہ!'' اعشال کہتے کہتے ہچکولے لے کر رونے لگی تھی' کتنی دیر اس کے آنسو بہتے رہے' بہت سا رو لینے کے بعد اپنا چہرہ پونچھ کر خالہ کے پاس آ بیٹھی۔

''کاش ہم الفاظ سے سمجھ جائیں...... اپنی زندگیوں پر ان سے تجربے نہ کریں۔'' خاموش بیٹھی سلویٰ کے آنسو دونوں آنکھوں سے پھسلتے گالوں اور منہ میں جا رہے تھے اور وہ اس وقت اتنی محتاج تھی، اپنے آنسو خود بھی صاف نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بے بسی سے اپنے کندھوں کی جانب دیکھا، وہاں آستین تو جڑی تھیں، مگر ان میں بازو مکمل نہیں تھے۔ ایک کہنی سے خاصا اوپر تک کٹا تھا ایک کلائی تک۔

عمرے کے بعد وہ جلد اس لیے آ گئی تھی، تاکہ اپنے اکلوتے بھانجے کی شادی میں شامل ہو سکے۔ ازلان کے سہرا تو کیا سجنا تھا وہ تو کفن میں لپٹ گیا تھا۔ جس کے صدمے سے آئمہ بالکل پاگل ہو گئی تھیں۔ سلویٰ کچھ وقت ہی پاکستان رہی تھی۔ حج کی درخواست تو پہلے ہی دے رکھی تھی، وہ تو نامنظور ہوئی تھی، لیکن سلویٰ میں حج کرنے کی تڑپ بہت تھی۔ ویسے بھی دل پر گناہوں کا بوجھ اتنا بڑھ چکا تھا، اللہ کے گھر بیٹھ کر رو لینے سے ہلکا کرنا چاہتی تھی اور حروف عام میں حج گناہوں کو ایسے دھو دیتا ہے جیسے پہلے دن کا پیدا ہوا بچہ، سوچنا یہ ہے کیا سارے گناہوں کو دھو دیتا ہے ایک حج...... تو پھر فرعون نے مرنے سے پہلے حج کیوں نہیں کر لیا تھا۔ کیا اللہ کے پاس نوری و ناری مخلوق کم ہے جو اس کی عبادت و شکر گزاری نہ کر سکیں، اس لیے اسے خاکی کے طواف و قیام کی ضرورت ہے۔ یہ طواف، قیام سجدے تو بہانا ہیں، بندے میں بندگی پیدا کرنے کا...... ورنہ اللہ تو اپنے خاکی سے اتنا سا چاہتا ہے، اس کے خاکی کو خاک نہ اڑائے کوئی اور ہم اس کے خاکی کو پاؤں کی دھول بنا کر جھاڑتے ہوئے حرم کی زمین پر لمبے سجدے کرتے ہیں۔ کیا

واقعی رب اس سجدے سے خوش ہو جاتا ہوگا؟ خیر یہ معاملہ تو خالق اور اس کی کریمی کا ہے، وہ سجدہ قبول کرے یا مداوا لے لے۔ سلویٰ ذاتی خرچ پر اپنے میاں کے ساتھ حج پر گئی تھی۔ بہت سا خرچا کر کے۔

اللہ نے تو راضی ہونے کا اتنا آسان نسخہ بتایا ہے، جس کا دل توڑا، اس کا دل جوڑ دو، اللہ خود راضی ہو جائے گا۔ زیادتی اگر مخلوق سے کی ہے تو معافی بھی مخلوق سے مانگ لو، خالق تو بنا سجدے کے معاف کر دے گا۔ مخلوق سے معافی مانگنا انا کو ٹھیس دیتا ہے، انا جو بہت پیاری ہے۔ سلویٰ بھی اپنی انا کو اونچا کر کے اللہ کی مخلوق میں دراڑ ڈال کر اپنے گناہ حرم کی زمین پر دھونے گئی تھی۔

اس رات حرم میں بہت بارش ہوئی تھی۔ شدید طوفانی بارش، حرم میں کم کم بارشیں ہوتی ہیں۔ جانے وہ رحمت تھی یا جلال...... یا کسی کے لیے رحمت، کسی کے لیے جلال۔ وہ ذوالحج کی شروع کی تاریخیں تھیں، بہت سے حاجی حرم میں پہنچ چکے تھے۔ ہر سال حاجیوں کی تعداد میں اضافے کے سبب حرم میں تعمیراتی کام مسلسل ہو رہے ہیں اور تب بھی ہو رہے تھے۔

سلویٰ اور اس کا میاں طواف کی غرض سے ادھر آ نکلے تھے۔ حالانکہ ان کے ساتھیوں کا وہ وقت نہیں تھا۔ ان کے پیچھے شاید سوڈانی یا ایرانی قافلے تھے۔ جس سے اسے چھوٹا سا دھکا لگا تھا اور وہ اپنی جگہ سے ایک لمحے میں چند گز آگے ہو گئی تھی، عین اسی وقت تعمیراتی کرین کا حصہ کھل کر اس پر آ گرا تھا۔ اس حادثے کا شکار صرف سلویٰ نہیں بہت سے لوگ ہوئے تھے، کتنی جانیں چلی گئی تھیں۔ سلویٰ کے تو صرف دونوں بازو کٹے تھے۔ اب وہ ان کٹے بازوں کو لیے اپنے کمرے تک محدود تھی۔ اعشال کے جملوں سے اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ اس نے صرف اسے اتنا کہا تھا۔ ''اعشال پلیز یہاں سے چلی جاؤ۔''

''میرے چلے جانے سے آپ کی تکلیف کم نہیں ہو گی خالہ...... زندگی کبھی بھی موقع دے جا چکی سے معافی مانگ لینا۔ یہ تو نہیں کہوں گی بازو واپس آ جائیں گے۔ البتہ سکون ضرور مل جائے گا۔'' اعشال کہہ کر رکی نہیں تھی۔ فوراً باہر نکل گئی۔ سلویٰ کو ماں جان کے منہ سے کبھی کا سنا جملہ یاد آ گیا۔

''اللہ کی طاقت کو آزمانا نہیں چاہیے، بنا دیکھے یقین کرنا چاہیے...... بڑا غضب ناک ہے وہ اگر جلال میں آ جائے۔''

☆☆☆

اس کی کئی دنوں سے عجیب سی کیفیت تھی، ہر چیز سے اکتاہٹ اور بے زاری ہوتی جا رہی تھی آؤٹ لیٹ پر جاتی، کام کرتی گھر آ جاتی، رابی کے کسی کام میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ جس اسکول میں اس کا ایڈمیشن ہوا تھا۔ وہاں پہلا فنکشن تھا رابی کا اس نے روائیہ کو ساتھ لے جانے کی ضد بھی کی تھی، مگر وہ طبیعت خرابی کا بہانا کیے گھر میں پڑی رہی۔ رابی اس سے خفا بھی ہوئی تھی، لیکن اس نے اسے منا ہی لیا تھا۔

اک زندگی تھی جو چل سو چل پانی پر بہتے تنکے کی مانند تیر رہی تھی۔ نہ کھانے میں رغبت نہ پکانے میں اور آج صبح کا ہی واقعہ تھا، رابی گھر کے باہر بنے اسٹیپ پر بیٹھی کسی بچے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اسے چوٹ کیسے لگی، بچے نے مارا یا گر گئی، اس کے ماتھے پر گومڑ سا ابھر آیا تھا۔ وہ روتی ہوئی اندر آئی تھی، اگر یہ ہی معاملہ آج سے سات آٹھ ماہ پہلے ہوا ہوتا۔ وہ رابی کی طرح رونے لگتی، مگر اس وقت وہ اس کے ماتھے کو دیکھے گئی اور پھر سرد سے لہجے میں پوچھا تھا۔

''کیا ہوا...... کہاں سے چوٹ لگی؟'' رابی جواب دینے کے بجائے اس کی ٹانگوں سے لپٹ بری طرح رونے لگی۔ روائیہ نے چند پل اسے روتے ہوئے دیکھا، پھر گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گئی، اسے کندھوں سے پکڑ کر گہرے انداز میں کہہ رہی تھی۔

''رابی تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے، انسان کو اپنا خیال خود رکھنا ہوتا ہے، کوئی تمہارا خیال رکھنے کو آگے

نہیں بڑھتا، میں یہ سب تمہیں بار بار نہیں بتاؤں گی۔ تمہیں خود یاد رکھنا ہوگا۔ اگر خود کو، خود نہ بچاؤ تو دنیا اسے کچل دیتی ہے، مار دیتے ہیں لوگ اسے۔" اس نے رابی کا روتا ہوا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر لیا، آواز بالکل روندھتے ہوئے حلق سے چپک رہی تھی۔ "یہ چوٹ تو ختم ہو جائے گی رابی، مگر درد رہ جائے گا۔ بے دھیانی میں کھائی چوٹیں بہت درد دیتی ہیں۔" رابی اس کے کندھے سے لپٹ گئی۔ روائیہ کا بھی جی چاہا روئے بہت روئے آنکھیں پانی سے بھر بھی گئیں تھیں، مگر چھلک نہیں رہی تھیں، صرف دل بوجھل تھا، دل کے بوجھل پن نے آنکھیں بے حد بھاری کردیں، وہ چھلکنے کے بجائے پتھر کی بن گئی تھیں۔

کچھ دیر گزرنے کے بعد اسے لگا تھا جیسے کوئی ڈرائنگ روم میں آیا ہے اور فلوریہ کے ساتھ باتیں کررہا ہے۔ فلوریہ خاصی سوشل تھی، اس سے اکثر لوگ ملنے آتے رہتے تھے۔ اس نے بھی نیچے اس کی پورشن میں جھانکا نہیں تھا۔ اگر دیکھنا ہے تو سیڑھیوں کے پاس لگی گرل سے ذرا سا جھانکے ڈرائنگ روم صاف دکھائی دیتا تھا۔ لیکن ٹوہ لینے کی روائیہ کی عادت کبھی رہی نہیں تھی۔ مگر اس وقت اس کا جی چاہا وہ آنے والے مہمان کو دیکھے، کون ہے۔ جس سے فلوریہ مسلسل بول رہی ہے۔ جب فلوریہ کی آواز تھمی تو سیڑھیوں پر چاپ ابھرنے لگی۔

روائیہ کا دو کمروں کا پورشن تھا۔ جس کے آگے ایک چھوٹا سا کوریڈور تھا۔ اس نے کوریڈور میں نکل کر دیکھا تھا۔ آنے والا کوریڈور میں قدم رکھ چکا تھا۔ لمحہ بھر کو تو وہ ساکت سی رہ گئی تھی۔ بالکل بت کی مانند، لیکن رابی اس نے دیکھتے ہی خوشی سے چیخ ماری اور بھاگ کر جندب کی گود میں چڑھ گئی۔ دونوں بازو اس کی گردن میں ڈالے، چٹاچٹ اس کا منہ چوم رہی تھی۔ ماہم، رضا حیات، عائشہ سب کا بے تابی سے پوچھتی گلے لگا رہی تھی۔ وہ اس کو مسکرا کر جواب دیتا آگے بڑھا اور ذومعنی لہجے میں بہت آہستگی سے بولا تھا۔

"کیا تعلق اتنا خراب ہوچکا ہے، اندر آنے کا بھی نہیں کہو گی۔" روائیہ نے سامنے سے ہٹتے ہوئے استہزا میں گال پھیلایا۔

"روکوں گی تو کون سا رک جاؤ گے۔"

"انفیکٹ۔" کوریڈور کے اختتام پر بنے چھوٹے سے لاؤنج کے صوفے پر دھپ سے بیٹھتے بولا تھا۔ "تم بحرالکاہل میں بھی اتر جاؤ نا۔ وہاں سے بھی نکال لاؤں گا۔"

اسے وہاں آئے تقریباً دو دن گزر چکے تھے۔ اتنا روائیہ کو یقین تھا، اسے، میرڈین سے اس کی معلومات ملی ہوں گی، لیکن نہ اس نے کچھ پوچھا، نہ ہی جندب نے خود سے کچھ بتایا، بس معمول کی گفتگو ایسے ہوتی رہی جیسے کبھی کوئی دوری آئی ہی نہ ہو۔ وہ ایک سرد رات تھی، کھانے کے بعد رابی کو سلا کر وہ باہر ٹیرس پر آ کھڑی ہوئی، ٹھنڈی رات کا سناٹا اور ٹم ٹم ہوتی روشنی جندب جانے کب اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا اور بہت حیرانی سے بولا تھا۔

"تم ابھی تک سوئی نہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں...... نیند نہیں آرہی تھی۔"

"ہاں ہوتا ہے کبھی کبھی ایسا۔" وہ ریلنگ پر کہنیاں جما کر سامنے دیکھتا اس کی تائید کررہا تھا۔ "بعض اوقات ہم تھکے ہوئے بھی ہوتے ہیں، آنکھوں میں بہت سی خواب بھی ہوتے ہیں جنہیں اگر سوچتے سوجائیں تو پرسکون نیند آجائے، لیکن پھر بھی پلکیں بند نہیں ہوتیں، پشت بستر سے لگنے سے انکاری ہوجاتی ہے۔"

روائیہ نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر سامنے دیکھنے لگی جندب کبھی اچھا وکیل نہیں رہا تھا، لیکن آج اسے وکالت کرنا تھی، حنبل کی وکالت، اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کون سے لفظ لائے کہ روائیہ کے اندر کا سارا غبار نکل جائے، گردو غبار جب ڈھل جائے تو منظر بہت واضح نظر آتے ہیں۔ اس نے پہلے اپنا اندر دھونا شروع کیا تھا۔

"روائیہ یہ ٹین ایج بھی بہت عجیب عمر ہوتی ہے، انسان کو کوئی چیز پسند آجائے، اسے پانے کے لیے بہت آگے تک کوشش کرتا ہے، مجھے معلوم نہیں کیوں، کب، کیسے، لیکن تم مجھے بے تحاشا اچھی لگتی تھیں۔ اگر اس وقت مجھے کسی سے شدید اختلاف کرنا پڑتا تو میں کرتا، تمہیں پانے کے لیے میں کسی بھی حد تک چلا جاتا۔" روائیہ نے گردن پھیر کر اسے دیکھا، وہ سامنے جلتے بجھتے ستاروں کو دیکھ رہا تھا۔

"پھر تمہاری شادی ہوگئی، میرے اندر کی محبت مری نہیں تھی، بلکہ زور پکڑ گئی، بہت شدید غصہ آیا تھا تم پر، خود پر، اپنے ماں، باپ پر، حنبل پر، ہر ہر چیز پر، جو تمہیں مجھ سے چھین لے گئی، پھر وہ سارا غصہ ایک عجیب سے احساس میں ڈھل گیا کہ مجھے تمہیں خوش دیکھنا ہے، بہت خوش، مجھے ہر ہر وہ چیز اچھی لگنے لگی جو تمہیں اچھی لگتی تھی، تمہیں رابی پسند تھی، مجھے رابی سے پیار ہوگیا، تمہیں اپنا بزنس اچھا لگتا تھا، میں اس میں انٹرسٹ لینے لگا اور ان سب سے پہلے تمہیں حنبل پسند تھا۔ میں اس کے لیے دعائیں مانگنے لگا۔" اس جملے پر روائیہ نے میکانکی انداز میں گردن پھیری اور دانت جماتے کہا تھا۔

"نہیں پسند تھا وہ مجھے۔ کبھی نہیں۔ اذیت ہے وہ میرے لیے، صرف اذیت۔"

"اچھا......" جندب کو اچنبھا ہوا۔ "یہاں میں کیسے دھوکا کھا گیا میں تو سمجھتا رہا تمہیں اس سے محبت ہے، میں تو اس کی زندگی کی دعائیں مانگتا رہا۔ یعنی میں تمہارے لیے اذیت مانگتا رہا۔" روائیہ نے گردن جھٹک کر دوسری جانب رخ پھیر لیا، مگر جندب اپنی روانی میں بولتا جارہا تھا۔ "پھر تو روائیہ ہمیں خوش ہونا چاہیے تمہاری زندگی سے یہ اذیت نکلنے والی ہے، بہت جلد اس سے جان چھٹنے والی ہے، مبارک ہو یار۔" روائیہ کی بھنویں آہستہ آہستہ سمٹیں۔

"وہ تمہارے لیے اذیت بنا، اللہ اسے اذیت کی موت مار رہا ہے، امیزنگ۔" روائیہ نے سر اٹھا کر جندب کو دیکھا تھا، وہ مسکرا رہا تھا، روائیہ کا منہ ایسے کھلا جیسے درد سے کھل گیا ہو، اسے لگا اس کا دل رک رک کر چلا ہو۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں وائیہ" وہ ایسے جیسے بہت خوشی کی خبر ہو اور روائیہ کی آواز کسی کنویں سے نکلی تھی۔

"کیا ہوا ہے...... اسے۔"

"تمہیں نہیں پتا۔ اس کی کڈنیز فیل ہوگئے ہیں، دس پندرہ دن تک ٹرانسپلانٹ ہے اس کا۔ بتا رہا تھا ڈاکٹرز زیادہ پرامید نہیں ہیں، اسی لیے اپنے بچے کو کسی کی کسٹڈی (تحویل) میں دینا چاہتا ہے۔ کوئی شلٹر ہوم دیکھ رہا ہے یا بے اولاد کپل۔" اس نے ایسے کندھے اچکائے جیسے خس کم جہاں پاک اور روائیہ کی ساری جان نکل گئی تھی۔ وہ تقریباً چلا کر بولی تھی۔

"وہ ایسا کیسے کرسکتا ہے۔ وہ عدن کو کیسے کسی کو دے سکتا ہے۔" اس نے ہذیانی کیفیت میں آگے بڑھ کر جندب کا گریبان پکڑ لیا اور آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھیں جندب کے چہرے پر پھسل رہی تھیں، کتنے آنسو یک دم اس کے رخساروں پر لڑھکے، ان سے جندب کو تکلیف بہت ہوئی تھی، لیکن اس نے محسوس ہونے نہیں دیا۔ "جندب وہ اتنا کٹھور کیسے بن سکتا ہے۔ وہ کیسے میرا بچہ کسی کو دے سکتا ہے۔"

"تمہارا بچہ......!" جندب کے جتا کر کہنے پر اس نے اس کی دبوچی شرٹ چھوڑی۔ "ہاں میرا بچہ...... عدن میرا بچہ ہے۔"

روائیہ نے سینے پر ہاتھ لپیٹتے ہوئے رخ پھیر لیا۔ آواز دھیمی ہوتی گئی۔ "یہ سب میرے ساتھ کیا ہورہا ہے اور حنبل اسے اتنی بڑی تکلیف کیسے ہوگئی، اس نے اپنا علاج کیوں نہیں کروایا۔"

"وہ بھی تمہاری ہی طرح خود کو اذیت دینا چاہتا ہوگا۔" جندب لمحہ بھر چپ رہ کر دوبارہ سے بولا تھا۔

"ویسے روائیہ غلطیاں تو تمہاری بھی ہیں۔ تم ماں تھیں، تم نے آئمہ کی باتوں پر کیسے یقین کرلیا، تمہاری بچی پری میچور ہے۔"

"جندب مجھے یہ کسی نے نہیں بتایا۔ مجھے تو کہا تھا رابی کو یرقان ہے، اس لیے نرسری میں ہے۔ میں تو

حنبل کے منہ سے سن کر حیران رہ گئی تھی، اوپر سے آئمہ بھرجائی کے جملے...... میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔''

'' پھر جب تمہارا دماغ ماؤف ہو سکتا ہے، تو حنبل کو یقین دلانے کے لیے کون کون سے جال نہیں پھینکے ہوں گے۔'' جندب اس کا ذہن صاف کرنے میں اچھی خاصی مدد کر رہا تھا۔ ''اور بہت سے شواہد تو تم خود فراہم کرتی رہیں۔ ایک لڑکی کسی شادی پر رہنے کے لیے اپنی مرضی سے آئے، آدھی رات کا وقت دیکھے بغیر غصے میں اپنے گھر چلی جائے، اس بات کے کتنے مطلب نکلتے ہیں۔ کیا تم نے بھی سوچا۔ صرف میں نے مس بی ہیو ہی کیا تھا، تم نے اپنے ساتھ کیا کر ڈالا۔ پھر اس رات میں نے رکنے کی غلطی کی حویلی میں، اس غلطی پر مہر تم نے لگائی۔ بھلے وہ تمہارا گھر تھا، مگر اس گھر میں کتنے اور لوگ بھی رہتے تھے۔ مخالفین بھی حمایتی بھی، تمہیں یوں آنا چاہیے تھا؟

'' مجھے بھرجائی نے کہا تھا، وہاں جا کر مل لو۔''

اس شاطر عورت کی بات مت کرو روائیہ، اس نے تو تمہیں تمہاری زندگی کی پہلی خوشی اپنے شوہر سے شیئر کرنے سے بھی منع کیا تھا۔ اگر تم اس وقت حنبل کو بتا دیتیں، ہو سکتا ہے اسے دن مہینوں کا حساب تم سے بہتر یاد رہتا۔''

'' میں ڈر گئی تھی، وہ وہاں بہت پریشان تھا، میں تو اس کی پریشانی کے خوف سے ہر ہر بات اس سے چھپا رہی تھی، میں نے تو اسے یہ تک نہیں بتلایا، اذلان نے میرے ساتھ کیا، کیا تھا۔'' جندب یک لخت چونک گیا، یہ بات تو اسے بھی معلوم نہ تھی۔

'' کیا...... کیا کیا تھا اذلان نے......'' وہ چپ رہی، وہ سامنے آ کھڑا ہوا۔ ''بولو...... بتاؤ مجھے...... کیا، کیا تھا۔''

'' یہ ہی بتانے ماہم کی شادی پر آئی تھی۔ تم نے میری بات نہیں سنی۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

'' تب دماغ خراب تھا میرا۔ مگر اب بتاؤ۔''

'' کیا کچھ نہیں تھا...... لیکن اس کا ارادہ بہت غلط تھا۔ وہ بہت گندی نیت سے میرے کمرے میں آیا تھا۔ اگر بروقت حنبل کا فون نہ آتا تو جانے......''

'' اوہو......'' جندب کی سانس تاسف سے رک گئی تھی۔ ''اور تم نے حنبل کو اس وقت بھی کچھ نہیں بتایا ہوگا۔'' روتے ہوئے وہ نفی میں سر ہلاتی رہی۔ ''تف ہے تم پر...... روائیہ تف ہے تم پر...... اتنا برا حملہ تم پر ہونے لگا اور تم نے اپنے شوہر سے چھپایا۔ وہ جس نے تمہیں پناہ دینی تھی، جس کی تم ذمہ داری اس سے تم نے چھپایا۔ اگر تم اسے بتاتیں تو کیا وہ تمہیں لینے نہ آتا۔ وہ کچھ بھی کرتا، مگر تمہیں تحفظ ضرور دیتا۔ پھر یہ سب تمہارے ساتھ نہ ہوتا۔ تم نے تو خود دشمن کے راستے صاف کیے، اپنے پاؤں کاٹے، پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو صرف حنبل بے اعتبار ہوا، تم نے اس ذہنی اذیت میں کیسی کیسی باتیں کیں ہوں گی حنبل سے اور کیسے کارگر ہوئیں۔ اف...... اب وہ شخص مر رہا ہے روائیہ...... تم سے معافی مانگ رہا ہے۔''

'' اس نے معافی مانگی؟'' اس کے سوالیہ انداز پر وہ غصے سے بولا تھا۔

'' وہ تمہارے پاؤں میں گرے، گڑگڑائے، تب تمہیں لگے گا کہ وہ معافی مانگ رہا ہے۔ وہ سراپا معافی بنا ہوا ہے روائیہ...... اور اگر تم اپنی طرف دیکھو تو بہت سی غلطیاں تمہاری طرف نکلتی ہیں۔ معافی تو تمہیں بھی مانگنی چاہیے۔ خیر......'' اس نے دکھ بھری سانس فضا میں چھوڑی۔ ''اب جلد فیصلہ کر لو، تمہیں عدن لینا ہے یا نہیں۔ حنبل کے پاس فیصلہ کرنے کے چند دن ہیں صرف۔''

اس نے جندب کی جانب دیکھتے ہوئے بے بسی سے نگاہیں اٹھائی تھیں۔ لہجہ ملتجی بن گیا۔ ''کیا حنبل واقعی نہیں بچے گا۔''

'' تم چاہتی ہو...... وہ بچ جائے۔'' اس نے جواب نہیں دیا، رخ پھیر لیا اور آنکھیں برستی رہیں۔

☆☆☆

یہ جرمن اسپتال کا کوریڈور تھا، جس کے ویٹنگ لاؤنج میں رضا حیات اور خیام ذکا ڈونر فیملی سے بات

چیت کر رہے تھے۔ روائیہ، جندب اور رابی کے ساتھ رات کسی وقت جرمنی پہنچے تھے۔

آسٹریلیا سے جرمنی آنے کے لیے سٹیٹس کنفرم کروانے میں تقریباً ایک ہفتہ لگ گیا تھا اور اس دوران اس نے اپنا تمام پھیلا کام سمیٹا۔ جب فلوریہ سے اپنے جانے کا ذکر کیا، پہلے تو اسے حیرت ہوئی، پھر صرف اتنا پوچھا تھا۔

'' کیا واپس آؤ گی؟'' وہ چپ رہی تھی، تو فلوریہ نے ایک اچھی خاصی اماؤنٹ اس کے اکاؤنٹ میں ڈلوا دی اور یہ کہا۔

'' یہ وہ تمام پیسا ہے جو میر تجمل آسکر کا تھا، مجھے خواہش تھی، میری اس رقم کا مجھ سے مطالبہ کرتی، اس نے نہیں کیا اور مجھے نہیں لگتا ہے تم اب واپس نہیں آؤ گی، بنا تمہارے مطالبے کے یہ تمہیں دینا چاہتی ہوں، تا کہ کل یسوع کے سامنے میں میر تجمل سے گردن اٹھا کر کہہ سکوں، میں نے اس کا حق نہیں کھایا۔'' وہ ان سے اچھے طریقے سے مل کر رخصت ہوئی تھی۔

جندب نے تو اسے باقاعدہ کہا تھا۔ ''اب تم اتنی امیر ہو گئی ہو، اپنے ساتھ میرا ٹکٹ بھی افورڈ کر سکتی ہو، نا صرف جرمنی کا بلکہ مجھے واپس پاکستان بھجوانے کا بھی...... تمہاری وجہ سے میرا اتنا پیسا لگا ہے۔''

جب وہ جرمنی پہنچے جندب نے کیب والے کو ایک ریسٹ ہاؤس کا بتایا۔ روائیہ کو اچنبھا ہوا تھا۔ وہ اسی وقت اسپتال جانا چاہتی تھی۔ جندب نے اسے گھر کا۔

'' اتنا سامان اٹھا کر، اسپتال دماغ خراب ہے تمہارا......'' وہ رات بھی بہت سی مشکلوں سے گزاری، راتوں کی طرح بہت بھاری گزری تھی، اس پر صبح ہوتے ہی اس نے عدن سے ملنے کا شور ڈال دیا تھا۔

جب وہ اسپتال پہنچے رضا حیات جو دو دن پہلے ہی حنبل سے ملنے جرمنی آئے تھے۔ سامنے بیٹھے خیام کو بھی آئے تیسرا دن تھا، ان سے کچھ فاصلے پر سیاہ چادر میں لپٹی اعشال بیٹھی تھی، جس کی گود میں عدن تھا، وہ عدن کے ہاتھ اپنی مٹھیوں میں دبائے بار بار چوم رہی تھی۔ حنبل کو خیام کے آنے پر تو حیرت نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اعشال کو دیکھ کر ضرور کہا تھا۔ ''بیٹا تم کیوں آئی ہو۔''

'' کیوں...... میرا کوئی حق نہیں رہا آپ پر...... یا اپنی ماں اور خالہ کے لیے جرم نے مجھے اتنا بڑا مجرم بنا دیا۔ میں آپ کی عیادت کرنے بھی نہیں آ سکتی۔''

حنبل نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اس کے سر پر بوسہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

'' کوئی مجرم نہیں ہے، میں خود مجرم تھا۔ اپنی ذمہ داریوں پر آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔''

'' چاچو آپ ٹھیک ہو جائیں گے، ان شاءاللہ۔''

'' اگر تم دعا کرو گی تو ضرور...... ان شاءاللہ۔''

عدن اتنی جلدی حنبل سے اٹیچ نہیں ہوا تھا، جس طرح اعشال سے گھل مل گیا تھا۔ اسے ویسے ہی آپیاں بہت پسند تھیں۔ اسی لیے وہ اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ اب اسپتال میں بھی اس کی گود میں تھا۔ روائیہ کو ادھر بڑھتا دیکھ کر اعشال یک دم کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے اعشال کو نظر انداز کیا تھا۔ اس کی نظریں گول مٹول سے بچے پر جمی تھیں۔ اس کی جانب بڑھتے قدم آہستہ آہستہ بھاری ہو رہے تھے، جسم کے مختلف حصوں میں درد اٹھنے لگا۔

وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گئی اور جھٹکے سے اسے خود میں بھینچ لیا تھا۔ ننھی گردن میں منہ چھپائے روائیہ کے سانسوں کی آواز ایسی گھٹی گھٹی تھی جیسے سمندر میں کوئی بڑی سی چیز تیرتی آ رہی ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے الگ ہوتے ہوئے اس کے چہرے کا ایک ایک نقش دیکھا۔ اس کے گال، آنکھیں، ناک، ہونٹ سب کو ایک ہی بوسے میں چوم رہی تھی۔ عدن خاصا گھبرا گیا تھا۔

'' عدن......'' اس کا چہرا اپنے ہاتھوں میں بھر کر روندھے لہجے میں بولی تھی۔ ''عدن...... تمہیں پتا ہے آج ہم نے پہلی بار آئینہ دیکھا ہے۔ ہم پہلی بار آئینہ دیکھ رہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کا عکس ہیں عدن۔''

اس کی دم توڑتی سسکاریوں پر رضا حیات

آگے بڑھے، اسے پیار کرتے ہوئے حوصلہ دیا تھا۔ زمین سے اٹھ کر اسے کچھ دیر خود کو نارمل کرنے میں لگی تھی، تب ہی اس کی نگاہ کوریڈور کے آخر میں بنے انتہائی نگہداشت کے یونٹ پر گئی تھی۔ اس کا دروازہ کھلا تھا۔ کئی ڈاکٹرز اور نرسیں نکل کر دوسری جانب باتیں کرتے جارہے تھے۔ وہ آہستگی سے اسی جانب چل پڑی۔ یونٹ کا پہلا دروازہ کھولنے پر ایک چھوٹی سی لاؤنج نما لابی تھی، جو خالی تھی، اس میں تین دروازے تھے، جیسے تین کمرے ہوں۔ ایک کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ اس نے آگے ہو کر اس میں جھانکا۔ وہاں پیشنٹ بیڈ پر ایک عورت لیٹی تھی، اس نے دوسرا کھولنا چاہا، وہ لاکڈ تھا۔ وہ تیسرے کی جانب بڑھی تھی، دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔

پیشنٹ بیڈ پر حنبل ذکا لیٹا تھا۔ اس کے بازوؤں پر بہت سی باریک نالیوں اور سوئیوں کا جال بنا تھا۔ نالیاں بالکل سیاہی مائل سرخ تھیں، جیسے ان میں سے خون آ، جا رہا ہو۔ اس کے آدھے چہرے پر ہلکے نیلے رنگ کا ٹرانسپیرنٹ ماسک چڑھا تھا، جس سے اسے سانس آ رہا تھا۔ دھنسی ہوئی آنکھیں سیاہ حلقوں میں بند تھیں۔ اسے دیکھ کر روائبہ کو اپنے قدم زمین میں دھنستے ہوئے محسوس ہوئے۔

"کیا یہ وہی مرد ہے، جس کی کشش سے وہ جگہ سج جاتی تھی، جہاں سے وہ گزرتا تھا۔ اس کی سانس رکنے لگی۔ حنبل کے گلے کنڈھ (نرخوا) آہستہ آہستہ گردن میں ڈوب رہا تھا۔ پانی میں تیرتی گرے پتلیاں اس ساکت وجود کو ٹٹولنے لگیں۔ روائبہ کو شاید چکر سا آیا تھا۔ اس نے سہارے کے لیے پیشنٹ بیڈ پر ہاتھ رکھے یا تو اس کی پوریں حنبل کی کلائی سے مس ہوئی تھیں یا اس کے آنسو حنبل کے بازو پر گرے تھے۔ اس کی بند پلکیں لرزش سے اٹھی تھیں۔ آنکھیں کھلی تو بند ہونا ہی بھول گئیں۔ وہ یہ تک بھول گیا تھا، اسے تو سانس ماسک سے آرہا ہے، اس کا آدھا دہانہ کھل گیا تھا۔ اس کی خشک آنکھوں میں جانے کہاں سے پانی اکٹھا ہونے لگا، ہونٹوں میں کپکپاہٹ پیدا ہوئی۔

بہت تکلیف کے باوجود اس نے بہت ہمت جمع کر کے اپنے دونوں بازو اوپر اٹھانے کی کوشش کی، اس کوشش میں اس کے بازو کانپ رہے تھے۔ مگر وہ اپنے دونوں ہاتھ ملانے کی پوری سعی کر رہا تھا۔ پیٹ کی جانب اوپر کو اٹھے ہاتھوں کی پوریں بمشکل ملی تھیں، جیسے وہ معافی کے انداز میں ہاتھ ملانا چاہتا ہو اور ملتجی نگاہ روائبہ پر تھی۔ روائبہ کا سر کسی بھاری سل کی طرح نفی میں سرکنے لگا۔ سرخ پڑتی ناک پھولتی پچکتی نم ہو گئی۔ اس نے فوراً سے حنبل کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"نہیں حنبل..... نہیں.....“ اس کا سر جھکا تھا اور ہونٹ حنبل کی انگلیاں پر رکھ دیے۔ "تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ پلیز ایسے نہیں کرو۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ چھوٹی چھوٹی سسکیاں بھرتے وہ بے ساختہ اس کے ہاتھ چوم رہی تھی۔ بازو ملنے سے اس کی چلتی ڈرپس رک گئی۔ اسی وقت ایک اٹینڈنٹ نرس اندر داخل ہوئی تھی۔ پیشنٹ پر ایک عورت کو بری طرح جھکے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ چیختے ہوئے انتہائی غصے میں آگے بڑھی، پیچھے سے کھینچ کر اسے سیدھا کیا۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ..... اندر آئیں کیسے۔“

"یہ میرے ہزبینڈ ہیں۔“ وہ منمنائی نرس نے شدید غصے میں باہر کی جانب انگلی کرتے کہا تھا۔

"باہر..... باہر۔“ جب وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی تو وہ اسے کھینچتی ہوئی باہر لے گئی تھی اور حنبل ترستی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

اسپتال کوریڈور میں ڈاکٹرز کے قدموں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ مختلف دروازے کھلتے بند ہوجاتے۔ ڈاکٹرز کی ایک ٹیم جدید طرز کے بنے آپریشن تھیٹر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ حنبل کو بہت پہلے ہی او ٹی میں لے جایا جا چکا تھا۔ وہ ویٹنگ لاؤنج کے صوفے کے اوپر پاؤں سمٹے بیٹھی تھی اور دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ رکھے تھے۔ اس کی بند آنکھوں کے سامنے وہ تمام مناظر آ..... آ کر رکے، جو چند ماہ

حنبل کے ساتھ گزارے کتنے خوب صورت لمحے تھے۔ مگر ان لمحوں کی عمر بہت کم تھی۔ پھر اسے وہ سب باتیں یاد آنے لگیں۔ جو وہ اس سے فون پر کرتی رہی تھی۔ کوئی معافی مانگے، معاف کر دینا چاہیے۔ بہت کچھ ہے جو تمہیں نہیں پتا۔ سرپرائز..... تم غصہ کرو گے..... سوری..... باتیں وہی تھیں صرف سوچنے کا انداز بدل گیا۔ اسے اپنا آپ ہی مجرم لگا تھا۔

جندب کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ دوسری جانب اعشال آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے روائبہ کے قریب ہوتے ہوئے اس کے ہاتھوں پر حوصلہ دیتے ہوئے ہاتھ رکھا تھا۔ روائبہ نے غیر محسوس طریقے سے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال لیے، جیسے پولنگ سے واپسی پر اعشال نے اس کے ہاتھوں کے نیچے سے نکال لیے تھے۔ دونوں کو ہی وہ وقت یاد آ گیا تھا۔ اعشال سنبھل کر بیٹھ گئی اور مدھم لہجے میں بولی تھی۔

"انسانوں سے ہی خطائیں اور غلطیاں ہوتی ہیں اور بیشتر خطائیں تو ایسی ہوتی ہیں جن کا خمیازہ ہم دنیا میں ہی سود سمیت بھر لیتے ہیں، لیکن پھر بھی اگر جس سے زیادتی کی گئی ہو، اس سے معافی نہ مانگی جائے، اللہ پاک معاف نہیں کرتا۔ آپ سے زیادتی کرنے والے سود کے ساتھ سزا بھگت رہے ہیں، پلیز انہیں معاف کر دیں۔“ روائبہ بالکل چپ رہی، جندب البتہ اس کے جملوں پر چونک گیا تھا۔ نظریں ترچھی کر کے اس کا بے ریا چہرا دیکھا تھا۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔

"اللہ پاک کے ننانوے صفاتی نام ہیں، ننانوے ناموں میں وہ کچھ کسی کو اپنا شریک نہیں بناتا، سوائے ننانوے نام عفو کے..... معاف کرنے والا..... اللہ پاک چاہتا ہے اس کا بندہ اس صفت میں اس کا شریک بن جائے۔ معاف کرنے والا بنے، درگزر سے کام لے۔“

"میں رب نہیں ہوں۔“ روائبہ نے جھٹکے سے کہا تھا۔

"جانتی ہوں..... لیکن یہ رب چاہتا ہے، اپنے بندے سے اور آپ جانتی ہیں معاف کرنے والے کے درجات کتنے بلند ہیں، اللہ اس کی بھی پوشیدہ، ظاہر بہت سی خطائیں معاف کر دیتا ہے اور غیب سے اس پر اپنی بہت سی عطائیں کھول دیتا ہے اور آپ کو اس وقت سب سے بڑی عطا کی ضرورت ہے، اپنے سہاگ کی..... اپنے شوہر کی۔“ روائبہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ اعشال بری طرح رو رہی تھی۔

"چاچی میں بہت سی تسبیحات پڑھ رہی ہوں، مگر لفظ ٹوٹ رہے ہیں، پلیز آپ معاف کر دیں، ہوسکتا ہے اللہ کی آپ پر سب سے بڑی عطا ہو جائے اور میرے اکلوتے چاچو کی زندگی بچ جائے، انہیں کھونے کا حوصلہ نہیں ہے، ہم میں۔“ اعشال نے کہتے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ روائبہ اس کے گلے لگ گئی۔ دونوں بہت دیر ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر بیٹھی، ایک دوسرے کو تسلی دے رہی تھیں۔

گھڑی کی سوئی ٹک ٹک کرتی کلاک کے چکر لگا رہی تھی۔ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا، کتنا ابھی باقی تھا۔ لیکن پل پل صدی کی مانند لگ رہا تھا، بار بار نگاہ او ٹی (آپریشن تھیٹر) کے بند دروازوں پر جاتی۔ سب کی پریشانی سے بے خبر رابی اور عدن دونوں ایک جانب بیٹھے اپنی ہی باتوں میں مصروف تھے۔ اعشال انہیں دور سے دیکھ کر مسکرائی، کچھ دیر ان کے پاس کھڑی رہی، پھر کوریڈور کی بیرونی دیوار جو شیشے کی تھی، وہاں کھڑی ہو گئی۔ باہر جرمنی شہر رواں ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ روائبہ آنکھیں بند کیے کوئی ورد کر رہی تھی۔ خیام ذکا، رضا حیات آپریشن تھیٹر کے باہر چکر لگاتے، پھر ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے بٹھا دیتے۔ جندب جانے کب اعشال کے پیچھے آ کھڑا ہوا اور بہت مدھم آواز میں بولا تھا۔

"آپ بہت دیر سے کھڑی ہیں، دعا بیٹھ کر بھی مانگی جا سکتی ہے۔“ اعشال نے پھیکا سا مسکراتے اپنی چادر سر کی جانب سے آگے کی اور بہت آہستہ آہستہ

بولی تھی۔
"جب ہم چھوٹی کلاسوں میں پڑھتے تھے، ہوم ورک صحیح نہ کرنے پر ٹیچر ہمیں کھڑے ہونے کی سزا دے دیتی تھیں، کبھی کلاس میں، کبھی کلاس سے باہر......

جب تک ہم کھڑے ہو کر پورا کام نہ کرلیں۔ ہمیں چھٹی نہیں ملتی تھی۔" بھیگی بھیگی ترچھی نگاہیں اٹھا کر اس نے جندب کو دیکھا۔ "آپ کو معلوم ہے۔ میری فیملی نے اپنا ہوم ورک صحیح طریقے سے نہیں کیا، اس قدر غلطیاں کردیں جنہیں مٹا مٹا کر صحیح کرنے میں مجھے ساری زندگی بھی کھڑا ہونا پڑا تو کم ہے۔"

جندب کو یک دم وہ دنیا کی بہت معصوم لڑکی لگی تھی، جسے اپنے خاندان سے پیار بھی ہے اور ان کی خطاؤں پر پچھتاوے بھی۔ اسے نہیں معلوم تھا اس کے دل کو اس لمحے کیا ہوا تھا، لیکن کچھ ہوا ضرور تھا، معمول سے ہٹ کے۔ وہ بہت ہمدردی سے بولا تھا۔ "سزا انہیں دی جاتی ہے جو غلطیاں کریں۔ جو غلطیاں نہیں کرتے انہیں تو کھڑا نہیں کیا جاتا۔" وہ سن کر استہزا میں ہنسی تھی۔

"میں خطا واروں سے الگ تو نہیں۔ ان ہی کے خاندان، ان ہی کے وجود کا حصہ ہوں۔" کہتے ہوئے اعشال کی آنکھوں میں بہت سا پانی آ گیا، اس نے گہرا سانس لیا۔ "کاش، پوری زندگی میں ہمیں اپنے ماضی کا ایک لمحہ ہی چرانے کا اختیار ہوتا۔ تو میں وہ لمحہ مانگتی اللہ سے، جب چاچو نے جرمنی بزنس کرنے کا فیصلہ کیا تھا یا چاچی کو چھوڑ کر جانے کا ارادہ......"

اس نے "سوں" کرتے ناک کی نمی کھینچی، بے اختیار جندب کا ہاتھ اٹھا تھا۔ اس کے کندھے پر تسلی دینے کے لیے، لیکن اس کے کندھے کو چھوتے چھوتے رک گیا، اس کا اس سے کوئی ایسا تعلق نہیں تھا جو وہ اتنی جرات کا مظاہرہ کرتا، وہ خود ہی پاس سے ہٹ گیا تھا، مگر دھیان اس کی جانب بھٹکتا رہا۔

☆☆☆

صدیوں کی مانند اٹک اٹک کر گزرتا وقت آخر گزر گیا تھا۔ تھیٹر کے دروازے کھلے۔ ایک ایک کرتے بہت سے ڈاکٹرز باہر نکل رہے تھے۔ روائیہ نے میکانکی انداز میں انہیں دیکھا تھا۔ اسے ڈاکٹرز کے چہرے بہت خوف زدہ محسوس ہوئے۔ وہ بھاگ کر ان کی جانب لپکی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سن نہیں سکی تھی۔ ڈاکٹرز خیام اور رضا حیات کو جو کچھ کہہ رہے تھے۔ بس اس کے قدموں کی جان راستے میں نکل گئی تھی۔ اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی، حنبل بچ جائے گا، اس کی زندگی میں کبھی کچھ اچھا ہوا ہی نہیں تھا۔ کچھ خود اپنے لیے خرابیاں کیں، کچھ قسمت نے، اب جانے یہ خرابی کس کھاتے میں تھی، اس کے دھم سے گرنے پر سب کو اس کی پڑ گئی تھی۔

وہ پیشنٹ بیڈ پر لیٹی تھی، بالکل ایسے جیسے سوئی ہوئی ہو۔ اعشال، جندب اس کے پاس کھڑے تھے۔ قریب ہی عدن اور رابی تھے۔ رابی نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا، اس کا بی پی لو ہونے پر ڈاکٹرز نے اسے نیند کا انجکشن دے کر ڈرپ لگا دی تھی۔ کیوں کہ جس طرح سے وہ ذہنی دباؤ کا شکار تھی اس کے کومے میں جانے کا خطرہ تھا۔ بہتر تھا اسے نیند کے انجکشن دے کر ریلیکس کیا جائے۔ رابی کے رونے پر اس کے سوئے چہرے پر ہلکی ہلکی جنبش ابھرتی۔ رابی کو عدن تسلی دے رہا تھا۔

"رابی تم مت رو...... تم شکر کرو، تمہاری مما سو رہی ہیں اور تم انہیں دیکھ سکتی ہو، پتا ہے میرے شہروز پاپا سوئے تھے، تو ان پر مٹی ڈال دی، میں نہیں دیکھ سکتا انہیں۔ میرے دوسرے بابا وہ بھی سو گئے، مجھے کوئی انہیں دیکھنے نہیں دے رہا، میں اپنے مما، بابا کو نہیں دیکھ سکتا سوتے ہوئے بھی نہیں۔" اس کی معصوم آواز پر روائیہ کے چہرے پر جاگنے کے آثار پیدا ہوئے، اس کے چپ ہوتے ہی روائیہ نے پلکیں جھپک جھپک کر اٹھنے کی کوشش کی۔ کئی گھنٹے سونے سے چہرے پر اچھا خاصا ورم آ گیا تھا۔ اس کے جاگتے ہی رابی اس کے تکیے پر سر رکھے رونے لگی۔ روائیہ نے ایک ہاتھ سے اس کے سر کو تھپکا، دوسرا ہاتھ عدن کی جانب بڑھایا تھا۔ اس کی آواز بہت بھاری نکلی تھی۔

"عدن...... میں ہوں آپ کی مما...... میرے پاس آؤ۔"

☆☆☆

حنبل کا ٹرانسپلانٹ کامیاب رہا تھا، لیکن ڈاکٹرز نے اسے بہت سی ہدایات دی تھیں، جن میں چار، پانچ ماہ تک کسی قسم کا سفر نہیں کرسکتا تھا، بلکہ اسے رہائش بھی اسپتال کے قریب ہی رکھنا تھی، تاکہ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں فوراً ٹریٹمنٹ کیا جائے۔ کئی گھنٹوں بعد جب وہ ہوش میں آیا تھا، تو اسے روتی ہوئی روائیہ کے جھمکے ہو رہے تھے اور وہ سب سے آخر میں بہت سی ہمت جمع کر کے اس سے ملنے آئی، آپریشن سے پہلے ہی وہ بہت مضمحل لگ رہا تھا اور آپریشن نے جیسے رہا سہا وجود بھی بالکل نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ رضا حیات تو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے تھے، یہاں تک کہ ڈاکٹرز سے پوچھنے گئے تھے۔

"ٹرانسپلانٹ کیا ہے کہ اس کا سارا جسم نکال لیا ہے۔" ڈاکٹرز نے ہی سمجھایا تھا۔

"تسلی رکھیں، ان کے جسم پر اتنی بڑی پیوند کاری ہوئی ہے، فرق تو پڑنا تھا، آہستہ آہستہ بالکل کور کرلیں گے اور پہلے سے بہت بہتر محسوس ہوں گے۔"

روائیہ بھی دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ اس کے پاس کھڑے کتنی دیر تک تو منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا۔ اس کی کلائی کو چھوتے ہوئے بمشکل بول پائی تھی۔ "ٹھیک ہو۔"

"ہاں...... بالکل ٹھیک۔" سہ لفظی جملہ حنبل نے بہت نقاہت سے ادا کیا۔ دونوں خاموش ایک دوسرے کی آنکھوں میں ہی دیکھتے رہے تھے۔ حنبل کو اس کے بولنے کا انتظار تھا کہ وہ بولے، کچھ کہے۔ روائیہ کو لگتا تھا، وہ حنبل کی ایسی حالت دیکھ کر سب کچھ بھول گئی۔ حنبل بہت مشکل سے پوچھ رہا تھا۔

"چھوڑ کر تو...... نہیں جاؤ گی؟"

اس کے ملتجی انداز پر اس کا دل کٹ گیا۔ "اگر جاؤں گی، تو کیا روکو گے نہیں؟"

بہت سا سکون اس کے بیمار چہرے پر لہرایا اور اپنی پوری سکت لگا کر روائیہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "بہت تھک گیا ہوں۔"

"میں بھی......" روائیہ نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیا۔ حنبل کا بیمار ہاتھ اس کے دونوں ہاتھوں کے قفس میں قید تھا۔ حنبل کی آنکھ کے کونے سے ایک قطرہ نکلا اور تکیے میں جذب ہو گیا۔

☆☆☆

اس کے آپریشن کو ایک ماہ ہونے والا تھا۔ جس تیزی سے وہ کور کر رہا تھا، ڈاکٹرز کا خیال تھا وہ بہت جلد معمول کی زندگی میں حصہ لینے لگے گا۔ اسے گھر شفٹ کردیا گیا تھا، لیکن مستقل چیک اپ اور ادویات تو شاید اب ساری زندگی کا حصہ بن گئے تھے۔ رضا حیات تو ایک ہفتے بعد ہی واپس چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کی اہم وجہ عائشہ کے بے تحاشا فون تھے۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھیں اور حنبل کو دیکھنے آنا چاہتی تھیں۔ رضا نے ڈپٹ کر کہہ دیا۔

"تم تو ایسے آنے کا کہہ رہی ہو، جیسے رکشا کروا کر فیض آباد جانا ہے۔ دوسرے ملکوں میں جانے کے لیے بہت رقم چاہیے ہوتی ہے بیگم۔"

میرے لیے تو تم ہمیشہ کنگلے ہی رہنا، بیٹے کو بھیج دیا، خود چلے گئے، خود کیا مانگتے ہوئے جہاز میں چڑھے تھے۔" اس سے پہلے کہ وہ زیادہ ضد کرتیں، وہ خود واپس چلے گئے۔

"خیام، اعشال کے ساتھ جندب کی بھی واپسی ہو رہی تھی۔ خیام نے حنبل کو بہت سمجھایا تھا، جیسے ہی ڈاکٹرز سفر کی اجازت دیں۔ فوراً واپس آنا ہے۔ جندب نے جاتے جاتے روائیہ کو روک کر کہا تھا۔

"حنبل کی زندگی تمہیں بہت مبارک ہو۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

"آمین...... اور کبھی مجھے بھی موقع دو، یہ سب کچھ تمہیں کہنے کا......" جندب نے زور سے قہقہہ لگایا تھا، بالکل ویسے جیسے وہ کبھی پہلے لگایا کرتا تھا۔

"ہاہاہا...... دوں گا مائی ڈیر...... وہ موقع تمہیں ہی دوں گا۔" وہ اس وقت تو اس کی بات سمجھ نہیں پائی، مگر جلد ہی سمجھ میں آ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ ایرپورٹ کا ویٹنگ لاؤنج تھا۔ ان تینوں کی ایک ہی فلائٹ میں سیٹیں تھیں۔ خیام بہت دیر ازلان سے باتیں کرتے رہے، اس کی جاب، اس کے فیوچر پلاننگز کسی کا فون آنے پر خیام اٹھ کر سائڈ پر ہو گئے تھے، تب جندب سیاہ چادر میں لپٹی بیٹھی اعشال کے پاس کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے بیٹھ گیا تھا اور بہت مدھم لہجے میں بولا تھا۔

"آپ سے کچھ کہنا تھا مجھے۔"

وہ گردن پھیرتے ہوئے چونکی۔ "جی۔"

"آپ کے الفاظ سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ جسے پورا زمانہ مل کر قائل نہیں کر سکتا تھا، آپ کے چند جملوں نے کر دیا۔"

اعشال کی بھنوئیں نا سمجھی سے سمٹیں۔

"مطلب......" وہ فوراً سنبھلتے ہوئے سٹپٹا گیا۔

"روائیبہ کی بات کر رہا ہوں۔" اس ایک ماہ میں جس طرح سے دونوں آپس میں رہی تھیں، کوئی دیکھ کر اندازہ نہیں لگا سکتا تھا، کبھی ان کے بیچ کوئی رنجش آئی ہو۔ اعشال سنتے ہوئے مسکرائی تھی۔

"چاچی ہیں ہی بہت اچھی۔"

"آپ بھی بہت اچھی ہیں۔" وہ کہہ کر اٹھ گیا تھا، لیکن اعشال بہت دیر اس کے جملے کا مطلب کھوجتی رہی۔

☆☆☆

ماہم کا بیٹا چار ماہ سے اوپر ہو رہا تھا، اس کی پیدائش کا قصہ بھی ایسا تھا، اس نے اسپتال جاتے وقت عائشہ سے وعدے لیے تھے۔ لحہ بھر کے لیے "آپ اوٹی سے دور نہیں ہوں گی۔" اور پیدائش کے بعد جب اس نے کہا، اس کا آج ہی ڈی این اے ٹیسٹ کروالیں تو عائشہ نے بہت زور سے اسے ڈپٹا تھا۔ جتنی وہ بچے کے لیے پہلے اتاؤلی تھی، اب چار ماہ گزر جانے کے بعد بھی ویسی ہی تھی، زیادہ سوئے نہ، زیادہ روئے نہ، اب بھی بہت دیر سے سوئے، حسن کو ہلا ہلا کر اٹھا رہی تھی۔

جندب پاس ہی بیٹھا اعشال کی کوئی بات بتا رہا تھا۔ بچے سے جھنجلائی ماہم اچھا خاصا چونکی کہ جندب کو جرمنی سے آئے دو ماہ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ ان دو ماہ میں وہ دو بار فیصل آباد ہو آیا تھا۔ میر ذکا کی طبیعت پتا کرنے اور دو ہزار سے زیادہ بار اس کے منہ سے اعشال کا ذکر سن چکی تھی۔ وہ بھنوئیں نچا کر بولی۔

"خیرت بھی ہے...... دو ماہ سے اعشال...... اعشال ہو رہی ہے۔ چکر کیا ہے آخر......"

"وہی چکر ہے، جس میں تم مجھے برسوں سے گھمانا چاہتی ہو۔" وہ کہہ کر زور سے ہنسا، ماہم کی تحیر سے آنکھیں پھیلیں اور چلاتی ہوئی عائشہ کے پاس دوڑی تھی۔

"امی جان!" ماہم تو کیا حیرت میں تھی، جتنی عائشہ کو حیرت ہوئی ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے جندب سے کہا تھا۔

"تم بھی ان ہی چیزوں کی جانب بڑھنا، جو پہنچ سے دور رہیں تو بھلا......"

"اوہو، کیا ہو گیا آپ کو...... وہ بہت اچھی ہے۔"

"سب پتا ہے مجھے جنہوں نے اپنے خاندان کو نہیں بخشا، دوسرے کس کھاتے میں ہیں۔"

"میری پیاری ماں! آپ ایک بار مل لیں، دیکھ لیں، کوئی زبردستی تھوڑا ہے۔" عائشہ کو اس کی بات انتہائی احمقانہ لگی تھی، البتہ رضا حیات نے علیحدگی میں اس سے ضرور پوچھا تھا۔

"تم واقعی سیریس ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ فیملی سے باہر نہیں کرتے رشتے۔"

"بات کرنے میں حرج کیا ہے۔" اس کے جواب پر رضا نے کچھ دیر سوچا۔ "اور بات کس سے کی جائے پہلے۔"

"اوبویسلی...... روائیبہ سے...... میں نے اس کے لیے اتنا کچھ کیا ہے، وہ میرے لیے صرف اتنا سا نہیں کر سکے گی۔"

رضا حیات کا سر پرسوچ انداز میں ہلتا رہا۔ انہوں نے جلدی نہیں کی، بلکہ دو تین ماہ ہر ہر پہلو سے سوچا، ایک دو بار میر ذکا کی طبیعت پتا کرنے کے بہانے حویلی ہو آئے۔ اب ان کے مزاجوں میں اچھی خاصی تبدیلی آ چکی تھی۔ اسی لیے رضا حیات نے روائیبہ سے بات کرنے کے بجائے ڈائریکٹ حنبل سے بات کی تھی۔ اب حنبل کی طبیعت بہت حد تک سنبھل چکی تھی، تمام تو

گیں، لیکن اپنے بہت سے کام خود کرنے لگا تھا۔ ایک تو ماہرین ادویات اور روائیبہ کی بھرپور محبت اور ساتھ اس کے صحت یاب ہونے میں معاون رہے تھے۔ رضا حیات کی بات سن کر وہ گم صم رہا تھا۔

رضا کو لگا شاید اسے برا لگا، لیکن حنبل ذکا حیران تھا۔ کیسی ہے یہ فیملی، ماضی میں ہم نے ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا، کس طرح کے الزام لگائے اور وہ اب بھی تعلق کے لیے ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔ حنبل کی خاموشی پر رضا حیات نے بات سنبھالی۔

"دیکھو بیٹا! میں نے صرف اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے، کوئی زور زبردستی نہیں ہے، دراصل مجھے وہ بچی بہت اچھی لگی تھی۔ باقی فیصلہ تو آپ لوگوں نے کرنا ہے، برا لگا تو معذرت۔"

"نہیں...... نہیں انکل، آپ غلط سمجھے...... جندب جیسے بے لوث، سمجھ دار شخص کا زندگی میں شامل ہونا کسی اعزاز سے کم نہیں ہے۔ میں خیام بھائی سے بات کرتا ہوں۔ پھر آپ کو بتاتا ہوں۔"

☆☆☆

وہ حنبل کے کپڑوں کی الماری کھولے کھڑی تھی جو اس وقت بے حد بے ترتیب تھی۔ حنبل اور عدن کی چیزیں اس قدر مکس ہوئی تھیں، ایک کی ڈھونڈنے میں بہت دیر خوار ہونا پڑتا تھا۔ اس الماری کو آج تک ٹھیک کیا جائے اسی ارادے سے اس نے اس میں سے چیزیں نکال نکال کر بیڈ پر پھینکنی شروع کیں، سب سے اوپر والے خانے سے حنبل کے پرانے کپڑوں میں لپٹی کوئی چیز نکلی تھی۔ اس نے جھاڑا۔ خشک پھولوں کا ایک بوکے فرش پر گرا، گرتے ہی سوکھی پتیاں ٹوٹ کر بکھر گئیں۔ کارڈ شاخوں میں ویسے ہی اٹکا تھا کتنی دیر تو وہ گم صم اسے ویسے ہی دیکھتی رہی، پھر سمیٹ کر ڈسٹ بن میں پھینکنے کے لیے اٹھی۔ حنبل تب ہی واش روم سے نکلا تھا۔ اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس کی نگاہیں کارڈ پر تھیں اور بہت مدھم لہجے میں بولا تھا۔

"سارے راستے ہی بند کر گئی تھیں تم، ایک پل بھی میرے دل کا نہیں سوچا۔"

"سوچا تھا۔" اس نے پھیکا سا مسکراتے سرد سانس کھینچی۔ "اور دل سے چاہ بھی تم بڑھ کر مجھے روک لو، لیکن وہ کیا کہتے ہیں حنبل......" اس نے نظر اٹھا کر حنبل کو دیکھا۔

"ہاں...... انا...... یہ انا بہت ظالم کر یہہ چیز ہے، ہمیں اپنے شکنجے میں کس لیتی ہے، تم مجھے حویلی سے نکلتا نہیں دیکھ سکے ہو گے، لیکن تمہاری انا نے مجھے روکا نہیں، میں وہ گھر چھوڑنا نہیں چاہتی تھی، لیکن میری انا مجھے دھکیلتی سڑک پر لے گئی، تم جب پلٹ کر میرے آؤٹ لیٹ پر آئے تھے، میرا بازو پکڑا تھا، میں تمہارے گلے لگ کر رونا چاہتی تھی، لیکن میری انا نے تمہارا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس دن یہ بوکے......" اس نے ڈسٹ بن میں بوکے پھینکتے ہوئے خشک پھولوں کو آخری بار دیکھا۔

"یہ بوکے دیکھ کر تم نے مجھے روکنا ضرور چاہا ہو گا، لیکن تمہاری انا نے تمہارے پاؤں زمین سے چپکا دیے ہوں گے۔ بس یہ انا بہت ظلم ڈھاتی ہے، اگر ہم اسے تاج کی صورت سر پر سجا لیں۔"

"تمہارا احسان ہے مجھ پر روائیبہ۔" اس نے روائیبہ کے دونوں شانے پکڑ کر اپنی جانب موڑے تھے۔ "تم اپنی انا توڑ کر میرے پاس آ گئیں، ورنہ میں تو گلٹ سے مر ہی جاتا۔"

"اللہ نہ کرے۔" بے ساختہ چند انگلیاں حنبل کے ہونٹوں پر رکھی گئیں، ان لمس کی خوشبو کہیں اندر تک حنبل میں پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

حویلی میں ایک جشن سا سماں تھا، ایک تو اعشال کی شادی کی تیاری تھی اور ڈیڑھ سال بعد حنبل کی واپسی۔ خیام ذکا کو لگ رہا تھا ان کی اجاڑ زندگی میں جینے کی امنگ پیدا ہو رہی تھی۔ ہر چیز نئے سرے سے درست کروائی گئی۔ ساری ذمہ داریاں زینب کو سونپ رکھی تھیں۔ زینب کو اصغر سے شادی کے بعد یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ ہر چیز اپنے مقام پر ہی سجتی ہے بلب کو کبھی بھی لالٹین کی چمنی کی جگہ فٹ نہیں کیا جا سکتا وہ

اب خوش تھی یا نہیں البتہ مطمئن ضرور تھی اور اسے اب اسی میں مطمئن رہنا تھا۔ اعشال کو بطور خاص ماؤں کی طرح خیام ذکا نے ہدایت دی تھی۔

"تم اب ایک جانب بیٹھی رہو۔"

حنبل نے جب خیام تک رضا حیات کی خواہش پہنچائی تھی، کچھ دیر تو وہ سمجھ ہی نہیں سکے، یہ کیا کہہ رہا ہے۔ خاندان میں آگے پیچھے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ جائدادوں، جاگیروں والے کبھی اپنی بیٹیاں خاندان سے باہر نہیں دیتے۔ حنبل کو ان کا روایتی جواب بہت عجیب لگا تھا۔

"بھائی کتنا عجیب ہے کہ ہم اپنی بیٹیوں پر جائدادوں، جاگیروں کو مقدم جانتے ہیں۔ کوئی بہت عزت سے ہماری بچی کو مانگ رہا ہے، ہمیں وہ اس لیے نامنظور ہے کہ وہ ہمارے اسٹینڈر سے باہر ہیں اور جو ہمارے اسٹینڈر کے ہیں کیا وہ ہماری بچی کو وہ عزت دے سکیں گے، جو غلطیاں، خودغرضیاں ماضی میں ہم اعشال کے ساتھ منسوب کرچکے ہیں، کیا ہمارا خاندان اسے بھلا کر، طعنوں کی نوک پر نہیں رکھے گا۔ وہ لوگ سب جاننے کے باوجود پوری عزت سے رشتہ مانگ رہے ہیں۔ باقی آپ کی مرضی ہے، بابا سے بات کرلیں، بھرجائی سے پوچھ لیں۔ فیصلہ آپ نے کرنا ہے، آپ کی بیٹی ہے۔"

"اچھا......" خیام ذکا استہزائیہ بولے تھے۔

"مجھ سے زیادہ تو تم اسے بیٹا، بیٹا کہتے رہے ہو۔"

"پھر میں تو فیصلہ کرچکا ہوں، جندب بہت اچھا لڑکا ہے، پوری فیملی ریسپکٹ ایبل ہے۔"

خیام نے فیصلہ کرنے میں تھوڑا ہی وقت لگایا تھا۔ آئمہ تو اس قابل رہی نہیں تھیں، کوئی رائے رکھتیں۔ میر ذکا کو بھی اعتراض نہیں ہوا تھا اور شادی حنبل کے آنے پر طے کردی گئی۔

☆☆☆

کسی اچھے انسان کے ساتھ زندگی کا جڑ جانا ہر لڑکی کے لیے ہی سکون کا باعث ہوتا ہے۔ اعشال بھی بہت خوش تھی، لیکن آئمہ کے دن بہ دن بدلتی کیفیت بہت سے دکھ میں گھیر دیتی۔ آئمہ نے اب اذلان اور اس کی چیزوں کی تلاش چھوڑ دی تھی۔ اب وہ بہت خاموش ہوگئی تھیں یا تو انہیں یقین آگیا تھا اذلان نہیں رہا، یا یہ کہ وہ ہے، لیکن اس کے پاس وقت نہیں ہے ماں سے ملنے کا، اب وہ کسی کونے، یا بستر میں دبک کر لیٹی رہتیں، رونا شروع کرتیں تو گھنٹوں کے حساب سے روتیں، مگر چھپٹ چھپٹ کے باہر کی جانب بھاگنا چھوڑ دیا تھا۔

اعشال چاہتی تھی اس کی شادی سے پہلے ان میں اور بہتری آجائے۔ اکثر انہیں سمجھاتی رہتی، وہ چپ اسے سنتی رہتیں۔ اعشال نے سلویٰ کو بھی شادی پر آنے کے لیے بار بار اصرار کیا تھا، لیکن سلویٰ عجیب سے عجیب تر ہوگئی تھی۔ اس کی اہم وجہ بھی تھی اس کے شوہر نے پچھلے مہینے ہی دوسری شادی کی تھی۔ وہ مجبور ہوچکا تھا، بہت واضح الفاظ میں سلویٰ کو اپنی مجبوری بتائی تھی۔

"سلویٰ بیگم یہ درست ہے، تم میری پہلی بیوی ہو اور رہو گی، مجھے تم سے محبت بھی ہے اور ہمدردی بھی، لیکن کیا، کیا جائے، محبت اور ہمدردی صرف احساس تک ہوسکتی ہے، زندہ رہنے کے لیے انسان کو زندگی کے کاموں کی ضرورت ہے اور تم میرا کوئی کام نہیں کرسکتیں۔ میں یہ نہیں کہتا تمہیں چھوڑ رہا ہوں یا نظر انداز کررہا ہوں، تمہاری جگہ ہمیشہ وہاں ہی رہے گی جہاں تھی، لیکن مجھے اپنے کاموں کے لیے بازوؤں کی ضرورت ہے، تو اس لیے میری بے ضرر خواہش کو معاف کردینا۔"

شوہر کی دوسری بیوی کو دیکھ کر ہی سلویٰ کو احساس ہوا تھا، انسانی اعضا کا پورے ہونا اور متحرک ہونا ہی اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے اور وہ کتنی احمق تھی، وہ حنبل ذکا کو نعمت سمجھتی رہی کہ چھین گئی تو انتقام کی حدوں کو پہنچ گئی تھی۔ جب اعشال کی شادی کا سنا، خوشی تو یقیناً اسے بہت ہوئی تھی اور پورے دل کے ساتھ شامل بھی ہونا چاہتی تھی، لیکن جب اس نے سنا اس شادی میں حنبل ذکا اپنی بیوی روائیہ کے ساتھ آرہا ہے۔ اس نے آنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ کچھ بھی تھا وہ سلویٰ تھی اپنی انا، اپنی اٹھی گردن کو سب

سے اہم سمجھنے والی۔ اب آدھ ادھورے وجود کے ساتھ حنبل کو اس کی مکمل فیملی کے ساتھ کم از کم اپنی آنکھوں سے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ خالہ کو زک پہنچنے کے خیال سے اعشال نے زیادہ اصرار کرنا چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

کچھ دیر پہلے ہی اسمتھ اور میرڈین کی دھواں دھواں لڑائی ہوئی تھی۔ میرڈین کا کہنا تھا وہ ابھی زندگی کو اسمتھ کے ساتھ بہت اچھی طرح انجوائے کرنا چاہتی ہے۔ کسی قسم کی روک ٹوک، احتیاط وہ ابھی برداشت نہیں کرسکتی، جب کہ اسمتھ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا، انسان اپنے بچوں کے ساتھ بہتر انجوائے کرتا ہے، ان کے زندگی میں شامل ہوجانے سے ہر چیز بہتر اور خوب صورت دکھائی دیتی ہے۔ یہاں آکر دونوں کا ایک ہنگامہ خیز اختلاف ہوتا، جس کی زد میں کمرے کا بہت سا سامان آجاتا تھا۔ بعد میں چاہے دونوں ہی پچھتاتے ہوں، بچے تو جانے کب آئیں گے، نہیں آئیں گے، گھر میں موجود سامان بھی ٹوٹ گیا، جسے خریدنے کے پیسے ضرور برباد ہوں گے، آج وہ میرڈین سے کشن کے بدلے میں ہیر برش کھا کر باہر نکلا تھا اور یہ کہہ کر گیا تھا وہ تب تک نہیں لوٹے گا جب تک وہ فون پر دس بار سوری لکھ کر سینڈ نہیں کرے گی۔ میرڈین دس بار کیا، پچاس بار لکھنے کو تیار ہوچکی تھی، بلکہ کان پکڑ کر معافی مانگ لیتی کہ آئندہ اس پر سخت ہتھیار نہیں اٹھائے گی، کیوں کہ اسے گھر سے نکلے کئی گھنٹے ہوگئے تھے۔

ابتدائی گھنٹوں میں وہ اکڑ کر بیٹھی رہی، معافی اور میرڈین، نو وے...... لیکن جیسے جیسے وقت گزرا غلطی کا احساس جاگا۔ سوری لکھ کر سینڈ کیا، جواب نہیں آیا، کال کی مسلسل بیل جارہی تھی، لیکن نو آنسر نگ۔ وہ اچھی خاصی گھبرا گئی تھی۔ جب تمام وسوسے وخدشات نے اسے پوری طرح توڑ دیا۔

وہ گھر کو لاک کرکے تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی، اس کا ذہن جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا، یہاں تک کہ وہ رو دینے کو تھی، بلکہ رو ہی پڑتی اگر اسمتھ کی قسمت اچھی ہوتی، میرڈین کے نیچے اترتے ہی ایک بلی اس کے پاس سے گزر کر سیڑھیوں کے نیچے بنی تھڑی پر بیٹھ کر "میاؤں میاؤں" کرنے لگی۔ میرڈین کو اس پر ترس آیا، وہ اس کے لیے کچھ کھانے کا لانے کے لیے مڑی اور بس اس کے قریب ہی دبکے بیٹھے اسمتھ پر نگاہ چلی گئی۔ وہ بھی اسے دیکھ کر سٹپٹا گیا تھا اور بچاؤ کے لیے اپنے چہرے کے آگے ہاتھ پھیلائے کیوں کہ اس کے ہاتھ میں وہ چابیوں کا گچھا دیکھ چکا تھا۔ میرڈین نے لڑاکا عورتوں کی طرح ناک بھنویں چڑھائیں اور قدم قدم اس کی جانب بڑھی۔

"میں اتنی دیر سے پریشان ہورہی ہوں اور تم میری ٹینشن کو انجوائے کررہے ہو...... ہاں......" وہ جیسے جیسے آگے بڑھی، وہ سوری، سوری کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم نے کہا تھا دس بار سوری لکھو...... میں بیس بار لکھ چکی ہوں۔ آخر تم نے سمجھا کیا ہے خود کو۔"

"تمہارا ہزبینڈ......"

"ابھی بتاتی ہوں، ہزبینڈ کا مطلب......" وہ یقیناً حملہ کرتی، اگر اسمتھ جلدی سے جندب کی شادی کا کارڈ آگے نہ کر دیتا۔

"جندب کی شادی ہو رہی ہے، ہمیں انوائٹ کیا ہے۔ اگر لڑائی کرو گی تو اپنا ٹکٹ خود خریدو گی۔"

☆☆☆

حنبل اور روائیبہ نے پاکستان پہنچتے ہی جو سب سے پہلا کام کیا تھا وہ سبرینہ سے رابطے کا تھا۔ حنبل نے روائیبہ کو یہ سب کرنے سے پہلے بہت اچھی طرح سوچ لینے کا کہا تھا۔ اس نے اس ایک سال میں یہ اندازہ لگا لیا تھا روائیبہ، رابی سے کس قدر محبت کرتی ہے، اس کے بغیر رہنا اتنا آسان نہیں ہوگا اور اب کم از کم حنبل ذکا برداشت نہیں کر پائے گا روائیبہ کو ایک کانٹا بھی چبھے، چہ جائیکہ کہ دل زخمی ہو اس کا، لیکن وہ اپنے فیصلے پر پوری طرح قائم بھی تھی۔ جب اسے اپنا بیٹا مل چکا ہے، پھر کسی ماں کا صبر اپنی جھولی میں کیوں ڈالے، بے شک غلطی سبرینہ ہی کی تھی، لیکن وہ بہت بڑی سزا بھگت چکی ہے۔ رابی کے بغیر رہنا کسی اذیت سے کم نہیں تھا، لیکن ممکن ہے عدن کی دلچسپیاں اس اذیت کو کچھ کم کر دیں۔

حنبل اور روائیبہ نے فیصل آباد سبرینہ سے ملنے جانے کا پروگرام بنایا، حنبل کو جب پتا چلا تھا۔ شہروز کمال نے وہ جوس فیکٹری عون کی پیدائش پر اسے گفٹ کر دی تھی۔ اس نے تب ہی یہ فیصلہ کیا تھا عون شہروز کا وارث نہیں ہے۔ یہ فیصلہ اس نے لاعلمی کے سبب کیا، مگر مجھے علم ہے اور میں اپنے بیٹے پر کوئی ایسا بار نہیں رکھوں گا جس کا وہ حق دار ہی نہیں۔ اس نے فیکٹری کی قیمت کے برابر رقم سبرینہ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروانے کا پکا ارادہ کیا اور اب جب روائیبہ کو بتایا وہ مسکرائی ضرور تھی۔ "جیسے دل چاہے کرو" وہ ابھی فیصل آباد کے رستے میں تھے۔ جب حنبل کو سلویٰ کا خیال آیا تھا۔ اس نے روائیبہ سے مشورہ کیا تھا۔

کیا خیال ہے مل آئیں اس سے "روائیبہ کے ماتھے پر کچھ سلوٹ آئے تھے "یار انسانوں سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ معاف کر دینا چاہیے۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ان کی گاڑی سلویٰ کی حویلی میں رکی تھی۔ میکے سے آئے مہمانوں کے سبب ملازمہ انہیں اندر لے آئی۔ سلویٰ لاؤنج میں ہی بیٹھی مل گئی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی اس کے تیور بگڑ گئے۔ گردن معمول سے زیادہ اکڑ گئی۔

"مجھ سے ہمدردی کر کے خود کو رحم دل ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھی طرح جانتی ہوں۔ مجھے اس حال میں دیکھ کر سب سے زیادہ خوش ہونے والے تم ہو گے۔" حنبل نے تاسف سے بند ہونٹ کھولے۔

"میں کیوں خوش ہونے لگا۔ مجھے حقیقت میں بہت دکھ ہوا۔"

مگر مجھے نہیں ہے۔ بہت اچھی جگہ، اچھی حالت میں میرے ساتھ حادثہ پیش آیا۔ کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھو۔" انہیں سرسری سا کہہ خود وہاں سے اٹھتے ہوئے ملازمہ سے کہہ رہی تھی۔

"یہ آپا کے گھر سے آئے مہمان ہیں اچھی خاطر کرنا۔" حنبل کو اس کے انداز پر بہت دکھ ہوا تھا اور روائیبہ کے سامنے شرمساری بھی مزید وہ وہاں ایک لمحے بھی نہیں رکا۔ روائیبہ کا ہاتھ تھامے تیزی سے باہر نکلا۔ اور تب ہی اس نے فیصلہ کیا۔ "میرا خیال ہے فیصل آباد جانے کے بجائے سبرینہ آپا سے فون پر ڈسکس کر لو وہ کیا کہتی ہیں۔" اس نے اپنے سیل سے نمبر ملا کر روائیبہ کی جانب بڑھا دیا۔

روائیبہ نے جب سبرینہ سے فون پر بات کی اور جلد ہی بات کرنے کا مقصد بتا دیا تھا۔ کتنی دیر سبرینہ کی آواز نہیں نکلی، جانے رو رہی تھی یا شرمندہ تھی، لیکن جب بولنے لگی، اس کی آواز بہت بھاری اور ٹوٹ رہی تھی۔

"روائیبہ اگر تم یقین کر سکو تو تمہیں سچ بتاؤں۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا سلویٰ یہ سب تمہاری جلن میں کر رہی ہے، ہاں میری ہمدرد بہت تھی، اب بھی ہے، لیکن یہ سب کچھ میں نے اپنی ماں کی طلاق کا بدلا نہیں لیا تھا، وہ باتیں ماضی میں دب گئی تھیں اور سچ یہ ہے مجھے اتنے سال بالکل پتا نہیں چلا۔ حنبل نے تمہارے ساتھ کیا، کیا تھا، مجھے آمنہ آپا نے یہ ہی بتایا تم اور رابی جرمنی میں اس کے ساتھ رہ رہی ہو۔ اگر مجھے پہلے پتا چل جاتا، ہو سکتا ہے میں اتنی ہمت کر لیتی، شہروز کو سچ بتانے کی، لیکن اللہ کو منظور یہ ہی تھا۔"

"بس ایسے ہی ہے، سبرینہ آپی...... ہم ہمیشہ اپنی غلط کرنیوں کو اللہ کی منظوری دے دیتے ہیں اور ہر پرفیکٹ کام اپنی عقل سے کیا فیصلہ...... یہ چھوڑیں آپ...... آپ بتائیں ہم کب آئیں رابی کو لے کر......" یہ بات جس دل سے روائیبہ نے کہی تھی یہ صرف اللہ اور روائیبہ کا دل جانتا تھا، اسے محسوس ہوا اس کا دل مسلسل کسی چیز سے دب رہا ہے۔

"نہیں...... نہیں روائیبہ...... اس روز میں صرف اسے دیکھنے گئی تھی، صرف اور صرف ایک نظر دیکھنے، میں نے اسے لینے کا مطالبہ نہیں کیا اور میں بالکل بھی نہیں چاہتی، میری بیٹی میرا خود غرض چہرا پڑھ لے، وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔ میں نے اپنا گھر بچانے کے لیے اپنی چندیل کی بچی کسی کو سونپ دی۔ وہ حقارت سے تھوک دے گی مجھ پر، تم نے اسے ماں بن کر پالا ہے، اسے پیار، اعتماد، محبت، لاڈ سب دیا ہے۔ وہ تمہیں کبھی نہیں بھولے گی۔"

"سوچ لیں آپ...... کیوں کہ میں بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کر رہی ہوں۔"

"اور میں نے تو روائیبہ...... اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا۔" سبرینہ نے زکام زدہ سانس کھینچی۔ "کہ میں اب پلٹ کر نہیں دیکھوں گی، کہیں یہ بچی مجھ سے نفرت نہ کرے۔ بس تمہارا احسان ہو گا کبھی کسی موقع پر مجھے اس کی ایک جھلک دکھا دینا۔"

"یہ آپ کے اندر کا گلٹ ہے سبرینہ جو صرف ایک جھلک دیکھنے کی بات کر رہا ہے ورنہ میں تو بہت اچھی طرح جان گئی ہوں اپنی اولاد کے بغیر رہنا کس قدر دشوار ہے۔ ہم لاکھ چاہنے کے باوجود بھی نہیں چھپا سکتے جو ماضی ان کے ساتھ جڑ چکا ہے کیونکہ ان کی ولدیت کے خانوں میں ہونے والی تبدیلی جلد یا بدیر سب حقیقت خود آشکار کرے گی۔"

اس نے توقف سے کہا۔ "میں ضرور لے کر آؤں گی رابی کو، چلیں ابھی نہیں لیکن جلد۔"

روائبہ نے فون بند کر کے رابی کی بہت سی پیاری پیاری تصویریں سبرینہ کو سینڈ کی تھیں اور سبرینہ انہیں دیکھتے اسکرین پر ہاتھ پھیرتے بلک بلک کر روئی تھی۔ اتنا اندازہ روائبہ کو بھی تھا۔ اس وقت سبرینہ پر کیا گزر رہی ہوگی جب پہلی بار اپنی بیٹی کو ہنستے اٹکھیلیاں کرتے دیکھے گی۔ روائبہ کا اپنا دل کسی بھاری سل کے نیچے رگڑے کھاتا محسوس ہوا، آنکھیں بوجھل ہو گئیں، اس نے اپنا سر صوفہ سیٹ پر ٹکا دیا۔

حنبل بہت دھیمے لہجے میں بولا تھا۔

"شیطان انسان کا پیدائشی دشمن ہے، یہ کبھی، کسی پر، کہیں بھی غالب آ سکتا ہے، بڑے بڑے پرہیزگار اس کے جھانسے میں پھنس جاتے ہیں، روائبہ، ہم چوبیس گھنٹوں میں کم از کم چوبیس سیکنڈ تو ایسے نکال سکتے ہیں، کہ اس کے شر کی جرأت سے پناہ مانگ لیں۔" روائبہ نے سر کو ہاں میں جنبش دی۔

"صحیح کہہ رہے ہو حنبل، کاش ہم اپنی تدبیر کو ہی کل نہ جانیں، اپنی غلطیوں، غلط فہمیوں کا اعتراف تو کیا سمجھ ہی لیں، شاید پھر بہت سے تعلق اذیت سے، ٹوٹنے سے بچ سکیں۔" حنبل نے اس سڑک کا موڑ کاٹا جو حویلی کی جانب جاتی تھی۔ گوداموں کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایسے لگا جیسے اذلان کی جیپ جل رہی ہو، وہ معافی طلب کرتا ہو، حنبل کو تکلیف ہوئی تھی، وہ آہستگی سے بولا۔

"پتا نہیں اذلان کس غلطی کو ذکر کر رہا تھا۔ آخر وقت تک کسی گلٹ میں تھا، بتایا نہیں اس نے۔"

روائبہ نے سنتے ہوئے آنکھیں پل بھر کو بند کیں صرف ترچھی نگاہ سے حنبل کو تکلیف کا اندازہ ہوا تھا۔ مگر وہ بات مکمل کر رہا تھا۔

"وہ بتا رہا تھا کسی کو بہت ہرٹ کیا ہے اس نے، نام نہیں بتایا۔ جانے ہرٹ ہونے والے نے اس اسے معاف کیا یا نہیں۔"

ایک ملتجی نگاہ روائبہ پر اٹھی وہ سامنے دیکھ رہی تھی بہت سکون سے بولی۔

"یقیناً کر دیا ہوگا۔۔۔ نہیں کیا ہوگا! تو کر دے گا۔ کیوں کہ ایک کی غلطی میں دوسرے کا بھی کہیں نہ کہیں ہاتھ ضرور ہوتا ہے، جو وقت سمجھا دیتا ہے۔"

اس کے ہونٹ مسکان میں پھیلے اور محبت پاش نگاہ سے حنبل کو دیکھا۔ حنبل نے اپنا بازو اس کے کندھے پر پھیلاتے اسے قدرے قریب کیا تھا۔

"حنبل ہمیں جس رشتے پر سب سے زیادہ اعتماد کرنا چاہیے، ہم اس سے ہی خوف زدہ کیوں ہوتے ہیں؟"

"کیوں کہ ہمیں ان سے بے پناہ محبت ہوتی ہے، اور محبتوں میں ڈر ہوتے ہیں۔ کھونے کے، ہرٹ ہونے کے، چھوٹنے کے، ٹوٹنے کے بس کسی صورت کھونا نہیں چاہتے نا" اس نے مسکرا کر اپنا گال حنبل کی بازو پر ٹیک لیا ایک آنسو ٹوٹ کر اس کی آستین پر گرا تھا۔ اس کی روندھی آواز نکلی تھی۔

"مجھے بھی معاف کر دینا حنبل۔۔۔ تمہیں بہت ہرٹ کیا، بنا کوئی دلیل دیے، سنے، تمہیں چھوڑ کر چلی تھی، تمہیں کھونے سے ڈرتی تھی۔"

"اچھا جی......!"

حنبل نے استہزا میں بہت لطف لیتے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

اس کی نگاہ سڑک کے دو اطراف لگے سنبل کے درختوں پر تھی جہاں سرخ پھول نکل آئے تھے، "کھیتوں کی شادیوں کا موسم" جملہ یاد آتے ہی زندگی کی ساری کلفتیں جاتی ہوا میں کہیں دور ہوتی چلی گئیں، وہاں صرف مسکان کا ڈیرہ تھا۔

☆☆



زمانہ شناس

نفیسہ سعید

''لڑکی کو کبھی اتنا آزاد خیال نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ماں باپ کے بتائے ہوئے رشتہ سے بھی انکار کردے۔ شادی تو وہ ہی اچھی اور کامیاب ہے جو ماں باپ کی پسند سے کی جائے مگر اللہ معاف کرے' آج کل کے بچے تو بھئی کسی کے قابو میں ہی نہیں رہے سارا قصور تربیت کا ہے۔'' عقب سے سنائی دینے والی یہ آواز یقیناً بڑی بھابھی کی تھی' ثنا نے پلٹ کر دیکھا وہ اک شان بے نیازی سے اپنے زرین خیالات بیان فرما رہی تھیں جس سے وہاں موجود ہر شخص بہت متاثر دکھائی دے رہا تھا سوائے ثنا کے جو قول و فعل کے اس تضاد پر حیران تھی۔

کچھ دن قبل ہی بڑی بھابھی نے ہی اسے یہ بات بتائی تھی کہ جاوید سے شادی انہوں نے اپنے گھر والوں کی بے حد مخالفت کے بعد کی کیونکہ ان کا رشتہ بچپن سے ماموں کے گھر طے تھا اور چونکہ یہ زیادہ پرانی بات نہ تھی اس لیے ثنا کو ابھی تک یاد تھی' ویسے بھی وہ تین سالوں میں' تین سو بار ثنا کو یہ بتا چکی تھیں کہ ان کی اور جاوید بھائی کی پسند کی شادی ہے پھر آج یہ کایا کیسے پلٹ گئی کہ ایک دم انہیں ارینج میرج زیادہ کامیاب نظر آنے لگی۔ وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں تھی جب ایک اور آواز اس کے کان سے ٹکرائی جو یقیناً جاذبہ کی جٹھانی کی تھی۔

''دراصل رشنا نے اپنی بیٹی کو بے جا آزادی دی' یونی ورسٹی میں پڑھنا اور پھر سارا دن لڑکوں کے ساتھ گھومنا پھرنا آخر کوئی تو رنگ دکھانا تھا نہ اس نے۔''

رشنا جاذبہ کی بڑی نند کا نام تھا جس کی دوستی مائرہ بھابھی سے بہت زیادہ تھی' یہ بات ثنا نے اکثر نوٹ کی تھی کہ وہ جاذبہ آپا کی نسبت ان کی فیملی کے دیگر افراد سے تعلقات استوار کرنے میں زیادہ خوشی محسوس کرتی تھیں مگر یہ تجزیہ اس نے کبھی بڑی بھابھی کے سامنے پیش نہیں کیا کہ مبادا وہ ناراض نہ ہوجائیں۔ ابھی بھی پیچھے بیٹھی دونوں خواتین گاہے بگاہے اپنے خیالات کا اظہار کررہی تھیں جنہیں سن کر ثنا جان گئی تھی کہ ایمل نے اپنے تایا کے گھر شادی سے انکار کردیا ہے کیونکہ وہ اپنے کسی دوست کو پسند کرتی تھی اور یہ بھڑاس اس کی تائی نکال رہی تھیں لیکن بڑی بھابھی کو اس سارے مسئلے سے کیا لینا دینا جو وہ بھی برائیوں میں مصروف تھیں۔

☆☆☆

ثنا اوپر آئی تو بڑی بھابھی فون پر کسی سے بات کررہی تھیں' ثنا کو دیکھتے ہی ان کی آواز دھیمی ہوگئی جسے سنتے ہی ثنا سمجھ گئی کہ وہ اس کے سامنے بات کرنے سے گریز کررہی ہیں اس لیے اس نے چاہا کہ واپس نیچے چلی جائے جب بھابھی نے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔

''ارے کھڑی کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔'' ثنا کو مخاطب کرتی وہ خود بال سمیٹتی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئیں جب کہ ثنا نے ڈائننگ کی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گئی۔

''ایمل کا فون تھا۔'' ثنا کے کوئی سوال کیے بنا انہوں نے اطلاع دینا ضروری سمجھا۔

''ایمل...... رشنا آپا کی بیٹی؟'' ثنا کا انداز سوالیہ تھا۔

''ہاں بھئی وہ ہی۔ خاصی لبرل اور آزاد خیال لڑکی ہے وہ تو۔''

''کیا آپ اسے سمجھا رہی تھیں کہ وہ اپنے کزن سے شادی کے لیے ہاں کردے؟''

''ارے میرا دماغ خراب ہے جو بلاوجہ دوسروں کے معاملے میں پڑوں' جس کا جو دل چاہے کرے ویسے بھی رشنا دوسروں کی بہت باتیں کرتی تھی تو اب پتا چلے کس طرح اپنی بیٹی ماں باپ کے سر میں خاک ڈالتی ہے' تم چائے پیو گی؟'' اپنی بات ختم کرکے انہوں نے ثنا سے سوال کیا جو منہ کھولے ان کی باتیں سننے میں اس قدر مگن تھی کہ پتا ہی نہ چلا بھابھی نے کیا سوال کیا ہے۔

''لیکن بھابھی پسند کی شادی کوئی اتنا برا عمل تو نہیں کہ جس سے ماں باپ دنیا میں رسوا ہوجائیں۔ یہ تو پھر نیا دور ہے جب کہ آپ نے تو اتنا عرصہ قبل جاوید بھائی سے اپنی مرضی سے شادی کی تھی۔''

''یہ بات تم سے کس نے کہی کہ میری اور جاوید کی شادی پسند کی ہے؟'' بڑی بھابھی کا سوال اتنا چبھتا ہوا تھا کہ ثنا جواب دیتے ہوئے گڑبڑا گئی۔

''آپ ہی نے تو بتایا تھا کہ......'' ثنا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا کیونکہ اسے شک تھا کہ کہیں بات مکمل ہونے تک بھابھی ناراض نہ ہوجائیں جس کا اندازہ ان کے چہرے کے بگڑتے تاثرات سے لگایا جاسکتا تھا۔

''میں تو تم سے مذاق کررہی تھی اور کمال ہے تم نے سچ سمجھ لیا' میں کیا تمہیں اتنی آوارہ نظر آتی ہوں جو ایک نامحرم سے پیار کی پینگیں استوار کرکے شادی کرلوں گی۔ میرے بھائی بڑے زور آور ہیں ثنا بی بی مار کر پھینک دیتے جو میں کوئی ایسا قدم اٹھاتی۔'' اپنی بات ختم کرکے بھابھی کچن میں چلی گئیں جب کہ پیچھے بیٹھی ثنا ہکا بکا تھی کہ ان کی کس بات پر یقین کرے وہ تو بڑے آرام سے اپنی اسٹیٹمنٹ تبدیل کرنے کی عادی تھیں یہ جانے بنا کہ ان کی یہ حرکت دوسروں کو کس قدر تکلیف پہنچاتی ہے۔

☆☆☆

سیڑھیوں سے کوئی اوپر جا رہا تھا ثنا نے دیکھا وہ رشنا آپا تھیں جو ثنا پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک کر کھڑی ہوگئیں۔

''السلام علیکم آپا! کیسی ہیں؟'' لامحالہ ثنا کو سلام کرنا پڑا جواباً وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دے کر اوپر چلی گئیں جب کچھ ہی دیر میں ہی اسے بڑی بھابھی کا بلاوا آگیا وہ ثنا کو بھی کھانے کے لیے بلا رہی تھیں جب کہ امی تو روزمرہ کی طرح شام اوپر ہی تھیں لہٰذا ثنا بھی نیچے کے سارے دروازے بند کرکے بھابھی کے فلور پر ہی آگئی جہاں ڈائننگ ہی ٹیبل پر سجے لوازمات اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ رشنا آپا ڈنر کے لیے انوائٹ کی گئی تھیں ورنہ اتنا اہتمام ایک گھنٹہ میں ہونا ناممکن تھا' نظر پڑتے ہی بھابھی کھلکھلاتے ہوئے بولیں۔

''جلدی آجاؤ آج میں نے تمہاری پسند کا چکن چلی بنایا ہے۔''

''ہاں بھئی مائرہ ماشاءاللہ سب کی پسند کا بہت خیال رکھتی ہے۔ مجھے بھی فون کیا تھا کہ کڑھی بنائی ہے آجاؤ' بس پھر میں تو یہ سنتے ہی دوڑی دوڑی چلی آئی۔''

''اچھا کیا اسی بہانے گھر کی ٹینشن سے تو کچھ دیر کو آزادی ملے گی' اب گھر کے ساتھ تو فرزانہ بھابھی کا گھر ہے جو ظاہر ہے رشتہ ختم ہونے پر سارا دن تمہیں باتیں سناتی ہوں گی کیونکہ ان کی عادت ایسی ہی ہے بلاوجہ دوسروں پر کیچڑ اچھالنے والی۔''

''ارے نہیں' فرزانہ بھابھی ایسی نہیں ہیں بس ایمل کے انکار نے انہیں تھوڑا سا دل برداشتہ کردیا ہے ورنہ تو......''

''رہنے دو رشنا' تم کچھ نہیں جانتیں۔'' ان کی بات کاٹتے ہوئے بڑی بھابھی تیزی سے بولیں' صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں فرزانہ بھابی کے لیے کی جانے والی تعریف بالکل پسند نہیں آئی۔

''بہت باتیں کررہی ہے وہ تم ماں بیٹیوں کو' میں کہنا نہیں چاہتی لیکن ایمل کے لیے تو اس کے خیالات بہت گندے ہیں طرح طرح کے الزام لگا رہی ہے تمہاری بیٹی پر اور ایک تم ہو جو اُن کی تعریفوں کے پل باندھے جارہی ہو۔ میری بات پر یقین نہیں آتا تو ثنا سے پوچھ لو اس دن جاذبہ کے گھر قرآن خوانی پر یہ ہمارے ساتھ ہی بیٹھی تھی' کیوں ثنا؟''

بھابی نے جیسے ہی تصدیق طلب انداز میں اسے مخاطب کیا وہ ایک بار پھر سے گڑبڑا گئی۔

''لیکن بھابھی میں نے آپ لوگوں کی کوئی بات نہیں سنی سوری مجھے کچھ نہیں پتا۔''

''جس کی جو بات ہوا کرے ثنا بی بی صاف صاف منہ پر کہہ دیا کرو اس طرح ڈر ڈر کے جینے کی عادت چھوڑ دو' مجھ سے سیکھو جو ہر بات بندے کے سامنے کھٹ سے کہہ دیتی ہوں چاہے کسی کو اچھی لگے

یا بری......''

ثنا کا اس طرح گڑبڑا کر جواب دینا بھابھی کو ذرا نہ بھایا تھا جس کا اندازہ ان کے ماتھے پر پڑی تیوریاں دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

اس دن جاذبہ آپا آئیں تو کچھ الجھی الجھی سی تھیں زیادہ ٹائم امی کے پاس ہی بیٹھی کچھ کھسر پھسر کرتی رہیں۔ وہ کیا بات کر رہی تھیں ثنا نے جاننے کی کوشش نہ کی کیونکہ یہ دونوں ماں بیٹی کا آپس کا مسئلہ تھا اس لیے وہ کچن میں کھانا پکانے میں مصروف تھی جب امی نے اسے خود آواز دے کر کمرے میں بلایا۔ ثنا چولہے کی آگ دھیمی کرتی ان کے پاس چلی آئی۔

''جی امی! بلایا آپ نے؟''

''مجھے تم سے ایک بات پوچھنی تھی' یہاں بیٹھو میرے پاس۔'' امی کے بجائے جواب جاذبہ آپا نے دیا وہ خاموشی سے ان کے پاس جا بیٹھی۔

''اس دن میرے گھر قرآن خوانی میں فرزانہ بھابھی، رشنا اور ایمل کے متعلق کیا بات کر رہی تھیں؟'' ثنا نے چونک کر دیکھا جاذبہ آپا خاصی سنجیدہ تھیں۔

''وہ مائرہ بھابھی سے پوچھیں انہیں زیادہ پتا ہوگا۔''

''ان سے بھی پوچھ لوں گی لیکن پہلے تم بتاؤ' کیا وہ ایمل کے متعلق کچھ غلط گفتگو کر رہی تھیں؟'' ثنا کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیا جواب دے اگر کسی بات سے انکار کرتی کہ اسے کچھ علم نہیں تو یقیناً بھابھی ناراض ہو جاتیں جیسے اس دن ہوئی تھیں اور اگر سچ بتاتی تو...... بہر حال اب جواب تو دینا ہی تھا اس لیے ہمت کر کے بول اٹھی۔

''جی وہ کہہ رہی تھیں کہ رشنا نے بیٹی کو آزاد خیال کر دیا ہے اور اسی طرح کی کچھ مزید باتیں......''

''آپ مان لیں امی یہ ساری باتیں بھابھی نے ہی رشنا کو بتائی ہیں' وہ نام تو کسی کا نہیں لے رہی مگر ان باتوں کو لے کر گھر کا ماحول خاصا خراب ہو گیا ہے اور مجھے خدشہ ہے اگر بات کھل گئی اور مائرہ بھابھی کا نام سامنے آیا تو میری کس قدر سبکی ہوگی۔''

ثنا کی بات سنتے ہی جاذبہ آپا امی کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔

''میں نے کتنی دفعہ سمجھایا ہے بیٹی کے سسرال کا مسئلہ ہے سوچ سمجھ کر کچھ بولا کرو مگر مجال ہے جو کوئی میری بات مانتا ہو اب یہ ہی دیکھو بلاوجہ دوسروں کے گھر کے مسائل میں ٹانگ اڑائی بھلا کیا ضرورت تھی۔''

وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں جب ثنا خاموشی سے اٹھ کر کچن میں آ گئی بظاہر اسی سارے مسئلے سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا' یہ سوچ کر وہ مطمئن تھی لیکن اگلے دن ہی اس کا سارا اطمینان فرزانہ بھابھی کے غیر متوقع فون نے رخصت کر دیا کیونکہ اس سے پہلے انہوں نے کبھی بھی ثنا کو فون نہ کیا تھا یہ ہی وجہ تھی جو فون پر ان کی آواز سنتے ہی ثنا کا دل دھک دھک کر اٹھا۔

''ثنا تم سے کس نے کہا کہ ایمل ایک آزاد خیال اور آوارہ لڑکی ہے؟ مزید یہ کہ وہ لڑکوں کے ساتھ گھومتی اور عیاشی کرتی ہے۔'' فرزانہ بھابھی کے الفاظ ثنا کو حیرت کے سمندر میں ڈبکیاں دے رہے تھے۔

''جی......؟'' اس نے بولنے کی کوشش کی۔

''میں نے تو کسی سے ایسا کچھ نہیں کہا؟''

''ارے یہاں تو گھر میں ایک پنچائیت لگی ہے جس میں تمہارا نام لیا جا رہا ہے کہ تم نے مجھے یہ سب باتیں کہتے سنا ہے غضب خدا کا میری تو کبھی تم سے اتنی بات ہی نہیں ہوئی اور تم بلاوجہ میرا نام لے رہی ہو۔''

ثنا کیا جواب دیتی اس کے پاس کوئی وضاحت نہ تھی' صرف ایک جملہ منہ سے نکالنے پر ایسی بے عزتی' اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں' آواز بھرا گئی۔ وہ کچھ کہہ ہی نہ سکی اور خاموشی سے فون بند کر دیا جب کہ فرزانہ بھابھی ابھی بولے ہی جا رہی تھیں۔ وہ

امی کے سامنے بیٹھی کتنی دیر سے رو رہی تھی اور انہیں سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اسے کس طرح خاموش کروائیں۔

''میں نے تو جاذبہ آپا سے کوئی ایسی بات نہیں کی پھر کیوں انہوں نے گھر جا کر فرزانہ بھابھی کے سامنے میرا نام لیا۔''

''تمہارا نام جاذبہ نے نہیں لیا میں اس سے پوچھ چکی ہوں۔''

''لیکن میں نے تو ان کے علاوہ کسی سے کوئی بات کی ہی نہیں کی۔'' اپنی آنکھوں میں آیا پانی صاف کرتی ثنا حیرت سے بولی۔

''شاید رشنا نے گھر جا کر کہا کہ تم نے مائرہ کی باتوں کی گواہی دی ہے تو بس بیٹا فرزانہ' مائرہ سے تو بگاڑ نہ سکتی تھی آخر کو دونوں ایک دوسرے کی دوست ہیں لے دے کر سارا غبار تم پر نکال دیا۔'' امی کے جواب نے ثنا کی حیرت میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

''امی یہ تو وہ بات ہوئی کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔''

''کیا کہوں بیٹا یہ ہی دستور زمانہ ہے' مائرہ کا اخلاق اور مہمان نوازی سب کے منہ بند کر دیتی ہے ورنہ حقیقت کیا ہے یہ تو سب ہی جانتے ہیں۔''

حقیقت کوئی جانے یا نہ جانے مگر ثنا جان گئی تھی کہ بڑی بھابھی کی خوش اخلاقی بھی شاید اپنے ہی مفاد کے لیے ہے یہ ہی سوچ کر اس نے دل ہی دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ آئندہ جہاں کہیں خواتین کو غیبت میں مصروف دیکھے گی وہاں خاموشی سے کان لپیٹ کر جگہ ہی تبدیل کر لے گی۔

☆☆☆

ایمل کا رشتہ طے ہو گیا کہاں اور کس سے ثنا کو جاننے میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی اس نے اس معاملے میں کوئی سن گن لینے کی کوشش کی یہاں تک کہ ایمل کا رشتہ طے ہونے تک وہ بھابھی کے فلور پر بھی بہت ہی کم گئی مبادا پھر کوئی بات ان کے منہ سے نکل جائے اور پھنس ثنا جائے یعنی وقت نے اسے خاصا سمجھ دار کر دیا تھا۔

آج امی نے اسے بتایا کہ ''آنے والے جمعہ ایمل کا نکاح ہے' رشنا کا فون آیا تھا سارے گھر کو دعوت دی ہے۔''

''میرا خیال ہے امی آپ اور جاذبہ چلے جائیں' میری طرف سے معذرت کر لیجیے گا۔'' امی نے ثنا کی بات سن کر اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور سمجھ گئیں کہ وہ ابھی تک فرزانہ کی باتیں بھولی نہیں ہے' یہ ہی وجہ ہے جو وہاں جانے سے انکار کر رہی ہے۔

''مگر بیٹا یہ جاذبہ کے سسرال کا معاملہ ہے اور پھر رشنا کے گھر کی پہلی خوشی' ایسے میں اگر تم نہیں جاؤ گی تو سب کو برا لگے گا۔''

''اور امی جو ان کی باتوں کا مجھے برا لگا وہ کیا؟ بنا جانے اور سمجھے رشنا باجی نے گھر جا کر میرا نام لیا اور پھر فرزانہ بھابھی کا رویہ یاد ہے آپ کو؟''

''بہت ساری باتیں یاد رکھنے کی نہیں ہوتیں بلکہ اکثر باتوں کو بھول جانا ہی اچھا ہوتا ہے کیونکہ اسی میں ہی ہم سب کی فلاح چھپی ہے اس لیے اچھا ہوگا کہ تم بھی فرزانہ اور رشنا کی باتوں کو بھول کر اپنے دل سے نکال دو کیونکہ یہ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو رشتوں کو خراب کرتی ہیں۔''

"جی امی ......" دل نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اثبات میں سر ہلا دیا شاید زندگی میں کئی دفعہ ہمیں وہ کرنا پڑتا ہے جس کے لیے ہمارا دل آمادہ نہیں ہوتا۔



جاذب آج آفس سے لیٹ ہوگیا تھا' اس لیے امی اور ثنا کو فنکشن میں کچھ لیٹ جانا پڑا جب کہ بھابھی' جاوید بھائی کے ساتھ کب کی جاچکی تھیں پھر جاذب اور امی کے ساتھ جب وہ ہال میں داخل ہوئی تو بالکل سامنے اسٹیج پر بیٹھی ایمل پر ایک نظر ڈالی جس کے پہلو سے جڑی مائرہ بھابھی دور سے ہی خاصی خوش دکھائی دے رہی تھیں بالکل ایسے جیسے ایمل ان ہی کی بیٹی ہو' انہیں قطعی نظر انداز کرتی ثنا' امی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ فی الحال اس کا ارادہ کسی سے زیادہ بات کرنے کا نہ تھا کیونکہ وہ اندر آتے ہوئے دیکھ چکی تھی کہ ریسپشن پر رشنا اور فرزانہ ایک دوسرے سے جڑی بڑی شیر و شکر دکھائی دے رہی تھیں ایسے جیسے ان کے درمیان کبھی کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ فرزانہ کا بیٹا طلال بھی ہال میں مہمانوں کی خاطر داری کرتا بڑا مصروف اور خوش دکھائی دے رہا تھا جب کہ اسے مائرہ بھابھی نے بتایا تھا کہ ایمل کے انکار نے طلال کو بیمار کردیا ہے اب دولہا کون تھا؟ یہ اس نے جاننے کی ابھی تک کوشش نہ کی تھی۔ وہ ان ہی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی جب بھابھی اس کے قریب آن کھڑی ہوئیں۔

"ارے تم یہاں کیوں بیٹھی ہو آؤ تمہیں ایمل سے ملواؤں' سچ بہت خوب صورت دکھائی دے رہی ہے ویسے تو ماشاء اللہ بچی ہے بھی بہت پیاری۔" ساڑھی کا پلو سنبھالتی بھابھی نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ جب اسی پل رشنا وہاں آ گئی' لامحالہ ثنا کو کھڑے ہو کر اسے مبارک باد دینا پڑی جو چہرے سے ہی بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔

"ارے مبارک تو مائرہ کو دو آج جو کچھ ہوا سب اسی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔" اس نے بڑے پیار سے مائرہ کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا جب کہ ثنا کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

"میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔" جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کا جاننا ضروری ہے اس لیے ثنا فوراً بول اٹھی۔

"ارے بھئی تم سب کو تو پتا ہے کہ ایمل کے رشتہ میں کتنی پرابلم تھیں جہاں وہ چاہ رہی تھی وہاں کوئی راضی ہی نہ تھا' خاص طور پر میرے میکے والے جو فرزانہ بھابھی اور طلال کو لے کر خاصے جذباتی ہو رہے تھے اور صاف بات کہوں کہ میرے میاں کو بھی اس رشتہ پر بہت اعتراض تھا اور ایمل تھی کہ اپنی ضد سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار ہی نہ تھی تو ایسے میں ......"

"السلام علیکم! بھئی بہت مبارک ہو آپ کو۔" رشنا کی بات درمیان میں ہی رہ گئی جب اس کی کوئی جاننے والی مبارک باد دینے اس کے پاس آ پہنچی رشنا جواب مبارک باد وصول کرنے میں مصروف ہوئی تو اپنی بات مکمل کرنا شاید بھول ہی گئی جب کہ دوسری طرف سامنے خاموش کھڑی ثنا کا مارے تجسس برا حال تھا۔ وہ جاننا چاہ رہی تھی کہ اس سارے مسئلے میں مائرہ بھابھی کا کیا کردار ہے؟ جو سامنے کھڑی کسی فاتح کی طرح مسکرا رہی تھیں۔

"دراصل ایمل کی شادی عبداللہ سے ہو رہی ہے جسے وہ پسند کرتی تھی۔" بھابھی کی بات سن کر ثنا کے تجسس میں مزید اضافہ ہوگیا کہ آخر کار یہ سب ہوا کیسے۔

"ہاں بھئی میرے اس سارے مسئلے کو حل کرنے کے لیے مائرہ نے بہت ساتھ دیا' فرزانہ کو سمجھایا' مجھے اور سبحان کو اس رشتہ کے حق میں ہموار کیا اور بالآخر کر ہم سب بات سمجھ گئے اور آخر کار میری بچی اپنی خوشیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی جس کا سارا کریڈٹ مائرہ کو جاتا ہے۔"

"سچی بات تو یہ ہے کہ زندگی تو بچوں نے ہی گزارنی ہے تو ظاہر ہے کہ جو انہیں پسند ہے وہ ہی بہتر ہوتا ہے ویسے بھی ہمارا مذہب بچوں کو پسند کی شادی کی اجازت دیتا ہے۔"

بڑی بھابھی کے الفاظ تھے یا ایٹم بم' ثنا نے چونک کر انہیں دیکھا اسے یقین ہی نہ آیا کہ یہ بڑی بھابھی کہہ رہی ہیں دل چاہا پوچھے کہ کچھ دن قبل تو آپ کہہ رہی تھیں کہ پسند کی شادی آوارہ لوگوں کا کام ہے جن کی تربیت اچھی نہ ہو وغیرہ وغیرہ ...... مگر خاموش رہی بلاوجہ بول کر بات نہ بڑھانا چاہتی تھی کیونکہ بنا بولے جو کچھ اسے فرزانہ بھابھی نے سنایا تھا وہ ہی سبق آئندہ کے لیے کافی تھا۔

بھابھی مزید بول رہی تھیں کہ "نکاح کے لیے مولوی صاحب آ گئے۔" لہٰذا اپنی بات کا کوئی جواب سنے بنا وہ تیز تیز چلتی اسٹیج کی جانب دوڑیں جب ثنا نے پلٹ کر امی کی جانب دیکھا جو مسکراتی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

"یہ دنیا ہے بیٹا اور یہاں وہ ہی لوگ کامیاب ہیں جو وقت کی چال سمجھ کر اپنا رخ بدل لیں۔"

"مگر امی یہ تو کھلے عام منافقت ہے جو ہمارے مذہب کے خلاف بھی ہے۔"

"بس بیٹا یہ صرف تمہارے اور میرے سوچنے کی باتیں ہیں ورنہ لوگ ایسی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور ہمیشہ وہ کرتے ہیں جس سے ان کی عزت دوسروں میں بنی رہے اور واہ واہ بھی خوب ہو۔"

امی درست کہہ رہی تھیں ثنا کو یاد آیا جب ہوا کا رخ رشنا کے مخالف تھا تو مائرہ بھابھی نے بھی مخالفین کا دل کھول کر ساتھ دیا لیکن جہاں دیکھا کہ ماں کے دل میں بیٹی کی لیے نرمی اور ہمدردی کے جذبات ابھر آئے ہیں اور عبداللہ' رشنا بھابھی کی بھی پسند بن گیا ہے وہاں انہوں نے فوراً پینترا تبدیل کر کے ایک بار پھر سے خود کو پسندیدہ لوگوں کی فہرست میں شامل کرلیا اور شاید اسے ہی دنیا داری کہتے ہیں اور جو اس فارمولے کو سمجھ جائے زمانہ شناس لوگ کہلاتے ہیں اور بلاشبہ بڑی بھابھی کا شمار ایسے ہی زمانہ شناس لوگوں میں ہوتا تھا۔







تنزیلہ ریاض

غم ہے یا خوشی ہے تو

تم سے الفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

"یہ آپ کی فیورٹ غزل ہے؟" مجھے سر دھنتا دیکھ کر اس نے مجھ سے پوچھا ہے۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "ہم اپنے گھر کی خواتین کو مسکراہٹ کے علاوہ دے ہی کیا سکتے ہیں۔ ان کی محبت کا حق تو ادا نہیں کیا جاتا ہم سے...... سو مسکراہٹ ہی دان کر دیا کریں تو بڑی بات ہے۔ نمانیاں اسی سے خوش ہو جاتی ہیں۔"

"یہ بھی پسند ہے لیکن یہ والا گانا تو بہت ہی زیادہ پسند ہے۔" میں نے موبائل کی اسکرین پر نظر آنے والی ساکت تصاویر کی طرف دیکھتے ہوئے ایک کی جانب اشارہ کر کے اسے بتایا۔ وہ مسکرائی ہے۔

"یہ والا؟" وہ پوچھ رہی ہے۔

"ہاں...... یہ والا...... وے سب تو سوہنیا...... ہائے وے من موہنیا......" میں نے اپنی بھدی آواز میں اس گانے کو تقریر کرنے والے انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ مسکرائی۔

"مجھے بہت پسند تھا یہ گانا۔ پی ٹی وی کا زمانہ تھا تو اکثر چلایا کرتے تھے دو پروگراموں کے درمیان۔ سب کام چھوڑ چھاڑ ٹی وی کے سامنے بیٹھ جایا کرتے تھے ہم۔ دلچسپ بات بتاؤں چاچا جی کے پروگرام میں خط لکھ کر اکثر فرمائش کیا کرتا تھا میں اس گانے کی۔ اماں مرحومہ سامنے موجود نا ہوتیں تو گنگنایا بھی کرتا تھا۔" میں نے اس کو سب سچ بتایا۔ وہ ہنس دی ہے۔

"اسی لیے تو میں نے آپ کو اس زمانے کی ساری آڈیوز ڈاؤن لوڈ کر کے دی ہیں۔ اب آپ جب چاہیں آرام سے سن سکتے ہیں۔" وہ میرے موبائل فون کو سامنے کرتے ہوئے مجھے سمجھا رہی ہے۔ "آپس کی بات ہے سمجھ میں مجھے ایک لفظ نہیں آیا لیکن میں پھر بھی سر ہلاتا جا رہا ہوں۔ اب اس کے سامنے انکار کر کے کتنی بار چغد محسوس کرواؤں خود کو۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بارے میں اس کی بھی وہی رائے قائم ہو جائے جو میری اہلیہ محترمہ کی ہے سو میں سر ہلا ہلا کر اسے باور کروا رہا ہوں کہ میں موبائل فون پر غزلیں سننا بخوبی سمجھ گیا ہوں۔"

"اب آپ اپنی فیورٹ غزلیں انجوائے کریں۔ میں بھی فیس بک کا چکر لگا لوں ذرا۔ صبح سے نہیں دیکھا کچھ بھی، کتنی غلط بات ہے نا۔" وہ شرارتی سے انداز میں مسکرائی ہے۔ اس کو پتا ہے کہ گھر کی مالکن یعنی میری زوجہ محترمہ کو اس کی ایسی حرکتیں پسند نہیں آتیں سو ان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ بھی موبائل لینے کمرے میں چل دی ہے۔

میں اس کو جاتا دیکھ کر مسکرایا ہوں۔

''آئیں آپ کا تفصیلی تعارف تو کروادوں اس سے۔

''یہ میری بہو ہے۔ ہمارے گھر کی رونق میرے گھر کے سکون کو چار چاند لگا دیے ہیں اس بچی نے...... میرے بیٹے نے اپنی پسند سے شادی کی ہے اور اس شادی کے لیے بہت پاپڑ بیلنے پڑے ہیں اس کو اور مجھے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن جس کو تھا۔ اس کو اس شادی پر رضا مند کرنے کے لیے ہم نے بڑے جتن کیے۔ بڑے مراحل سر کیے۔۔ تب جا کر یہ بچی ہمارے گھر کی رونق بن پائی ہے۔

''آئیں ذرا آپ کو ان سب مراحل کی تفصیل سناتے ہیں بلکہ چھوڑیں۔ سنانے کا فائدہ نہیں، دکھاتے ہیں آپ کو۔

☆☆☆

''ارے آج ہی آ گئے، مزید رہ لیتے بیٹا! آرام سے اطمینان سے تین چار ہفتے بعد آ جاتے۔'' مہناز بیگم نے بیٹے کو باتھ روم کے دروازے سے نکلتا دیکھ کر طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ وہ ہنسی کو چھپا کر گیلے بالوں کو رگڑتے ہوئے واش بیسن کے قریب آ گیا۔

''جی ارادہ تو یہ ہی تھا لیکن پھر آپ کا خیال آ گیا کہ آپ کہیں میری جدائی میں بیمار نا پڑ جائیں تو بس پھر آنا پڑا۔'' وہ بنا شرمندہ ہوئے کہہ رہا تھا۔ مہناز بیگم نے سر جھٹکا پھر چائے کا کپ گھسیٹ کر اپنے سامنے کیا تھا اور اس کے لیے چائے انڈیلنے لگیں۔

''یہ جدائی تو اب میرا نصیب بن چکی ہے بیٹا جی! کوئی آج کا قصہ تو ہے نہیں۔ عرصہ ہوا یہ ہی سب دیکھ رہی ہوں۔ مجھے تو اب یہ بات بھی عجیب نہیں لگتی کہ آخر تم دو دو گھنٹے باتھ روم میں کرتے کیا ہو۔ سنا ہے قلوپطرہ اپنے حسن کی حفاظت کی خاطر غسل خانوں میں اتنا طویل قیام کیا کرتی تھی، تم اللہ جانے کیا کرتے رہتے ہو۔'' وہ چڑ کر طنزیہ سی ہو گئی تھیں حالانکہ پتا تھا کہ ان کے اکلوتے بیٹے کو باتھ روم میں زیادہ وقت بیتانے کی عادت ہے لیکن پھر بھی ناشتے کی میز پر اتنی دیر انتظار انہیں چبھتا بھی بہت تھا اور جب سے انہیں اندازہ ہوا تھا کہ وہ سیل فون بھی باتھ روم میں لے جاتا ہے تو وہ مزید ناراض رہنے لگی تھیں۔ دوسری جانب واش بیسن کے آئینے میں اپنے چہرے کے خدوخال کو تکتے ان کے بیٹے پر ذرا اثر نا ہوا تھا۔

''ارے تو ہم کیا کسی قلوپطرہ سے کم ہیں۔ ہمیں بھی تو اپنے حسن کو نکھارنا سنوارنا ہوتا ہے۔ التمش کہتے ہیں مجھے، سنا ہے اس نام کے بادشاہ ہوا کرتے تھے زمانہ قدیم میں اور ہم بھی کسی بادشاہ سے کم نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کو پروا نہیں۔ کسی سے بھی جا کر کہیں گی نا یونی ورسٹی میں کہ التمش سے ملنا ہے تو جواب ملے گا وہی التمش نا جس کا پوری یونی ورسٹی میں کوئی ثانی نہیں۔ اب کیا کہوں آپ سے۔ امی ہیں آپ میری، آپ کو دال اور گھر کی مرغی والا محاورہ سناتا اچھا لگوں گا کیا لیکن سچ یہ ہی ہے کہ یونیورسٹی میں بے حد مقبول ہے آپ کا یہ بیٹا۔'' وہ بالوں میں جیل لگاتے ہوئے انہیں بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ اگرچہ فی الوقت وہ مذاق کر رہا تھا لیکن یہ بات سچ بھی تھی کہ اس جیسا دوسرا کوئی نہیں تھا۔ وہ شروع سے ہی اسکول کالج اور یونیورسٹی میں اساتذہ سے لے کر اپنے کلاس فیلوز کا منظور نظر رہا تھا۔ اس کے ایک ایک لفظ میں اس کے وجود کی رعونت جھلک رہی تھی۔ مہناز بیگم کے چہرے پہ مسکراہٹ چمکی اور پھر غائب ہو گئی۔

''تحمل بیٹا جی! تحمل...... اب اتنے بھی ہیرو نہیں ہو جتنا بننے کی کوشش میں ہلکان ہوئے جا رہے ہو۔ ذرا دھیان سے، ہاتھ ہلکا ہی رکھو۔ یہ کیا کہ اپنے ہی ہاتھوں مکھن میں لوٹ پوٹ ہونے لگے۔'' مسکراتے ہوئے اسے آسمان سے زمین پر لا رہی تھیں، اپنے بیٹے کی طبیعت کا اندازہ تھا انہیں۔

''کیوں بھئی کیوں ہاتھ ہلکا رکھیں۔ ڈرتے ہیں کیا کسی سے ہم، کیوں نا لوٹ پوٹ ہوں ہم مکھن میں۔ مکھن تو بنا ہی ہمارے لیے ہے۔ پراٹھا ہوں مکھن شان ہے میری، سوکھی روٹی نہیں ہوں۔ التمش کہتے ہیں مجھے۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے انہیں چڑا رہا تھا۔

اپنی شخصیت کی پروموشن میں تو وہ ہمیشہ ہی دو قدم آگے چلنے کا عادی تھا۔ یہ بات تو سچ تھی کہ قد کاٹھ میں وہ کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں تھا۔ چھ فٹ سے اونچا قد تھا، پھر جم جا جا کر جسم بھی خوب کسرتی بنا رکھا تھا اس پر گندمی رنگت اور تیکھے نقوش کا حامل ان کا بیٹا شروع سے ہی خاندان اور محلے میں بڑا دل عزیز رہا تھا لیکن اس کی شخصیت کا اصل چارم صرف اس کا ظاہری قد کاٹھ نہیں تھا۔ یہ کچھ اور تھا جو اسے بہت جلد لوگوں میں مقبول کر دیتا تھا۔ وہ لاپروا تھا اور مغرور بھی، ایک شان بے نیازی اس کے سارے وجود پر ہمہ وقت طاری رہتی تھی۔ وہ چلتا تھا تو زمانے کو جوتے کی نوک پر رکھ کر چلتا تھا۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے اور بولنے چالنے میں ایک عجب سا طنطنہ ہمہ وقت جھلکتا تھا۔ سونے پر سہاگا اس کا پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تھا۔ مجال ہے اس نے کبھی کوئی آؤٹ آف فیشن کپڑا پہنا ہو۔ موسم کی تو اس نے کبھی پروا نا کی تھی لیکن فیشن کی پروا اسے ہمیشہ رہتی تھی۔ بچپن سے لے کر اب تک اس نے کبھی آؤٹ ڈیٹڈ کپڑا نا پہنا تھا۔ اس کی وارڈروب میں ہر موقع کی مناسبت سے لباس استری کر کے موجود رہتا تھا، کون سا رنگ کس موقع پر پہننا ہے یہ بات سارے خاندان میں اس سے بہتر کوئی نہیں بتا سکتا تھا اور یہ بات دونوں ماں بیٹا جانتے تھے کہ اس اعلا درجے کے ڈریس سینس کا کریڈٹ اس اکیلے کو نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس نے یہ سب اپنے والد محترم سے وراثت میں لیا تھا۔

''یہی صورت حال رہی تو لوگ تمہیں التمش کے بجائے مغرور کہنے لگیں گے۔ تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ ماسٹر جی کتنی دیر تمہارا انتظار کرنے کے بعد گھر سے نکلے ہیں۔ صبح صبح باپ کو تمیز سے خدا حافظ کہہ دو تو کیا جائے تمہارا۔'' مہناز بیگم نے سلائس پر چیز کی ایک خاصی مقدار کا لیپ کرتے ہوئے اسے جتایا۔

''لوگوں کی پروا کسے ہے۔ کہنے دیں جو بھی کہتے ہیں لوگ، یہ کانوں کے دونوں اطراف جو اینٹر اور ایگزٹ رکھا ہے اللہ نے، اس کا فائدہ اٹھایا کریں نا اور ماسٹر جی کا اچھا یاد دلایا آپ نے۔ آپ ان سے پوچھتیں کیوں نہیں کہ اتنی صبح صبح آخر گھر سے نکلتے کیوں ہیں۔ میں بتا رہا ہوں آپ کو کہ ذرا نظر رکھا کریں۔ مجھے ان کے لچھن اچھے نظر نہیں آ رہے، بھلا بتاؤ آٹھ بجے ہی گھر سے تشریف لے جاتے ہیں۔ یہ شریف آدمیوں کا چلن نہیں ہو سکتا۔ اتنی صبح اٹھتا کون ہے آج کل۔ بتاؤ اتنا آؤٹ ڈیٹڈ باپ میرے حصے میں ہی آنا تھا۔''

وہ مزاحیہ انداز میں بڑبڑاتا ہوا ان کے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ پلیٹ میں سجا بنا کر رکھا گیا سلائس اٹھا کر کھانا شروع کرتا، اس کے سیل کی مخصوص بپ بجنے لگی تھی۔ وہ سرعت سے اٹھا اور باتھ روم کی جانب چل دیا تھا۔ مہناز بیگم نے ناگواری سے اس کے اس عمل کو دیکھا تھا۔ ابھی تو انہیں اس کو اس کے باپ کے متعلق فضول بولنے پر سرزنش کرنی تھی پھر ذرا ماحول بنا کر کچھ اہم باتیں دہرانی تھیں لیکن درمیان میں یہ سیل فون آ گیا تھا۔ اس کا فون آج کل کچھ زیادہ ہی بجنے لگا تھا۔ وقت بے وقت وہ فون پر مصروف نظر آنے لگا تھا۔ انہیں اندازہ تو تھا کہ وہ اپنے سیل فون کو بھی باتھ روم میں

ساتھ ہی لے جاتا ہے اور یہ جو باتھ روم میں اتنا طویل قیام ہوتا ہے اس کی بھی وجہ کہیں نا کہیں۔ یہ۔ سیل فون، ہی ہے لیکن پھر بھی ان کی دعا تھی کہ وہ خدشہ جو انہیں بے چین کیے رکھتا ہے، وہ خدشہ ہی ہو۔ وہ چند لمحوں بعد ہی فون ہاتھ میں لیے دوبارہ میز پر آ گیا تھا۔

"یہ منحوس چیز کچھ زیادہ ہی استعمال میں نہیں رہنے لگ گئی آج کل تمہارے؟ چل کیا رہا ہے تمہاری زندگی میں آج کل، کیا سلسلہ ہے یہ؟" وہ چڑ کر پوچھ رہی تھیں۔

"امی......" اس نے کچھ زیادہ ہی حیران ہو کر ان کے شکوے کو سنا تھا پھر ان کے سخت لہجے سے خائف ہو کر بولا۔

"آپ کیا ماسٹر جی کی طرح بس ہر وقت ٹوکتی رہتی ہیں۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔" اسے برا لگ گیا تھا۔ ایک تو یہ بڑا مسئلہ تھا، وہ ناراض بہت جلدی ہو جاتا تھا اور یہ عادت بھی اتفاق سے اس نے ماسٹر جی سے لی تھی۔ دونوں باپ بیٹے نے بے حد زود رنج مزاج پایا تھا، ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جایا کرتے تھے۔

"ٹوک نہیں رہی ہوں، حیران ہو رہی ہوں اور کھوج لگانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ آخر اس استعمال مسلسل کے پیچھے وجہ کچھ "خاص" تو نہیں۔" وہ اسے چڑاتے ہوئے بولی تھیں۔ اس نے سابقہ انداز میں ہی گردن ہلا کر گویا ان کی بات کو رد کر دیا تھا۔

"آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اس کی وجہ "عام" ہو سکتی ہے۔ التمش کہتے ہیں مجھے، ہمارے یہاں ہر چیز "خاص" ہی ہوتی ہے۔ عام تو ہماری زندگی میں کبھی آم بھی نہیں ہوا۔"

"مجھے احساس ہے بیٹا جی! اسی لیے تو تمہارے لیے ایک بے حد خاص لڑکی چنی ہے میں نے اور میں چاہتی ہوں......" مہناز بیگم، ابھی ماحول بنا ہی رہی تھیں کہ اس نے بڑے بڑے لقمے لے کر اپنا سلائس ختم کیا اور ان کی بات کاٹتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"خاص لڑکی...... وہ چار فٹ دس انچ......" انداز میں ناپسندیدگی ہی نہیں تمسخر بھی تھا۔

"کم آن امی جی! جاگ جائیں۔ خواب غفلت میں زیادہ دیر پڑا رہنا صحت کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"التمش! ہیرا ہے وہ لڑکی۔ سدا زندگی دعائیں دو گے مجھے۔" وہ زچ سی ہو گئی تھیں۔ ان کے اور ان کے بیٹے کے درمیان یہ موضوع ہمیشہ ہی بنا کسی نتیجے کے اختتام کو پہنچ جاتا تھا۔

"اب ماؤں کو کوسنے تو کوئی بھی نہیں دیتا۔ دعائیں تو دیتا ہی رہوں گا میں لیکن اس چار فٹ دس انچ سے شادی مر کر بھی نہیں کر سکتا بھلا بتاؤ، میرے ساتھ کھڑی ہو تو میری کہنی تک بھی نہیں پہنچ سکتی ہے۔ آپ کیا اسے ساری زندگی سیڑھی پر کھڑا رکھنا چاہتی ہیں کیونکہ مجھ سے بات کرنے کے لیے سیڑھی ہی لگانا پڑا کرے گی اسے۔" وہ واش بیسن کے قریب کھڑا دوبارہ سے کلی کرتے ہوئے نہایت تمسخر بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"غضب خدا کا، اتنا غرور...... اتنی پیاری بچی ہے۔ کیا ہو گیا جو ذرا سا قد کاٹھ میں کم ہے تم سے۔" وہ انتہائی ناراضی بھرے لہجے میں بولی تھیں۔ اس نے مڑ کر ایک نظر انہیں دیکھا پھر ہنسا تھا۔

"التمش کہتے ہیں مجھے۔ غرور سجتا ہے مجھ پر، صرف وہ ہی ایک پیاری بچی نہیں ہے دنیا میں۔ ذرا وقت آنے دیں اس سے کہیں زیادہ پیاری بچی کو لا کھڑا کریں گے آپ کے سامنے۔" وہ شرارتی انداز میں ان کی جانب دیکھ کر بولا تھا۔ مہناز بیگم اس واضح اعتراف پر سن رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

"یہ کب ہوا؟" وہ اسے جگانے کے لیے کمرے میں آئی تھیں لیکن اسے جاگتا دیکھ کر پہلے وہ چونکیں پھر جب اس کے بیڈ پر پڑا وہ سنہرا لباس دیکھا تو ان کی آنکھیں جیسے حیرانی سے پھٹ سی گئیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں استفسار کیا اس سے پھر اسے اثبات میں سر ہلاتا دیکھ کر وہ آگے بڑھی تھیں۔

"تم نے تو کمال کر دیا سونیا!" انہوں نے جھک کر اس لباس پر ہاتھ پھیرا تھا۔ وہ مسکرائی۔

"یہ بتائیں کیسا لگ رہا ہے؟" وہ ان سے پوچھ رہی تھی۔ انہوں نے اس بھاری کام دار کلیوں والے فراک کو بہت نرمی اور مہارت سے اٹھایا۔ وہ بیڈ پر پڑا جتنا بھاری نظر آتا تھا۔ ہاتھوں میں آ جانے کے بعد اس سے کہیں زیادہ بھاری لگنے لگا تھا۔ ایک نظر اس لباس پر ڈال کر انہوں نے پھر دوبارہ سے سراہنے والے انداز میں بیٹی کو دیکھا اس نے رات کو انہیں بتایا تھا کہ وہ صبح تک اپنا کام مکمل کر لے گی لیکن ان کو یقین نہیں تھا کہ یہ کام ختم ہو سکے گا۔ انہیں خدشہ تھا کہ اسے یہ لباس واپس کرتے ہوئے معذرت ہی کرنی پڑے گی لیکن اب یہ تیار لباس دیکھ کر ان کی آنکھیں اس کی خوب صورتی سے چندھیا سی گئی تھیں۔ یہ انتہائی بھاری کام دار عروسی لباس تھا۔ باریک گنجلک پر بہت شیفون سا مگر نفیس اور بھاری کام کیا گیا تھا۔ اس کی سلائی کے لیے بے پناہ مہارت درکار تھی اور ان کی بیٹی کوئی ماہر ڈریس ڈیزائنر نہیں تھی۔ اس نے باقاعدہ کسی سے نہیں سیکھا تھا بس ان سے پوچھ پاچھ کر یا پھر انٹرنیٹ پر ویڈیوز دیکھ دیکھ کر کپڑے سینا سیکھ گئی تھی لیکن اس عروسی لباس کو دیکھ کر انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی بیٹی اس ہنر میں بے حد طاق ہو چکی ہے۔

کل رات کی بات تھی جب اس کی ایک دوست نے پریشانی میں فون پر بتایا تھا کہ درزی نے عین وقت پر اس کی بھابھی کے ولیمہ کا لباس تیار کرنے سے معذرت کر لی تھی۔ وہ بہت پریشان تھی اور سونیا سے کسی کی پریشانی دیکھی نا جاتی تھی۔ رات گیارہ بجے وہ اَن سِلا لباس اس نے اپنے گھر منگوایا تھا اور پھر عطیہ خاتون کی سرزنش کے باوجود وہ اسے سینے بیٹھ گئی تھی اور اب جو چیز سامنے پڑی تھی وہ

یہ بتانے کو کافی تھی کہ ان کی بیٹی کو اپنا آپ منوانے کے لیے کسی سند یا سرٹیفکیٹ کی ضرورت نا تھی۔

''روبی کو دکھایا؟'' انہوں نے اس کی سہیلی کی بابت دریافت کیا تھا

''جی۔ اس کو پکچر واٹس ایپ کر دی تھی۔ اس کی کال آئی تھی، بس آ رہی ہے ایک گھنٹے میں لینے کے لیے۔ بہت شکریہ ادا کر رہی تھی۔ آنٹی نے بھی بات کی، وہ بھی بہت شکر گزار ہو رہی تھیں اور حیران بھی۔'' وہ عام سے انداز میں بتا رہی تھی۔ عطیہ خاتون کو اس پر بے حد پیار آیا۔

''اپنی ممانی کو بھی پکچر بھیج دینی تھیں۔ وہ بھی حیران رہ جائیں گی۔'' عطیہ نے اسے اکسایا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات یک دم بدلے تھے جیسے ان کی بات اچھی نہ لگی ہو۔

''اب ایسا بھی کوئی کارنامہ سر انجام نہیں دیا میں نے کہ سارے خاندان کو تصویریں بھیجی جائیں۔ آپ تو شاید اخبار میں بھی تصویر چھپوانا چاہیں گی۔'' وہ سادہ سے انداز میں بولی تھی۔

''ارے تو کیوں نا چھپواؤں۔ یہ کارنامہ ہی ہے، میری بیٹی ہے ہی اتنی قابل۔ کسی سے سیکھا نا پوچھا، ایسا شان دار عروسی لباس تیار کر دیا دو گھنٹوں میں اور کارنامہ کسے کہتے ہیں۔ آنکھیں نہیں ٹھہر رہیں اس شاندار جوڑے پر۔ کیسی گھیر دار لچکتی ہوئی فال بنائی ہے، بہت اعلا اور عمدہ۔ تم نے تو واقعی کمال کر دیا۔ تم میری بیٹی نہیں ہو سونیا! اللہ تعالیٰ کا معجزہ ہو۔ میں تو حیران ہوئی جا رہی ہوں دیکھ دیکھ کر، کہاں سے سیکھ لیتی ہو یہ سب چیزیں۔ میں تو اتنی بد سلیقہ ہوں، تم کہاں سے اتنی سلیقہ مند ہو گئیں میری جان!'' انہوں نے دل کھول کر بیٹی کو سراہا تھا۔ ایک جھینپی ہوئی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

''ایسی بھلا کون تعریف کرتا ہے اور کوئی کر بھی دے تو وہ اس کو سمیٹ کر رکھے کہاں۔'' سونیا صاحبہ کو تعریفیں وصولنے اور سمیٹنے کا قطعاً کوئی سلیقہ نہیں تھا۔

''بس کریں اب میری تعریفیں اور یہ کیسی باتیں کرتی رہتی ہیں ماما! آپ ہی سے تو سیکھا ہے جو بھی سیکھا ہے۔'' وہ ماں کے اس کومپلیمینٹ پر شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

''ارے جانے بھی دو بٹیا رانی! مجھ میں اتنا ہی سلیقہ ہوتا تو وہ دو جو بیاہ کر سسرال والوں کی قسمت کو رو رہی ہیں ان کو بھی نا سکھا چکی ہوتی یہ سب۔'' وہ مصنوعی تاسف چہرے پر سجا کر بولی تھیں۔ ان کی یہ بیٹی صرف سلائی کڑھائی میں ہی ماہر نہیں تھی۔ آرٹ اینڈ کرافٹ سے لے کر کھانا پکانے، بُنائی باغبانی تک وہ با کمال تھی۔

اوہو...... وہ تو بڑی آپی کی شادی ہی اتنی جلدی کر دی آپ نے، وہ کیسے سیکھتیں یہ سب اور چھوٹی آپی کی نظر ہی اتنی کمزور تھی کہ وہ مشین لے کر زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتی تھیں۔'' اس نے وضاحت دی تھی۔

''ارے اب ایسی بھی کوئی کمزور نظر نا تھی۔ وہ تو بس ڈائجسٹ پڑھنے کے جنون نے آنکھوں پر چشمہ سجا دیا تھا جس کو بہانہ بنا کر تمہاری چھوٹی آپی سلائی مشین کے پاس بھی نا پھٹکتی تھی۔'' عطیہ خاتون زیادہ متاثر نا ہوئی تھیں۔

''لیکن اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا نا کہ آپ نے انہیں کچھ سکھانے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے یاد ہے آپ ان کو کتنا سمجھایا کرتی تھیں۔ وہ زمین پر پڑے شاپر سمیٹتے ہوئے ان سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تھکن تھی، نا ہی رات بھر جاگنے کی وجہ سے کوئی بے زاری تھی۔

''اچھا چلو چھوڑو یہ سب۔ روبی کو میں سنبھال لوں گی۔ تم ناشتا کرو اور پھر سو جاؤ کچھ دیر، شام کو تمہیں نکاح کی تقریب پر بھی جانا ہے۔ ابھی نذیراں آئے گی تو میں اس سے یہ سب صاف کروا لوں گی۔'' انہوں نے اسے چیزیں سمیٹنے سے روکا تھا۔ اپنی جس دوست کی بھابھی کے لیے اس نے یہ لباس تیار کیا تھا۔ اسی دوست کے نکاح کی تقریب بھی شام کو تھی اور وہ دونوں ماں بیٹی بھی مدعو تھیں۔

''ابھی شام ہونے میں بہت وقت پڑا ہے امی! ابھی تو میں یہ سب صفائی ستھرائی کروں گی، باجی نذیراں پر چھوڑ دیا تو سمجھیں تین چار سال بعد ہی کریں گی۔'' وہ جلدی جلدی کترنیں سمیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''اچھا اپنی ممانی کو تصویر بھیجو سب سے پہلے اس لباس کی۔ دیکھنا وہ کتنی خوش ہوں گی۔'' عطیہ خاتون نے گہری سانس بھرتے ہوئے تاکید کی۔ اس نے ان کی بات کی جانب کوئی توجہ نا دی تھی۔ اس کی فی الوقت ساری دلچسپی صفائی ستھرائی میں تھی۔ یہ نہیں تھا کہ ان کی صفائی والی لڑکی کام اچھا نا کرتی تھی بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ سونیا کو کسی کا کام پسند نا آتا تھا اور اسے ہر کام خود سے کرنے کی عادت تھی۔

وہ ان کی تیسرے نمبر والی آخری ہونہار بیٹی تھی۔ اللہ نے تین ہی بیٹیاں دی تھیں اور یہ آخری اولاد تو جیسے انہوں نے بڑی منت و مرادوں کے بعد لی تھی اللہ سے۔ خواہش تو یہ تھی کہ اس بار اللہ ایک عدد بیٹے سے نواز دے مگر جب تیسری بار بھی بیٹی ہوئی تو ان کا دل ٹوٹ سا گیا تھا پھر جب ساس نے وہ ننھی سی پری گود میں دی تو وہ زیادہ دیر ناراض نا رہ سکی تھیں۔ وہ بڑی بڑی گہری آنکھوں والی بچی ان کی گود میں دنیا کو انتہائی تجسس سے دیکھتی ہوئی انہیں بے حد پیاری لگی اور پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ پیار بڑھتا ہی چلا گیا تھا۔ بڑی دونوں بیٹیاں بھی ان کے دل کے بے حد قریب تھیں مگر سونیا تو جیسے ان کے دل کا ٹکڑا تھی اور وہ تھی بھی بڑی من موہنی سی...... ذرا بڑی ہوئی تو عطیہ خاتون کو احساس ہوا کہ سمجھ داری بھی ان کی اس بیٹی پر ختم تھی۔ پڑھائی میں بھی اچھی تھی، ان کے ساتھ گھر کے کام کاج میں بہت جلد ہاتھ بٹانے کی عادت اس میں پیدائش کے ساتھ ہی آ گئی تھی اور وقت نے ثابت کیا تھا کہ سلیقہ بھی جیسے کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اس میں۔ اس سے فارغ نا بیٹھا جاتا تھا۔ سلائی کڑھائی سے لے کر گھر سجانے سنوارنے یا نت نئے کھانے بنا کر کچن سنبھالنے کی بات ہوتی۔ وہ ہر کام میں آگے تھی۔

دونوں بڑی بیاہی بہنیں اپنے اپنے سسرال میں دعوتوں سے پہلے اس سے، فون کر کے مشورہ کرتی تھیں اور پھر صرف سلیقہ ہی نہیں تھا، رنگ روپ میں بھی کسی سے کم نا تھی۔ گندمی رنگت کے ساتھ بہت مناسب سے نقوش عطا کیے تھے اللہ نے، بے داغ چہرہ، معصومیت کی چمک سے لبریز گہری آنکھیں اور اچھی بات کرنے کی ادا اسے ایک پرفیکٹ بہو میٹریل ثابت کرتی تھی۔ اس حساب سے تو بڑی دونوں بہنوں کی طرح اب تک اس کا بہت مناسب سی جگہ پر رشتہ ہو چکا ہونا چاہیے تھا لیکن مسئلہ تھا تو بس ایک...... قد بہت بوٹا سا تھا۔ اتنا بوٹا کہ خاندان کی ساڑھے پانچ پانچ فٹ کی لڑکیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کی چھ انچ کی ہیل بھی ناکام ہو جایا کرتی تھی اور پھر ان کے یہاں شادیاں اپنی ہی ذات برادری میں کی جاتی تھیں اور خاندان میں اتنا چھوٹا قد کسی کا بھی نہیں تھا اور دراصل یہ بھی وجہ تھی کہ جو اسے کچھ زیادہ ہی چھوٹے قد کا ثابت کرتی تھی کہ ان کے خاندان میں سب ہی لمبے قد کے تھے۔ اس کا نارمل سا پانچ فٹ کے قریب قد سب کو چھوٹا لگتا تھا کیونکہ خاندان میں لڑکے تھے تو وہ بھی چھ فٹ سے نکلتے ہوئے اور لڑکیوں میں بھی کوئی ایک بھی ساڑھے پانچ سے کم کی نا تھیں۔ یہ سونیا ہی تھی جو پانچ فٹ سے کم تھی۔ اس کی دونوں بڑی بہنیں بیس بیس سال کی عمر چچا اور پھپھی کے یہاں بیاہی بھی جا چکی تھیں لیکن سونیا تیئیس کی ہو چکی تھی بی ایس سی کر کے تین سال سے گھر میں بیٹھی تھی لیکن ابھی تک کوئی مناسب جوڑ نا ملا تھا۔ اسے تو شاید کوئی پروا نا تھی۔ اس نے خود کو لاتعداد کاموں اور مصروفیات میں الجھا رکھا تھا۔ بڑی بہنوں کی طرح اعلا تعلیم یافتہ نہیں تھی لیکن باقی ہر ہنر میں یکتا تھی۔ اس نے گھر سے ہی ایک چھوٹے سے بزنس کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ آرڈر پر کیکس اور کپ کیکس تیار کرتی تھی، کسٹمائزڈ کارڈز، بیگز، گفٹس آئٹمز اور گوڈی پیکس بنا کر دیتی تھی۔ بچوں کے اسکولز کے سائنس اور آرٹس پروجیکٹس بنا کر دیتی تھی۔ اسے تو

سوچنے کی فرصت بھی نہیں تھی کہ وہ تئیس کی ہوگئی یا چھبیس کی...... لیکن عطیہ خاتون کی نیند اٹھتے بیٹھتے اسی ایک مسئلے نے اُڑا رکھی تھی۔ چلتے پھرتے بس یہ ہی ایک دعا ان کے لبوں پر رہتی تھی۔

''یا اللہ! میری اس شہزادی جیسی بیٹی کے نصیب کب کھلیں گے۔ مولا، کرم کردے اور اسے ایک اچھا جیون ساتھی عطا کردے۔''

دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ جس شخص کو بیٹی کے جیون ساتھی کے طور پر دیکھتی تھیں، اس کا نام نقشہ سب انہیں پتا تھا۔

ان کا بس نا چلتا تھا کہ ''جیون ساتھی'' کی جگہ بھتیجے التمش کا نام با آواز بلند دعاؤں میں لیا کریں لیکن بیٹی کے چہرے پر پھیلتی ناراضی و ناگواری دیکھ کر وہ بہت ہی دھیمی آواز میں اس طرح دعا کیا کرتی تھیں۔

''یا اللہ! میری اس شہزادیوں جیسی بیٹی کے نصیب کھول دے۔ مولا کرم کردے اور اسے التمش عطا کردے۔''

☆☆☆

''کیسی ہو؟'' عطیہ بیگم نے بہت محبت سے ان کی خیریت دریافت کی تھی۔ مہناز نے گہری سی سانس بھری۔ ان کا دل سیل فون پر ان کا نمبر دیکھ کر ہی بوجھل سا ہوگیا تھا حالانکہ ہر تیسرے چوتھے روز ان بھابھی نند کی آپس میں بات ہوتی تھی۔ خیر خیریت کے علاوہ مختلف سیریل، مارننگ شوز، نئے فیشن ٹرینڈز خاندان میں چلنے والی نئی افواہیں، چغلیاں، خوشی غمی فون پر ہر ہفتے ہی ڈسکس ہوتی تھیں۔ وہ دونوں اسکول کے زمانے کی سہیلیاں تھیں۔ عطیہ بیگم کے والدین نے جب اپنے بیٹے کے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کیا تب ہی سے عطیہ نے واویلا مچانا شروع کردیا تھا کہ ان کی بھابھی تو ان کی سہیلی ہی بنیں گی۔ خاندان برادری بھی اپنی تھی اور دونوں گھروں میں پیار محبت بھی تھا سو بزرگوں کی باہمی رضامندی سے مہناز ان کی بھابھی بن گئی تھیں۔ آج تک کبھی ایسا نا ہوا تھا کہ ایک مسئلے پر ان دونوں کی دو رائے ہوئی ہو لیکن اب آکر جب ان دونوں کے بچوں کے رشتے کی بات کہیں نکلی تھی تب سے جانے کیوں رویوں میں کچھ کھچاؤ آنا شروع ہوگیا تھا۔

''ٹھیک ہوں عطیہ! تم سناؤ، کیا کررہی تھی۔ آج گھر کے کاموں سے جلدی فارغ ہوگئی تھی۔'' مہناز بیگم نے پوچھا تھا، عام طور پر وہ دونوں دوپہر کے کھانے کے بعد بات کیا کرتی تھیں لیکن مہناز نے بہت دن سے انہیں فون نہیں کیا تھا۔

''آج کل اتنے بجے ہی فارغ ہوجاتی ہوں۔ تین لوگوں کا کام ہی کتنا ہوتا ہے اور پھر صفائی والی بہت اچھی مل گئی ہے مجھے، سب کچھ اتنے اطمینان سے کرکے جاتی ہے کہ دوبارہ کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے بعد سالن ہی بنانا ہوتا ہے مجھے، روٹی بنانی ہو یا چاول سونیا ہی کرتی ہے۔'' وہ پہلے ایسے نہیں تھیں لیکن اب جانے کیوں ہر بات میں بیٹی کا ذکر خود بخود درآتا تھا۔ سونیا کھانے پکانے میں ماہر تھی لیکن وہ اسے کچن میں الجھاتی نہیں تھیں۔

''پھر تو سکون سے ''میرا سلطان'' دیکھتی ہوگی آج کل۔'' مہناز نے چڑایا۔ ان دونوں کا پسندیدہ پروگرام دوپہر کے وقت ریپیٹ ٹیلی کاسٹ ہورہا تھا آج کل۔

''ارے سکون کہاں...... وہ ہے نا میری سامری جادوگر جیسی بیٹی، وہ کہاں بیٹھنے دیتی ہے سکون سے۔ آج کل جینز کے بیگز بنانے کا آرڈر پکڑا ہوا ہے۔ ان پر کروشیا کروارہی ہے مجھ سے، بس وہی لے کر بیٹھی ہوئی ہوں ابھی بھی۔'' عطیہ بیگم نے جیسے بیٹی کی شکایت کی تھی۔

''ارے واہ۔ جینز کے بیگ۔ یہ آئیڈیا کہاں سے آگیا؟'' وہ سراہ کر پوچھ رہی تھیں۔ عطیہ بیگم کو خوشی تو بہت ہوئی مگر لہجے میں ناگواری سمو کر بولیں۔

''ایسے آئیڈیاز تو آتے رہتے ہیں اسے۔ ایسے ایسے بیگز بنارہی ہے کہ کیا بتاؤں، تصویریں نہیں بھیجیں اس نے تمہیں۔ پورے ایک لاکھ کا آرڈر ملا ہے، مختلف طرح کے بیگز بنا کردینے ہیں۔''

''ماشاء اللہ! بہت ہی ہنرمند بچی ہے ہماری سونیا!'' انہوں نے مزید سراہا تھا۔

''اور تھکتی بھی نہیں ہے یہ لڑکی! سارا سارا دن لگی رہتی ہے، جب بھی کوئی نیا آرڈر ملتا ہے دن رات ایک کردیتی ہے اور ہمیشہ وقت سے پہلے تیار کر کے دے دیتی ہے۔ دراصل گھٹی (پیدائش کے وقت جو شہد یا کھجور کا میٹھا بچوں کو چٹایا جاتا ہے) بھی تو تمہاری ہے نا۔ ممانی کا اثر ہے بھئی۔'' وہ ہنسی تھیں۔

''رہنے بھی دو عطیہ! اتنا ہی گھٹی کا اثر ہوتا تو اپنے ہونہار سپوت کو بھی میں نے ہی دی تھی گھٹی۔ اس پر تو ذرا اثر نا آیا میرا، اتنا لاپروا غیر ذمہ دار اور سست لڑکا ہے کہ پوچھو مت۔'' وہ شکوہ کناں انداز میں بولیں۔

''بیٹے تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بیٹیاں ذرا جلدی سمجھ دار ہوجاتی ہیں۔ ماں باپ کا احساس جلدی ہونے لگتا ہے انہیں۔'' عطیہ نے تسلی دینی چاہی تھی۔

''صحیح کہہ رہی ہو۔ بیٹیوں کے بھی کتنے فائدے ہیں نا۔ کاش میری بھی ایک بیٹی ہوتی تو میں بھی تمہاری طرح یہ بات کہہ سکتی۔ اب تو یہ حال ہے کہ ماسٹر جی اور ان کے بیٹے کے نخرے اٹھاتے صبح سے شام ہوجاتی ہے۔ ماسٹر جی کو سبزی چاہیے تو بیٹے کو مرغی۔ ان کو ناشتے میں انڈہ کھانا ہے تو وہ سوجی کا حلوہ مانگیں گے۔ میں تو فرمائشیں پوری کرکر کے اور کپڑے استری کرکر کے تھک جاتی ہوں سچی۔'' مہناز بیگم بولی تھیں۔

''کیوں چغلیاں کررہی ہو میرے بھتیجے کی۔ ایسا پیارا بچہ سارے خاندان میں کسی کا نہیں۔ چند دن پہلے مجھے تصویریں بھیجی تھیں اس نے، سفید شلوار قمیص میں ایسا ہیرا لگ رہا تھا نا۔ میں تو تصویر کی ہی نظر اتارتی رہی، دعائیں پڑھ پڑھ پھونکتی رہی۔'' عطیہ کے لہجے سے محبت پھوٹنے لگی تھی۔

''ارے پیارا ہونا کون سا مشکل ہے آج کل۔ ذرا سی محنت کرلو تو سب ممکن ہوجاتا لیکن ہنر اور سمجھ داری ایسی چیزیں نہیں جو سیلون اور پارلر میں سکھائی جاسکیں۔'' وہ کافی ناراض لگتی تھیں بیٹے سے۔

''سیکھ جائے گا بھئی، سب ہی سیکھ جاتے ہیں۔ لڑکے تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اپنے ماسٹر جی کا وقت بھول گئی ہو، اللہ بخشے ہماری اماں مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ جانے یہ لڑکا کب سمجھ دار ہوگا۔ زندگی میں کچھ کرے گا بھی نہیں لیکن تم گواہ ہو شادی کے بعد بھائی کی طبیعت میں ذمہ داری آگئی تھی۔ وہی لڑکا جو غیر ذمہ دار سا ہوا کرتا تھا شادی کے بعد کیسے سب کے لیے ماسٹر جی ہوگیا تھا۔ التمش بھی کھونٹے سے بندھے گا تو سیکھ جائے گا۔'' انہوں نے ہمیشہ کی طرح موضوع کو اپنے حق میں ہموار کیا تھا۔

''اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا ہوگا، کھونٹا بھی کون سا ہماری مرضی کا چنیں گے، اپنی منشا مرضی سے منتخب کریں گے کھونٹا تو اپنے جیسا ہی ہوگا غیر ذمہ دار اور لاپروا۔'' انہوں نے چڑ کر اگل ہی دیا تھا۔ عطیہ کی ہارٹ بیٹ مس ہوئی، انہیں خفیف سا جھٹکا لگا تھا۔ اگلا جملہ منتخب کرتے ہوئے بڑی ہمت کرنا پڑی انہیں۔

''اچھا آ...... آ...... تو ایسا کچھ سلسلہ ہے۔ التمش کو پسند ہے کوئی......؟'' انہوں نے پوچھا، ساتھ ہی دل میں دعا کی کہ بھاوج ان کی بیٹی کا نام لے کر ان کی ساری پریشانی دور کردے۔

''ارے ہمیں کہاں بتاتے ہیں کچھ۔ تم چھوڑو التمش کی بات، تم بتاؤ سونیا کے رشتے کی بات چلی کہیں۔ میری ایک جاننے والی ہیں انہوں نے رشتے کروانے کا کام شروع کیا ہے۔ اچھی بھروسے والی خاتون ہیں، تم کہو تو ان کو سونیا کی تصویر دے دوں۔'' وہ پوچھنے لگی تھیں۔ عطیہ کا بلڈ پریشر جیسے ایک دم لو سا ہوگیا۔ یہ تو کھلم کھلا انکار کررہی تھیں بھاوج۔ ان کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔

''ارے مہناز! دروازے پر شاید دودھ والا آگیا ہے۔ کب سے بج رہا دروازہ، میں بعد میں فون کرتی ہوں۔'' انہوں نے خدا حافظ بھی نہیں کہا

تھا اور فون بند کر دیا تھا۔ انہیں ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔

''ایسے کیسے اللہ میاں...... ایسے کیسے...... یہ کیا بات ہوئی۔ میں تو روز عشا کے بعد آیت کریمہ بھی پڑھ رہی ہوں آج کل۔ ایسے کیسے بھلا التمش کسی اور کو پسند کر لے گا۔'' وہ ہولنے لگی تھیں۔ دوسرے کمرے میں بیٹھی محراب نے اپنا آخری جینز کا بیگ مکمل کر کے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ اس آرڈر نے اسے بڑا حوصلہ دیا تھا، اسے امید تھی کہ ایسے مزید آرڈرز ملیں گے اب۔

☆☆☆

''ماسٹر جی ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔'' وہ ابھی اپنی کرسی پر بیٹھے ہی تھے کہ ان کے ہونہار شاگرد رَب نواز نے روہانسا سا منہ بنا کر مسئلہ بیان کرنا چاہا۔ انہوں نے اپنا عصا ایک طرف رکھا اور پشاوری چپل سے پاؤں نکال کر سامنے کی جانب دیکھا۔ رَب نواز نے فوراً ہی سامنے پڑی بنچ ان کے پاؤں کے آگے کر دی۔ ماسٹر جی نے پاؤں اطمینان سے اس کے اوپر رکھ لیے تھے۔

''ناشتا کیا تم نے؟'' انہوں نے رب نواز کے سوال کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے خود سوال کیا تھا۔

''جی ماسٹر جی! کر چکا ہوں۔'' وہ کچھ زیادہ ہی پریشان لگ رہا تھا۔

''کیا کھایا خیر سے......؟'' انہوں نے دوسرا سوال کیا۔ رب نواز نے گہری سانس بھری۔

''ماسٹر جی! پراٹھا چنے کھائے ہیں۔ دودھ پتی بھی پی تھی ساتھ۔'' وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا تھا۔

''اچھا، یہ تو ہو گئیں ہیڈ لائنز۔ اب بتاؤ تفصیل......'' ماسٹر جی نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی تھی۔

''وہ جی آج نا شوکت کی امی جی نے گاجر کا حلوہ بھیجا تھا۔ وہ بھی کھا لیا ہم نے۔'' رَب نواز کا لہجہ بڑا شرمسار سا تھا جیسے اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔

''میرا حصہ کدھر ہے؟'' ایک اور سوال کیا گیا۔ رب نواز نے مزید سر جھکا لیا۔

''یہ ہی تو مسئلہ ہے ماسٹر جی!'' رَب نواز نے اگلا تھا۔ ماسٹر جی کے چہرے کے تاثرات یک دم بدل گئے۔

''اوئے کم بختو! سارا کھا گئے ہو کیا۔ کمینو میرا خیال نا آیا تم لوگوں کو......'' ماسٹر جی بدک سے گئے تھے۔ انہوں نے جوش میں پاؤں بھی بنچ سے نیچے اتار لیے تھے۔ رَب نواز ذرا سہم کر پیچھے ہو گیا۔

''نہیں ماسٹر جی! ہم نے تو رکھا تھا آپ کے لیے۔ تھا بھی بڑا ہی مزے دار۔ سارے گریاں بادام بہت زیادہ ڈالے تھے شوکت کی امی جی نے۔ ذائقہ اتنا عمدہ تھا کہ ہر نوالے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ پکانے والی نے بھون بھون کر گاجروں کا تراہ ہی نکال دیا ہے۔ اوپر زعفران بھی چھڑک کر لایا تھا شوکت اور رنگ بھی ایسا سرخ کہ آنکھیں خوش ہوتی تھیں دیکھ کر۔'' رَب نواز نے پہلے تو پوری تفصیل بتائی اور پھر دوبارہ سے سر جھکا لیا۔

''آگے بھی تو پھوٹو کہ ہوا کیا اس حسین و جمیل حلوے کے ساتھ۔ غضب خدا کا، بس بیان کیے جا رہے ہو۔ چہرہ نہیں دکھا رہے، گاجر کا حلوہ نا ہو گیا امراؤ جان ادا ہو گئی۔'' ماسٹر جی کے جذبات حلوے کی تفصیل سے اتھل پتھل ہو گئے تھے۔

''وہ ماسٹر جی! ہم نے الگ سے ڈھک کر رکھا تھا کہ آپ واپس آئیں گے تو کھا لیں گے لیکن آپ تو آئے نہیں، استانی جی آ گئیں......'' اس کا سر مزید جھک گیا تھا۔ استانی جی کے ذکر پر ماسٹر جی کا چہرہ ہی بدل گیا۔

''دھت تیرے کی یعنی دل میں تیرے قرب کی حسرت تمام شد۔'' ماسٹر جی کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

''انہوں نے آپ کا پوچھا، ہم نے بتا دیا کہ آپ ہاشمی صاحب کی عیادت کے لیے گئے ہیں۔ وہ کچھ ناراض سی لگتی تھیں پھر انہوں نے شوکت سے بس اس کی امی جی کا حال ہی پوچھا تھا۔ وہ شروع ہی ہو گیا

اس نے ہی سارا کھڑاک ڈالا یہ والا...... فٹافٹ اپنی امی جی کی تعریفیں شروع کر دیں۔ ساتھ ہی بتانے لگا کہ گاجر کا حلوہ بنا کر بھیجا ہے انہوں نے حالانکہ ماسٹر جی! انہوں نے تو بس خیریت ہی پوچھی تھی۔ شوکت مردود اگلے پچھلے سارے قصے سنانے شروع ہو گیا کہتا ہے استانی جی حلوہ تو ضرور ہی چکھیں۔ اتنا میٹھا ہے کہ ہونٹ چپکتے ہیں کھاتے ہوئے، استانی جی نے فوراً کہا کہ خبردار ماسٹر جی کے آگے نہیں رکھنا۔ ان کی شوگر ہائی رہتی ہے آج کل۔'' رَب نواز کی اس بات کے بعد ماسٹر جی کو سارے قصے میں بالکل ہی دلچسپی ہی ختم ہو گئی تھی۔

''اونہہ! شوگر ہائی رہتی ہے...... میں کوئی اکیلا ہوں جس کی شوگر ہائی رہتی ہے نا، سارے زمانے کی ہی شوگر ہائی رہتی ہے آج کل لیکن ان زنانیوں سے کون بحث کرے۔ یہ کام تو راجاؤں مہاراجاؤں نے بھی نہیں کیے تو غریب ماسٹر جی کیسے یہ جرأت کر سکتے ہیں۔'' ماسٹر جی کا چہرہ بالکل اتر گیا تھا۔ رب نواز کو بڑا دکھ ہوا اس نے ان کے پاؤں دبانے شروع کر دیے تھے۔

''آپ دل چھوٹا نا کریں ماسٹر جی! شوکت پھر بنوا لائے گا۔ گاجر کے حلوہ بنانے میں کون سی روڑی کوٹنی پڑتی ہے۔ یہ گاجریں چھیلیں، کاٹیں پیسیں اور پتیلے میں چڑھا دیں۔ آدھ گھنٹے میں حلوہ تیار۔'' وہ انہیں بہلا رہا تھا، ماسٹر جی نے ناک چڑھا کر سر جھٹکا۔

''کہیں ہو ہی نا جائے آدھے گھنٹے میں تیار۔'' وہ چڑ سے گئے تھے، سب ہی جانتے تھے کہ ماسٹر جی کی کمزوری ہے میٹھا اور استانی جی کی کمزوری ہیں ماسٹر جی۔ وہ ان کی صحت سے متعلقہ تمام تر معاملات کے متعلق بہت محتاط رہا کرتی تھیں۔ جب سے ان کو ذیابیطس ہوئی تھی، استانی جی نے گھر میں چینی لانی بند کر دی تھی۔ حلوہ بنانا تو دور کی بات ہے، وہ تو ماسٹر جی کو چائے کے ایک کپ میں چمچہ بھر چینی نہ ڈالنے دیتی تھیں۔ ماسٹر جی اپنے شاگردوں سے چھپ چھپ کر میٹھا منگوا کر کھایا کرتے تھے۔ شوکت نے کب سے ہی وعدہ کر رکھا تھا کہ جب بھی گھر میں حلوہ بنے گا تو وہ ضرور ہی ان کے لیے لے آئے گا لیکن یہ کسی کے گمان میں نہیں تھا کہ جب حلوہ آئے گا اس روز استانی جی بھی آ جائیں گی۔

''ہوتا ہے ماسٹر جی! ایسا بھی ہوتا ہے بس آپ کے نصیب میں نہیں تھا گاجر کا حلوہ، چھوڑیں......'' رَب نواز نے پھر تسلی دی تھی۔

''اوہ چھوڑوں تو تب جب تم لوگوں نے مجھے پکڑنے دیا ہو۔ بے ہدایتو! مجھے تو دیدار نصیب نا ہوا اور بس...... خبردار اب کسی نے گاجر کے حلوے کا نام بھی لیا ہو، تمہارا کیا خیال ہے۔ اب وہ مہارانی جودھا بائی جو میرے گھر میں رہتی ہیں وہ مجھے کھانے دیں گی کچھ میٹھا...... اب ان کو پتا چل گیا ہے کہ میں تم لوگوں سے منگوا کر میٹھا کھاتا ہوں تو دیکھ لینا اب میرے مشکل دن شروع ہو جائیں گے، پابندی لگ جانی ہے میرے کھانے پینے پر۔ میرے لیے تو سمجھو روزے شروع ہو جانے ہیں آج سے اور اوپر سے بی بی کی ناراضی الگ سہنی پڑے گی۔'' تاسف ان کے ایک ایک لفظ سے چھلک رہا تھا۔ رَب نواز کو ان پر بڑا ہی ترس آیا مگر وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ ماسٹر جی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے تھے۔ ان کے چہرے سے شدید مایوسی ٹپکنے لگی تھی۔ اس کا مطلب تھا آج کا سبق ختم ہو چکا تھا۔ آج سارا دن بس گاجر کے حلوے کا ماتم ہی ہونا تھا

''ستیاناس...... اب گھر جا کر کیا جواب دینا ہے۔'' ماسٹر جی کو ہول اٹھ رہے تھے۔

☆☆☆

''نظر نہیں آتا کیا؟'' وہ اپنے دھیان میں مگن آ رہا تھا جب سامنے آتے کسی نفس سے بری طرح ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ ایک لمحہ لگا تھا اسے سنبھلنے میں جبکہ وہ تو دھڑام سے نیچے ہی گر گئی تھی۔ التمش نے گلاسز آنکھوں سے اتارے تو وہ تڑخ کر بولی تھی۔

''آتا ہے نظر۔ کیوں تم نے قمیص کی ترپائی

کروانی ہے؟'' وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔ زرمین نے اپنے بال جھاڑے اور ہاتھوں کی مدد سے فوراً ان کو ٹھیک کیا تھا۔ اسے اپنے بالوں سے بڑی محبت تھی ان کو سجانے سنوارنے کے بڑے جتن کرتی تھی وہ۔

''بس شروع ہوگئیں تمہاری تھکی ہوئی فیصل آبادی جگتیں۔'' بالوں کو ٹھیک کرتے ہوئے وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔

''ارے تو کیا فیصل آبادی جگتوں کو بھی انرجی ڈرنک پلایا کریں ہم کہ وہ تھکی ہوئی نا لگیں۔ جگتیں ہی ہیں بے چاری...... کوئی تمہاری قینچی جیسی زبان نہیں ہے کہ تھکیں گی نہیں۔ آخر فیصل آباد سے نکلتی ہیں تو سارے پاکستان میں چلتی ہیں، تھکنا تو بنتا ہے نا۔'' وہ آنکھیں گھما کر بولا تھا۔ زرمین کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''بس باتوں کے ہی نواب ہو تم اور منہ کیا دیکھ رہے ہو، یہ نہیں کہ اٹھنے میں مدد ہی کر دو، بھلا بتاؤ اتنی حسین و جمیل لڑکی سے ٹکرانے کے بعد معذرت ہی کر لیتا ہے انسان۔'' وہ جتا کر بولی تھی۔

''التمش کہتے ہیں مجھے، معذرت کرتے ہیں میرے یہ ایڈیڈ اس کے جوگرز۔'' وہ ناک چڑھا کر بولا پھر ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھنے میں مدد کی تھی۔

''اور غلطی تمہاری ہی ہے اے حسین و جمیل لڑکی! تم خود دیکھ کر چلا کرو تو ایسی ہمپٹی ڈمپٹی ھیڈ آ گریٹ فال والی نوبت ہی نا آئے لیکن تم تو مجھے دیکھتے ہی......'' اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑی اور پھر اپنا ہاتھ اس کے سامنے کیا تھا جسے تھام کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بھورے سلکی لانگ اسٹیپس میں کٹے بالوں سے اٹھتی دھیمی سی مہک نے التمش کی تمام تر حسیات کو جیسے معطر کر دیا تھا۔ ایک تو برانڈڈ شیمپو کی مہک، اس پر فراخدلی سے اسپرے کیا ہوا پرفیوم اور پھر نفاست سے سجایا بنایا گیا سراپا...... وہ زمین سے اٹھتے ہوئے ایک دم سے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ چہرے پر دل فریب سی مسکراہٹ تھی جسے چھپانے کی سعی لاحاصل میں وہ اور بھی خوب صورت لگنے لگی تھی۔ التمش نے تمام تر استحقاق کے ساتھ اس کا جائزہ لیا۔ آف وائٹ اور میرون ٹاپ کے ساتھ جینز پہنے وہ روزانہ کی طرح بے حد حسین لگ رہی تھی۔ یہ ٹاپ اس نے صبح پہننے سے پہلے التمش کو واٹس ایپ پر تصویر بھیج کر دکھایا تھا۔ التمش نے ''اوکے'' کیا تھا تو وہ پہن کر آئی تھی۔ براؤن اور میرون سی لپ اسٹک بھی لگا رکھی تھی اور آنکھوں پر لائنر بھی نمایاں تھا اور اب اس کی تمام تر تیاری متقاضی تھی کہ وہ دل کھول کر اسے سراہتا لیکن......

''توبہ...... اتنی ڈارک لپ اسٹک کیوں لگا رکھی ہے تم نے اور آنکھوں پر یہ کیا لگا لیتی ہو تم لڑکیاں۔ تلوار مارکہ آئی لائنر...... آنکھوں سے ایک ایک کلومیٹر تک باہر نکلا ہوا ہوتا ہے۔ کیا بن کر آئی ہو بھئی۔ یہ یونیورسٹی ہے تمہاری پھپھو کے بیٹے کا ولیمہ نہیں ہے۔ چاکلیٹ میں ڈوبا ہوا ڈونٹ لگ رہی ہو بالکل۔'' وہ زمین سے اس کی چیزیں اٹھاتے ہوئے اسے چڑا بھی رہا تھا۔ زرمین کا دل جیسے بجھ سا گیا حالانکہ اسے گزشتہ دو سالوں میں بخوبی اس کی طبیعت کا اندازہ ہو چلا تھا لیکن پھر بھی کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کھل کر اس کی تعریف کیا کرے۔

''اونہہ...... تمہیں کیا پتا آج کل کے میک اپ ٹرینڈز کا، یہ فیشن ہے۔ ڈارک لپ اسٹک اِن ہے آج کل۔ یہ نیو ونٹرز ٹرینڈ ہے۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی تھی اور ساتھ ہی اس کے ہاتھ سے اپنا بیگ اور کتابیں تھامی تھیں اور آگے کو چل دی تھی۔

''اچھا پہلے نہیں بتایا تم نے۔ کل کو میں بھی ایسا ہی ڈونٹ بن کر آؤں گا پھر...... آخر ہم بھی تو ٹرینڈز کو فالو کریں۔ یہ کیا کہ لڑکیاں ہی ڈونٹس اور کپ کیکس بنیں یونیورسٹی میں آوارہ گردیاں کرتی رہیں۔''

وہ مسکرایا تھا اور ساتھ ہی گلاسز دوبارہ سے آنکھوں پر رکھ لیے تھے۔ زرمین چپ رہی تو وہ اس کے پیچھے چل پڑا تھا چند لمحے وہ دونوں ایسے ہی خاموشی سے ایک دوسرے کے پیچھے چلتے رہے پھر التمش نے ہی اسے پکارا تھا۔

''سنو تو...... غصہ کر گئی ہو کیا۔ اب میں نے مزید کچھ کہا تو تم نے پھر فیصل آبادی جگتوں کا طعنہ دے دینا ہے۔'' وہ اسے چڑا ہی رہا تھا زرمین نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

''اچھا بات تو سنو...... ویسے میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ آئی لو ڈونٹس۔'' وہ اس کے عقب میں چلتا ہوا بولا تھا۔ زرمین کے چہرے پر مسکراہٹ سی بکھر گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے قدم رکے تھے پھر اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''بدتمیز......'' وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔ التمش مسکرایا تھا اور یہ مسکراہٹ صرف زرمین کے لیے مخصوص تھی۔ ساری یونیورسٹی جس لڑکے کی دوستی کی خواہاں تھی، وہ لڑکا اپنے تمام تر حقوق زرمین کے نام لکھ چکا تھا۔

''اور تم مسز بدتمیز......'' اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا پھر وہ دونوں ہی قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔ التمش نے اس کی کتابیں اس کے ہاتھ سے لے کر خود تھام لیں پھر مصنوعی تفاخر لہجے میں سمو کر بولا۔

''التمش کہتے ہیں مجھے۔ تمہارے معاملے میں سب بدتمیزیاں سجتی ہے مجھ پر۔''

☆☆☆

ماسٹر جی نے گھر میں قدم رکھتے ہی چہرہ بالکل بجھا ہوا کر لیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا تھیلا جو وہ صبح ہمراہ لے جایا کرتے تھے وہ بھی کچن کے باہر ہی رکھ دیا تھا۔ گلا کھنکار کر صاف کیا نا ہی با آوازِ بلند سلام کیا بلکہ دھیمے سے انداز میں سلام کرتے ہوئے چپ چاپ اپنے کمرے کی جانب چل دیے۔ طبیعت بالکل ہشاش بشاش تھی لیکن چہرہ ایسا اترا ہوا بنا لیا تھا کہ جیسے برسوں کے بیمار ہوں۔ کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے کن انکھیوں سے مڑ کر کچن کی جانب دیکھا لیکن اہلیہ کہیں نظر نہ آئی تھیں۔ انہوں نے سکھ کی لمبی سی سانس لے کر بیڈ پر نشست سنبھال لی تھی۔

ابھی بیٹھے ہی تھے کہ بیڈ روم سے ملحقہ بنے چھوٹے سے اسٹور سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ انہوں نے ایک ساعت میں جھٹکا کھا کر سرہانا دیکھا کیا اور بستر پر چت لیٹ گئے۔ اسی دوران مہناز بیگم ہاتھ میں التمش کی شرٹ پکڑے آئی تھیں۔ ماسٹر جی نے لمبی گہری دردناک سانس لی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بیگم پر ثابت کر دیں کہ وہ اچھا محسوس نہیں کر رہے۔ مہناز بیڈ کے سامنے پڑے کاؤچ پر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے ماسٹر جی کو مخاطب تک نہ کیا تھا۔ ان کا نازک دل ذرا تیز دھڑکنے لگا تھا۔

''یہ بی بی آج اتنا چپ کیوں ہیں...... اب ایسا بھی کوئی طوفان نہیں آ گیا۔ ایک گاجر کا حلوہ ہی تھا اور میں نے تو چکھا تک نہیں۔'' وہ تاسف بھرے دل سے سوچ رہے تھے پھر انہوں نے چند منٹ انتظار کیا پھر کن انکھیوں سے بیگم کی جانب دیکھا۔ ان کا چہرہ کسی گہری سوچ کی عکاسی کر رہا تھا۔ وہ کچھ الجھی ہوئی لگتی تھیں۔ ماسٹر جی نے دل ہی دل میں اپنے حق میں دعا کی تھی۔ یہ بہت ہی کم ہوتا تھا کہ مہناز بیگم انہیں مخاطب نہ کریں۔ یہ ان کے دل میں چلتی کسی ناراضی کی غمازی کر رہا تھا انہوں نے سوچا کہ وہ خود ہی بات کا آغاز کر لیں جو جھڑکیاں کھانی ہیں ایک ہی دفعہ کھا لیں تاکہ ماحول میں جو غبار نظر آ رہا تھا وہ چھٹ جائے۔ مہناز بیگم اگر اتنا چپ نہ ہوتیں تو وہ بھی شاید یہ سب محسوس نہ کرتے لیکن اب انہیں زیادہ تکلیف ہو رہی تھی۔

''بی بی! میں نے کہا اب ایسی بھی کیا......'' انہوں نے ابھی آغاز کیا ہی تھا کہ مہناز بیگم نے ہاتھ میں پکڑی شرٹ پہلو میں رکھ دی وہ چپ سے ہو گئے۔

''ماسٹر جی! یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔'' وہ بولی تھیں۔ ان کی آواز میں عجیب سا افسوس اور پریشانی تھی، ماسٹر جی کو بڑا دکھ ہوا۔ ان کی اور ان کی بیگم کی کیمسٹری ایسی تھی کہ وہ انہیں ناراض نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھے تھے۔

''ارے یہ کیا بی بی! مجھے تفصیل سے بتانے تو دیں۔ آپ جو سمجھ رہی ہیں وہ حقیقت نہیں ہے۔''

ماسٹر جی نے تسلی دینے والے انداز میں کہا تھا۔ مہناز بیگم نے گردن ہلائی۔

''وہی حقیقت ہے۔ میں سب جانتی ہوں اس نے اپنے منہ سے بتایا ہے مجھے......'' وہ سخت ناخوش تھیں۔ ماسٹر جی کو شوکت پر سخت غصہ آیا۔ وہ سمجھے اہلیہ ان کے شاگرد شوکت بات کر رہی ہیں۔

''اوئے اس کو تو میں دیکھ ہی لوں گا، جانے کیا اناپ شناپ بکتا رہتا ہے۔ آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں ہے۔'' وہ اپنے موقف کو سچ ثابت کرنے کے لیے جارحانہ انداز میں بولے تھے۔

''آپ پر بھروسا ہے تب ہی تو سارا معاملہ آپ پر چھوڑا ہوا تھا لیکن یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔'' وہ روہانسی ہوئی جا رہی تھیں۔ ماسٹر جی ان کے انداز پر پہلے سے زیادہ دکھ ہوا۔

''بی بی! اتنا کیوں پریشان کر رہی ہیں۔ بخدا میں نے ایک دانہ بھی منہ میں نہیں ڈالا تھا۔ چکھا تک نہیں تھا آپ کی قسم! آپ جانتی ہیں میں جھوٹ نہیں بولتا۔'' انہوں نے وضاحت کی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ بیگم سے ڈرتے تھے لیکن ان کی ناراضی سے خائف ضرور رہتے تھے اور میٹھا نا کھانے کا وعدہ تو انہوں نے خود ہی کیا تھا۔ انہیں واقعی افسوس تھا کہ مہناز بیگم کو ان کے وعدہ توڑنے کے اس عمل سے تکلیف ہوئی ہے۔

''آپ سمجھ ہی نہیں رہے ماسٹر جی! التمش کی زندگی میں کوئی لڑکی ہے۔ مجھے پہلے شک رہتا تھا لیکن اب یقین ہو گیا ہے۔ بتاؤ ہر وقت فون پر دن رات کون اس طرح مصروف رہتا ہے۔ باتھ روم میں بھی فون ساتھ لے جاتا ہے۔ میں کیا جواب دوں گی عطیہ کو۔''

ماسٹر جی کو ایک جھٹکا لگا پھر ساری بات سمجھتے ہوئے انہوں نے ایک لمبی گہری ٹھنڈی اطمینان بھری سانس لی تھی۔ مہناز بیگم کسی اور وجہ سے بجھی بجھی تھیں۔

''اچھا...... آ...... آ...... تو وہ بات نہیں تھی اور میں سمجھا......'' مہناز بیگم نے ان کی جانب دیکھا پھر بولیں۔

''اللہ جانے ماسٹر جی آپ کیا سمجھے...... میں تو اتنا جانتی ہوں کہ آپ کے بیٹے کی حرکتیں بہت مشکوک ہو چلی ہیں۔'' وہ کچھ زیادہ ہی پریشان لگ رہی تھیں۔ التمش اور ان کی بھانجی محراب کے رشتے کی بات ان بزرگوں کے درمیان ایک عرصے سے مسئلہ بنی ہوئی تھی لیکن ایسی پریشانی مہناز کے چہرے پر پہلے کبھی نظر نا آئی تھی۔ ماسٹر جی کا دل تو جیسے کسی بوجھ سے آزاد ہوا تھا۔ بیٹے کی بات رشتے کی بات سے کہیں زیادہ پریشان کن تھی ان کے لیے، ان کی تو پریشانی یک دم ختم ہو گئی تھی۔

ارے بی بی! اتنا مت سوچیں۔ ایسی باتیں زور زبردستی سے تو کی نہیں جا سکتیں اور پھر......'' وہ کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن مہناز بیگم نے بات کاٹ دی۔

''اور بہن کو کیا جواب دیں گے آپ۔ کچھ اندازہ بھی ہے وہ کتنی پریشان رہتی ہے، جب بھی ملتی ہے آس امید بھرے انداز میں میرا چہرہ دیکھتی ہے کہ میں کوئی بات کروں گی اور میں ہوں کہ آپ دونوں باپ بیٹے کی جواب کی منتظر ہوں اور اب تو وہ صاف ہی کہہ چکا ہے کہ جلد ہی کسی اور لڑکی سے ملوائے گا۔''

''بی بی! پریشان مت ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ مطمئن ہو کر بولے تھے۔ ان کو تو اپنی پریشانی سے نجات ملی تھی۔ وہ پرسکون ہو گئے تھے۔

''کیسے پریشان نا ہوں۔ آپ کو پتا ہے کئی دن میں نے عطیہ سے بات ہی نہیں کی۔ آج اس کی کال آ گئی تو سرسری سا ذکر کیا میں نے، اس بے چاری کو چپ ہی لگ گئی۔ ایک لفظ نہیں بولا جا رہا تھا اس سے۔ میرا دل تو جیسے پھٹ گیا ماسٹر جی! کتنی امید ہے اس کو کہ میں ضرور ہی رشتہ دوں گی اپنے بیٹے کا اور بیٹا یہاں سنتا نہیں کسی کی۔'' وہ لاچاری سے بولی تھیں۔ ماسٹر جی نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا اور چند لمحے دیکھتے رہے۔

''اچھا بی بی! سوچتے ہیں کچھ۔ اب کتا پھٹا تو رفو کرنا ہی پڑے گا۔'' انہوں نے باآواز بلند خود کلامی کی تھی۔

''تو جلدی کر لیں ماسٹر جی! آپ کی اس رفو گری میں بتا خیر نقصان وہ ثابت ہو سکتی ہے۔'' وہ بے زار نظر آتی تھیں۔

☆☆☆

''میں کل نہیں آؤں گی۔ تم ذرا تمیز سے رہنا، میں جب نہیں آتی تو تم لوگ ہر ایرے غیرے سے فرینڈلی ہونے کی کوشش کرنے لگتے ہو۔'' زرمین نے مونگ پھلی کا دانہ پیکٹ سے نکال کر منہ میں رکھا تھا۔ التمش نے مڑ کر اسے دیکھا پھر استفہامیہ انداز میں گردن ہلائی تھی۔ ''تیمور لوگوں کی بات کر رہی ہوں۔ ان کے گروپ سے اتنا کیوں فرینک ہوتے ہو تم سب، مجھے نہیں پسند وہ لوگ۔ سب کے سب چغل خور ہیں۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔ وہ دونوں کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔ بُراق ان سب سے پیسے اکٹھے کر کے کینٹین گیا تھا۔ نمیرہ اور احتشام لیپ ٹاپ سامنے رکھے اسائنمینٹ کے لیے گوگل سے میٹریل کاپی پیسٹ کرنے میں مگن تھے۔ شہاب موبائل ہاتھ میں لیے جانے کس سے واٹس ایپ کرنے میں مگن تھا۔

''خیر اتنے چغل خور بھی نہیں ہیں۔ تم سب لوگوں سے تو کم ہی چغلیاں کرتے ہیں وہ لوگ۔'' براق چائے اور سموسے کی ٹرے تھاما قریب آیا تھا۔ وہ دوستوں کا دوست تھا۔ سارے ڈیپارٹمنٹ میں ہر ایک سے علیک سلیک تھی اس کی۔ اس نے تیمور لوگوں کی تعریف کر کے اپنی شامت کو آواز دی تھی۔ اس کو پتا تھا اب سب اس پر چڑھ دوڑیں گے۔

''ارے......'' نمیرہ اور احتشام زرمین کے ساتھ مل کر چلائے تھے۔

''کتے یہ چغل خور کس کو کہا ہے تُو نے۔'' احتشام نے مصنوعی ناراضی سے غرا کر کہا تھا

''احسان فراموش...... کمینہ۔'' نمیرہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ براق کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی

''تم تو واقعی احسان فراموش ہو بُراق کے بچے۔ ایک سینگ والا گھوڑا نا ہو تو...... کیسے منہ بھر کر چغل خور کہہ دیا تم نے ہمیں۔'' زرمین نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

''اس نے چغل خور کہا ہے ہمیں؟'' شہاب نے یک دم ہی سر اٹھایا تھا۔

''اوئے میں پوچھتا ہوں شرم نہیں آئی تجھے۔ تیرا کلیجہ کیوں نا پھٹ گیا ایسا کہتے ہوئے۔ یاد ہے جب نئے نئے بورے والہ سے آئے تھے تو کوئی منہ بھی نہیں لگاتا تھا تمہیں۔ یہ ہم ہی تھے جنہوں نے تمہیں پال پوس کر بڑا کیا۔ تمہیں رینگنا چلنا سکھایا، یونیورسٹی میں سروائیو کرنے کے اصول کاغذوں پر لِکھ لِکھ کر سمجھائے اور اب جب تم ڈپ رے ایشن کو ڈِپریشن کہنا اور سٹ ریس کو اسٹریس کہنا سیکھ گئے ہو تو ہمیں باتیں سنا رہے ہو۔ بے غیرت......'' شہاب گھاس سے اٹھ کر کرسی پر آ بیٹھا تھا۔ بُراق ان سب کی باتوں سے لطف لیتا ہوا بس ہنستے ہوئے سموسا کھانے میں مگن تھا۔

''نکالو اس کو یہاں سے۔ یہ ہمارے پاس بیٹھا ہی کیوں ہے۔ ہمارے دشمنوں کو ہم سے بہتر کہنے کی ہمت کیسے کی اس نے۔'' احتشام نے چائے کا کپ اٹھایا۔

''اوہ بخش دو مجھے بھائی! غلطی ہو گئی مجھ سے۔'' براق ہنستے ہوئے بولا تھا۔

''غلطی......؟ گناہ بیٹا جی! گناہ......'' نمیرہ نے لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے کہا تھا۔

''بس چوہدری براق! ساڈی تہاڈی مُک گئی...... نکل جاؤ ہمارے سرکل آف فرینڈز سے۔ ہمیں تم جیسے غدار کی ضرورت نہیں ہے۔'' زرمین اسے گھورتے ہوئے بولی تھی۔

''تم کیوں چپ ہو۔ تم بھی نکال لو دل کی بھڑاس۔ حسرت نا رہ جائے کسی کے دل میں کوئی، دے لو طعنے تم بھی دو چار۔'' براق نے التمش کو اکسایا تھا جو ان کی باتیں سنتے ہوئے بس اِدھر اُدھر دیکھنے میں مگن تھا۔

"ناٹ انٹرسٹڈ...... بچے ہو تم لوگ بچے! لڑتے رہو بس بچوں کی طرح۔" وہ ناک چڑھا کر بولا پھر اپنی جیب سے موبائل نکالا تھا۔

"یہ اس لیے چپ ہے کیونکہ ڈان کو پکڑنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔" احتشام نے کہا تھا۔

"نہیں یار! یہ اس لیے چپ ہے کیونکہ ساس بھی کبھی بہو تھی۔" نمیرہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"اوہ ہو نہیں بھئی۔ یہ اس لیے چپ ہے کیونکہ دو گولی ڈسپرین پانی میں حل ہو جاتی ہے۔" وہ سب ایک کے بعد ایک جملہ کس رہے تھے۔ اب سب کی توجہ براق سے ہٹ کر التمش کی جانب مبذول ہو گئی تھی جبکہ اس نے موبائل ہاتھ میں لے کر زرمین کو واٹس ایپ کیا۔

"کل کس خوشی میں نہیں آرہیں تم؟" واٹس ایپ کرنے کے بعد اس نے اس کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا بلکہ چپ چاپ اپنا چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ زرمین کے سیل کی ننھی سی بیپ بجی تھی۔ اس نے بیگ سے موبائل نکالا تھا۔

"یہ اس لیے چپ ہے کیونکہ دل دے دیا ہے، جاں تمہیں دیں گے، دغا نہیں کریں گے صنم!" نمیرہ پھر بولی تھی۔ وہ سب ہنس بھی رہے تھے اور ایک کے بعد ایک جملہ بھی جوڑتے جارہے تھے۔

"کل لندن سے میری خالہ کا دیور آرہا ہے، وہ سرجن ہے۔ ان میرڈ ہے، ہینڈسم ہے۔ اپنے اماں ابا کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ممی بہت ویلیو کرتی ہیں خالہ کے اِن لاز کی۔ پاپا بھی اسلام آباد گئے ہیں تو میں ذرا گھر پر رک کر ممی کے ساتھ سرجن صاحب کو کمپنی دوں گی۔" اس نے جواب میں ایک لمبا سا جواب لکھا تھا۔

"یہ اس لیے چپ ہے کیونکہ جینا صرف میرے لیے۔ جینا صرف میرے لیے۔" احتشام نے کہا تھا۔

"جینا خواہ مخواہ صرف تیرے لیے۔ ہم مر گئے ہیں کیا جو جینا کو تو لے جائے گا۔ جینا ہو یا...... رو جینا یا مرجینا...... پہلا حق صرف بورے والا والوں کا ہے۔" براق نے کہا تھا۔ التمش نے زرمین کا بھیجا ہوا میسج بہ نظر غایت دیکھا تھا لیکن اس سرسری سی نظر نے بھی اس کی پیشانی پر تیوریاں نمایاں کر دی تھیں۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اتنی دور پرے کے رشتہ دار کو کمپنی وپنی دینے کی۔ یونیورسٹی آؤ گی تم کل۔" اس نے میسج کے ساتھ ایک خوف ناک ایموجی بھی بھیجا تھا۔

"ارے کیوں ضرورت نہیں ہے۔ میری خالہ کا دیور ہے، اتنا قریبی رشتہ ہے۔" اس نے جواب دیا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے کرو چھٹی، دو خالہ کے دیور کو کمپنی، فیکٹری، کارخانے، دکانیں......" یہ دھمکی بھرا میسج دیکھ کر زرمین کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی جبکہ ان کے باقی سب دوست آپس کی بحث میں مگن تھے۔

"اوکے ڈن۔" اس نے بس اتنا ہی جواب لکھا تھا۔ التمش نے فون کی اسکرین کی جانب دیکھا۔ اسے یہ میسج بالکل بھی پسند نا آیا۔ اس نے فون سائڈ پر رکھ دیا تھا۔ زرمین منتظر ہی رہی کہ وہ مزید کوئی میسج بھیجے گا لیکن اس نے فون جینز کی جیب میں رکھ دیا تھا۔

"تم کیوں غصے میں آ گئے ہو؟" احتشام نے یک دم ہی اس کے چہرے کی جانب دیکھا تھا۔

"اس لیے کہ غصہ بجتا ہے مجھ پر۔ اٹھو سب اب، ساڑھے تین ہو رہے ہیں اور تم نمیرہ اور زرمین! جاؤ اب، شام ہونے کو آئی مگر تم لوگوں کو احساس نہیں کہ گھر بھی جانا ہوتا ہے۔ تم لوگوں کا سسرال نہیں ہے یونیورسٹی ہے۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔ زرمین نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔ اس کو دل ہی دل میں گدگدی ہوئی تھی۔ وہ اس کے یونیورسٹی سے چھٹی کرنے کی وجہ سے ناراض تھا۔ اسے یہ بات بھی پسند نہیں آرہی تھی کہ وہ اپنے کسی رشتہ دار کی وجہ سے چھٹی کر رہی تھی۔

اسے التمش کا تپا ہوا چہرہ دیکھ کر بڑا مزا آرہا تھا۔ ابتدا محبت میں استحقاق اسی طرح مسرور کر دیا کرتا ہے۔ وہ

بھی مسرور سی ہو گئی تھی۔

"اور سنو سب...... کوئی چھٹی نہیں کرے گا کل اور اگر کرے گا تو نتائج کا ذمہ دار بھی خود ہوگا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور حکم دینے والے انداز میں کہتا ہوا ڈیپارٹمنٹ کی جانب چل دیا تھا۔ زرمین مسکراتے ہوئے اس کے عقب میں چل پڑی تھی۔

☆☆☆

"کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟" مہناز بیگم نے ماسٹر جی کو الماری میں سر دیے ادھر اُدھر ہاتھ مارتے دیکھ کر پوچھا تھا۔ وہ بڑے منتظم انسان تھے۔ اپنی چیزیں ایسے سنبھال کر تمیز طریقے سے رکھتے تھے کہ دوبارہ لینی ہوتیں تو ایسے تلاش نہیں کرنی پڑتی تھیں۔

یہ مہناز ہی تھیں جو ذرا لاپروا ہو جاتی تھیں۔ کام کی مصروفیت میں کبھی ادھر کی چیز اُدھر کر دیتی تھیں تب ہی ماسٹر جی کو ایسے کچھ تلاش کرتا دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی۔

"ارے بی بی! یہاں میں نے ایک بیگ رکھا تھا، دس ایک دن پہلے سیاہ رنگ کا۔" وہ ان کی جانب مڑ کر دیکھے بنا بولے تھے۔

"اچھا؟" مہناز نے کہا پھر ذرا الماری کے قریب ہوئیں۔

"مجھے دیکھنے دیں شاید میں نے کہیں آگے پیچھے کر دیا ہو۔" ان کے وجود پر ابھی بھی بے زاری طاری تھی لیکن چونکہ ماسٹر جی کے سامنے بیٹے کے شکوے کر کے دل ہلکا کر چکی تھیں تو اب کچھ سنبھل سی گئی تھیں۔

"ارے آپ کو کہاں ملے گا، آپ بس وہ فرسٹ ایڈ باکس لے آئیں۔ مجھے ضرورت ہے۔" وہ سابقہ انداز میں ان کی جانب پشت کر کے بولے تھے۔ مہناز نے سر جھٹکا، ان کا فرسٹ ایڈ بکس کیا تھا۔ یہ اچھی طرح جانتی تھیں وہ......

"آپ ہٹیں تو صحیح، میں دیکھتی ہوں نا۔" وہ اصرار کر کے بولی تھیں۔

"یہ مل گیا، ذرا نیچے کی جانب ہو گیا تھا تو نظر نہیں آرہا تھا۔ التمش کے لیے لایا تھا یہ لیکن ذرا مرمت کی ضرورت ہے۔ میں نے سوچا کر ڈالوں۔" وہ شاپر ہاتھ میں لیے بستر پر آ بیٹھے تھے۔

"چھوڑیں ماسٹر جی! کتنی مرمتیں کریں گے۔ زندگی گزر گئی، یہ ہی کرتے۔ کیا ہاتھ آیا، اب چھوڑ دیں یہ سب۔ اب مرمت کی نہیں نصیحت کی ضرورت ہے۔ سمجھائیں اپنے بیٹے کو، غلطی کر رہا ہے۔ پچھتائے گا ایک دن، لوگ پاؤں پر کلہاڑی مارتے ہیں۔ آپ کے بیٹے نے تو کلہاڑی پر پاؤں مارنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ ارے اتنی اچھی چیز ایسے ہی جانے دیتا ہے کوئی ہاتھ سے۔ اتنا احمق آپ کا بیٹا ہی ہو سکتا تھا۔" وہ بہت جھنجلا کر بول رہی تھیں۔ ان کو واقعی بے حد قلق تھا اس بات کا کہ ان کے بیٹے نے ان کی منشا کا علم ہوتے ہوئے بھی اپنے لیے لڑکی پسند کر لی تھی۔

ماسٹر جی نے ایک نظر ان کے چہرے کی جانب دیکھا۔ ان کو لوگوں کو مطمئن کرنے کا ہنر آتا تھا لیکن جو سامنے بیٹھی تھیں وہ "لوگوں" نہیں ان کی شریکِ حیات تھیں ان کی زوجہ اور ازواج نے تو نبیوں کو بھی وختہ ڈالے رکھا تھا۔ وہ تو پھر عام انسان تھے وہ بلاوجہ مسکرائے تھے۔

"اب آپ کو کیسے سمجھاؤں بی بی! سب پڑھا لکھا ایک آپ کے سامنے بے کار ہو جاتا ہے۔"

"آپ کو لگتا ہے میں کچھ غلط کہہ رہی ہوں۔ آپ خود بتائیں ماسٹر جی! ایسی پیاری بچی ہے کوئی اور پورے خاندان میں۔ اتنی سمجھ دار، احساس کرنے والی۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناتی ہوں آپ خود اندازہ لگائیں کہ میں غلط کہہ رہی ہوں یا صحیح، ابھی جب گزشتہ بار میں ساہیوال گئی تو عطیہ کے گھر ایک ضرورت مند خاتون آئی بیٹھی تھیں۔ سونیا نے اسے پانچ ہزار دیے کہ کچھ آسرا ہو جائے گا۔ وہ میرے وہاں قیام کے دوران ہی پھر آ گئی تو ایک بار پھر پانچ ہزار دے دیے۔ عطیہ خوب ناراض ہوئی کہ وہ بہانے بہانے سے روپے لے جاتی ہے تو جانتے ہیں اس بچی نے کیا جواب دیا۔ کہتی ہے کہ امی اللہ گھر بیٹھے ثواب

کمانے کا موقع دیتا ہے تو کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو ایسے مواقع ضائع کرے گا۔ ہم نہیں جانتے وہ خاتون بہانے بنانی ہے یا واقعی ضرورت مند ہے۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ اللہ ہم پر مہربان ہے۔ گھر بیٹھے ہمیں اپنے نامہ اعمال میں انویسٹ کرنے کا موقع دے رہا ہے۔ وہ بھی ڈبل پرافٹ کے ساتھ، دس دیں گے تو بیس ملے گا تو کیوں نا کریں ہم۔ اب آپ خود بتائیں کہ ایسی بچی کو کون بہو بنانا چاہے گا۔ احمق ہے آپ کا اور میرا بیٹا! یقین کریں میرا ماسٹر جی! اللہ مہربان ہے تو وہ آپ کی بھانجی ہے۔ ہمیں زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑے گی ورنہ ایسا فل پیکیج تو جوتیاں گھسا کر بھی نہیں ملتا آج کل۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہی تھیں۔

"دیکھیں بی بی! تحمل سے سنیے گا اب مجھے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہماری بچی اچھی نہیں ہے لیکن بچیاں تو سب ہی اچھی ہوتی ہیں آپ نے کیسے یہ سمجھ لیا کہ وہ بچی جو آپ کے بیٹے نے اپنے لیے منتخب کی ہے وہ اچھی نہیں ہے۔ آپ مل کر تو دیکھیں ایک بار، بنا ملے کسی بہن بیٹی کے بارے میں رائے قائم کرنا اچھا نہیں ہے۔" انہوں نے بہت محبت سے اہلیہ کو سمجھانا چاہا تھا۔ مہناز بیگم نے سر ہلایا جیسے انہیں یہ بات اچھی نا لگی ہو۔

"آپ اپنے بیٹے کی زبان ہی بولیں گے ماسٹر جی! آپ میری بات کیوں سنیں گے۔ آپ کیوں سمجھیں گے میرا موقف۔" ماسٹر جی نے ان کی بات کاٹی۔

"یہ شکایت آپ مجھ سے کریں گی اب، اس بڑھاپے میں کیسے یقین دلائے گا یہ غریب ماسٹر آپ کو اپنی محبت کا لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے ہمیشہ آپ ہی کی سنی ہے۔ اماں جی مرحومہ تک یہ ہی شکایت کرتی دنیا سے چلی گئیں کہ میرا یہ بیٹا تو بیوی کی مرضی کے بنا سر بھی نہیں اٹھاتا۔ اس سے بڑی گواہی تو نہیں لاسکتا میں اب۔" وہ ہر ممکن کوشش کر رہے تھے کہ اہلیہ کا مزاج نارمل کر سکیں۔

"اوہو، میں یہ تو نہیں کہہ رہی۔ میں تو بس......" مہناز بیگم ان کی بات سن کر مسکرادی تھیں حالانکہ انہوں نے مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کی لیکن ان سے ہو نہیں سکا تھا۔ ماسٹر جی نے طمانیت بھری گہری سانس سینے سے آزاد کی۔

"اف...... کیسا سکون ملا ہے۔ آپ کو اندازہ بھی ہے کہ آپ کی اس مسکراہٹ کی خاطر کب سے خوار ہو رہا تھا یہ ماسٹر!" وہ شرارتی سے انداز میں بولے تھے۔

"چھوڑیں بھی ماسٹر جی! آپ کے اپنے ہی چونچلے شروع ہو جاتے ہیں۔ آپ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں بہت پریشان ہوں۔ عطیہ بے چاری کی بجھی بجھی سی آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے کہ التمش کو کوئی اور پسند ہے کیا۔" وہ پھر پہلے کی طرح جھنجلا کر بولی تھیں۔ ماسٹر جی نے ایک گہری سانس بھری۔

"دیکھیں بی بی! آپ سمجھ ہی نہیں رہیں کہ بات آپ کے اختیار سے نکل چکی ہے۔ میں بچوں کی شادیاں ان کی مرضی کے خلاف کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اس سے نقصان کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ زندگی انہوں نے گزارنی تو فیصلہ بھی انہیں کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ آپ تو شکر ادا کیجیے کہ وہ آپ کو اپنی پسند سے ملوانے کی بات کر رہا ہے۔ کسی بچی سے وعدے وعید کر کے مکر گیا ہوتا تو اللہ کو کیا منہ دکھاتے ہم۔ اس پہلو پر بھی تو سوچیے بی بی! مت کیجیے وہ غلطی جو آپ کرنے کا ارادہ کیے بیٹھی ہیں۔"

"ماسٹر جی! آپ نے التمش کے مقابلے میں کبھی میرا ساتھ دیا ہی نہیں تب ہی اتنا سر چڑھ گیا ہے وہ۔ ہر بات میں دانت نکال کر کہہ دیتا ہے کہ "التمش ہوں میں سب بجتا ہے مجھ پر......" بتاؤ ایسی اولاد جس کا غرور اور نخرا آسمان پر رہتا ہو۔ اس کے لیے کوئی ایسی لڑکی ہی مناسب رہے گی جو تحمل والی ہو۔ نباہ کرنا جانتی ہو، محراب سے بڑھ کر ایسا کون ہو سکتا ہے۔" وہ زچ ہو گئی تھیں اس بحث سے۔ ماسٹر جی نے سر ہلایا

مگر اپنے موقف سے ہٹے نہیں تھے۔

"وہ بچی جسے آپ کا بیٹا پسند کرتا ہے وہ بھی تو ان خوبیوں سے مالا مال ہو سکتی ہے نا۔ تحمل والی، گھر بنانے والی، آپ ملے بنا کوئی بھی منفی رائے کیوں قائم کر رہی ہیں۔" مہناز نے انہیں گھور کر دیکھا۔

"بس رہنے دیں آپ، ساتھ پڑھتی ہے اس کے، اتنی ہی تہذیب طور طریقے والی ہوتی تو یونیورسٹی کو درسگاہ ہی سمجھتی۔ بن قاسم پارک نہیں جہاں ہر بنچ پر لڑکا لڑکی بیٹھے مستقبل کی اندھی پلاننگ کر رہے ہوتے ہیں۔" وہ ناک چڑھا کر بولی تھیں۔ ماسٹر جی کو ان کا انداز برا لگا۔

"یہ بات آپ نے اپنے بیٹے کو نہیں سمجھائی۔ وہ بھی تو برابر کا شریک ہے یونیورسٹی کو بن قاسم پارک بنانے میں۔"

"اس کا تو آپ پوچھیں مت۔ دل چاہتا ہے دو تھپڑ مار کر گھر ہی بٹھا لوں۔ نام ڈبو دیا ماں باپ کا، الو کا پٹھا......" وہ ناک چڑھا کر بولیں۔ ماسٹر جی بلبلا اٹھے لیکن مزید بحث کا ارادہ ترک کر دیا کہ جانتے تھے اگلے مرحلے پر اہلیہ کا بلڈ پریشر ہائی ہونے کا سخت امکان ہے۔

"اچھا بتائیں آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ اب میں جوان اولاد پر زبردستی تو نہیں کر سکتا۔"

"اوہو...... میں کب کہہ رہی ہوں کہ زبردستی کریں۔ میں تو کہہ رہی ہوں کہ کچھ ایسا ماحول بنائیں کہ التمش محراب سے شادی کر لے۔" وہ بچوں کی طرح ضدی سے انداز میں بولیں۔

"اسے ہی سلیس اردو میں زبردستی کہتے ہیں بی بی!" ماسٹر جی نے کہتے ہوئے ساتھ ہی شاپر کھول لیا تھا۔

"مجھے نہیں پتا ماسٹر جی! میں کسی کو برا نہیں کہتی۔ آپ ٹھیک کہتے ہوں گے۔ سب ہی بچیاں اچھی ہوتی ہوں گی لیکن مجھے محراب ہی کو بہو بنانا ہے بس...... آپ اپنی پڑھی لکھی ترکیبیں لڑائیں اور اس مسئلے کو حل کریں۔" انہوں نے جیسے حکم دیا تھا۔ ماسٹر جی کو ان کی بات ذرا نا اچھی لگی تھی مگر بیوی سے بلاوجہ کی تکرار ان کی عادت نا تھی۔ وہ سوچنے لگے تھے کہ ان کو ترکیبیں بیوی پر آزمانی چاہئیں یا بیٹے پر...... وہ سوچ میں پڑ گئے تھے۔

☆☆☆

"تمہاری خاطر ماما کو ناراض کیا ہے میں نے، تمہاری وجہ سے آئی ہوں میں آج۔" وہ لیکچر ہال میں بیٹھے پیپر پر لکھ لکھ کر چیٹ کر رہے تھے۔ ساری کلاس اکاؤنٹس کا ٹیسٹ کر رہی تھی اور یہ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مگن تھے۔

"کیوں......؟ تم کو ماسٹرز کی ڈگری میں نے دینی ہے کیا۔ فیس مجھے دیتی ہو تم یونیورسٹی کی۔" التمش نے جواب لکھا تھا اور ساتھ ہی ناک چڑھاتی ہوئی تصویر بنائی تھی۔

"نہیں...... لیکن محبت کرتی ہوں تم سے، کیا یہ کافی نہیں۔" زرمین نے جواب لکھا تھا۔ التمش کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی۔ اسے ڈر تھا کہ پروفیسر صاحب ان کی جانب نا دیکھ رہے ہوں اس لیے اس نے مسکراہٹ کو ہونٹوں کے کنارے تک محدود کر لی۔ چند لمحے وہ کچھ لکھ نا سکا تھا۔ زرمین اپنی قیمتی محبت کا اعتراف کر کے اس کو کتنا معتبر کر دیتی تھی۔

"مر جائیے، لیکچر کے دوران ایسی باتیں صحت کے لیے کس قدر نقصان دہ ہو سکتی ہیں۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کیا۔" اس نے کاغذ پر لکھا اور اب کی بار دو لکیریں سی کھینچ کر گڑیا بنا دی جو مسکرا رہی تھی۔ اس کی ڈرائنگ بہت اچھی تھی۔ زرمین مسکرائی۔

"محبت نقصان دہ کبھی نہیں ہوتی مسٹر التمش!" اس نے لکھا اور ساتھ ہی اسی پیپر پر اس کی بنائی ہوئی گڑیا کے ساتھ ایک اور تصویر بنانے کی کوشش کی جو کہ ناکام ثابت ہوئی۔ وہ ایک بھدا سا گڈا بنا پائی تھی۔

"آر یو شیور......؟" التمش نے لکھا تھا۔ وہ اسے اسی طرح چڑاتا رہتا تھا۔ زرمین نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا اور پھر اس گڈے اور گڑیا کی تصویر

کے نیچے التمش اور زرمین لکھنے کے بعد مزید لکھا تھا۔

''ہنڈرڈ پرسینٹ شیور، ماما کو بتادیا ہے میں نے آج کہ بلاوجہ لندن پلٹ رشتے داروں پر محنت نا کریں۔ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا کیونکہ میں نے جہاں محنت کرنی تھی میں کرچکی ہوں۔'' وہ آج کچھ زیادہ ہی اچھے موڈ میں تھی جو اعتراف پر اعتراف کرتی چلی جارہی تھی۔ التمش اب کی بار مسکرایا نہیں تھا۔

''اچھا واقعی...... تو کہاں کی ہے محنت، ہمیں تو بتادو۔ دوست بھی کہتی ہو اور بھروسا بھی نہیں کرتی۔'' التمش نے لکھا۔

''بکو مت اور اب ذرا سنجیدہ ہوجاؤ۔ ماما کو خالہ کا دیور اتنا پسند آیا ہے کہ وہ اصرار کرتی چلی جارہی ہیں۔'' اس نے لکھا تھا۔

''کیوں بھئی وہ اتنا اصرار کیوں کررہی ہیں اور ایک بار انہیں مجھ سے بھی تو ملواؤ۔ بات اصرار سے اصرار یسٹ پر نا چلی گئی تو پھر کہنا۔'' التمش نے ناک چڑھائی تصویر بناتے ہوئے لکھا تھا۔

''میں نے تو کئی بار کہا ہے، تم آؤ نا ہمارے گھر اپنے پیرنٹس کے ساتھ۔ اس سے پہلے کہ خالہ کا دیور اپنا ووٹ بینک بڑھا لے۔ تم کوئی پریکٹیکل ایفرٹ کرو نا اچھا ہے۔'' زرمین نے لکھا تھا

اور اسی دوران پروفیسر صاحب نے ٹیسٹ ختم کرنے کا اشارہ کرکے پیپرز جمع کرنے شروع کردیے تھے۔ ان دونوں نے اپنے ٹیسٹ پیپر پر نام کے سوا کچھ نا لکھا تھا۔ ان کے دوست ٹیسٹ کے متعلق ایک دوسرے سے سوال کرنے لگے تھے جبکہ وہ لیکچر ہال سے باہر نکل آئے۔

''یہ پریکٹیکل ایفرٹ سے کیا مراد ہے آپ کی خاتون؟'' اس نے بیک کندھوں پر پہن رکھا تھا۔ آنکھوں پر گلاسز لگائے ہلکی سی سرمئی رنگ کی شرٹ پہنے وہ کتنا وجیہہ لگتا تھا۔

''میرے پیرنٹس سے ملو، ان کا دل جیتنے کی کوشش کرو، ان پر ثابت کرو کہ ان کی بیٹی کی چوائس ایک دم پرفیکٹ ہے۔'' زرمین سمجھا رہی تھی۔

''پہلے اپنے پیرنٹس کا دل تو جیتنے دو بی بی! ابھی تو یہ مرحلہ ہی سَر نہیں ہوا۔ اگلی اسٹیج پر پہنچنے تو دو تب ہی مزید کچھ سوچیں گے۔'' وہ پریشانی کے عالم میں بولا تھا۔

''تمہارے پیرنٹس پسند نہیں کرتے مجھے، انہیں میں اچھی نہیں لگی؟'' زرمین نے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس کے چہرے پر کیسی پریشانی چمکنے لگی تھی۔ التمش نے لمحہ بھر رک کر اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ دل تو چاہا کہ عادت کے مطابق کوئی جملہ کس دے لیکن پھر اس کے چہرے پر پھیلے خدشات دیکھ کر اس کی ہمت نا ہوئی کہ اس کا دل توڑتا۔ بعض اوقات انرجی پل کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ التمش نے ملائمت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''یہ بات نہیں ہے زرمین! تمہیں کون ناپسند کرسکتا ہے۔ پرفیکٹ بہو میٹیریل ہو تم تو......'' زرمین نے اس کی بات کاٹی۔

''تم مجھے ان سے ملواتے کیوں نہیں ہو۔ ماسٹر جی سے ملواؤ تو سہی، اتنی نکمی نہیں ہوں میں کہ ان کو متاثر نا کرسکوں۔''

''ارے یار ماسٹر جی کو منانا مشکل نہیں ہے لیکن وہ جو ہیں نا میری امی! مہارانی جودھا بائی ان کو منانا فی الوقت مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ذکر کیا ہے میں نے مگر تھوڑا وقت دو، امیاں ایسے معاملات میں ذرا جذباتی ہوتی ہیں۔'' وہ اس کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا لیکن اسے اندھیرے میں بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

''نہیں...... میرا معاملہ تم سے مختلف ہے، میں نے ماما کو منالیا ہے۔ اب ماما جانیں اور ان کے کام۔ پاپا کو منانا ان کی ذمہ داری ہے اور میری ماما کو یہ گر آتا ہے۔ پاپا کو اچھا قابو کرکے رکھا ہے انہوں نے، ماما کی بات سے انکار نہیں کرتے وہ۔ اتنی ہمت نہیں ہے ان میں۔'' وہ مسکرائی تھی۔

''ارے یہاں بھی یہ ہی صورت حال ہے بھئی ویمن لیگ ہی پاور فل لیگ ہے۔ ہمارے گھر میں بھی امی کی ہی چلتی ہے اور تمہاری شیرنی جیسی فطرت

دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ یہ خاندانی روایت قائم و دائم رہے گی۔'' وہ ہنسا تھا۔ زرمین کو مستقبل کی منصوبہ بندی سن کر مزا تو بڑا آیا لیکن اس نے التمش کے کندھے پر ایک ہاتھ جڑا تھا۔

''اوہ......'' اس نے مصنوعی تکلیف کا اظہار کرتے ہوئے بازو سہلایا پھر مزید بولا۔

''دیکھا، یہ ہی تو کہہ رہا ہوں میں ظالم لڑکی! ثابت کردیا نا تم نے، ویمن لیگ زندہ باد۔ ظالم لیگ زندہ باد۔''

''تم اپنی امی سے ملواؤ تو سہی مجھے ایک بار، میں بالکل اسٹار پلس والی سنسکاری بہو بن کر ملوں گی ان سے۔ ان کو شکایت نہیں ہوگی کوئی، میں پسند آؤں گی ان کو التمش۔'' وہ اصرار کررہی تھی۔ التمش نے گہری سانس بھری اور گلاسز کے عقب سے اس کے چہرے کی جانب دیکھا تھا۔ وہ کتنی محبت کرتی تھی اس سے، یہ اس کے چہرے پر لکھا تھا۔ ایسے اصرار کرنے میں اسے اپنے مقام سے کتنا نیچے آنا پڑ رہا تھا اس بات کا التمش کو بخوبی احساس تھا مگر وہ ابھی حالات کو اپنے موافق کر نہیں پایا تھا۔

وہ مغرور تھا، خود پسند تھا، نخرا اور غصہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا لیکن خواتین کی عزت کرنا اس کی تربیت میں شامل تھا۔ یہ چیز اس نے ماسٹر جی سے سیکھی تھی۔ اسی لیے اسے اچھا نہیں لگا کہ زرمین کیسے منت پر اتر آئی تھی۔

''تم کو کون ناپسند کرسکتا ہے زندگی! تم تو تتلی ہو، خوشبو ہو، ہوا ہو روشنی ہو، زندگی ہو...... تم کو ناپسند نہیں کریں گی وہ، بات یہ نہیں ہے بات دراصل یہ ہے کہ......'' وہ کچھ کہتا کہتا رک گیا تھا پھر اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر بولا۔

''بس مزید کچھ دن ٹھہر جاؤ، مجھے ذرا وہ مسئلہ چار فٹ دس انچ سلجھا لینے دو پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' وہ تسلی دے رہا تھا۔

''وہ مسئلہ ابھی تک نہیں سلجھا، تم نے تو کہا تھا کہ تم اپنی کزن کو پسند نہیں کرتے اور یہ بات تم اپنے پیرنٹس کو بتا چکے ہو۔'' زرمین پریشان سی ہوئی تھی۔

''بتا چکا ہوں لیکن امی کو منانے میں چند دن تو لگیں گے نا اور پھر ذرا یونیورسٹی ختم ہوجائے۔ مجھے کوئی جاب تو کرلینے دو۔ اب تمہارے اماں باوا کے سامنے ایسا نکما، بنا کسی جاب کے جا کر تو نہیں کھڑا ہوسکتا۔ وہ تو مجھے ایک منٹ میں ہی انکار کردیں گے پھر تم بیٹھ کر اپنی خالہ کے لندن پلٹ دیور کے ساتھ دکھی غزلیں سنا کرنا۔'' وہ اس کا مزاج بحال کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

''جاب کی خیر ہے التمش! ہم دونوں ہی اکلوتے ہیں۔ ہمارے ماں باپ کے پاس جو بھی ہے وہ ہمارا ہی ہے۔'' زرمین کچھ کہہ رہی تھی لیکن التمش نے اس کی بات کاٹی۔

''واہ! بہت خوب، تالیاں آپ کی اس سوچ کے لیے...... یعنی تم نے پوری پلاننگ کی ہوئی ہے اپنے ماں باپ کے سامنے مجھے شرمندہ کروانے کی۔ ایسے تو ضرور ہی خالہ کے دیور کا مقابلہ کرسکے گا التمش!'' اس نے ناک چڑھائی تھی۔

''مل جائے گی جاب! اب تم یہ نیا اٹیچی کیس نا کھولو۔ میں نے ماما کے سامنے اتنی تعریفیں کی ہیں تمہاری اور تمہاری فیملی کی۔ تم لوگوں کے خاندان کی...... پنجاب میں تمہارے وسیع و عریض زرعی زمینوں کی، بالخصوص ماسٹر جی کی، ان کی قابلیت کی۔ وہ کبھی انکار نہیں کریں گی، یاد رکھنا یہ بات۔'' اس نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔ التمش نے اس کی بات کو بغور سنا، کچھ کہنا چاہا پھر چپ سا رہ گیا۔

''جی اچھا، مہربانی صبح صبح اتنا گیان بخشنے کے لیے، یاد رکھوں گا یہ بات۔ آؤ اب کینٹین چلیں ذرا کچھ کھا باڈا با کرلیں۔'' التمش نے کہا تھا۔ زرمین مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر آگے چل دی تھی۔

☆☆☆

''سونیا باجی! امی کہہ رہی ہیں آپ اگر فارغ ہیں تو دس منٹ کے لیے آجائیں۔ ہمارے گھر شام کو

مہمان آرہے ہیں۔ امی نے کچھ پوچھنا ہے آپ سے۔" دو گھر چھوڑ کر آنٹی طیبہ کا گھر تھا۔ بہت اچھے اخلاق والی خاتون تھیں۔ عطیہ بیگم کی منہ بولی بہن بنی ہوئی تھیں۔ ہر مشکل میں سارے محلے کی مدد کردیا کرتی تھیں لیکن کھانے پکانے سے ان کی بڑی جان جاتی تھی۔ اکثر دعوتوں وغیرہ کے سلسلے میں سونیا کو بلوایا کرتی تھیں۔ ابھی بھی ان کا بیٹا پیغام لے کر آیا تھا۔ وہ مختلف اقسام کے رنگ اور مگ لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک پارٹی کے لیے کسٹمائزڈ کپس بنانے کا نیا آرڈر ملا ہوا تھا۔ تین دن بعد اس نے ڈیلیوری دینی تھی اس لیے اس کی ساری توجہ ان ہی کی جانب تھی۔ اسی لیے اس نے بیگز والا آرڈر پہلے مکمل کرلیا تھا اور کب سے یہ سب لے کر بیٹھی تھی۔

"امی کو بولو، میں دس منٹ میں آتی ہوں۔" اس نے ایک کپ پر بہت نفاست سے کچھ لکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔ عطیہ بیگم نے گھور کر اسے دیکھا

"ارے...... تو سونیا باجی کیا ملازمہ ہیں تمہاری امی کی جب جی چاہا بلوالیا۔ وہ کوئی فارغ تھوڑی ہے صبح سے یہ سارا پھیلاوا پھیلا کر بیٹھی ہے۔ کمر دہری ہوگئی ہے بے چاری کی۔ اب اگر تم لوگوں کی طرف چلی جائے گی تو یہ کام کیسے نمٹائے گی۔ پہلے تم لوگوں کے یہاں سر کھپائی کر کے آئے گی پھر آدھی رات تک یہ برتن بھانڈے لال کرتی رہے گی۔ انسان ہے مشین تو نہیں ہے میری بیٹی۔"

بعض اوقات عطیہ بیگم کو اس کی مفت کی سوشل سروسز زہر لگنے لگتی تھیں۔ کیا ضرورت تھی بھلا سارے محلے کی خدمتیں کرنے کی۔

"اوہو! تم جاؤ توثیق۔ میں آجاؤں گی دس منٹ میں۔" اس نے بچے کو واپس بھجوا کر اپنی امی کی جانب دیکھا تھا۔

"آپ بھی کبھی کبھی حد کرتی ہیں، اس کے سامنے ایسا کہنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ ناراض سی ہوئی تھی۔

"کیوں ضرورت نہیں تھی۔ اس کی ماں نے تو ملازمہ ہی سمجھ لیا ہے تمہیں۔ ہر دو دن بعد بلوا بھیجتی ہے۔ بتاؤ جب پکانا نہیں آتا تو ہر دوسرے روز دعوت کیوں رکھتی ہو بھئی اور فرض کرو دعوت رکھنی ہی ہے تو کھانا آرڈر کردیا کرو۔ اب تو ہر دو گھر چھوڑ کر ہوٹل بن گئے ہیں۔ ایک فون کرو تو دہلیز پر کھیرے ٹماٹر تک کاٹ کر پکڑا جاتے ہیں۔ کھانا بنوانا مشکل ہے کیا لیکن وہ ایسا کیوں کریں گی۔ مفت کی نوکرانی جو ملی ہوئی ہے انہیں۔" وہ چڑ کر بولی تھیں۔

سونیا نے بغور انہیں دیکھا۔ وہ اتنی بد اخلاق نہیں تھیں لیکن ابھی جس طرح وہ ناراض ہورہی تھیں تو اس کا مطلب تھا کہ ان کا مزاج کسی اور وجہ سے خراب تھا لیکن وہ ظاہر کچھ اور کررہی تھیں۔

"کیا بات ہے، اتنا کیوں ناراض ہورہی ہیں؟ پہلے بھی تو بلواتی رہتی ہیں وہ، آج کوئی نئی بات ہوئی ہے کیا جو اس طرح ری ایکٹ کررہی ہیں آپ۔" اس نے سامان سمیٹتے ہوئے ان سے پوچھا تھا۔

"اسی لیے تو ناراض ہورہی ہوں کہ پہلے بھی بلواتی رہتی ہیں اور آج بھی بلوالیا۔ اپنی بیٹی کو تو اچھے کپڑے پہنا کر میک اپ کروا کر مہمانوں کے پاس بٹھادیں گی اور میری بیٹی کو سگھڑ، سلیقہ شعار کہہ کہہ کر چولہے کے سامنے کھڑا رکھیں گی۔ یہ تو کوئی بات نا ہوئی۔" وہ مزید ناراضی لہجے میں سمو کر بولیں۔

"اچھا مجھے آپ کی بات کا یقین نہیں آیا، جو بات ہے وہ سچ سچ بتائیں۔ چچی سے بات ہوئی ہے یا ممانی سے، چھوٹی خالہ کا فون آیا تھا کیا...... کس کا رشتہ ہوا ہے اب خاندان میں جو آپ اس طرح سیخ پا ہوئی جارہی ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے انہیں چڑایا تھا۔

اسے پتا تھا جب بھی کسی کے بچے کی منگنی یا شادی کی خبر ملتی ہے، اس کی امی کا موڈ ایک دو دن تو خراب رہتا ہی ہے۔ خفا رہنا، چڑچڑے انداز میں بات کا جواب دینا یا پھر بلاوجہ بڑبڑاتے رہنا اسی عارضے کی علامات تھیں۔

"کسی سے بات نہیں ہوئی جس نے بلوا بھیجا

ہے نا، اسی کا بیٹی کا رشتہ طے ہورہا ہے اپنی خالہ کے گھر، لڑکا ایم بی اے ہے۔ اچھی کمپنی میں ملازم ہے اور ایک بہن دو بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے۔ دبئی جانے کی کوششیں کررہا ہے تو ماں نے سوچا رشتہ کر کے ہی بھیجوں تو اچھا ہے۔ بس بہن کے گھر دے رہی ہیں بیٹے کا رشتہ، بتاؤ اٹھارہ کی ہوئی ہے ابھی اور رشتہ بھی طے ہوگیا۔ آج وہی لوگ آرہے ہیں باقاعدہ رشتہ لے کر جس کے لیے تمہیں بلوا کر دس کلو بریانی دم دلوائیں گی۔ اپنی بیٹی کو تو مہارانی بنا کر تخت پر بٹھائے رکھیں گی اور میری بیٹی سے قورمے کوفتے کرواتی رہیں گی۔" عطیہ بیگم سخت کبیدہ خاطر تھیں۔ وہ حریص نہیں تھیں لیکن یہ بات بھی سچ تھی کہ کسی کی بیٹی کے رشتے کی خبر ان کے دل کو ہلا دیتی تھی۔ ان کی بیٹی کے نصیب کھل ہی نہیں رہے تھے اور لوگوں کی بیٹیاں ایک کے بعد رخصت ہوئی چلی جارہی تھیں۔

"یہ تو اچھی بات ہے امی! آپ کو خوش ہونا چاہیے نا۔" اس نے اپنے کمرے کی جانب جاتے ہوئے سادہ سے لہجے میں کہا تھا۔ اسے تو بس اس بات کی فکر لگی تھی کہ وہ آرڈر جو اس نے تین دن بعد دن ڈیلیور کرنا تھا، وہ آج مکمل کرنا لازمی تھا۔ کل تو مگ کی پیکنگ وغیرہ میں دن نکل جانا تھا۔ نازک سے مگ تھے جس پر اس نے پینٹنگ کر کے سجایا بنایا تھا ان کی پیکنگ بھی ایک بڑا مرحلہ تھی۔

"بہت خوش ہولی میں دوسروں کی خوشیوں میں، اب دل چاہتا ہے اپنی کسی بات پر خوش ہونے کو۔ آٹھ سال ہوئے اس گھر میں تو ڈھولکی بجی نہیں ہے۔ ہم خواہ مخواہ دوسروں کے گھروں کے طبلے بجا بجا اپنی ہتھیلیاں سرخ کرتے جائیں۔" انہوں نے گردن جھٹکی تھی اور ساتھ ہی جیسے دل کا سارا غبار نکال دیا تھا، سونیا پر مطلق اثر نا ہوا۔

وہ دوپٹا گلے سے نکال کر واش بیسن پر ہاتھ منہ دھونے میں مگن ہوگئی تھی یعنی اسے محلے کی آنٹی کی مدد کو جانا ہی جانا تھا۔ عطیہ بیگم بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر مزید بڑبڑاتے ہوئے کچن کی جانب آگئیں۔ سونیا کو باہر کھڑے بھی ان کی بڑبڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔

"اچھا بتائیں کیا کروں، کیا نہ جاؤں ان کے گھر۔ فون پر انکار کردیتی ہوں انہیں، بتائیں کیا کروں ایسا کہ آپ خوش ہوجائیں۔" وہ بے چارگی سے کہتی ہوئی کچن کے دروازے پر آکھڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا پھر احساس ہوا کہ اس کا بھی کیا قصور، انہوں نے بلاوجہ ایک بات کا بتنگڑ بنالیا تھا۔ دل ہی دل میں انہیں شرمندگی ہوئی۔

"میں نے یہ کب کہا، میں تو بس......" وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں پھر انہیں الفاظ ہی نا ملے۔ اپنے رویے کا افسوس ہوا تھا۔

"اچھا جاؤ تم، شاید بلڈ پریشر ہائی ہے میرا اسی لیے بولتی چلی جارہی ہوں۔" وہ بھی اپنی جگہ لاچار تھیں۔ آٹھ سال پہلے منجھلی بیٹی بیاہ کر گھر سے رخصت کی تو اگلے ہی دن سے تیسری والی کا جہیز جمع کرنا شروع کردیا تھا۔ بازار آتے جاتے کچھ بھی برتن کپڑا یا زیور پسند آیا، لا کر اسی بڑی سی خاندانی الماری میں لا کر رکھ دیا جس میں باقی دونوں بیٹیوں کا جہیز رکھا کرتی تھیں کہ کل کو سونیا کے کام آئے گا۔ وہ الماری بھرتی جارہی تھی بلکہ بھرتے بھرتے اب سامان باہر اگلنے لگی تھی لیکن سونیا کے نصیب روشن نا ہو کر دے رہے تھے اور جن سے امید تھی۔ انہوں نے بھی اشاروں اشاروں میں جتا دیا تھا کہ ہم پر تکیہ نا کرنا۔

وہ ماں تھیں، پریشان ہوجایا کرتی تھیں تو کچھ نا کچھ بول دیتی تھیں جس پر بعد میں پچھتاتی بھی تھیں کہ ایسی بھی کیا جہالت ہوئی کہ دوسروں کی بیٹیوں کے کھلتے نصیب کی خبریں سن کر یوں پریشان ہونا لیکن چند دن سکون کے گزرتے تھے تو پھر کوئی آس پڑوس سے خبر آجاتی تھی اور ان کا بلڈ پریشر ہائی ہوجاتا تھا۔

"اچھا چھوڑیں سب، بتائیں نا ممانی کا فون آیا تھا کیا؟" سونیا نے تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے خود ہی پوچھ لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بیٹی کو بھاوج

سے چند دن پہلے ہونے والی گفتگو کی تفصیل بتائیں کیا فائدہ تھا اس کو بتا کر سو وہ ناک چڑھا کر بولیں۔

''ارے ان کے پاس بھی ہمارے لیے کون سا کوئی اچھی خبر ہے۔ ہر دو روز بعد فون کرتی ہیں، گھنٹہ بھر بات کرتی ہیں، تمہارے بارے میں اتنی محبت سے بات کریں گی، حال چال پوچھیں گی۔ تمہاری تعریفیں کرتی رہیں گی لیکن مجال ہے کبھی کہا ہو کہ عطیہ پریشان نا ہوا کرو تمہاری بیٹی میری ہی بیٹی ہے اور التمش تمہارا ہی بیٹا ہے۔ تم فکر مت کیا کرو...... لیکن ناجی، وہ تو بس اس ایک معاملے پر گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھی ہیں اور یہاں یہ حال ہے کہ میرے کان ترس گئے ہیں یہ ایک جملہ سننے کو۔ جانے کب نصیب کھلے گا میری اس بیٹی کا۔'' وہ سر جھٹک جھٹک کر بات کر رہی تھیں۔

سونیا چند لمحے ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اپنے چہرے کے تاثرات کو بمشکل قابو کیا تھا اس نے۔ اسے سمجھ میں نا آیا تھا کہ کیا جواب دے، انہیں کیسے سمجھائے کہ امی یہ بات مت کیا کریں، میں ہرٹ ہوتی ہوں، میرے دل کو تکلیف پہنچتی ہے۔ میری عزت نفس بہت زور سے مجروح ہوتی ہے۔ انہیں کس طرح بتائے کہ اس ایک شخص کا نام بار بار اس کے نام کے ساتھ مت لیا کریں۔ اگر اسے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے تو وہ بھی اس کا نام تک سننے کی روادار نہیں ہے لیکن جانے کیوں لحاظ اور مروت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس میں۔ اسے اپنے جذبات کا کھلم کھلا اظہار نہیں کرنا آتا تھا۔

''اچھا اب کیا میری جانب دیکھتی جا رہی ہو، میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی۔ تمہیں بھی احساس نہیں ہے کہ ذرا اپنی جانب توجہ ہی دے لو۔ اپنی طرف دھیان ہی دے لو۔ کوئی سج سنور ہی جایا کرو۔ آج کل کی لڑکیاں کیا کیا نہیں کرتیں خود کو نمایاں کرنے کے لیے اور ایک تم ہو۔'' انہوں نے جتا کر کہا پھر چند لمحے کے لیے چپ ہوئیں اور ناک چڑھا کر بولیں۔

''ایسے ڈھلے ہوئے منہ کے ساتھ تو ضرور ہی کھل جائے گا نصیب۔'' انہوں نے طعنہ دیا تھا۔

سونیا چپ ہی رہ گئی۔ امی کو احساس تو تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہی ہیں لیکن ان سے بھی کنٹرول نہیں ہو رہا تھا جس دن سے بھاوج سے بات ہوئی تھی بس ایک ہی جملہ کانوں میں گونجتا رہتا تھا۔

''کھوٹنا بھی کون سا ہماری مرضی کا چنیں گے۔ اپنی منشا مرضی سے منتخب کریں گے کھوٹنا۔''

وہ چڑ کر بولتی جا رہی تھیں، سونیا ان کی آخری بات سن کر جیسے ساکت رہ گئی تھی۔ کتنی تکلیف دہ بات کہہ گئی تھیں وہ، اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگی تھیں جنہیں اس نے فوراً سنبھالا تھا۔

''اللہ ہی آپ کے حال پر رحم کرے امی! چلتی ہوں میں۔ آدھے گھنٹے میں آجاؤں گی۔'' اس نے اب کی بار بنا ان کی جانب دیکھے دوپٹا سر پر جماتے ہوئے کہا تھا۔ امی کو مزید غصہ آگیا تھا۔

''آدھے گھنٹے میں بریانی کی وہ دیگ نہیں پکنے والی جو تم پکانے جا رہی ہو۔ پتا ہے مجھے کب آؤ گی تم۔'' عطیہ بیگم ناراض ہو گئی تھیں۔

سونیا چپ چاپ باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

وہ کاؤچ پر بیٹھی تھی۔ سامنے میز پر پھر کپ، رنگ اور برش بکھرے تھے۔ اسٹینسلز اور مارکرز بھی موجود تھے، فیتے اور مختلف لیس کے بنڈل بھی پڑے تھے۔ وہ اتنی مشاق اور ماہر تھی کہ ایسی چیزیں بکھری دیکھ کر ہی دماغ اور ہاتھ چلنے لگتے تھے لیکن اب جانے کیوں اس کا دماغ سن ہوا ہوا تھا۔ ذہن میں بس امی کے ایک ہی جملے کی تکرار چل رہی تھی۔

''جانے کب نصیب کھلے گا میری اس بیٹی کا...... اب ایسے ڈھلے ہوئے منہ کے ساتھ تو ضرور ہی کھلے گا نصیب۔'' امی یہ بات آج کل بے حد کثرت سے کرنے لگی تھیں۔

وہ جانتی تھی کہ اس کی امی اس کے لیے پریشان ہیں۔ اس کے لیے فکر مند ہیں تب ہی بلاوجہ کچھ بھی بول دیتی ہیں، ان کا مقصد اسے ہرٹ کرنا نہیں ہوتا

لیکن پھر بھی کچھ عرصہ سے وہ نا چاہتے ہوئے بھی ان کی باتوں پر کافی ہرٹ ہونے لگی تھی اگرچہ وہ ظاہر نا کرتی تھی، خود کو ضرورت سے زیادہ مصروف رکھتی تھی لیکن پھر بھی اس کی نسوانیت ہرٹ ہوتی تھی۔ بالخصوص اسے دکھ ہوتا تھا جب وہ اس کے لیے فکر مند ہوتے ہوئے التمش کا نام لیتی تھیں۔

التمش اس کے ماموں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماموں شروع سے کراچی میں رہے تھے جبکہ وہ لوگ دس بارہ سال پہلے بابا کے کاروبار کی وجہ سے ساہیوال شفٹ ہو گئے تھے۔ وہ اکلوتا تھا اور یہ تین بہنیں تھیں۔ جب وہ لوگ کراچی میں رہتے تھے تو ان تینوں بہنوں کی التمش کے ساتھ اچھی دوستی ہوا کرتی تھی۔ بالخصوص اس کی دونوں بڑی بہنوں کی التمش سے خوب جمتی تھی۔ ایک دوسروں کے ساتھ کھلونے بھی شیئر ہوتے تھے اور لنچ باکسز بھی۔ باتیں بھی خوب ہوتی تھیں سب کے درمیان میں لیکن پھر بڑی آپی کی شادی ہو گئی۔ وہ بیاہ کر کینیڈا چلی گئیں اور پھر منجھلی کی بھی شادی ہوئی وہ لندن چلی گئیں تو ان کے درمیان خود بخود فاصلے بڑھنے لگے تھے اور تین سال پہلے جانے کس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ التمش اور محراب کا رشتہ کر دینا چاہیے بس تب سے سب کچھ بدل گیا تھا۔ التمش اس کے ساتھ کافی ریزرو ہو گیا۔ وہ لوگ کراچی جاتے تو بھی بس اس کا انداز لیا دیا ہی رہتا تھا۔ سونیا کو بھی اس میں دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بھی اس کی بالکل پروا نہیں کرتی تھی اور التمش اپنے مغرور متکبر اور جتاتے ہوئے انداز کی وجہ سے مزید اس کے دل سے اتر گیا تھا لیکن امی کی مسلسل اس کے متعلق باتیں اسے بہت پریشان بھی کرتی تھیں اور تکلیف بھی دیتی تھیں۔ اسے بچپن سے ہی اپنے جذبات شیئر کرنے کی عادت نا تھی۔ وہ کیا سوچتی تھی، کیا چاہتی تھی یہ بتانے کا بھی مطلق شوق نا تھا اسے لیکن اب اس کے اعصاب جیسے تھکنے لگے تھے۔ ہر طرف سے ایک سوال، ایک ہی بات کی تکرار اسے جھنجلانے پر مجبور کر دیتی تھی۔ وہ خود کو سنبھالتے سنبھالتے جیسے تھکتی جا رہی تھی۔ ایک رشتہ ہی تو تھا جس میں تاخیر ہو رہی تھی باقی سب کام جو اس کے اختیار میں تھے اس نے کر کے دکھا تو دیے تھے۔ پڑھائی لکھائی، سلائی کڑھائی، پکانا پرونا، اوڑھنا پہننا، اخلاق اطوار، سگھڑاپا، سلیقہ طریقہ...... سب تو کر لیا تھا اور بنا کسی کے کہے کر لیا تھا۔ کہیں بھی تو اس کی توانائی ماند نا پڑی تھی لیکن ایک یہ معاملہ تھا جس میں وہ بالکل بے اختیار تھی اور بس یہی معاملہ جیسے اس کی سب خوبیوں کو نگلتا چلا جا رہا تھا۔ رشتہ نا تھا بلکہ دکھتی ہوئی داڑھ تھی جو نکلتی تھی نا جلد کے ساتھ جڑی رہ رہی تھی، بس تکلیف ہی تکلیف تھی۔

اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا تھا اور ہمکتا ہمکتا گال سے پھسل پھسل کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔

''تم اب تک جاگ رہی ہو؟'' امی کی آواز نے جیسے اسے بے دار کر دیا تھا۔ اس نے چہرہ صاف کیا تھا نا مڑ کر ان کی جانب دیکھا تھا۔ انہوں نے اس کا بہت دل دکھایا تھا۔ عطیہ بیگم اندر چلی آئی تھیں۔ اس نے پھر بھی ان کی جانب نہیں دیکھا تھا۔

''کیوں جاگ رہی ہو اب تک......'' وہ اس کے قریب آئی تھیں۔ ان کی آواز میں پریشانی اور ندامت چھلک رہی تھی۔ وہ پھر بھی چپ رہی۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے محراب!'' انہوں نے اس کے گود میں پڑے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ بہت دنوں بعد اسے اس کے نام، سے پکارا تھا ورنہ تو لاڈ کا نام ہی زبان پر چپکا ہوا تھا۔ وہ ہلی تک نہیں۔

''کیا...... کیا پوچھ رہی ہیں آپ؟'' ان کے چہرے پر پھیلی پریشانی دیکھ کر اس سے مزید چپ نہ رہا گیا۔

''کیوں جاگ رہی ہو میری بچی!'' وہ نادم لگ رہی تھیں جیسے انہیں احساس تھا کہ وہ کیوں اتنی ٹوٹی ہوئی لگ رہی ہے۔

''میں نے سوچا شاید میرے جاگنے سے میرا نصیب بھی جاگ جائے، یہ ہی چاہتی ہیں نا آپ؟'' وہ اب ان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ وہ سن سی رہ گئیں۔ دل چاہا آگے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں

چھپالیں، کیسے دل دکھا دیتی تھیں وہ اپنے جگر کے ٹکڑے کا۔

''ناراض ہو مجھ سے......؟'' وہ گلوگیر لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔ اس کے ساکت وجود میں جیسے جنبش پیدا ہوئی۔ وہ ان کی جانب مڑی تھی پھر اس نے گہری سانس بھری۔

''نہیں امی! ماؤں سے کون ناراض ہوتا ہے لیکن تھک ضرور گئی ہوں۔ بہت تھک گئی ہوں۔'' وہ اپنی کیفیت کو چھپانے کی کوشش میں بالکل نڈھال ہوتے ہوئے بولی تھی۔ عطیہ بیگم نے اسے ایک دم خود کے قریب کرنا چاہا تھا لیکن اس نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''نہیں امی! ایک منٹ پلیز...... آج ہم اس مسئلے پر کھل کر بات کر ہی لیں۔ کبھی کبھی بات کرنا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔'' اس کا لہجہ بے حد ٹوٹا ہوا تھا۔

''آپ بتائیں کیا کروں میں کہ یہ جو میرا سویا ہوا نصیب ہے یہ جاگ جائے۔ بتائیں کیسے جگاتے ہیں اسے، کوئی ویڈیو دستیاب ہے یوٹیوب پر یا کوئی گوگل لنک۔ کیا کروں میں، کیسے کروں...... آپ نے کہا نماز پڑھ کر دعا کیا کرو نصیب کھل جائے گا' میں نے ہر نماز کے بعد یہ دعا کرنی شروع کردی۔ آپ نے کہا یہ سورۃ پڑھو نصیب کھل جائے گا۔ میں نے وہی سورتیں کثرت سے پڑھنی شروع کردیں۔ آپ نے کہا اِس آیت کا وِرد کیا کرو میں نے اٹھتے بیٹھتے آیات کا وِرد شروع کردیا، ہر وہ کام جو اس سوئے ہوئے نصیب کو جگانے کے لیے آپ نے کہا میں نے کر کے دکھایا لیکن بقول آپ کے میرا نصیب پھر بھی سو رہا ہے۔ بتائیں اب کون سی گیدڑ سنگھی لا کر سونگھوں، کون سا منتر پڑھوں، کون سا تعویذ لے آؤں جو نماز قرآن سے بڑھ کر ہو۔ وہ کیا چیز ہے جو دعا سے بڑھ کر اللہ تک پہنچ سکتی ہے۔ آپ بتائیں میں کروں گی، آپ کی خاطر سب کروں گی۔'' وہ بنا کوئی آنسو بہائے بول رہی تھی لیکن آنکھیں جیسے شکوہ کناں ہوئی جا رہی تھیں۔ عطیہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ انہوں نے پھر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا جسے اس نے ایک بار پھر جھٹک دیا۔

''امی میں تو سب کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے تو کبھی کسی کام کو ''نو'' نہیں بولا، اچھا بتائیں التمش کی منت کروں جا کر۔ اس کے قدموں میں بیٹھ جاؤں، اس کے سامنے ہاتھ جوڑوں، اس کے پاؤں پکڑ کر درخواست کروں کہ مجھ سے شادی کرلے۔ آپ بتائیں کروں یہ سب، ایسے کھل جائے گا میرا نصیب۔ ایک وہ شخص مجھے قبول کرلے گا تو کیا میرا نصیب کھل جائے گا تو پھر بتائیں اس کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ بھول جاتی ہوں کہ ضروری امر یہ ہے کہ میرا اللہ مجھے قبول کرلے۔ اس بات پر محنت کرتی ہوں کہ بس التمش قبول کرلے مجھے۔ اللہ کو راضی نہیں کرتی بس التمش کو راضی کرتی ہوں۔ بتائیں کروں ایسے...... کچھ تو بولیں امی...... آپ کی خاطر یہ بھی کرلوں گی۔'' وہ بس ایک ٹک ان کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ عطیہ بیگم مسلسل رو رہی تھیں۔ انہوں نے اب کی بار زبردستی اسے گلے سے لگالیا۔

''بھاڑ میں جائے التمش! بھاڑ میں جائیں سب...... میری ہیرے جیسی بیٹی...... میں ہی جس کا دل دکھاتی رہتی ہوں مجھے معاف کردو میری بچی! میں تو بہت تکلیف دے دیتی ہوں تمہیں، ایسے تھوڑی ہوتا ہے، ایسے تو نہیں چاہیے تھا مجھے۔'' وہ روتی جا رہی تھیں۔ سونیا نے انہیں خود سے الگ کیا تھا۔

''تو پھر امی ایک بات سمجھ جائیں نا کہ میرا نصیب سویا ہوا نہیں ہے کیونکہ اگر سویا ہوا ہوتا تو اتنی دعاؤں کے بعد کھل چکا ہوتا۔ یہ نصیب جسے آپ سویا ہوا سمجھتی ہیں نا، یہ سویا ہوا نہیں ہے جاگ رہا ہے۔ مجھے دیکھیں ہاتھ پاؤں پورے ہیں، صحت مند ہوں۔ آنکھیں ناک بھی مکمل دیا ہے اللہ نے، دماغ کی بھی ناقص نہیں ہوں۔ اتنا کرم کر رکھا ہے رب کی ذات نے کہ تین چار ہنر عطا کر رکھے ہیں ان کی وجہ سے کتنی دعائیں ملتی ہیں مجھے۔ دعاؤں کی اہمیت کا اندازہ ہے آپ کو امی اور آپ کہتی ہیں میرا نصیب سویا ہوا ہے۔ میز دیکھ رہی ہیں نا جس پر یہ سب پھیلاوا پڑا ہے۔'' اس نے میز کی جانب اشارہ کیا تھا۔

''پانچ ہزار میں خرید کر لائی ہوں اور ان سب سے جو چیز بنا رہی ہوں نا اس کو جب ڈیلیور کروں گی تو پچپن ہزار ملیں گے۔ بتائیں پانچ ہزار سے پچپن ہزار بنانے والا ہنر کسی سوئے ہوئے نصیب والی کا ہو سکتا ہے۔ سوئے ہوئے نصیب والی ہوتی تو اللہ کھل کر ایسی ایسی بند راہیں کھول رہا ہوتا میرے لیے، نہیں ہے سویا ہوا نصیب میرا۔'' اب کی بار وہ خود پر قابو نا رکھ سکی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔

''میرے ہر ہنر، میری ہر کامیابی، میری ہر صلاحیت کو اس ایک رشتے والے معاملے کی وجہ سے ذلیل کرنا چھوڑ دیں امی! التمش کے انکار کی وجہ میرے نصیب کو کوسنا چھوڑ دیں۔ اتنا مت گرائیں مجھے میرے مقام سے، مجھے دُکھ ہوتا ہے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ عطیہ بیگم نے اسے سینے سے لگالیا تھا۔

''نہیں کہوں گی میری بچی! اب نہیں کہوں گی۔ کبھی نہیں کہوں گی۔'' وہ اسے بھینچ بھینچ کر اپنے ساتھ لپٹائے چلی جا رہی تھیں۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ امی کے سیل فون کی بپ بجنے لگی تھی۔ انہوں نے آنکھیں پونچھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اپنا فون انہیں صوفے کے کشن کے نیچے دھنسا نظر آیا تھا۔

''جی بھائی جی! کیسے ہیں آپ؟ نہیں گلا خراب ہے بس...... کچھ سر میں درد تھا اس لیے۔ روؤں گی کیوں بھائی!'' وہ بات بنا رہی تھیں۔ سونیا نے آنکھیں صاف کی تھیں ماموں کا فون تھا۔ وہ جب بھی بات کرتے تھے ہمیشہ سب سے بات کرتے تھے اس کی باری بھی آنے والی تھی۔

''اچھا، کب...... اگلے سے اگلے ہفتے، ہاں ہاں ضرور آئیں۔ ہم تو منتظر ہی رہتے ہیں آپ لوگوں کی آمد کے، ضرور آئیں بھائی جی!'' عطیہ بیگم کی آواز میں جوش چھلکا تھا۔ سونیا نے بھیگی پلکوں کے عقب سے انہیں دیکھا اور بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ماموں ممانی کی اچانک آمد وہ بھی اتنی دور سے۔ اس کے حواس جیسے الرٹ ہو گئے تھے۔

''بھائی جی اور مہناز لوگ آرہے ہیں، التمش بھی آئے گا۔ سونیا میری بچی! مجھے یقین ہے وہ اب کی بار رشتے کی بات کر کے ہی جائیں گے۔ یا اللہ! تُو نے سن لی میری، شکر میرے مالک، شکر...... میں تمہارے ابو کو بتا کر آتی ہوں۔'' وہ خوشی خوشی باہر چلی گئی تھیں۔ انہیں بھول ہی گیا تھا کہ انہوں نے فقط چند لمحے پہلے بیٹی سے کیا وعدہ کیا تھا۔ سونیا نے چڑ کر پیشانی پر ہاتھ مارا تھا۔

☆☆☆

لو جی دوستو! یہاں تک تو آپ نے دیکھ لیا کہ معاملہ کیا تھا۔ وہ ہی پرانی، عورتوں کی کشمکش میں آدمی پس رہے تھے اور پستے چلے جا رہے تھے جبکہ باقی دنیا واویلا مچانے میں مگن تھی کہ مردوں کے حقوق عورتوں سے زیادہ ہیں۔

سونیا کی اپنی ماں سے ٹھنی تھی۔ التمش کی اپنی ماں سے، زرمین بے چاری ریلو کٹی بنی درمیان میں منتظر کھڑی تھی کہ حالات سازگار ہوں تو وہ اپنا کارڈ پھینکے یعنی سارا معاملہ عورتوں کا ہی تھا۔ ہم مرد تو بس خاموش تماشائی بنے منتظر تھے کہ ڈھول چھٹ جائے، ہمیں فیصلہ سنایا جائے تو ہم سر جھکا کر شادی ہال، کرسیوں اور مہمانوں کی تعداد، شادی میں پیش کیے جانے والی ڈشز جیسے معاملات طے کرسکیں۔ ہمارے حصے میں تو بس ایسی ہی چیزیں آتی ہیں۔ خیر اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔ آپ چھوڑیں اس بات کو، میں آپ کو بتا رہا تھا کہ پھر میری چہیتی بہو میرے گھر کی زینت کیسے بنی۔ چلیں ایسا کرتے ہیں باقی کی باتیں آپ کو اگلے مہینے بتاتے ہیں۔ آپ بھی تب تک اپنے چیدہ چیدہ مسائل سلجھالیں، کیا خیال ہے؟

☆☆

(باقی آئندہ)

سالگرہ نمبر



نگہت سیما

جادوگر سیاں

مکمل ناول

میں ماما کو خدا حافظ کہہ کر ان کے بیڈروم سے نکل کر چند لمحوں کے لیے برآمدے میں رکا اور ہمیشہ کی طرح برآمدے میں موجود واش بیسن کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ عادتاً بالوں میں انگلیاں پھیر کر اچھی طرح سیٹ کیے ہوئے بالوں کو درست کرنے کی کوشش کی اور پھر مدھم سروں میں گنگناتے اور دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں کی رنگ گھماتے ہوئے میں نے صحن میں قدم رکھا تب ہی مجھے لگا کسی نے مجھے آواز دی ہو۔

''سنیں...... سنیں پلیز۔''

اور میں ٹھٹک کر رک گیا، کیا میرے کانوں نے غلط سنا تھا یا سچ میں کسی نے آواز دی تھی۔ شاید یہ آواز اوپر سے آئی تھی، ٹیرس پر سے۔ میں نے چاہا کہ مڑ کر دیکھو شاید کوئی ٹیرس پر تھا لیکن مجھے لگا میں مڑ کر دیکھوں گا تو پتھر کا ہوجاؤں گا۔ میرے کانوں میں بچپن میں دادی سے سنی ہوئی کسی کہانی کے بول گونجنے



گے۔

''دیکھو پیچھے مڑ کر مت دیکھنا ورنہ پتھر کے ہو جاؤ گے۔''

''اف او...... پتا نہیں کیوں یہ دادی کی سنائی ہوئی کہانیاں میرے ذہن سے نکلتی ہی نہیں تھیں۔'' میں جھنجلایا۔

میں کچھ دیر یوں ہی ساکت کھڑا رہا، ماما اور دادی کی بتائی ہوئی بہت ساری باتیں میرے ذہن میں آ رہی تھیں لیکن میں اب چھوٹا بچہ نہیں تھا۔ یونیورسٹی کا طالب علم تھا، مجھے خود پر ہنسی آئی اور میں نے دھیرے دھیرے گردن موڑ کر اوپر دیکھا۔

فرسٹ فلور کا ٹیرس ہمارے صحن کی طرف تھا اور صحن میں کھڑے ہو کر اوپر کی طرف دیکھا جا سکتا تھا جب کہ اوپر ٹیرس میں کوئی کھڑا ہوتا تو نیچے صحن میں ہونے والی ہر کارروائی دیکھی جا سکتی تھی۔ ٹیرس خالی تھا، میں اب پورے کا پورا گھوم گیا تھا اور سر اٹھائے اوپر ٹیرس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر میں یوں ہی سر اٹھائے دیکھتا رہا لیکن



کوئی بھی ٹیرس پر نظر نہیں آیا۔ ایک تولیہ تھا جو ٹیرس کی ریلنگ پر لٹکا ہوا تھا، میں تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔

لاؤنج کا ٹیرس میں کھلنے والا دروازہ کھلا تھا جسے میں نے اکثر بند ہی دیکھا تھا تو کیا مجھے وہم ہوا تھا، شاید ہاں وہم ہی تھا ورنہ کوئی تو نظر آتا کم از کم اپنی پکار کا جواب سننے کے لیے تو کوئی کھڑا ہوتا۔ میں نے پھر رخ موڑا اور ابھی ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ میرے کانوں میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ کوئی ہولے ہولے روتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا اور رونے کی یہ آواز یقیناً اوپر سے آتی تھی۔ شاید ٹیرس میں کھلنے والے لاؤنج کے دروازے سے ہوا کے دوش پر سوار نیچے صحن میں آتی تھی۔ میں نے بہت دھیان سے سنا، یہ میرا وہم نہیں تھا، بلاشبہ یہ کسی کے رونے کی آواز تھی۔ کبھی بہت مدھم اور کبھی قدرے بلند اور میں بے اختیار اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ یہ سیڑھیاں برآمدے میں بائیں طرف کچن کے پاس سے اوپر جاتی تھیں۔

میں بے دھیانی میں یہ سوچتا ہوا کہ شاید اوپر کوئی مسئلہ ہو گیا ہے، سیڑھیوں تک آیا تھا اور پھر سیڑھیوں کے پاس ٹھٹک کر رک گیا۔ سیڑھیوں کا دروازہ بند تھا اور ایک زنگ آلود سا تالا جھول رہا تھا۔ برسوں سے سیڑھیوں کا یہ دروازہ بند تھا جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا تب سے یہ تالا یوں ہی لگا تھا۔ اوپر کون رہتا تھا مجھے ٹھیک سے نہیں معلوم، شاید بابا کے کوئی عزیز، لیکن بہت بچپن میں ہی دادی جان نے مجھے باور کروایا تھا کہ مجھے اوپر نہیں جانا اور نہ ہی کبھی اوپر والوں سے بات کرنی ہے اگر کبھی وہ باہر گلی وغیرہ میں مل جائیں۔

''لیکن کیوں؟'' مجھے سوال کرنے کی بہت عادت تھی۔

''اس لیے کہ وہاں اوپر جادوگرنیاں رہتی ہیں اور اگر تم اوپر گئے تو اپنے جادو کے زور سے وہ تمہیں کوا بنا دیں گی اور تم ہر وقت کائیں کائیں کرتے رہو گے۔''

کوا مجھے بہت برا لگتا تھا البتہ کبوتر بننے پر سمجھوتا کیا جا سکتا تھا۔ کبوتر مجھے پسند تھے اور کبوتروں کی طرح اوپر نیلے آسمان پر اڑان بھرنے کی خواہش کئی بار میرے ننھے سے دل میں پیدا ہوئی تھی اس لیے میں نے فوراً پوچھا۔

''کیا وہ مجھے کبوتر نہیں بنا سکتیں؟''

''بات سمجھتے نہیں ہو اور بک بک کیے جاتے ہو۔'' دادی کو غصہ آ گیا تھا۔

''میں تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ تمہیں کبھی اوپر والیوں سے بات نہیں کرنی، اوپر نہیں جانا۔ وہ جادوگرنیاں ہیں اور چھوٹے بچوں کو کھا جاتی ہیں۔''

''اور وہ مکھی بنا کر دیوار سے بھی چپکا دیتی ہیں۔'' مجھے دادی کی سنائی ہوئی ایک کہانی ''بوڑھی جادوگرنی'' یاد آ گئی تھی۔

''ہاں کبھی کبھی وہ مکھی بنا کر دیوار سے بھی چپکا دیتی ہیں۔'' دادی نے مجھے مزید ڈرایا، اب کے میں واقعی ڈر گیا تھا لیکن میں نے ماما اور بابا سے دادی کی بات کی تصدیق ضرور کی تھی۔ ماما نے تو فوراً ہی تصدیق کر دی تھی۔

''ہاں تمہاری دادی جان صحیح کہتی ہیں، ایسی ویسی جادوگرنیاں نہیں خوف ناک چڑیلیں۔'' البتہ بابا خاموش رہے تھے اور انہوں نے ایک تاسف بھری نظر ماما اور دادی پر ضرور ڈالی تھی۔

''بچے سے ایسی فضول بات کرنے کی کیا ضرورت ہے ثریا!''

''وہ بس اماں جان نے......'' ماما نے دادی کی طرف دیکھا تھا۔

''تو غلط کہا کیا میں نے، جادوگرنیاں ہیں تو دونوں ماں بیٹی......ایسا جادو جو تمہیں......''

''اماں پلیز......'' بابا نے ایک ہاتھ اوپر اٹھایا تھا اور دادی باہر نکل گئی تھیں۔

''آپ کو تو پتا ہے نا اماں جان کا......'' ماما نے معذرت طلب نظروں سے بابا کی طرف دیکھا تھا۔

''ٹھیک ہے میں بات کرلوں گا اماں جان

ہے۔''



اب پتا نہیں بابا نے دادی جان سے بات کی تھی یا نہیں لیکن دادی مجھے اوپر والی جادوگرنیوں سے وقتاً فوقتاً ڈراتی رہتی تھیں اور ڈرنے کے باوجود بھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ میں اوپر جا کر دیکھوں کہ جادوگرنیاں کیسی ہوتی ہیں۔ بس چپکے سے دیکھ کر بھاگ آؤں گا، رکوں گا تھوڑا ہی کہ وہ مجھے پکڑ کر کھا جائیں یا مکھی بنا کر دیوار سے چپکا دیں۔ ان دنوں میں اس عمر میں تھا جب جنوں، بھوتوں، پریوں اور دیوؤں کی کہانیاں بہت اٹریکٹ کرتی ہیں۔ دادی تو مجھے کہانیاں سناتی ہی تھیں، میں خود بھی اپنی پاکٹ منی سے کہانیوں کی کتابیں خریدتا تھا۔ نیلم پری والی کہانی مجھے بہت پسند تھی، نیلم پری جسے ایک بوڑھی جادوگرنی نے قید کر رکھا تھا۔

کیا خبر اوپر بھی جادوگرنیوں نے کسی شہزادی یا پری کو قید کر رکھا ہو اور اگر میں اسے ان جادوگرنیوں کی قید سے آزاد کروادوں تو وہ مجھے بھی خوش ہو کر جادو کی کوئی چھڑی دے دے اور میرے مزے ہو جائیں۔ جادو کی چھڑی ہلائی تو سارا ہوم ورک ختم، پھر ہلائی تو ڈھیروں آئس کریم حاضر۔ میرا تخیل ایسے ہی تانے بانے بنتا رہتا تھا اور ایک روز جب دوپہر میں دادی اور ماما سو رہی تھیں۔ میں چپکے سے دادی کے پاس سے اٹھ کر باہر آ گیا، دھوپ پورے صحن بلکہ برآمدے تک میں پھیلی ہوئی تھی۔ بابا آفس میں تھے دادی اور ماما سوئی ہوئی تھیں اور اوپر جانے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اوپر بالکل خاموشی تھی شاید دونوں جادوگرنیاں بھی سو رہی تھیں، مجھے نانو اور دادی کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ اوپر دو جادوگرنیاں رہتی ہیں۔ میں نے دادی کو نانو سے کہتے سنا تھا کہ دونوں ماں بیٹی جادوگرنیاں ہیں۔

میں نے اپنے اطمینان کے لیے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ دادی کے خراٹے پورے کمرے میں گونج رہے تھے، میدان صاف تھا اب میں نے برآمدے میں آ کر لکڑی کی چھوٹی سی میز اٹھا کر سیڑھیوں کے پاس رکھی لیکن اس میز پر کھڑے ہو کر بھی میرا ہاتھ چٹخنی تک نہیں پہنچتا تھا۔ میں نے وہاں ہی کھڑے کھڑے جائزہ لیا اور مجھے برآمدے میں ایک موڑھا نظر آ گیا، میں میز سے اترا اور دبے پاؤں چلتا ہوا برآمدے میں آیا اور موڑھا اٹھا کر میز پر رکھا۔ شاید یہ کچھ دیر پہلے پڑھنے والی ''بہادر شہزادے'' کی کہانی کا اثر تھا کہ میں وقتی طور پر جادوگرنیوں کا خوف بھول گیا تھا اور صرف انہیں دیکھ لینے کا تجسس ہر طرح کے خوف پر غالب آ گیا تھا۔

میں نے موڑھے پر پاؤں رکھنے سے پہلے ادھر اُدھر دیکھا تھا اور پھر اپنا دایاں پاؤں موڑھے پر رکھا تھا، پتا نہیں میں نے اپنا بایاں پاؤں موڑھے پر رکھا تھا یا......نہیں مجھے یاد نہیں بس اتنا یاد ہے کہ موڑھا الٹ گیا تھا اور نیچے گرتے ہوئے میز کا کونا میری کنپٹی پر لگا تھا۔ شاید وہاں کوئی کیل بھی تھا کہ خون بڑی تیزی سے بہنے لگا تھا۔ میں بلند آواز میں رونے لگا تھا۔ میرے رونے اور گرنے کی آواز سن کر دادی اور ماما دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر آئی تھیں اور خون دیکھ کر گھبرا گئی تھیں اور فوراً ہی مجھے محلے کے ایک کلینک میں لے گئی تھیں جہاں مجھے دو ٹانکے لگے تھے جن کا ہلکا سا نشان ابھی تک موجود ہے۔

اس وقت تو دادی اور ماما نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا تھا لیکن رات کو جب میں سو کر اٹھا تھا اور میری طبیعت ٹھیک تھی تو دادی نے مجھ سے پوچھا کہ میں وہاں کیا کر رہا تھا جب میں نے بتایا کہ میں نے اوپر جانا تھا تو دادی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

شاید انہیں گمان بھی نہیں تھا کہ میں بھی اوپر جانے کا سوچ بھی سکتا ہوں۔ اب انہیں کیا پتا کہ میں اس وقت بہادر شہزادہ تھا اور مجھے کسی نیلم پری کو جادوگرنیوں کی قید سے آزاد کروانا تھا لیکن یہ بات میں دادی کو نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ میرا سیکرٹ تھا اور سیکرٹ تو کسی سے بھی شیئر نہیں کیے جا سکتے۔ دادی نے میری چوٹ کی پروا کیے بغیر ہی میرے کندھے پر

ہاتھ مارا۔

''ہائے قاسو! تجھے کب عقل آئے گی، اگر تم اوپر چلے جاتے اور وہ تمہیں کچا چبا جاتیں تو ہم سب تو بے موت مر جاتے۔'' انہوں نے مجھے گلے سے لگالیا تھا۔

''اب دیکھ لیا نا انہوں نے اوپر بیٹھے بیٹھے ہی ایسا جادو کیا کہ تم گر گئے۔''

اور دادی کی باتوں سے میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ضرور اوپر والی جادوگرنیوں نے ہی کچھ جنتر منتر پڑھا ہوگا جو میں گر گیا ورنہ میں نے تو میز پر موڑھا بہت اچھی طرح سے رکھا تھا۔

☆......۞......☆

دادی نے دوسرے دن ہی مستری بلا کے دروازے میں کنڈا لگوایا تھا اور اس میں تالا لگا دیا گیا اور یہ تالا ابھی تک ایسے ہی لگا تھا۔ دادی نے میرے اندر ایسا خوف بٹھا دیا تھا کہ میں نے پھر کبھی اوپر جانے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے اب دادی کی باتیں سچ لگنے لگی تھیں۔ جب کبھی میں صحن میں سائیکل چلا رہا ہوتا تو مجھے لگتا جیسے ریلنگ کے پیچھے سے دو آنکھیں مجھے دیکھتی ہوں۔ میں مڑ کر دیکھتا تو مجھے وہ آنکھیں جو ریلنگ کے پیچھے سے جھانکتی تھیں دکھائی نہ دیتیں۔

میرے دل میں عجیب سا خوف بیٹھ گیا تھا جیسے یہ دو آنکھیں جو چھپ چھپ کر مجھے دیکھتی تھیں اپنی آنکھوں کی طاقت سے مجھے مکھی نہ بنا دیں یا پھر کوّا...... اور کوّا تو مجھے بہت برا لگتا تھا اور میں نے مارے ڈر کے صحن میں جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں گھر میں ہوتا تو زیادہ تر اپنے کمرے یا برآمدے میں ہی کھیلتا رہتا جب کبھی مجھے اسکول جانے یا کہیں اور جانے کے لیے صحن میں سے گزرنا پڑتا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور مجھے اپنی پیٹھ پر کسی کی آنکھیں چبھتی ہوئی محسوس ہوتیں اور آنکھوں کے سامنے تیز نوکیلے دانتوں والی چڑیلیں آجاتیں۔

یہ خوف میرے ذہن میں اس قدر بیٹھ گیا تھا کہ میں خواب میں بھی ڈر کر اٹھ جاتا، اکثر مجھے خواب آتا تھا کہ انتہائی خوف ناک اور ڈراؤنی شکلوں والی جادوگرنیاں ہاتھوں میں لمبے لمبے چھرے اٹھائے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہیں۔

ایک بار رات کو جب ہم لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہے تھے تو بابا نے مجھے کہا کہ وہ میرے لیے چاکلیٹ لائے تھے لیکن شاپر بائیک کے ہینڈل پر لٹکا ہوا ہے، جا کر لے آؤں۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا، صحن میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا، برآمدے میں جلنے والے بلب کی روشنی ناکافی تھی۔ ڈرتے ڈرتے میں نے برآمدے میں قدم رکھا لیکن صحن میں جانے کی ہمت نہیں ہوئی اور پلٹ آیا۔

''کیا ہوا؟'' بابا نے پوچھا تھا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے۔'' میری رنگت زرد ہو رہی تھی اور دل کانپ رہا تھا۔

''لیکن اپنے ہی گھر میں بھلا کوئی ڈرتا ہے بیٹا!'' بابا نے میرے کندھے پر تھپکی دی تھی۔

''لیکن جب کسی کے گھر کے اوپر والے پورشن میں جادوگرنیاں رہتی ہوں تو پھر ڈر تو لگتا ہے نا بابا۔ آپ کو پتا ہے وہ مجھے اپنے جادو کے زور سے کوّا بنا کر غائب کر دیں گی اور پھر جب ان کا دل چاہے گا وہ مجھے پھر سے لڑکا بنا کر کھا جائیں گی۔'' میں خوف سے لرزنے لگا تھا، بابا نے ایک خشمگیں نظر دادی اور ماما پر ڈالی تھی۔

''یہ کیا پٹیاں پڑھاتی رہتی ہیں آپ اسے۔'' ان کی آواز بلند نہ تھی لیکن اس میں سختی تھی۔ لیکن بابا نے تو اتنی بلند آواز میں بھی کبھی بات نہ کی تھی۔ وہ بہت نرم گفتار تھے، بہت آہستگی اور نرمی سے بات کرتے تھے۔ ماما بھی اگرچہ سخت مزاج نہ تھیں اور نہ ہی وہ کبھی مجھے ڈانٹتی تھیں لیکن ان کے لہجے میں وہ ملائمت نہیں تھی جو بابا کے لہجے میں تھی۔

''وہ اس روز اوپر جانے کے چکر میں جو گر گیا تھا نا تو شاید اماں جان نے ڈرانے کے لیے کچھ کہہ دیا ہو۔'' ماما نے رک رک کر کہا تو بابا نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔

''آئندہ میں نہ سنوں کہ آپ لوگوں نے بچے سے اس طرح کی کوئی بات کی ہو۔''

ماما نے سر ہلا دیا تھا اور دادی اٹھ کر باہر چلی گئی تھیں۔ ماما بابا سے ڈرتی تھیں لیکن دادی تو بابا کی بھی ماں تھیں وہ بھلا کیوں ڈرتیں بابا سے اور بابا بھی دادی کے سامنے خاموش ہو جاتے تھے۔ دادی کے جانے کے بعد انہوں نے مجھے سمجھایا۔

''یہ جادوگرنیاں اور چڑیلیں صرف کہانیوں میں ہوتی ہیں، حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔''

''اور اوپر...... پھر اوپر کون رہتا ہے؟'' مجھے بھی موقع ملا تھا کہ اپنا تجسس دور کرتا۔

''اوپر بھی ہمارے تمہارے جیسے انسان ہی رہتے ہیں بیٹا! بس تمہاری دادی جان کی ان سے لڑائی ہے۔''

''اور اگر وہ دادی جان سے لڑتی ہیں تو آپ انہیں گھر سے نکال کیوں نہیں دیتے۔ کسی اور کو کرائے پر دے دیں۔ جواد کے ابو نے بھی اپنے گھر میں نئے کرایہ دار رکھے ہیں۔'' میں نے فوراً مشورہ دیا تھا۔

''وہ ہمارے گھر میں نہیں رہتیں بیٹا! وہ ان کا اپنا گھر ہے۔''

''اچھا آپ نے اوپر والا پورشن کرائے پر نہیں دیا بلکہ فروخت کر دیا ہے۔'' بابا مسکرائے تھے۔

''گڈ! اب جاؤ اور اپنا چاکلیٹ والا شاپر لے آؤ۔'' اگرچہ بابا کی باتوں نے مجھے مطمئن کر دیا تھا اور بظاہر مجھے کوئی ڈر بھی نہیں لگ رہا تھا اور میں چاکلیٹ کے لالچ میں بہادری سے صحن میں چلا گیا تھا لیکن جب میں بائیک سے شاپر اتار کر مڑا تو میری نظریں اچانک ہی اوپر اٹھی تھیں۔ ٹیرس میں روشنی ہو رہی تھی اور ٹیرس کے ریلنگ پر ہاتھ رکھے کوئی کھڑا تھا، وہ ماما کی عمر کی عورت ہوگی۔ روشنی میں اس کا گورا رنگ دمک رہا تھا، اس کے نقوش بے حد دلکش تھے۔ وہ مجھے کسی ملکہ کی طرح ہی لگی تھی، وہ یک دم سیدھی ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں تولیہ تھا جو شاید اس نے ریلنگ سے اٹھایا تھا۔ یکا یک میرے اندر چھپا ہوا خوف امڈ

آیا تھا، مجھے لگا تھا جیسے اس کی شکل بدل گئی ہو اور اس کے ہونٹوں سے لمبے دانت جھانکنے لگے ہوں اور ہونٹوں سے خون ٹپک رہا ہو۔ خوف سے میرے دانت بجنے لگے، مجھے لگا جیسے اس نے اپنا بازو آگے بڑھایا ہو اور پھر یہ بازو لمبا ہو گیا ہو۔ اتنا لمبا کہ بس میری گردن دبوچنے ہی والا ہو۔ میرے حلق سے بے ساختہ ایک چیخ نکلی اور پھر میں چیختا ہی چلا گیا، میری چیخوں کی آواز سن کر بابا اور ماما دوڑتے ہوئے باہر آئے تھے، بابا نے یکدم مجھے گود میں اٹھا لیا تھا۔

”کیا ہوا...... کیا ہوا بیٹا؟“

”وہ...... وہ......“ میں نے اوپر ٹیرس کی طرف دیکھا لیکن وہاں اب اندھیرا تھا، وہ غالباً لائٹ آف کر کے اور تولیہ اٹھا کر جا چکی تھیں۔

”وہ...... وہ......“ میری گھگھی بندھی ہوئی تھی اور پھر شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا کیونکہ کہ جب میری آنکھ کھلی تو میں بابا ماما کے بیڈروم میں ان کے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور ماما میرے تلوے سہلا رہی تھیں اور بابا ناراضی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”یہ آپ صحیح نہیں کر رہی ہیں ثریا! خدا کے لیے میرے بیٹے کے ساتھ یہ دشمنی مت کریں، اس طرح تو اس کی شخصیت مسخ ہو جائے گی۔“

ماما نے تڑپ کر انہیں دیکھا تھا۔

”کیا قاسم میرا بیٹا نہیں ہے، میں بھلا اس کے ساتھ دشمنی کیوں کروں گی، وہ تو اماں......“

”اگر اماں اپنی سادگی میں اس سے کوئی الٹی سیدھی بات کر بھی جاتی ہیں تو کیا آپ کا فرض نہیں ہے کہ آپ اس کے ذہن کو......“

تب ہی بابا کی نظر مجھ پر پڑی تھی اور انہوں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ ماما نم آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں اور اپنے ہونٹ کچل رہی تھیں۔ میں اگرچہ ماما کی نسبت بابا کے زیادہ نزدیک تھا لیکن اس وقت مجھے بابا کا ماما سے اس طرح بات کرنا بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

”ماما......“ میں نے دونوں بازو اٹھا کر ان کے گلے میں ڈالے اور ان سے لپٹ گیا۔ ماما نے بھی مجھے اپنے ساتھ بھینچ لیا اور مجھے بے تحاشا چومنے لگیں۔

☆......❁......☆

اور پھر بہت سارے دن بابا میرے دل سے یہ خوف دور کرنے کی کوشش کرتے رہے اور بہت حد تک یہ خوف دور بھی ہو گیا تھا۔ ماما اپنی زبان سے کبھی کچھ نہیں کہتی تھیں لیکن وہ دادی کی باتوں کی تردید بھی نہیں کرتی تھیں جو وقتاً فوقتاً مجھے یاد دہانی کرواتی رہتی تھیں کہ مجھے کبھی اوپر نہیں جانا نہ پتنگ لوٹنے نہ ویسے۔ اس روز میرے اوپر جانے کی کوشش سے انہوں نے یہ ہی سمجھا تھا کہ میں شاید کسی گڈے کے چکرے میں اوپر جا رہا تھا کہ اکثر کٹی ہوئی پتنگیں وغیرہ اوپر چھت پر گرتی رہتی تھیں۔

”اور سنو......“ وہ مجھے تاکید کرتیں۔

”یہ ماں بیٹیاں اگر کبھی گلی میں بھی کہیں نظر آ جائیں تو ہرگز کلام نہ کرنا۔ پوری جادوگرنیاں ہیں دونوں۔“ اور میں نے تو کبھی ان دونوں میں سے کسی کو کبھی دیکھا نہ تھا سوائے اس رات کی ایک جھلک کے پھر اگر وہ مجھے گلی میں نظر آتی تو میں بھلا کیسے پہچانتا کہ یہ ہمارے گھر کے اوپر والے پورشن میں رہنے والی جادوگرنیاں ہیں۔

اوپر والے پورشن کی ایک سیڑھیاں تو ہمارے برآمدے میں تھیں جب کہ دوسری سیڑھیاں ہمارے گھر کی پچھلی طرف والی گلی میں تھیں اور وہ آنے جانے کے لیے وہ ہی سیڑھیاں استعمال کرتی تھیں۔ ایک روز جب میں اور جواد گلی میں کھیل رہے تھے تو تب میں نے ان میں سے ایک کو دیکھا۔ میں اس وقت پچھلی گلی میں اپنی گیند ڈھونڈ رہا تھا، ابھی کچھ دن پہلے ہی تو ماما نے میری ضد پر مجھے گلی میں کھیلنے کی اجازت دی تھی ورنہ میں اس سے پہلے تو گھر کے اندر ہی کھیلتا تھا۔ وہ سیڑھیوں سے اتر کر نیچے گلی میں آئی تھیں، وہ تقریباً دادی کی عمر کی ہی تھیں۔ سفید چادر لپیٹے وہ اس وقت مجھے بہت اچھی لگی تھیں، وہ مجھے گلی میں دیکھ کر حیران ہوئی تھیں اور پھر میرے قریب آ کر

انہوں نے دو انگلیوں سے میرے رخساروں کو چھوا تھا۔

”تم قاسم ہونا، ہاشم کے بیٹے۔“

میں وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا لیکن میرے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے، وہ بہت اشتیاق اور محبت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

”تم قاسم ہونا۔“ انہوں نے پھر پوچھا تھا، میں نے غیر ارادی طور پر سر ہلا دیا تھا۔

انہوں نے جھک کر دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ لے کر میری پیشانی چوم لی تھی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا، میں نے بمشکل تھوک نگلا اور پوری طاقت سے گلی سے بھاگ نکلا جب کہ جواد ابھی تک گلی میں گیند ڈھونڈ رہا تھا، کچھ دیر بعد وہ گیند ڈھونڈ کر لے آیا میں اس کے گھر کے گیٹ کے باہر بنے چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا۔

”تم کیوں بھاگ آئے تھے؟“

”ویسے ہی۔“ میں اب جواد کو یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مجھے ڈر لگ گیا تھا۔

”بی جی تم سے کیا کہہ رہی تھیں؟“ اس نے پوچھا۔

”بی جی کون؟“ میں چبوترے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”وہ ہی جو تم سے کچھ کہہ رہی تھیں، جوہی آنٹی کی امی! جو تمہارے گھر کے اوپر والے پورشن میں رہتی ہیں۔“

”اچھا تو ان کا نام بی جی ہے؟“

”نام تو پتا نہیں لیکن ہم سب انہیں بی جی کہتے ہیں۔ جوہی آنٹی بھی انہیں بی جی ہی کہتی ہیں۔ بی جی بہت اچھی ہیں، وہ جب بھی ہمارے گھر آتی ہیں تو ہم سب بچوں کے لیے ٹافیاں یا کوئی اور چیز لے کر آتی ہیں۔“

”اچھا۔“ میں نے جواد کی باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی تھی اور اس سے گیند لے کر ہوا میں اچھالنے لگا تھا، کیونکہ اب دوسرے بچوں کے ساتھ مجھے گلی میں کھیلنے کی اجازت مل چکی تھی تو وہ مجھے کبھی کبھار نظر آنے لگی تھیں۔ کبھی سبزی خریدتے ہوئے، کبھی دودھ اور انڈے لیتے ہوئے۔ وہ گھر کا سودا سلف خود ہی لیتی تھیں، کبھی کام کرنے والی ماسی بھی ان کے ساتھ سامان اٹھائے ہوتی۔ اب میں انہیں دیکھ کر بھاگتا نہیں تھا بلکہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا تھا، وہ بھی مسکرا دیتیں۔ پاس سے گزرتے ہوئے دو انگلیوں سے میرا رخسار سہلاتیں اور کبھی میرے پاس رک کر میرا اور بابا کا حال پوچھتیں۔ میں نے گھر میں کسی سے ذکر نہیں کیا تھا کہ میں نے بی جی کو دیکھا ہے۔

لیکن ایک روز جب میں دادی کے پاس بیٹھا تھا تو اچانک ہی میرے منہ سے نکل گیا تھا کہ ”میں نے اوپر والی بوڑھی عورت کو دیکھا ہے۔“

”کیا...... کہاں دیکھا...... کیا کہہ رہے ہو تم؟“ دادی ہکا بکا رہ گئی تھیں۔

”باہر گلی میں سبزی لیتے ہوئے کئی بار، جواد نے بتایا تھا کہ وہ ہمارے اوپر والے پورشن میں رہنے والی بی جی ہیں۔“ دادی جیسے سانس روکے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

”اس نے تم سے کچھ کہا تو نہیں۔“

”نہیں تو...... وہ تو بالکل آپ جیسی ہیں دادی، خوب صورت سی۔“

”وہ میرے جیسی کیسے ہو سکتی ہیں جادوگرنی؟ نرا بہروپ بنا رکھا ہے اس نے، اس کے ظاہر پر نہ جانا قاسم بچے۔“

اور مجھے دادی کی سنائی ہوئی وہ کہانی یاد آ گئی جس میں بوڑھی بدصورت جادوگرنی خوب صورت شہزادی کا روپ دھار کر اپنا شکار پکڑا کرتی تھی۔

اس روز ایک بار پھر دادی نے مجھے زور و شور سے تلقین کی کہ مجھے ان سے بچ کر رہنا ہے اور اگر وہ کبھی بلائیں بھی تو نہیں جانا اور میں نے دادی سے وعدہ کیا تھا کہ میں کبھی ان سے بات نہیں کروں گا اور گلی میں کھیلتے ہوئے جب کبھی میں انہیں دیکھتا تو ادھر اُدھر ہو جاتا تھا لیکن ان سے ایک بار پھر خوف زدہ

ہونے کے باوجود میرا جی چاہتا کہ میں ان کے قریب جا کر انہیں غور سے دیکھوں وہ تو مجھے دادی سے بھی زیادہ اچھی اور شفیق لگتی تھیں لیکن میں دادی سے کیا ہوا وعدہ توڑ نہیں سکتا تھا۔

پھر ان کے ساتھ ایک چھوٹی سی بچی بھی نظر آنے لگی۔ جسے اکثر وہ اسٹور سے چاکلیٹ یا کچھ اور لے کر دیتی نظر آئی تھیں۔ اب یہ بچی کبھی کبھی ٹیرس کے ریلنگ پر سے بھی لٹکتی یا جھانکتی نظر آتی اور پھر ایک نرم شفیق سی آواز سنائی دیتی۔

''بیٹا گر جاؤ گی ادھر آجاؤ گڑیا!''

اوپر والا پورشن جہاں پہلے خاموشی رہتی تھی اب گویا آوازوں سے بھر گیا تھا۔ بھاگنے دوڑنے کی، ہنسنے، کھلکھلانے کی...... جیسے سویا ہوا محل جاگ اٹھا تھا۔ اوپر کے مردہ پورشن میں اب زندگی ہنستی، کھلکھلاتی تھی اور میں صحن میں اپنی سائیکل دوڑاتے ہوئے یہ کھلکھلاہٹیں سنتا رہتا تھا۔ پتا نہیں پہلے یہ بچی کہاں چھپی ہوئی تھی، دادی اور ماما اب بھی کبھی کبھی مجھے اوپر والوں سے ڈرانے کی کوشش کرتی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اب پہلے کی طرح ڈرتا نہیں تھا لیکن پھر بھی اگر کبھی بی جی گلی میں اچانک سامنے آجاتی تھیں تو میں ان کی شفیق اور مہربان مسکراہٹ سے نظر چرا لیتا تھا اور ادھر اُدھر ہو جاتا تھا کیا خبر دادی صحیح ہی کہتی ہوں۔ وہ بھی بوڑھی جادوگرنی کی طرح ہو۔

☆......❁......☆

دادی کی طرح نانو کو بھی وہ کچھ زیادہ پسند نہ تھیں وہ جب بھی آتیں اوپر والیوں سے ماما کو ہوشیار رہنے کی تاکید کرتی تھیں۔ ایک بار جب وہ آئی ہوئی تھیں اور میں ماما کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا اور ماما ہولے ہولے میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں اور نانی جو سامنے ہی بیٹھی تھیں یکدم ناگواری سے بولی تھیں۔

''ایک تو مجھے تیری سمجھ نہیں آتی ثریا! آخر تُو کس لیے اتنے لاڈ اٹھاتی ہے اور اس سنپولیے کو دودھ پلا پلا کر پال رہی ہے، دیکھ لینا یہ کبھی تیرا نہیں بنے گا۔'' پتا نہیں نانی کس کی بات کر رہی تھیں اماں نے یک دم گھبرا کر انہیں دیکھا تھا۔

''کیسی باتیں کرتی ہیں اماں! بھلا یہ بات کرنے کا کیا موقع ہے اور آپ کو کیا پتا پالنے کی محبت جنم دینے والی سے کم نہیں ہوتی۔ آپ پلیز ایسی باتیں نہ کیا کریں۔''

''تم بھی نا ثریا!'' نانی نے اس وقت مجھے جس طرح غصے سے دیکھا تھا۔ وہ مجھے بہت بری لگی تھیں اور میں نے سوچا تھا میں بابا سے ضرور نانی کی شکایت لگاؤں گا۔

میں نے شکایت تو نہیں لگائی تھی البتہ بابا سے سنپولیے کا مطلب ضرور پوچھا تھا۔

''سنپولیا کیا ہوتا ہے۔''

''سنپولیا سانپ کا بچہ ہوتا ہے قاسم! لیکن تم نے یہ لفظ کہاں سے سنا ہے؟'' اور میں نے بابا کو نانو کی ساری بات بتا دی تھی اور بابا کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں پڑ گئی تھیں۔

''تو پھر ماما سانپ کے بچے کو دودھ کیوں پلاتی ہیں اور یہ سانپ کا بچہ ماما نے کہاں رکھا ہے؟'' اپنی عادت کے مطابق میں نے پھر سوال کر دیا تھا۔

''بس قاسم! اب کوئی سوال نہیں۔'' اتنے سخت لہجے میں انہوں نے کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

میں سہم کر خاموش ہو گیا تھا اور اس رات میں نے بابا کو بہت غصے سے اور اونچا اونچا بولتے ہوئے سنا تھا۔ میں اس وقت ماما کے بیڈ پر ہی سو رہا تھا، بابا کی آواز سے ہی میری آنکھ کھلی تھی۔ بابا کہہ رہے تھے۔

''ثریا اپنی والدہ کو سمجھا دو کہ آئندہ کبھی انہوں نے میرے بچے کے حوالے سے کوئی غلط بات کی تو اچھا نہ ہوگا۔ کہہ دو خالہ سے کہ اگر انہوں نے یہاں آکر اس طرح کی باتیں کرنی ہیں تو مت آیا کریں یہاں۔''

''آپ کو تو پتا ہے نا میری تو جان بند ہے اس میں، آپ جانتے ہیں نا لیکن اماں کو کیسے سمجھاؤں؟''

ماما کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور بابا

خاموش اور تھکے تھکے سے صوفے پر گر گئے تھے۔ میں نے کروٹ بدل کر اپنے بازو ماما کے گرد حمائل کر لیے تھے اور ماما نے بھی مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا، اس رات میں ضد کر کے ماما کے پاس سویا ہوا تھا ورنہ دادی کے کمرے میں سوتا تھا۔

نانو کچھ دن مزید رہ کر واپس سرگودھا چلی گئی تھیں لیکن جاتے جاتے وہ ماما کو پھر تاکید کر گئی تھیں کہ وہ خواہ مخواہ غیروں پر محبت نہ لٹایا کریں۔

ماما پتا نہیں کن غیروں پر اپنی محبت لٹاتی تھیں اور نانو انہیں کیوں منع کرتی تھیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا اور جب میں نے دادی سے پوچھا تھا تو دادی نے غصے سے کہا تھا۔

''چل چھوڑ اسے، خواہ مخواہ میں جلتی ہے۔ میں نے بھی کہہ دیا ہے تیری ماں سے اب اگر اس نے ایسی ویسی بات کی نا تو اسے بھی چلتا کروں گی یہاں سے، میرے بیٹے کے لیے لڑکیاں بہت۔'' اور مجھے دادی کی بات بھی سمجھ نہیں آئی تھی لیکن دادی نے مجھے کہانی سنانا شروع کر دی تھی اور مجھے کہانی سن کر اتنی ہنسی آئی تھی کہ میں دادی سے مزید کچھ پوچھنا ہی بھول گیا تھا۔

☆......❁......☆

بابا کی عادت تھی کہ رات کو سونے سے پہلے کچھ دیر ضرور آکر دادی کے پاس بیٹھتے تھے۔ کبھی تو میں سو رہا ہوتا کبھی جاگ رہا ہوتا، ایک روز میں دادی کے پاس لیٹا آنکھیں موندے سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ بابا حسب معمول آکر بیٹھ گئے شاید وہ کچھ پریشان تھے کہ میں نے کچھ دیر بعد دادی کو کہتے سنا۔

''کیا بات ہے ہاشم! اتنے چپ چپ سے کیوں ہو؟''

''کچھ نہیں بس ایسے ہی۔''

''بس ایسے ہی کیسے، ماں ہوں تمہاری شکل سے دل کا حال جان لیتی ہوں۔ دو دن سے دیکھ رہی ہوں تمہیں، جانے کن گھمن گھیریوں میں پڑے رہتے ہو۔''

''قاسم سو گیا ہے کیا؟''

''ہاں۔''

دادی نے رخ موڑ کر مجھے دیکھا تھا۔

''کبھی کبھی میرا دل بہت پریشان ہو جاتا ہے اماں جان! انجانے میں شاید ہم سے ظلم ہوا ہے، سوچتا ہوں اپنے ظلم کا ازالہ کر دوں لیکن دل کٹنے لگتا ہے کیسے...... کیسے رہیں گے ہم اس کے بغیر۔''

''بے کار کے وہم نہ کیا کر، ہم نے کون سا ظلم کیا اور......'' دادی کی آواز مجھے دور سے آتی محسوس ہوئی تھی اور پھر نیند نے مجھ پر غلبہ پا لیا تھا اور میں دادی کی پوری بات نہیں سن سکا تھا۔

سیڑھیوں کے پاس کھڑے کھڑے میں نے یہ ساری باتیں سوچ ڈالی تھیں حالانکہ بہت سال پہلے میں نے اوپر والوں کے متعلق سوچنا، تجسس کرنا اور ڈرنا چھوڑ دیا تھا تب میں سونتھ کلاس میں پڑھتا تھا ایک روز جب میں اور جواد اسکول سے گھر آئے تھے تو ہماری گلی میں بہت ساری لوگ کھڑے تھے۔ جواد کا گھر بالکل ہمارے گھر کے سامنے تھا اور ہم اکٹھے اسکول جاتے اور گھر آتے تھے۔

''یہ اتنے سارے لوگ یہاں کیوں کھڑے ہیں جواد!'' میں پتا نہیں کیوں ڈر سا گیا تھا تب ہی کلمہ شہادت کی آواز سنائی دی اور پچھلی گلی سے ایک جنازہ آتا دکھائی دیا۔

''شاید ادھر پچھلی گلی میں کوئی مر گیا ہے۔'' جواد نے کہا اور ہم درمیان سے ہٹ کر ذرا پیچھے ہو کر کھڑے ہو گئے تھے تب ہی جواد کو اپنا بڑا بھائی بلال نظر آگیا تو اس نے آواز دی تو بلال بھائی ہمارے قریب آئے۔

''کون فوت ہوا ہے بھائی؟''

''بی جی کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''بی جی کون؟'' میرے لبوں سے یوں ہی نکل گیا تھا حالانکہ مجھے پتا تھا کہ بی جی کون تھیں۔

''جو ہی آنٹی کی امی! جو تمہارے گھر کے اوپر والے پورشن میں رہتی تھیں۔''

”اوہ۔“ جواد کے لبوں سے نکلا تب ہی میری نظر بابا پر پڑی تھی جو جنازے کو کندھا دیے سر جھکائے کلمہ شہادت پڑھتے آرہے تھے۔

”یہ میرے بابا......“ میں نے جیسے خود سے کہا تھا لیکن بلال نے میری بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔

”بی جی تمہارے بابا کی چچی تھیں۔“ بلال بتا کر جنازے میں شامل ہوگیا تھا اور میں حیران سا کھڑا تھا۔ بابا نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا کہ بی جی ان کی چچی ہیں اور......

”بی جی بہت اچھی تھیں قاسم! ہم سب بہن بھائیوں سے بہت پیار کرتی تھیں اور مجھ سے تو بہت زیادہ۔ وہ مجھ سے ہمیشہ تمہارے متعلق پوچھتی رہتی تھیں اور جب کبھی تم کوئی پوزیشن لیتے تھے تو بہت خوش ہوتی تھیں۔ تم لوگ تو ان کے گھر نہیں جاتے تھے، امی نے ایک بار بتایا تھا کہ تمہاری ان کے ساتھ ناراضی ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا، گلی خالی ہوگئی تھی اور میں بھی افسردہ ہوگیا تھا شاید موت کی اپنی ایک اداسی ہوتی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ ایسے موقعوں پر ناراضیاں ختم ہوجاتی ہیں لیکن دادی اور ماما گھر پر ہی تھیں اور آرام سے برآمدے میں بیٹھی باتیں کررہی تھیں جیسے بی جی کی موت یا زندگی ان کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔

میں انہیں سلام کرکے اپنے کمرے میں آگیا تھا اور ماما کو بتادیا تھا کہ مجھے بھوک نہیں ہے کیونکہ میں نے اسکول میں سموسے کھالیے تھے۔ میں ان کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا تھا لیکن پھر بھی بار بار ان کا خیال ذہن میں آرہا تھا۔ میں نے بہت عرصہ سے انہیں نہیں دیکھا تھا کیونکہ مجھے گلی میں جاکر کھیلنے کا وقت نہیں ملتا تھا، اسکول سے آکر کھانا کھاتا تو قاری صاحب آجاتے، تھوڑا سا آرام کرتا تو پھر بابا آجاتے اور میں ان کے ساتھ اسپورٹس کلب چلا جاتا۔ جسے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے میں نے جوائن کیا تھا، میں کچھ صحت مند تھا اور بابا کا خیال تھا کہ مجھے کوئی کھیل کھیلنا چاہیے، سو یہاں میں فٹ بال کھیلتا تھا۔ بابا کافی دیر بعد آئے تھے اور سیدھے میرے کمرے میں آئے تھے، وہ بے حد تھکے تھکے سے تھے اور ان کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

”سوری بیٹا! آج ہم کلب نہیں جاسکیں گے۔“

”کوئی بات نہیں بابا!“ میں نے آہستگی سے کہا اور پھر قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ آپ کی چچی تھیں نا بابا۔“

وہ چونکے...... ”ہاں۔“

”پھر دادی جان انہیں جادوگرنی کیوں کہتی ہیں؟“ وہ لمحہ بھر یوں ہی میری طرف دیکھتے رہے اور پھر میرے پاس ہی آکر بیٹھ گئے تھے۔ میرے پاس بہت سے سوال تھے۔

”کیا وہ اچھی نہیں تھیں، آپ کبھی ان کے گھر بھی نہیں جاتے تھے۔“ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر میری طرف دیکھا تھا۔

”تم ٹی وی ڈرامے دیکھتے ہونا قاسم! جن میں نندوں، بھابھیوں، دیورانیوں، جٹھانیوں میں لڑائیاں ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں اور جانے کیا کچھ، لڑائی جھگڑے میں تو کسی کو کچھ بھی کہہ دیتا ہے، جیسے وہ کل والے ڈرامے میں ایک خاتون دوسری خاتون کو چڑیل کہہ رہی تھیں تو بس تمہاری دادی جان کی چچی جان سے ہمیشہ لڑائی رہی تو بس وہ بھی غصے میں انہیں ”جادوگرنی“ کہہ دیتی تھیں۔ تم ٹھیک کہتے ہو وہ بہت اچھی تھیں لیکن ایسے ہی ایک جھگڑے میں اماں جان نے مجھ سے بہت بڑی قسم لی کہ میں کبھی چچی جان سے بات نہیں کروں گا، ان کے گھر نہیں جاؤں گا، ملوں گا نہیں تو بس میں مجبور تھا۔“

ان کے چہرے پر کرب بکھرا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ میں اب کبھی بابا سے اس کے متعلق بات نہیں کروں گا۔ اسرار ختم ہوگیا تھا اور اس روز کے بعد میں نے کبھی اوپر والوں کے متعلق نہیں سوچا تھا اور نہ ہی کبھی غور کیا تھا کہ اوپر کیا ہورہا ہے۔

☆......❁......☆

”سنیں...... سنیں پلیز......“

میرے کانوں میں آواز آئی تو میں چونکا، میں نے سیڑھیوں کے پاس کھڑے کھڑے اتنا سب کچھ سوچ ڈالا تھا۔ میں تیزی سے صحن میں آیا اور اوپر دیکھا۔ ریلنگ کے پاس مجھے نیلے رنگ کے دوپٹے کی ایک جھلک نظر آئی اور پھر کوئی تیزی سے لاؤنج کے کھلے دروازے سے اندر چلا گیا۔

”نیلم پری۔“ میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے میں سنجیدہ ہوگیا۔ اب کے رونے کی آواز بہت واضح تھی، اوپر یقیناً کوئی حادثہ ہوگیا تھا اور کوئی مجھ سے مدد کا طالب تھا اور انسانیت کے ناطے مجھے اس کی مدد کرنا چاہیے تھی۔ مجھ سے کون سا دادی نے کوئی قسم لی تھی اور پھر اب تو دادی کو اس دنیا سے رخصت ہوئے کئی سال ہوگئے تھے۔ میں تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھا اور چند منٹوں میں پچھلی گلی میں سیڑھیوں والے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ دروازہ بند تھا، میں نے بیل دی اور ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ اوپر سے ہی رسی کھینچ کر دروازہ کھولنے والا سسٹم تھا شاید، میں نے جھجکتے ہوئے سیڑھیوں پر قدم رکھا اور اوپر نظر دوڑائی۔ اوپر والا دروازہ نیم وا تھا اور اس نیم وا دروازے سے مجھے نیلے دوپٹے کی جھلک نظر آئی تھی اور ساتھ ہی کھٹاک سے میرے پیچھے دروازہ بند ہوا تھا۔ میں تیسری سیڑھی پر ٹھٹک کر رک گیا۔

”طوطیا من موتیا اس گلی نہ جاویں، اس گلی دے لوک نوں بھیڑیے ہندے پھائیاں پا۔“

میرے کانوں میں جیسے دادی کی آواز آئی تھی، کہانی تو مجھے یاد نہیں تھی لیکن کہانی کے یہ بول پتا نہیں کیسے خود بخود ہی میرے دل میں اتر آئے تھے۔ بچپن کے ڈر، خوف اور تخیلات شاید ہمارے اندر ہی کہیں چھپے رہ جاتے ہیں۔

اوپر والا دروازہ کھلا تھا اور میرے پیچھے دروازہ بند ہوچکا تھا، ایک لمحہ کو میرا جی چاہا کہ واپس پلٹ جاؤں تب ہی اوپر والے دروازے پر ایک رویا رویا چہرہ نیلے دوپٹے کے ہالے میں نمودار ہوا۔

”جلدی آئیں پلیز امی! کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے۔“ اور پھر فوراً ہی وہ چہرہ غائب ہوگیا اور میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی ایک کشادہ لاؤنج تھا، سامنے ہی صوفہ کم بیڈ پر کوئی لیٹا ہوا تھا اور پاس ہی نیچے کارپٹ کے گھٹنوں کے بل وہی نیلے دوپٹے والی لڑکی بیٹھی ہولے ہولے روتی آواز میں پکار رہی تھی۔

”امی...... امی پلیز آنکھیں کھولیں۔“

میں تیزی سے آگے بڑھا۔

”کیا ہوا ہے انہیں؟“

”پتا نہیں۔“ پانیوں میں ڈوبی گھور سیاہ آنکھیں لمحہ بھر کے لیے میری طرف اٹھیں۔

”میرے ساتھ بیٹھ کر باتیں کررہی تھیں کہ یک دم بے ہوش ہوگئیں، ہاتھ مڑ گئے تھے۔“

”اوہ......“ میں نے جھک کر ان کی نبض دیکھی جو بہت آہستہ چل رہی تھی۔ یک دم میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لیا تھا، اپنی ہی کیفیت پر حیران ہوتے میں نے پوچھا۔

”کب سے یہ حالت ہے؟“

”کچھ دیر ہوئی ہے، میں نے سمجھا تھا شاید ان کی شوگر لو ہوگئی ہے میں نے انہیں چینی دی لیکن......“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر رونے لگی تھی۔ میں نے بے ہوش پڑی خاتون کی طرف دیکھا، وہ بے انتہا خوب صورت تھیں حالانکہ وہ ماما کی عمر کی ہی تھیں لیکن پھر بھی ان کے چہرے کے جمال پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ میں نے گلی میں آتے جاتے انہیں نہیں دیکھا تھا شاید وہ پردہ کرتی تھیں۔

”امی...... امی......“ لڑکی ان کا بازو پکڑ کر ہلا رہی تھی۔ ”دیکھیں کون آیا ہے؟“

”میرا خیال ہے میں ایمبولینس منگواتا ہوں انہیں ہسپتال لے چلتے ہیں۔“ لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا تو میں پاکٹ سے فون نکال کر نمبر ملانے ہی لگا

تھا کہ خاتون نے آنکھیں کھول دیں۔

"امی...... امی یہ دیکھیں کون ہے آیا...... قاسم ہے امی......" میں حیران ہوا کہ وہ میرا نام جانتی تھی لیکن یہ کوئی ایسی بات حیرانی کی بات بھی نہیں تھی۔ ماما اور دادی نے کئی بار مجھے بلند آواز میں پکارا ہوگا تو...... میں نے سر جھٹک کر خاتون کی طرف دیکھا، لڑکی انہیں سہارا دے کر اٹھا رہی تھی۔

"اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں، اگر آپ کہیں تو میں آپ کو ڈاکٹر کی طرف لے چلتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں، ان کی نظریں میرے چہرے پر تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے پھر وہ یک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے میری پیشانی چوم لی۔ میں حیران سا کھڑا تھا، وہ یقیناً جوہی آنٹی تھیں بابا کی کزن لیکن میں بھلا...... وہ مجھے کب جانتی تھیں۔ میں تو پہلی بار انہیں دیکھ رہا تھا اور ان کا یہ التفات...... وہ یک دم لڑکھڑائیں تو میں نے بے اختیار انہیں سہارا دیا وہ ہولے ہولے لرز رہی تھیں، میں نے انہیں بٹھاتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا۔

"آپ کو صرف رونا ہی آتا ہے کیا، جلدی سے گرم دودھ لے کر آئیں، ان کا بی پی بھی لو ہے شاید۔" لڑکی نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر تیزی سے کچن کی طرف بھاگ گئی۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا!" وہ بہت محبت اور شفقت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"کیا کبھی پہلے بھی آپ کی ایسی حالت ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک دو بار بس اچانک ہی شوگر لیول لو ہو گیا تھا لیکن پھر فوراً ہی میری حالت بہتر ہو گئی تھی۔ آج بس شاید کچھ...... سوری بیٹا! یہ جو ماہا ہے نا بہت چھوٹے دل کی ہے، آپ کو خواہ مخواہ تکلیف دی، میں خود ہی کچھ دیر میں ٹھیک ہو جاتی۔"

"تکلیف کیسی آنٹی! میں نے کیا پہاڑ توڑا ہے۔" مجھے ان کا یہ اجنبی ما انداز بتا نہیں کیوں اچھا نہیں لگا تھا۔

ماہا گرم دودھ کا کپ اٹھائے آئی اور میری طرف معذرت طلب نظروں سے دیکھا اور پھر جوہی آنٹی کے پاس بیٹھتے ہوئے جیسے مجھ سے اور جوہی آنٹی دونوں سے وضاحت کی۔

"میں انہیں تکلیف ہرگز نہ دیتی امی لیکن سامنے ملک صاحب کی فیملی گھر پر نہیں تھی اور بیگ صاحب کے گھر اس وقت کوئی مرد نہیں ہوتا......"

"خیر میں نے کوئی ایسا کارنامہ سر انجام نہیں دیا جس کے لیے آپ اتنی معذرتیں کر رہی ہیں۔" میں پتا نہیں کیوں تلخ ہوا تھا، جوہی آنٹی بے اختیار ہنس پڑی تھیں۔

"آپ بالکل اپنے بابا جیسے ہو، ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جانے والے۔"

"نہیں تو......" میں جھینپ گیا لیکن میں ان کی بات پر حیران نہیں ہوا تھا آخر وہ بابا کی کزن تھیں۔ ایک گھر میں رہتے تھے وہ تو ان کے مزاج کو جانتی ہی ہوں گی، آخر ہمیشہ سے تو لڑائی نہیں رہی ہو گی نا۔ میں جانے کے لیے اٹھا۔

"اب آپ آ ہی گئے ہیں تو بیٹھ جائیں پلیز میں آپ کو چائے پلاتی ہوں اور......" ماہا کی آنکھوں میں شریر سی چمک تھی اور ہونٹوں پر مدھم مسکراہٹ تھی۔

"بیٹھ جائیں بیٹا! ماہا چائے بنا کر لاتی ہے۔"

اور میں جیسے خود ہی اندر سے وہاں مزید بیٹھنا چاہتا تھا کہ بنا کچھ کہے بیٹھ گیا۔ ماہا کے جانے کے بعد وہ مجھ سے میرے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتی رہیں اور ان کی نگاہیں میری بلائیں لیتی تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ماہا بھی اسی یونیورسٹی سے بی اے آنرز کر رہی ہے جس میں میں پڑھتا ہوں۔ میں کیمسٹری میں ماسٹرز کر رہا تھا اور وہ ابھی بی اے آنرز سائیکالوجی کے فرسٹ ائر میں تھی، شاید اسی لیے میں نے اسے کبھی یونیورسٹی میں نہیں دیکھا تھا۔

ماہا نے بہت پُرتکلف چائے پلائی تھی اور جوہی آنٹی نے بہت اصرار سے مجھے ہر چیز کھلائی تھی۔ ہر

[illegible] سے خوب اچھی طرح انصاف کرنے کے بعد اب میں اٹھا تو مجھے یہاں آئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔

"تھینک یو ماہا!"

"وہ کیوں؟" اس نے نظریں اٹھائیں۔

"اس سب کے لیے جو آپ نے کھلایا پلایا۔"

"شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے کہ آپ میری پکار پر چلے آئے بھلے کچھ دیر سے ہی سہی۔" اور میں شرمندہ سا ہو گیا۔

"وہ دراصل......"

"کوئی بات نہیں فیصلہ کرنے میں دیر تو لگتی ہے لیکن آپ آ تو گئے۔" جوہی آنٹی نے ماہا کو گھورا۔

"سوری امی!" اس نے فوراً معذرت کی اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی، اس کی مسکراہٹ نے جیسے اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔ مجھے لگا جیسے اس کی مسکراہٹ جادو کرتی ہے، سحر طاری کرتی ہے۔ میں نے فوراً ہی اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور جوہی آنٹی کی طرف دیکھا۔

"میں کل کسی اسپیشلسٹ سے ٹائم لے لیتا ہوں تو آپ کو لے چلوں گا۔ بہتر ہے کہ آپ ایک بار اپنے سارے ٹیسٹ کروالیں، کیا خبر شوگر وغیرہ ہو۔"

"نہیں شکریہ! امی کے سارے ٹیسٹ ہو چکے ہیں۔ شوگر وغیرہ نہیں ہے انہیں، جب بہت سوچتی ہیں تو اپنی طبیعت خراب کر لیتی ہیں۔" ان کے بولنے سے پہلے ہی ماہا نے جواب دیا تھا۔

"اور پھر ڈاکٹر مرتضیٰ ہیں ناں، ان کے پاس ہی جاتے ہیں ہم ہمیشہ۔"

مجھے یوں اس کا بولنا اچھا نہیں لگا تھا، شاید میں کسی بہانے سے پھر آنا چاہتا تھا۔

"او کے، اللہ حافظ۔" میں نے کہا تو وہ ایک دم کھڑی ہو گئیں اور میرا کندھا تھپکتے ہوئے ایک بار پھر پہلے کے سے انداز میں انہوں نے میری پیشانی چوم لی تھی۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی اور وہ حسرت سے مجھے دیکھتی تھیں یا مجھے ایسا لگا تھا۔ بابا کی یہ کزن مجھے بہت اچھی لگی تھیں اور ان کی بیٹی...... ہونہہ...... ایک دم فضول...... کاش دادی اور بابا کی چچی جان میں لڑائی نہ ہوئی ہوتی اور میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا، ماہا سیڑھیوں کے دروازے تک میرے ساتھ آئی تھی۔

"آپ کا بہت شکریہ، آپ میری مدد کو آئے، رئیلی میں بہت گھبرا گئی تھی مجھے لگا تھا جیسے امی......"

اس کی آواز بھرا گئی تھی، وہ چند لمحے پہلے والی شرارت اب اس کی آنکھوں سے نہ جھانکتی تھی اور وہ بے حد سنجیدہ لگ رہی تھی، میری رائے اس کے متعلق بدلی۔

"کوئی بات نہیں مس ماہا! پھر بھی ضرورت پڑے تو آپ بلا تکلف بلا سکتی ہیں۔" میں اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتا سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ میں جو اس وقت جواد سے ملنے کے لیے گھر سے نکلنے لگا تھا، اب اس سے ملنے کا ارادہ ترک کر کے گھر واپس آ گیا تھا۔ جواد نے دراصل قائداعظم یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا اور میں نے یہاں پنجاب یونیورسٹی میں سو جواد جب کسی ویک اینڈ پر گھر آتا تو ہم کچھ وقت اکٹھے ساتھ گزارتے تھے۔



میں اپنے کمرے میں داخل ہی ہوا تھا کہ ماما نے جو کچن سے باہر آ رہی تھیں مجھے بتایا کہ "جواد آیا تھا مجھ سے ملنے، میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم اس سے ملنے گئے ہو۔"

"گیا تو اس سے ہی ملنے تھا لیکن راستے میں یونیورسٹی کا ایک دوست مل گیا جو اپنے ساتھ لے گیا اور پھر لنچ کیے بغیر اس نے مجھے آنے ہی نہیں دیا۔" میں نے دانستہ ماما کو اصل بات نہیں بتائی تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں لنچ نہیں کرنا۔" ماما اب کمرے میں آ گئی تھیں۔

"میں یوں ہی صبح سے کچن میں گھسی ہوئی تھی ایک سنڈے ہوتا ہے جب ہم تینوں لنچ پر اکٹھے ہوتے ہیں اور اُدھر تمہارے بابا کسی دوست سے ملنے چلے گئے اور کہہ گئے ہیں لنچ پر ان کا انتظار نہ کیا جائے اور اب تم......" وہ روہانسی ہو گئیں تو میں نے بے اختیار اپنے بازو ان کے گرد حمائل کیے۔

”اوہ مائی سویٹ ماما! وعدہ، اب ہر سنڈے لنچ آپ کے ساتھ...... اور آپ نے جو کچھ بنایا ہے اس کی ساتھ ڈنر پر انصاف کیا جائے گا، بے فکر رہیں۔“ میں ذرا سا شوخ ہوا تو ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”جواد سے مل آتے۔“

”شام کو جاؤں گا، اس وقت کچھ آرام کا موڈ ہے۔“

”لیکن شام کو ضرور جانا وہ بہت یاد کر رہا تھا تمہیں۔“ انہوں نے جاتے جاتے مجھے تاکید کی تھی۔

جب میں نے آرام کی غرض سے بیڈ پر لیٹتے ہوئے آنکھیں بند کیں تو بند آنکھوں کے سامنے جوہی آنٹی اور پھر ماہا کا چہرہ آ گیا اور میں ان دونوں کے متعلق سوچتا ہوا سو گیا۔ شام کو جواد کی طرف گیا تو بے اختیار ہی پوچھ بیٹھا۔

”کیا جوہی آنٹی اب بھی تمہارے گھر آتی ہیں؟“

”ہاں، امی سے ملنے آتی رہتی ہیں اور امی بھی جاتی رہتی ہیں اُدھر، لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”بس یوں ہی، بی جی سے ملتی جلتی ایک خاتون تمہاری طرف آتے ہوئے گلی میں نظر آئیں تو مجھے خیال آ گیا کہ بی جی کے بعد جوہی آنٹی تو اکیلی ہوں گی۔“

”نہیں اکیلی تو نہیں، ماہا ہے ان کے پاس۔“

میں کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا لیکن جواد کا فون آ گیا تھا، وہ بات کرنے لگا اور پھر اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی۔

☆......❁......☆

اگلے دن یونیورسٹی میں غیر ارادی طور پر میں بی اے آنرز کے سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ کی طرف چلا گیا لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مل گئی تو جوہی آنٹی کی طبیعت کا پوچھ لوں گا۔ جب میں واپس اپنی ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا رہا تھا تو مجھے سبین نظر آ گئی۔ سبین جواد کی کزن تھی اور اکثر جواد کے گھر میں ملاقات ہوتے رہنے کی وجہ سے بے تکلفی تھی، وہ بھی سائیکالوجی میں آنرز کر رہی تھی۔

”ارے قاسم بھائی آپ آج یہاں کہاں؟“ مجھے دیکھ کر اس نے بے اختیار پوچھا۔

”بس ایسے ہی اور یہ تم آج اکیلی کیسے نظر آ رہی ہو، وہ تمہاری ہم راز نقاب پوش حسینہ کہاں ہے۔“ میرے نقاب پوش حسینہ کہنے پر وہ بے اختیار ہنس دی۔

”ماہا آج نہیں آئی۔“

”تو ماہا......“ میں چونکا۔ یعنی وہ نقاب پوش حسینہ جو سبین کے ساتھ ہمیشہ نظر آتی تھی ماہا تھی، لیکن ضروری تو نہیں یہ جوہی آنٹی کی بیٹی ہو، وہ کوئی اور بھی تو ہو سکتی ہے۔

”ہاں میری دوست کا نام ماہا ہی ہے، وہ پردہ کرتی ہے۔ آپ تو جانتے ہوں گے اسے جوہی آنٹی کی بیٹی ماہا۔“

میں نے سر ہلایا اور واپس اپنے ڈیپارٹمنٹ میں آ گیا، لیکن میرا ذہن بار بار جوہی آنٹی کی طرف چلا جاتا تھا۔ ماہا نہیں آئی یونیورسٹی کیا خبر جوہی آنٹی کی طبیعت زیادہ خراب ہو۔ مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں ان کے لیے کیوں فکر مند ہو رہا ہوں، ابھی کل میں پہلی بار ان سے ملا تھا اور آج میں یوں پریشان ہو رہا تھا جیسے برسوں کی آشنائی ہو۔ سو یونیورسٹی سے واپس آ کر گھر جانے کے بجائے کسی انجانی کشش سے کھنچتا ہوا ان کے دروازے پر پہنچ گیا۔ چونکہ اس وقت جب میرا ہاتھ بیل پر تھا اور اوپر سے کسی نے کھڑکی میں سے جھانک کر مجھے دیکھا تھا اور پھر کھٹک سے رسّی کھینچ کر دروازہ کھول دیا تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے دادی کی بات یاد آئی کہ دونوں ماں بیٹی جادوگرنیاں ہیں تو میری ہنسی نکل گئی۔

ماں بیٹی ہی نہیں نواسی بھی جادوگرنی تھی، دادی کو شاید اس کے متعلق علم نہ تھا ورنہ وہ اس کے متعلق بھی فرمان جاری کر دیتیں۔ جیسے ہی میں نے لاؤنج میں قدم رکھا جوہی آنٹی جو صوفے پر بیٹھی مٹر چھیل رہی تھیں یک دم کھڑی ہو گئی تھیں۔ ان کا چہرہ چمک اٹھا تھا اور آنکھیں محبتیں لٹاتی تھیں۔ بے اختیار آگے بڑھ کر انہوں نے پہلے دن کی طرح میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر میری پیشانی چومی تھی۔ میں نے محسوس کیا وہ خوش بھی تھیں، حیران بھی۔

”میں...... وہ...... آپ کی طبیعت کا پتا کرنے آیا تھا۔“ میں نے اپنے آنے کا جواز پیش کیا حالانکہ مجھے خود بھی نہیں پتا تھا کہ میں کیوں آیا ہوں، بس کھنچتا چلا آیا تھا۔

”ویسے آپ کو نہیں آنا چاہیے تھا۔“

ماہا نے جو ایک طرف گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی بے حد سنجیدگی سے کہا تو میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کل مجھے کسی کی مدد کی ضرورت تھی، اتفاق سے وہ ”کسی“ آپ ہی نظر آئے لیکن آج ہمیں کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ کل اگر اس وقت میرے پاس کوئی اور آپشن ہوتا تو میں کبھی بھی آپ کو زحمت نہ دیتی۔ اتفاق سے امی کے موبائل میں بیلنس بھی نہیں تھا ورنہ میں بلال بھائی یا انکل کو فون کر کے بلا لیتی (اس نے جواد کے بڑے بھائی اور ابو کے متعلق کہا تھا) اور امی کو اس حالت میں اکیلا چھوڑ کر مجھے جانے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ آپ کی والدہ محترمہ کو آپ کے یہاں آنے کا علم ہوا تو وہ آپ کو تو خیر کچھ نہیں کہیں گی لیکن امی کا جینا حرام کر دیں گی۔“

مجھے اس کی یہ وضاحت اور تبصرہ بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

”میری والدہ ایسی بھی ظالم نہیں ہیں کہ لوگوں کا جینا حرام کرتی پھریں۔“ میں سنجیدہ ہو گیا کچھ دیر پہلے کی خوشی مفقود ہو گئی تھی اور دل پر جیسے کوئی بوجھ آ گرا تھا۔

”اچھا......“ اس کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”ماہا......“ جوہی آنٹی نے اسے تنبیہہ نظروں سے دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

”بیٹھ جاؤ بیٹا!“

”میرے خیال میں ماہا کو میرا یہاں آنا برا لگا ہے، اس لیے چلتا ہوں۔“ میں ہنوز سنجیدہ تھا اور درد کی کوئی لہر سی میرے دل میں اٹھتی تھی جیسے مجھے کسی بہت قریبی رشتے سے دور رہنے کی سزا دی جا رہی ہو۔

”ارے نہیں بیٹا! بیٹھو یہ تو پاگل ہے۔“ انہوں نے پھر ماہا کو گھورا۔

”ٹھیک ہے پھر مجھ سے گلہ مت کیجیے گا، کل آپ خود ہی ڈانٹ رہی تھیں مجھے کہ میں نے کیوں بلایا مسٹر قاسم کو۔“ اس نے منہ پھلا لیا تھا جوہی آنٹی لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔

”اچھا جاؤ، دیکھو جا کر چاولوں کو دم آ گیا ہو گا۔“ کچھ دیر بعد انہوں نے ماہا سے کہا اور پھر میری طرف دیکھا۔

”بیٹھ جاؤ بیٹا دراصل......“

”میں جانتا ہوں آنٹی!“ میں نے بیٹھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے یک دم جلاوطنی کی سزا سنا کر حکم واپس لے لیا گیا ہو۔

”کیا جانتے ہو آپ؟“ جوہی آنٹی جیسے گھبرا سی گئی تھیں۔

”بابا نے ایک بار بچپن میں مجھے بتایا تھا کہ، میری دادی جان کی بی جی سے سخت لڑائی ہو گئی تھی اور انہوں نے بابا سے قسم لی تھی کہ وہ آپ سے اور بی جان سے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔“ میں نے ایک جتاتی ہوئی سی نظر ماہا پر ڈالی جو ابھی تک وہاں ہی کھڑی تھی۔

”بی جی اور دادی جان اب اس دنیا میں نہیں ہیں، جو بھی لڑائی جھگڑا تھا ان کے درمیان تھا۔ میرے خیال میں تو یہ جھگڑا اب ختم ہونا چاہیے، جوہی آنٹی اور بابا کا بہت قریبی رشتہ ہے۔“

”چھوڑیے قاسم صاحب! کیا اور کتنا قریبی رشتہ ہے آپ کچھ نہیں جانتے لہٰذا یہاں آنے کے متعلق گھر میں بتانے کی غلطی ہر گز نہ کیجیے گا۔“ اس کے لبوں پر پھر وہی طنزیہ سی مسکراہٹ آ ٹکی تھی۔

”جو میں نہیں جانتا وہ آپ بتادیں لیکن میں آج بابا سے بات کروں گا کہ یہ ناراضیاں ......“

”نہیں بیٹا نہیں ...... ہر گز نہیں ......“ جوہی آنٹی گھبرا گئی تھیں اور ان کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔

”میں مزید کسی غم کی متحمل نہیں ہو سکتی۔“

ان کی آنکھوں میں ایسی التجا تھی کہ میں چاہت کے باوجود کبھی بابا سے ان کا ذکر نہ کر سکا لیکن میں خود کو بھی وہاں جانے سے روک نہ پایا تھا۔ ہفتے میں کم از کم دو تین بار تو میں ضرور جاتا تھا۔ جوہی آنٹی بھی جیسے اب میری منتظر رہتی تھیں، ماہا نے بھی میرے وہاں جانے کو قبول کر لیا تھا اور ہمارے درمیان اچھی دوستی ہو گئی تھی، ایسی دوستی جس میں بے تکلفی بھی تھی اور ایک دوسرے کا احترام بھی۔ یونیورسٹی میں بھی تقریباً روز ہی اس سے ہلکی پھلکی بات ہو جاتی تھی۔ جب کبھی جوہی آنٹی کو کچھ خاص پکانا ہوتا تو ماہا مجھے ان کا پیغام دیتی اور میں یونیورسٹی سے ہی اُدھر چلا جاتا تھا اور پھر ان کے ساتھ لنچ کر کے اور بہت سا خوب صورت وقت بتا کر جب میں گھر آتا تو ماما کو میرے دیر سے آنے پر کوئی خاص تشویش نہیں ہوتی تھی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ یونیورسٹی میں دیر ہو گئی ہو گی اور دیر ہونے کا مطلب تھا کہ میں اب ڈنر ہی کروں گا، سو مجھے کبھی ماما کو دیر سے آنے کی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

عام طور پر میں شام کو بابا کے آفس سے آ جانے کے بعد ہی اُدھر جاتا تھا۔ جوہی آنٹی ہمیشہ مجھے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور میں بھی ایک نامعلوم سی کشش محسوس کرتا تھا، ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے مجھے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ ایک بار یوں ہی باتوں باتوں میں ماہا نے بتایا تھا کہ جوہی آنٹی کالج میں کیمسٹری کی پروفیسر تھیں اور چند ماہ پہلے ہی ریٹائر ہوئی ہیں اور میرا بھی سبجیکٹ کیمسٹری تھا حالانکہ بابا چاہتے تھے کہ میں ایم بی اے کروں لیکن میں کیمسٹری میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔ میری خواہش تعلیم کے بعد اٹیمک انرجی میں جانے کی تھی، سو جوہی آنٹی سے اکثر اپنے سبجیکٹ کے متعلق بھی ڈسکشن ہو جاتی تھی۔ ایسے میں ماہا برے برے منہ بناتی رہتی تھی۔

”جوہی آنٹی! آپ کی یہ بیٹی مجھ سے جلتی ہے۔“ مجھے پتا نہیں کیوں اسے چڑانے میں مزا آتا تھا۔

”ارے نہیں، میری بیٹی ایسی نہیں ہے۔ وہ بھلا کیوں جلے گی؟“ جوہی آنٹی محبت سے اسے ساتھ لگا لیتیں۔

”اس لیے کہ اس کی محبت کا کچھ حصہ اب مجھے بھی ملنے لگا ہے۔“

”انہیں تو ہمیشہ سے عادت ہے، میری محبتوں میں کسی کو حصہ دار بنانے کی سو ہم پروا نہیں کرتے۔“ اس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جوہی آنٹی کی طرف دیکھا جو لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ سجائے اسے دیکھ رہی تھیں۔

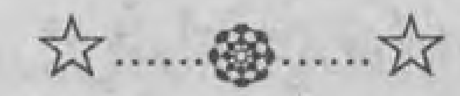
”تھینک یو ملکہ عالیہ اس سخاوت کے لیے، خادم کیا نذرانہ پیش کر سکتا ہے؟“

”ہم عوام سے نذرانہ نہیں لیتے۔“ اس نے سچ میں کسی ملکہ کی شان سے کہا تو ہم تینوں ہی ہنس دیے۔ میری خاموش اور بے رنگ زندگی میں جیسے یک دم سے رنگوں کی برسات اتر آئی تھی۔

کئی بار میرا جی چاہا میں بابا کو اپنی اس خوشی کے متعلق بتاؤں جو میرے دل میں کسی انار (آتش بازی والا) کی طرح پھوٹتی تھی اور پھر چاروں اور روشنیاں اور رنگ بکھر جاتے تھے لیکن پھر جوہی آنٹی کی آنکھوں کی التجا یاد آتی تو میں دل مسوس کر کے رہ جاتا اور ہر روز سوچتا کیا تھا اگر دادی اور بی جی کی لڑائی نہ ہوئی ہوتی اور اگر لڑائی ہوئی بھی تھی تو بابا نے ایسی فضول قسم نہ کھائی ہوتی اور ہر روز ان کے گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے دادی کی بات یاد آتی تو مجھے ہنسی آ جاتی۔

جادوگرنیوں نے مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا اور میں اس سحر سے رہائی کی کوئی خواہش بھی نہیں رکھتا تھا۔ میں جوہی آنٹی اور ماہا سے مل کر کیوں خوش ہوتا تھا، میں نے اس کیوں کو کبھی کھوجنے کی کوشش نہیں کی تھی، شاید میں رشتوں کو ترسا ہوا تھا۔ نانی اور ایک خالہ کے علاوہ اور کوئی میرا قریبی رشتہ نہ تھا۔

نانی اب بیڈ پر تھیں اور انہوں نے یہاں آنا چھوڑ دیا تھا اور ہم خود کبھی وہاں گئے نہیں تھے، خالہ نانی کے گھر میں رہتی تھیں۔ بابا خالہ سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے، ماما اکیلی ہی نانی اور خالہ سے ایک دو ماہ بعد ملنے چلی جاتی تھیں۔ خالہ کے دو بیٹے تھے لیکن میرا ان سے کبھی رابطہ نہیں رہا تھا تو شاید اس لیے ہاں شاید اسی لیے مجھے جوہی آنٹی اور ماہا سے ملنا اچھا لگتا تھا۔ میرے اندر کہیں کچھ اور بھی جذبہ تھا تو میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ میں ایک انوکھی، انجانی سی اپنائیت محسوس کرتا تھا ان کے لیے۔



ایک روز یونیورسٹی سے نکلا تو میں نے ماہا کو پوائنٹ کے انتظار میں کھڑے دیکھا تو اسی اپنائیت کے رشتے نے مجھے بائیک اس کے پاس روکنے کے لیے مجبور کر دیا۔

”آج پوائنٹ نکل گیا کیا؟“

”ہاں۔“ ماہا نے میری طرف دیکھا۔

”تو چلو میرے ساتھ۔“ لیکن اس نے فوراً انکار کر دیا۔

”کیا میں تمہیں کھا جاؤں گا؟“ مجھے اس کے انکار پر غصہ آ گیا۔

”نہیں، آپ تو نہیں لیکن آپ کی ماما مجھے ضرور قتل کر دیں گی۔“ وہ ہولے سے ہنسی تھی۔

”میری ماما کے متعلق تمہارے خیالات خاصے فضول ہیں ...... ورنہ میری ماما بہت سویٹ ہیں۔“

”اس میں تو کوئی شک نہیں، آپ کی ماما بہت سویٹ ہیں۔“ وہ شاید مسکرائی تھی، نقاب سے جھانکتی اس کی آنکھوں سے شرارت جھلکتی تھی شاید وہ طنزیہ کہہ رہی تھی۔

”ہاں ہیں نا، کہو تو کسی روز ملوانے لے چلوں؟“ میں نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس کا طنز نہ سمجھ سکا تھا۔

”بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔“ اس کی ہلکی سی ہنسی کی آواز جیسے دیر تک میرے اندر جلترنگ بجاتی رہی۔ میں کھو سا گیا تھا، پہلی بار مجھے اس کی ہنسی کی خوب صورتی کا ادراک ہوا تھا۔ ایک رکشا شور مچاتا ہوا پاس سے گزرا تو میں چونکا۔

”کبھی انہیں دیکھو تو آ کر۔“

”بہت دیکھا ہے۔“ اس کے لہجے میں ایک خوش گواریت سی تھی۔

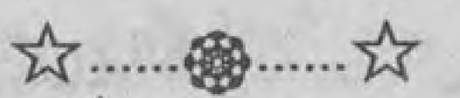
”میرا مطلب ہے کبھی روبرو آ کر دیکھو، ریلنگ کے پیچھے سے چھپ چھپ کر نہیں۔“

”جی نہیں، میں نے کبھی انہیں ریلنگ کے پیچھے سے چھپ چھپ کر نہیں دیکھا۔“

”اچھا تو پھر کسے دیکھتی تھیں، مجھے ...... ہاں بھئی ہم تو ہیں ہی ایسے کہ لوگ ہمیں چھپ چھپ کر دیکھیں۔“ میں شوخ ہوا تھا۔

”بڑی خوش فہمیاں ہیں جناب کو۔“ وہ کبھی لاجواب نہیں ہوتی تھی۔

”ایسی ویسی خوش فہمیاں۔“ میں پتا نہیں کیوں اس کے سامنے شوخ ہو جاتا تھا ورنہ میں بہت سنجیدہ اور ریزرو سا بندہ تھا لیکن ان دنوں میرے اندر یقیناً کچھ تبدیلی ہوئی تھی۔ میرا ہر وقت گنگنانے اور خوش ہونے کو جی چاہتا تھا۔



جواد نے میری اس تبدیلی کو سب سے پہلے نوٹ کیا تھا، ایک ویک اینڈ پر اس نے اچانک ہی باتیں کرتے کرتے میری طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے، بدلے بدلے میرے سرکار نظر آتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں حیران ہوا تھا۔

”دال میں کچھ کچھ کالا لگتا ہے میری جان!“ وہ بدستور گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”نہ کالا نہ چٹا۔“ میں ہنس دیا تھا۔

”تمہاری نظر کا قصور ہے۔“ اب پتا نہیں یہ اس

کی نظر کا قصور تھا یا سچ مچ ہی میرے اندر کہیں کچھ تھا، کچھ مختلف جذبہ کوئی انوکھا احساس۔

''تم تسلیم کرو یا نہ کرو لیکن تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔''

وہ اگر میرے ساتھ ہوتا تو یقیناً بہت پہلے جان لیتا لیکن وہ مہینے میں ایک بار اسلام آباد سے لاہور آتا تھا اور مختصر سی ملاقات ہوتی تھی ورنہ وہ یقیناً اسے کھوج لیتا جس کا خود مجھے بھی ادراک نہیں تھا۔

اس روز میں پوائنٹ آنے تک وہاں ہی کھڑا رہا کیونکہ ماہا وہاں اکیلی لڑکی تھی، دو چار اسٹوڈنٹ ادھر اُدھر کھڑے گپیں لگا رہے تھے۔ پہلے بھی کئی بار وہ یہاں اسٹاپ پر اکیلی کھڑی رہی ہوگی لیکن اس وقت وہ مجھے اپنی ذمہ داری محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ وہی اپنائیت کا تعلق تھا جو میں جوہی آنٹی اور اس کے لیے محسوس کرتا تھا۔

دوسرے دن اس نے یونیورسٹی میں میرا شکریہ ادا کیا، اس وقت وہ لائبریری میں تھی اور میں بھی ایک کتاب ایشو کروانے گیا تھا۔

''کس بات کا؟'' میں نے بے دھیانی سے پوچھا۔

''اب انجان مت بنیں۔''

''اس میں شکریہ والی تو کوئی بات نہیں تھی۔'' میں سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''شاید تمہیں برا لگا۔''

''نہیں، اچھا لگا تھا۔'' وہ آہستگی سے کہہ کر لائبریری سے چلی گئی تھی اور مجھے لگا تھا جیسے میں ایک دم معتبر ہو گیا ہوں۔ میرے خلوص اور میرے تعلق کو تسلیم کر لیا گیا ہو، ایک انوکھی سی خوشی اور طمانیت نے میرے پورے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا تھا پھر اگلے چند مہینوں میں میرے اور ماہا کے درمیان یہ تعلق گہرا اور مضبوط ہوتا چلا گیا تاہم ابھی تک میں نے اس تعلق کو کوئی نام نہیں دیا تھا اور نہ ہی کبھی اس کے متعلق میں نے کچھ سوچا تھا بس یہ بے نام سا تعلق مجھے انوکھی خوشی دیتا تھا۔ ایسی خوشی جو اس سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

اس خوشی کے رنگ بڑے نرالے تھے اور اس کی چھب بے حد دلکش تھی لیکن پھر بھی میں ابھی تک اس تعلق کو کوئی نام نہیں دے سکا تھا حالانکہ میں اگر ایک روز بھی ماہا سے نہ ملتا تو مجھے لگتا تھا جیسے میرا کچھ کھو گیا ہے۔ میری زندگی میں کہیں کوئی کمی سی ہو گئی ہے۔

جوہی آنٹی اور ماہا ایک ہفتے کے لیے ملتان اپنے کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے گئی ہوئی تھیں اور مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا نہ یونیورسٹی میں نہ گھر...... کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ ہر طرف ویرانی کا سا احساس ہوتا تھا، اس وقت بھی یونیورسٹی سے آ کر میں اپنے کمرے میں بے زار سا لیٹا تھا کہ ماہا کا میسج ملا کہ وہ لوگ واپس آ گئے ہیں اور میری بے زاری یک دم ختم ہو گئی تھی اور میں فوراً ہی تیار ہو کر ان کے گھر جانے کے لیے باہر نکلا حالانکہ کچھ دیر پہلے جب ماما مجھے چائے کے لیے بلانے آئی تھیں تو میں نے یہ کہہ کر منع کر دیا تھا کہ مجھے نیند آ رہی ہے اور یہ کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اب ساری تھکن اور نیند غائب ہو گئی تھی، ماما اور بابا لاؤنج میں چائے پیتے ہوئے بہت خوش گوار موڈ میں باتیں کر رہے تھے۔

''کہاں کی تیاری ہے صاحب زادے؟'' بابا کا لہجہ بے حد خوش گوار تھا اور لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

''بس...... وہ ذرا ایک دوست کی طرف جا رہا تھا۔'' میں جواب دیتے ہوئے ذرا سا اٹکا تھا، کئی بار میں نے سوچا تھا کہ میں ماما کو تو نہیں لیکن بابا کو بتا دوں میں کہ میں جوہی آنٹی کے گھر جاتا ہوں۔ اتنا تو مجھے یقین تھا کہ بابا ماما کی طرح انہیں برا نہیں سمجھتے تھے لیکن میں انہیں بتا نہیں سکا تھا شاید میرے اندر کہیں یہ خوف تھا کہ اگر بابا نے مجھے ان سے ملنے سے منع کر دیا تو...... اور اس تو کے بعد میرا دل جیسے ڈوبنے سا لگتا تھا۔ چھ سات ماہ میں ہی کیسا گہرا تعلق بن گیا تھا ان سے۔

''کوئی خاص دوست ہے کیا؟'' بابا کے لبوں کی

مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ اب کے ماما نے بھی چونک کر مجھے دیکھا تھا، میں جھینپ سا گیا۔

''ہے ایک یونیورسٹی فیلو۔''

بابا مسکراتے ہوئے گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے اس وقت بابا مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ وہ بے حد سنجیدہ سے تھے، اس طرح کے موڈ میں بہت کم میں نے انہیں دیکھا تھا، اگر مجھے جوہی آنٹی سے ملنے کی بے چینی نہ ہوتی تو میں یقیناً وہاں بیٹھ کر ان کے اس موڈ کو انجوائے کرتا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی سخت مزاج اور غصیلے تھے بس سنجیدگی ان کے مزاج کا حصہ تھی ورنہ وہ بہت دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے۔

ان کے لہجے میں بلا کی نرماہٹ تھی، میں نے انہیں کبھی اونچا بولتے یا ماما سے لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا، اسی طرح ماما بھی کم گو سی تھی۔

''وش یو گڈ لک ڈیئر!'' بابا کے لہجے سے اب بھی شرارت جھلکتی تھی، میں ایک بار پھر جھینپ گیا تھا۔

''چند ماہ ہی رہ گئے ہیں اس کے فائنل ایگزام ہیں، میں سوچ رہا ہوں اس کی شادی کر دیں۔ گھر کی خاموشی اب اچھی نہیں لگتی۔'' وہ بات تو ماما سے کر رہے تھے لیکن ان نظریں میرے چہرے پر کچھ کھوجتی تھیں۔

''تعلیم تو مکمل کر لے پہلے، ہمارے شہزادے کے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی ہے کیا؟'' اب ماما بھی مسکرا رہی تھیں۔

''ہاں ہاں، لیکن کہیں رشتہ ڈالنے سے پہلے اپنے شہزادے سے پوچھ لینا کیا خبر انہوں نے کسی کو پہلے ہی پسند کر لیا ہو۔''

اور میرا اٹھتا قدم رکا تھا، یہ بابا آج کیسی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے تو کبھی کسی لڑکی کے متعلق اس طرح نہیں سوچا تھا۔ اپنی کلاس فیلوز سے بھی بس واجبی سی ہی سلام دعا تھی۔ بھلا بابا کو میری کس بات سے گمان گزرا تھا کہ میں کسی کو پسند کر چکا ہوں بلکہ میرا تو ابھی شادی کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ ابھی مجھے ایم فل کرنا تھا اور پھر ہائر ایجوکیشن کے لیے باہر جانا تھا۔ یہ میرا اور جواد کا بہت پہلے سے ارادہ تھا جب جواد کا بھائی بلال ہالینڈ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر آیا تھا۔

''واہ! ایسے ہی پسند کر چکا ہوگا، اپنے بیٹے کے لیے تو میں خود لڑکی پسند کروں گی، لاکھوں میں ایک ہوگی میری بہو!'' ماما نے ہر ماں کی طرح فوراً اپنا حق جتایا تھا۔

''جی نہیں، میں نے کوئی لڑکی پسند نہیں کی اور نہ ہی میرا جلدی شادی کرنے کا ارادہ ہے۔ مجھے ابھی ہائر ایجوکیشن کے لیے باہر جانا ہے۔'' اور ماما کو جیسے شاک سا لگا تھا۔

''ہرگز نہیں...... مجھے باہر نہیں بھیجنا تمہیں، جتنا پڑھنا ہے یہاں ہی رہ کر پڑھ لو۔''

''جاؤ یار! جدھر جا رہے ہو، ہر بات کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ جہاں اور جب ہونا ہوگی ہو جائے گی، آپ کی ماما تو سیریس ہی ہو گئی ہیں۔''

☆......❁......☆

میں خوش گوار موڈ میں جوہی آنٹی کے گھر پہنچا تھا لیکن وہاں آج ماحول سازگار نہیں تھا۔ دروازہ کھلا تھا اس لیے میں بیل دیے بغیر ہی سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے میں نے سنا، جوہی آنٹی کہہ رہی تھیں۔

''میں تمہارے بھلے کو ہی کہتی ہوں ماہا! جو راستے منزلوں کی طرف نہیں جاتے ان پر جانے کا کیا فائدہ۔''

''تب آپ نے یہ بات کیوں نہیں سوچی تھی امی! اب جب کہ......'' یہ ماما کی آواز تھی، اس نے کچھ اور بھی کہا تھا لیکن میں نے سنا نہیں اور دروازے کو ہلکا سا دھکیلا۔

''آ جائیں...... کون ہے؟''

میں نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا، سامنے ہی جوہی آنٹی صوفے پر بیٹھی تھیں۔

''السلام علیکم!'' میں نے جس گرم جوشی سے سلام کیا تھا، مجھے اتنی گرم جوشی سے جواب نہیں ملا تھا۔

"جیتے رہو بیٹا!"

جوہی آنٹی مجھے بے حد اداس سی لگیں حالانکہ ہمیشہ میرے آنے پر ان کا چہرہ کھل اٹھتا تھا اور آنکھیں چمکنے لگتی تھیں۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" مجھے تشویش سی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہوں بیٹا! آپ کیسے ہو؟"

"میں ایک دم ٹھیک ہوں البتہ آپ لوگوں کے لیے اداس ہوگیا تھا۔" میں نے ان کے سامنے سنگل صوفے پر بیٹھتے ہوئے ماہا کی طرف دیکھا، مجھے اس کی پلکیں جھکی بھیگی سی لگیں اور آنکھوں میں ہلکی سرخی تھی، کوئی بات ہوئی ضرور تھی لیکن مجھے پوچھنا مناسب نہ لگا اور میں نے نارمل انداز میں پوچھا۔

"کیسی رہی شادی اور خوب انجوائے کیا ہوگا؟"

"ٹھیک ہی تھی۔" ماہا نیچے کارپٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیا کوئی پریشانی ہے آنٹی!" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے نکل گیا۔

"نہیں...... کچھ خاص نہیں بس یوں ہی کبھی کبھی دل پریشان ہوجاتا ہے۔ سوچتی ہوں مجھے کچھ ہوگیا تو ماہا کا کیا بنے گا، وہاں شادی میں ہماری ایک دور کی عزیزہ ہیں، انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے کہا تو...... مجھے تو بہت اچھا لگا وہ، بہت سلجھا ہوا اور سمجھ دار لڑکا تھا۔"

ماہا نے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"نہیں کرنی مجھے کوئی شادی وادی! منع کردیں بس۔" وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی، میرا دل جیسے ڈوب کر ابھرا تھا۔

"پاگل ہے بالکل، بھلا بیٹیاں بھی سدا ماں باپ کے گھر رہتی ہیں لیکن میں جب بھی کوئی بات کرتی ہوں، رونا دھونا شروع کردیتی ہے۔ چلو ملتان نہ سہی یہاں لاہور میں بھی اس کے دودھیالی رشتہ داروں میں ایک دو رشتے ہیں، اچھے ہیں لیکن یہ تو......"

دودھیالی رشتہ دار...... یعنی ماہا کے بابا کا خاندان۔ میں نے کبھی جوہی آنٹی سے کوئی ذاتی سوال نہیں پوچھا تھا، مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ ان کے شوہر زندہ ہیں یا وفات پاچکے ہیں اور یہ کہ وہ اپنے سسرال کے بجائے میکے کے گھر میں کیوں رہتی ہیں۔ اس طرح کے ذاتی سوال پوچھنا مجھے کبھی مناسب نہیں لگا تھا، سو آج بھی چپ بیٹھا ان کی بات سن رہا تھا اور میرا دل جیسے بجھتا جارہا تھا۔

"ماہا......" جوہی آنٹی نے اسے آواز دی تو وہ منہ پھلائے کچن سے نکلی۔

"قاسم کے لیے ملتانی حلوہ تو لاؤ۔"

میری نظریں بار بار اس کی طرح اٹھتی تھیں اور جوہی آنٹی کی نظریں مجھے کھوجتی تھیں۔ وہ اس طرح منہ پھلائے واپس چلی گئی اور میری نظروں نے کچن تک اس کا تعاقب کیا۔ "اس کی شادی ہوجائے گی تو اس کے بغیر یہ گھر کتنا ویران سا لگے گا۔" میرا اپنا دل بھی جیسے خالی سا ہوگیا تھا، ہر لڑکی کی شادی ہوتی ہے، اس کی بھی ہوجائے گی۔ نامعلوم سی اداسی نے میرے وجود کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا، میں یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں اب چلتا ہوں آنٹی!"

"ملتان کا مشہور سوہن حلوہ لائے تھے ہم تمہارے لیے۔ ماہا لاتی ہی ہوگی، کھا کے جانا۔"

"نہیں آنٹی! اس وقت جی نہیں چاہ رہا پھر کبھی سہی۔" میں جو بہت خوش خوش آیا تھا اب اداس سا واپس جارہا تھا۔

"آپ آتے ہو بیٹا تو بہت خوشی ہوتی ہے، جہاں تک دل کی بات ہے تو دل تو یہ ہی چاہتا کہ ہر روز آپ سے ملوں، آپ کو دیکھوں، آپ سے باتیں کروں لیکن دل کا کیا ہے یہ تو انہونی خواہشیں کرتا ہے۔"

میں سمجھ نہیں پارہا تھا کہ جوہی آنٹی کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔

"آپ کو اللہ نے ایک نرم دل عطا کیا ہے، آپ ہماری تنہائی کا خیال کر کے چلے آتے ہیں لیکن اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھیں۔

تو کیا اتنے ماہ سے میں صرف ان کی مزاج پرسی کے لیے آرہا تھا، کیا وہ محبت کے اس دھاگے کو محسوس نہ کرپائی تھیں جس سے بندھا میں چلا آتا تھا۔

"برا مت مانیے گا قاسم بیٹا! آپ کا اس طرح روز روز آنا مناسب نہیں ہے۔ یہ چھوٹا سا محلّہ ہے، گلی میں آگے پیچھے سب جاننے والے ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر آپ کے بابا اور ماما وہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ آپ......" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور نگاہیں جھکالی تھیں اور میں ان کی بات سمجھ کر ساکت کھڑا تھا۔ یعنی وہ مجھے اپنے گھر آنے سے منع کررہی تھیں لیکن کیوں؟ اب سات ماہ بعد وہ مجھے کہہ رہی تھیں کہ میں ان کے گھر نہ آؤں، انہوں نے پہلے ہی مجھے منع کیوں نہ کیا۔

"کیا ماہا نے کچھ کہا ہے؟" میرے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی تھی۔

"نہیں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا، میں کھڑا ہوگیا لیکن مجھے لگتا تھا جیسے میرے قدم من من بھر کے ہوگئے ہوں یا جیسے زمین نے میرے پاؤں جکڑ لیے ہوں میں پاؤں اٹھانا چاہتا تھا لیکن اٹھا نہیں پارہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا! ماہا چائے بنارہی ہے، پی کر جانا۔" وہ بہت مضطرب اور بے چین لگ رہی تھیں، بار بار اپنے ہاتھوں کو کھولتی بند کرتی تھیں اور میری طرف تکتی تھیں۔ تب ہی ماہا کچن سے نکلی تھی، کچن کا دروازہ لاؤنج میں ہی کھلتا تھا۔ جوہی آنٹی جہاں بیٹھی تھیں اس کے دائیں طرف اور شاید ماہا ان کی ساری بات سن رہی تھی۔ جب جانا ہی ٹھہرا تھا تو چائے کے لیے رکنے کا کیا جواز تھا۔ میں جانا چاہتا تھا لیکن میرے قدم اٹھ نہیں رہے تھے۔

"نہیں بنائی میں نے چائے کیونکہ......" ماہا نے بالکل یہ ہی بات کہی تھی، میرا چہرہ یک دم گرم ہوکر سرخ ہوا تھا اور میری نگاہیں لمحہ بھر کے لیے ماہا کی طرف اٹھی تھیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں شاید کچن میں جا کر وہ روئی تھی، نہیں بلکہ وہ اب بھی رو رہی تھی۔ اس کے آنسو اس کے رخساروں کو بھگوتے تھے اور میرے دل کو جیسے کچھ ہوتا تھا۔

"یہ آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا نا امی! میری غلطی تھی کہ میں نے انہیں بلایا تھا لیکن آپ نے تب ہی کیوں منع نہیں کیا قاسم کو، اگر آپ کو ایسا کوئی خدشہ تھا تو...... پر آپ تو خوش ہوتی تھیں نا اسے کھلا پلا کر، اس کی پسند کی چیزیں پکا کر...... پھر......" وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی، بالکل بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں جوہی آنٹی پر تھیں، اس کی گفتگو کچھ بے ربط سی تھی، مجھے فوراً چلے جانا چاہیے تھا لیکن میں ساکت کھڑا تھا۔

"اور پھر کتنا کہا تھا میں نے کہ یہ پورشن بیچ دیں، کہیں اور گھر لے لیں۔ ایک بار نہیں کتنی بار، جب ثریا آنٹی آپ کو پیغام بھجواتی تھیں کہ اپنا پورشن ان کے ہاتھ فروخت کردیں جب آپ کو جی پی فنڈ ملا تھا اور جب آپ کے ماموں جان نے بی جی کے حصے کی رقم بھیجی تھی لیکن تب آپ کو یہاں ہی رہنا تھا کیونکہ یہاں......"

"میں نے بیگ صاحب سے اور بلال کے والد سے بات کی ہے کہ......" وہ آہستہ سے بولی تھیں۔

"اب کیا فائدہ امی! اب کیا فائدہ جب......"

اور وہ وہاں ہی جوہی آنٹی کے پاس بیٹھ گئی اس کے آنسو اب بھی اسی تواتر سے اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ میں حیران سا کھڑا تھا لیکن میں یہاں کیوں کھڑا تھا، جب جوہی آنٹی نے مجھے جانے کو کہہ دیا تھا تو مجھے جانا چاہیے تھا...... ہاں جانا چاہیے تھا۔

"اللہ حافظ۔"

میں نے اپنی تمام توانائی اکٹھی کر کے قدم

اٹھایا، لمحہ بھر کو میری نظروں نے روتی ہوئی ماہا کو اپنے حصار میں لیا اور پھر میری نظریں جوہی آنٹی کی طرف اٹھیں، جو حسرت سے مجھے تکتی تھیں اور آنکھوں کے کٹورے پانیوں سے بھرے تھے۔ میں من من بھر کے قدم اٹھاتا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اندر سے بالکل خالی ہو گیا ہوں۔ ان سات ماہ کا ہر وہ دن جو میں نے یہاں گزارا تھا میری آنکھوں کے سامنے جیسے مجسم ہو گیا تھا۔

"قاسم...... قاسم......" میں نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ ماہا کی روتی ہوئی آواز آئی۔

"جلدی آؤ پلیز...... امی کو کچھ ہو گیا ہے قاسم...... امی......!" اور میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر لاؤنج میں پہنچا تھا۔ ماہا جوہی آنٹی کو سہارا دیے بیٹھی تھی اور وہ منہ کھولے مشکل سے سانس لے رہی تھیں۔

"امی...... نہیں پلیز، امی نہیں...... اس طرح مت کریں۔" ماہا ان کی پیٹھ سہلا رہی تھی لیکن ان کا سانس مشکل سے آتا تھا اور ان کی رنگت سفید ہو رہی تھی۔

"آنکھیں کھولیں...... آپ جو کہیں گی میں ایسا ہی کروں گی۔ جہاں دل چاہے کردیں میری شادی، ہاں کردیں لیکن یوں مجھے چھوڑ کر مت جائیں۔" وہ اونچا اونچا رونے لگی تھی۔

"ماہا......" میں نے اسے ڈانٹا۔

"کچھ نہیں ہوتا آنٹی کو، اِن ہیلر دو انہیں، کہاں ہے ان ہیلر۔" مجھے یاد آیا تھا ایک بار ان کا سانس رکا تھا، معمولی سا تو میں نے انہیں ان ہیلر استعمال کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ انہیں کبھی کبھی سانس کی تکلیف ہو جاتی ہے۔

"ہاں ان ہیلر......" ماہا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "پلیز بیڈ روم میں بیڈ سائڈ ٹیبل کی اوپر والی دراز میں ہوگا، جلدی سے لے آئیں۔" وہ انہیں سہارا دیے اب بھی ان کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بلا رہی تھی۔

"امی...... امی پلیز......"

میں تیز تیز چلتا ہوا بیڈ روم میں گیا اور دراز کھینچی، دراز میں ایک فوٹو فریم الٹا پڑا تھا، میں نے ان ہیلر ڈھونڈنے کے لیے یوں ہی اسے اٹھایا اور پھر جیسے میں ساکت رہ گیا تھا۔ فریم میرے ہاتھ میں تھا اور میں بنا پلک جھپکائے دیکھ رہا تھا، یہ جوہی آنٹی کی شادی کی تصویر تھی، جوہی آنٹی دلہن بنی بے انتہا خوب صورت لگ رہی تھیں اور دولہا...... ہاں دولہا کوئی نہیں بابا تھے۔ میرے بابا...... ایسی ہی ایک تصویر ماما، بابا کے بیڈ روم میں بھی تھی بس فرق یہ تھا کہ وہاں بابا کے ساتھ دلہن بنی کھڑی میری ماما تھیں، ہاں ایک اور فرق بھی تھا یہ تصویر جو اس وقت میرے ہاتھ میں تھی اس میں بابا بہت خوش لگ رہے تھے۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ تصویر جو ان کے بیڈ روم میں تھی اس میں وہ بے حد سنجیدہ، خاموش بلکہ اداس لگ رہے تھے۔ ایک بار میں نے بابا سے کہا بھی تھا کہ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے آپ کو زبردستی دولہا بنادیا ہے۔ سچ بتائیں بابا کہیں یہ زبردستی کی شادی تو نہیں تھی۔

"نہیں یار! اماں جان بہت بیمار تھیں اور ہنگامی حالات میں یہ شادی ہوئی تھی، میں ان کی وجہ سے پریشان تھا۔"

میں فریم ہاتھ میں لیے کھڑا تھا اور میرے اردگرد جیسے ساری آوازیں مر گئی تھیں۔ پوری دنیا آوازوں سے خالی ہو گئی تھی پھر کہیں دور سے ماہا کی آواز آئی تھی۔

"قاسم! بائیں طرف والے سائڈ ٹیبل کی دراز میں دیکھو...... پلیز جلدی کرو، امی کا سانس رک رہا ہے۔"

میں جیسے کسی گہری نیند سے چونکا تھا، میں نے جلدی سے فریم دراز میں یوں ہی الٹا کر کے رکھا اور بائیں طرف والی سائڈ ٹیبل کی دراز سے ان ہیلر نکال کر لاؤنج میں آیا۔ کچھ دیر بعد ان کا سانس بحال ہو گیا تھا، ماہا نے انہیں صوفے پر لٹا دیا تھا، میں نے دیکھا ان کی بند آنکھوں سے آنسو پھسل کر رخساروں پر بہہ رہے تھے اور ماہا اپنے ہاتھوں سے انہیں پونچھتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔

"بس کریں امی! مت روئیں...... کہا تو ہے نا جیسا آپ چاہیں گی ویسا ہی ہوگا۔ کسی چمار سے بھی شادی کریں گی تو کرلوں گی، بس اب خوش ہو جائیں نا۔"

مجھے اپنا وجود وہاں غیر ضروری لگا اور ایک بار پھر میں اللہ حافظ کہہ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور تیز تیز اترتا چلا گیا۔ اپنی بائیک تک آتے آتے جیسے مجھے صدیاں لگ گئی تھیں' یہاں آتے ہوئے میں کتنا خوش تھا، کسی انجانے جذبے سے جیسے میرے اندر پھول کھلتے تھے۔ عجب بہاروں کا سا سماں تھا اور اب...... یہ انکشاف جو ابھی کچھ دیر پہلے ہی ہوا تھا اس نے سارے پھول جلا ڈالے تھے اور اندر دھول ہی دھول تھی، راکھ ہی راکھ تھی۔ ماہا کون تھی، کیا بابا کی بیٹی...... کیا ماما سے شادی پہلے بابا کی شادی جوہی آنٹی سے ہوئی تھی اور کیا بابا نے انہیں طلاق دے دی تھی اور بابا نے مجھے کبھی یہ سب کچھ بتایا کیوں نہیں...... چھپایا کیوں...... اور اگر ماہا ان کی بیٹی تھی تو کبھی کبھی وہ کیوں حسرت سے کہتے تھے کہ کاش ان کی ایک بیٹی بھی ہوتی تو گھر میں اس کے دم سے کتنی رونق ہوتی۔ کیا اس لیے میرے دل میں ماہا کے لیے اپنائیت کا جذبہ پیدا ہوا تھا کہ میرا اس کے ساتھ خون کا رشتہ تھا، تھینک گاڈ محبت و اپنائیت کے اس جذبے نے ابھی اظہار کا پیرہن نہیں پہنا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا میں دھاڑیں مار مار کر روؤں، دیواروں سے سر ٹکراؤں۔

☆......❀......☆

گھر آ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر ڈھے گیا تھا۔ یوں جیسے میرا سب کچھ ختم ہو گیا ہو، جیسے میں ساری پونجی ہار بیٹھا ہوں۔ ابھی تو میں خود پر خود بھی پوری طرح منکشف نہیں ہوا تھا کہ میرے اوپر جیسے کوئی پچاس منزلہ عمارت آ گری تھی اور میں اس کے ملبے تلے دبا اوکھے اوکھے سانس لیتا تھا اور اپنی چیخیں روکنے کے لیے میں دانت پر دانت جمائے اوندھا لیٹا آنسو بہاتا تھا۔ پتا نہیں میں کتنی دیر تک روتا رہا، میں کیوں رو رہا تھا مجھے خود پتا نہیں تھا۔ اگر بابا نے جوہی آنٹی سے شادی کی تھی اور انہیں چھوڑ دیا تھا تو یہ ان کا ماضی تھا، مجھے اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ کئی لوگ دو دو شادیاں کرتے ہیں، اگر انہوں نے مجھے نہیں بھی بتایا تھا بھی کیا فرق پڑتا تھا لیکن شاید پڑتا تھا فرق، میرے اندر جیسے کوئی اون کا گولا کھل کر الجھ گیا تھا اور سلجھ نہیں رہا تھا۔ میری انگلیاں جیسے اسے کھولنے کی کوشش میں زخمی ہوئی تھیں اور ان اَن دیکھے زخموں کی تکلیف میرے دل میں ہوئی تھی۔

ہاں کچھ تو تھا...... کچھ تو تھا کہیں کہ میں کسی راز کے منکشف ہونے سے خوف زدہ ہو کر روتا رہا تھا اور پھر پتا نہیں کب میں روتے روتے سو گیا تھا یا بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہاں جب میری آنکھ کھلی تو بابا اور ماما میرے کمرے میں تھے اور کمرے میں لائٹ جل رہی تھیں، ماما میرے ہی بیڈ پر بیٹھے میرے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھیں اور بابا پاس ہی کرسی پر بیٹھے تشویش سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"کیسا خوش خوش ہنستا ہوا گھر سے گیا تھا، جانے کیا ہوگا میرے بچے کو۔ نظر لگ گئی یا کچھ چمٹ گیا، کسی نے کچھ کردیا۔" ماما کی بڑبڑاہٹ مجھے سنائی دی تھی۔ ہاں کچھ چمٹ ہی تو گیا تھا، کچھ کردیا تھا کسی نے کہ میرا ذہن اور میری سوچیں میرے قابو میں نہ تھیں۔ کاش میں وہاں نہ گیا ہوتا، کتنا منع کرتی تھیں دادی اور ماما کہ وہاں مت جانا، وہاں جادوگرنیاں رہتی ہیں۔ جادو کردیں گی اور شاید جادو کردیا تھا نا مجھ پر...... میری آنکھیں پھر بند ہو گئی تھیں، نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔

"بابا......" میرے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

"میرا دم گھٹ رہا ہے۔" میں نے گردن پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے آنکھیں کھولیں، بابا اسی طرح کرسی پر بیٹھے تھے۔

"جان بابا!" بابا یک دم میری طرف جھکے تھے۔ "کیا ہو گیا میری جان! کہاں گئے تھے؟"

کہاں گیا تھا میں، مجھے یاد نہیں آ رہا تھا لیکن میرا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ میں جیسے ایک خالی برتن تھا، میرا سانس بند ہوتا تھا اور جیسے کوئی میرے گلے میں رسّی ڈال کر کھینچتا ہو۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا، بابا کرسی سے اٹھ کر میرے پاس بیڈ پر بیٹھ گئے تھے اور مجھے ساتھ لگائے ہولے ہولے تھپک رہے تھے، میں بہت تکلیف میں تھا اور اذیت سے میری رگیں کٹتی تھیں اور میں نہیں جانتا تھا کہ یہ اذیت کیوں تھی۔ بابا مجھے تھپکتے رہے اور میں ان کے کندھے پر سر رکھے ایک بار پھر سو گیا تھا یا غنودگی میں چلا گیا تھا۔ تیسری بار جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ فرش پر چوکور ٹکڑوں کی شکل میں بکھری پڑی تھی۔ کھڑکیوں سے پردے ہٹے تھے اور یہ دھوپ شیشوں سے آ رہی تھی، میری نظر سامنے گھڑی پر پڑی، دس بج رہے تھے اور مجھے کسی نے اب تک جگایا نہیں تھا، میں یک دم کھڑا ہو گیا تھا تب ہی ماما دروازے کو ہلکا سا ناک کر کے اندر آئی تھیں۔ مجھے کھڑا دیکھ کر جیسے ان کے چہرے پر اطمینان بکھر گیا تھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے بیٹا؟"

"جی ٹھیک ہوں۔"

"رات تو تمہاری حالت دیکھ کر ہم پریشان ہی ہو گئے تھے۔"

"کیا ہوا تھا مجھے؟" میں حیران ہوا۔

"میں تمہارے کمرے میں آئی تو تم بخار میں جل رہے تھے اور مدہوشی میں الٹے سیدھی باتیں کرتے تھے۔ شکر ہے اب تمہیں بخار نہیں ہے۔ تمہارے بابا نے آفس جانے سے پہلے چیک کیا تھا، رات تمہارے بابا ڈاکٹر قمر کو لائے تھے۔ وہ بھی گھبرا گئے تھے، کہتے تھے اگر بخار نہیں اترتا تو ہسپتال لے جائیں لیکن رات کو ہی شکر اللہ کا بخار کم ہو گیا تھا۔" ماما بتا رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا مجھے کیوں رات کی بات یاد نہیں آ رہی۔

"تم فریش ہو جاؤ، میں ناشتا لگاتی ہوں اور آج یونیورسٹی تو نہیں جانا ہو گا، دیر ہو گئی ہے۔"

ماما باہر چلی گئیں تو مجھے یاد آیا، کل...... ہاں کل میں نے چاہا کہ میں ماما کو آواز دے کر بابا اور جو ہی آنٹی کی تصویر کے متعلق پوچھوں لیکن ماما جا چکی تھیں اور میرے اندر وہی کل والا خالی پن تھا۔ میرے اندر جھکڑ چلتے تھے اور میں کسی حقیر تنکے کی طرح اس میں اڑتا تھا، ماما نہیں...... مجھے بابا سے پوچھنا چاہیے لیکن بابا تو آفس جا چکے تھے۔ میں جلدی سے تیار ہو کر باہر نکلا۔ مجھے ماما سے اور جو ہی آنٹی سے ہی پوچھنا چاہیے بلکہ مجھے کل ہی پوچھنا چاہیے تھا۔ ماما نے مجھے آواز بھی دی تھی کہ میں ناشتا کر کے جاؤں لیکن میں رکا نہیں تھا۔ لمحہ بھر میں نے اپنے گیٹ کے باہر رک کر سوچا تھا کہ کیا مجھے حقیقت جاننے کے لیے جو ہی آنٹی کے پاس جانا چاہیے شاید نہیں...... لیکن میرے اندر جو آندھیاں اٹھ رہی تھیں، وہ کشاں کشاں مجھے ان کی سیڑھیوں تک لے گئیں لیکن سیڑھیوں کے دروازے پر بڑا سا تالا لگا تھا۔ میں تھکے قدموں سے گھر لوٹ آیا تھا، چائے کا ایک کپ پی کر میں اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ اب مجھے بابا سے کچھ پوچھنا تھا اور بابا عموماً پانچ بجے تک آفس سے آتے تھے، کچھ دیر میں یوں ہی بیڈ پر بیٹھا رہا پھر یک دم اٹھ کر بیگ میں کپڑے اور اپنی ضرورت کا سامان رکھا۔ میں کچھ دن یہاں سے دور گزارنا چاہتا تھا، میں ڈر رہا تھا، خوف زدہ ہو رہا تھا، اس جذبے کے منکشف ہونے سے جو دور اندر کہیں گہرائیوں میں نمو پا رہا تھا۔ میں خود پر بھی اس جذبے کو منکشف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے کہیں چلے جانا چاہیے۔

"کہاں......؟" میں نے خود سے پوچھا اور خود ہی جواب دیا، اسلام آباد جواد کے پاس۔ وہ کتنی ہی بار کہہ چکا تھا کہ کچھ دن فرصت نکال کر اس کے پاس جا کر رہوں، وہ مجھے اپنی یونیورسٹی اور اسلام آباد کی دوسری قابل ذکر چیزیں دکھانا چاہتا تھا۔ میں بیگ اٹھا کر ماما کو کچھ بتائے بغیر گھر سے نکل آیا۔

☆......❁......☆

مجھے بتا کر آنا چاہیے تھا میں جانتا تھا میرے اس طرح بتائے بغیر چلے جانے پر وہ کتنا پریشان ہوں گے لیکن پھر بھی میں نے نہیں بتایا۔ میرے اندر بڑی خاموشی سے ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی اور مجھے خود پتا نہیں چل رہا تھا کہ کیوں...... جواد مجھے دیکھ کر حیران ہوا اور خوش بھی۔

"تم فریش ہو جاؤ تو پھر کھانا کھانے چلتے ہیں باہر۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ میرا روم میٹ آج چھٹی پر گھر گیا ہوا ہے لیکن وہ ہوتا تو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑنا تھا۔"

"مجھے آج کہیں نہیں جانا جواد! تھکن ہو رہی ہے، سو جاؤں گا۔ ہو سکے تو بس چائے پلوا دو۔"

جواد نے بغور مجھے دیکھا۔

"کیا بات ہے قاسم! کوئی مسئلہ ہے تم مجھے پریشان لگ رہے ہوئے۔"

"نہیں یار کوئی مسئلہ نہیں بس اس لمبے سفر سے تھک گیا ہوں۔"

"اوکے" جواد نے ضد نہیں کی تھی، اور بہت پر تکلف چائے منگوائی تھی۔ میں چائے پی کر لیٹ گیا اور کمبل سر تک تان لیا پھر ذہن میں بے شمار سوال اٹھتے تھے۔ میں کیوں یہاں آ گیا تھا۔

کس سے بھاگ رہا تھا۔ کون سا جان لیوا احساس روح کی گہرائیوں میں چھپا رگیں نچوڑتا تھا۔ مجھ سے کیوں چھپایا گیا تھا۔ مرد، دو تین شادیاں کر ہی لیتے ہیں۔ بابا نے اگر دو شادیاں کر لی تھیں اور پہلی بیوی سے ان کی نہیں بنی تھی تو کیا، ہاں تو کیا کیس کچھ اور بھی تھا۔ لیکن کیا۔ میرا دل بھر بھر آتا تھا میں کمبل میں منہ چھپائے خود سے الجھتا جانے کب سو گیا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو جواد یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

"یار ایک بہت اہم لیکچر ہے بس وہ اٹینڈ کر کے گھنٹے بھر میں آ رہا ہوں۔ پھر تمہیں اچھا سا ناشتا کرواتا ہوں لیکن اگر پہلے کچھ کھانے کو جی چاہے تو نیچے جا کر میرے حساب میں کچھ ناشتا کر لینا میں نے انچارج سے کہہ دیا ہے۔ چائے کا موڈ ہو تو ابھی بنا دیتا ہوں۔" جواد آداب میزبانی نبھا رہا تھا۔

"یار تم آرام سے یونیورسٹی جاؤ، میرا موڈ بنا تو میں خود ہی چائے بنا لوں گا۔ الیکٹرک کیٹل، ٹی بیگ دودھ سب کچھ تو سامنے پڑا ہے۔"

"او کے! اور ہاں......" اس نے بالوں میں برش کرتے کرتے مجھے دیکھا۔ "تم گھر میں بتا کر نہیں آئے۔ رات بلال بھائی کا فون آیا تھا۔ بتا رہے تھے کہ تمہارے بابا اور ماما کی بری حالت ہے کیونکہ تم پتا نہیں کہاں غائب ہو گئے ہو۔ آج تو نہیں لیکن شاید کل وہ تھانے میں تمہاری گم شدگی کی رپورٹ درج کروانے والے ہیں۔"

"اوہ......" میں بے حد شرمندہ ہوا۔ "دراصل اچانک ہی میرا پروگرام بنا، بابا آفس میں تھے، ماما سو رہی تھیں۔ میں نے سوچا راستے میں فون کر کے بتا دوں گا لیکن جلدی میں فون چارج ہی نہیں کیا تھا۔ بیٹری آف تھی۔ یہاں آ کر اتنی تھکن ہو رہی تھی کہ سو گیا۔" میں نے جواد کو وضاحت دی۔ وہ کچھ دیر گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر کندھے اچکائے۔

"خیر جو کچھ بھی ہوا۔ کس قدر پریشان ہوئے ہوں گے وہ۔ میں نے بلال بھائی کو اسی وقت تمہارے گھر جانے کا کہا تھا۔ پھر فوراً ہی تمہارے بابا کا فون آ گیا تھا۔ میں نے بتا دیا تھا کہ تم سو رہے ہو۔ اب پہلے اٹھ کر فون چارج پر لگاؤ اور پھر بابا کو فون کرو تم سے بات کر کے ہی انہیں تسلی ہو گی حالانکہ میں نے انہیں بہت یقین دلایا کہ تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو پھر بھی بار بار پوچھتے رہے تھے طبیعت تو خراب نہیں، ٹمپریچر تو نہیں۔"

اور میں مزید شرمندہ ہوا۔ اپنی اس تیئس سالہ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میں ماما، بابا کو بتائے بغیر گھر سے چلا آیا تھا وہ بھی دوسرے شہر مجھے تو لاہور میں بھی کہیں جانا ہوتا تو بتا کر جاتا تھا۔

جواد کے جانے کے بعد میں نے فون آن کیا

جسے میں نے خود ہی آف کر دیا تھا۔ فون آن ہوتے ہی بابا کا فون آ گیا تھا۔ میں نے ان سے معافی بھی مانگی اور تسلی بھی دی کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور یہ کہ میرا چند دن جواد کے پاس ہی رہنے کا پروگرام ہے۔ میں نے ماما سے بھی بات کی جو میری آواز سنتے ہی رونا شروع ہو گئی تھیں۔ انہیں بھی میں نے وہی سب کچھ کہا جو بابا سے کہا تھا۔ لیکن کیا میں واقعی ٹھیک تھا۔ نہیں میں ٹھیک نہیں تھا۔ میرے اندر بلا کی شکست و ریخت ہو رہی تھی میں ان سے بات کرنے کے بعد فون آف کر کے ایک بار پھر لیٹ گیا تھا۔ مجھے پتا نہیں کیوں لگ رہا تھا کہ میرے اندر زندگی مر رہی ہے دھیرے دھیرے۔ جواد یونیورسٹی سے واپس آیا تو میں اس طرح کمبل اوڑھے لیٹا تھا۔

''اوئے سستی کے مارے ہوئے انسان، ابھی تک بستر میں گھسے ہو۔'' جواد نے بازو پکڑ کر زبردستی مجھے اٹھایا۔

''جلدی سے تیار ہو جا۔ زبردست قسم کا ناشتا کرواتا ہوں پھر ذرا گھومنے نکلتے ہیں۔ تمہاری خاطر میں نے......''

''نہیں یار! موڈ نہیں ہو رہا کسی زبردست قسم کے ناشتے کا، بس اب لنچ ہی کروں گا۔''

''تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے یار! میں تمہارا دوست ہوں ہر مشکل میں تم مجھے اپنے ساتھ کھڑا پاؤ گے، جو کچھ بھی ہے مجھ سے......''

''نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ایسے ہی بے زاری سی ہے تب ہی تو تمہارے پاس چلا آیا ہوں۔''

''چائے تو پیو گے نا؟'' جواد نے مزید بحث نہیں کی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''چائے پی کر باہر چلتے ہیں، تمہیں فیصل مسجد دکھاتا ہوں، واپسی پر لنچ کر کے ہوسٹل آ جائیں گے۔''

میں نے اب کچھ نہیں کہا تھا۔ حالانکہ میرا جی نہیں چاہ رہا تھا کہیں بھی جانے کو۔

''ارے ہاں......'' الیکٹرک کیٹل میں پانی ڈالتے ہوئے اسے یاد آیا۔ ''وہ ماہین ہے نا ماہا، جوہی آنٹی کی بیٹی۔ اس کے والد کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے کل۔ کافی زخمی ہیں ہسپتال میں ہیں، رات بلال بھائی نے بتایا تھا۔ تمہیں بتانا یاد نہیں رہا تھا۔ تمہاری تو یونیورسٹی فیلو ہے نا۔''

میرا دل جیسے ڈوب کر ابھرا تھا۔

''والد......؟''

میں کچھ ناسمجھی سی کیفیت میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اگر بابا ماہا کے والد نہیں تھے تو کون تھے شاید جوہی آنٹی نے دوسری شادی کی ہو لیکن پھر اس کے والد کہاں تھے...... میں نے کبھی انہیں گھر میں دیکھا کیوں نہیں، اور کبھی ماہا جوہی آنٹی نے ان کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔

''ہاں یار! ماہا کے والد جانتے تو ہو تم انہیں۔ بیگ صاحب، یوسف بیگ صاحب وہی جو گلی نمبر 21 میں رہتے ہیں۔ ایک بار کونسلر بھی بنے تھے اور ہم نے بھی ان کے لیے کام کیا تھا۔''

''ہاں لیکن وہ......'' میں حیران سا تھا۔ ''ان کے تو اپنے بیوی بچے ہیں اور جوہی آنٹی...... کیا......''

''ارے نہیں یار! تم غلط سمجھ رہے ہو۔ ماہا بیگ صاحب کی پہلی بیوی سے ہے۔ ماہا کی مما نرگس آنٹی، جوہی آنٹی کی بہت گہری دوست تھیں۔ انہیں کینسر ہو گیا تھا ماہا تین سال کی تھی تب جب اپنی وفات سے پہلے بیگ صاحب کی اجازت سے انہوں نے ماہا کو جوہی آنٹی کو دے دیا تھا کیونکہ بیگ صاحب نے ان کی زندگی میں ان کی اجازت سے دوسری شادی کر لی تھی۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری طویل سانس لی۔ یک دم مجھے اپنے دل سے بوجھ ہٹتا ہوا سا محسوس ہو۔ مجھے لگا جیسے وہ زندگی جو میرے اندر مر گئی تھی پھر ہولے ہولے سانس لے رہی ہو۔ جواد نے چائے بنا کر کپ میرے سامنے رکھا۔

''چلو یار! شروع ہو جاؤ۔''

''کیا......؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''وہ سب جو تم نے مجھ سے چھپا رکھا ہے۔ کیا محبت کر بیٹھے ہو کسی سے اور اگر کر بیٹھے ہو تو بتاؤ کون ہیں وہ محترمہ جنہوں نے ہمارے شہزادے کو حال سے بے حال کر رکھا''۔

''ہاں محبت...... ہاں شاید یہ محبت ہی ہے لیکن میں خود بھی ابھی سمجھ نہیں پا رہا کہ یہ محبت ہے یا صرف اپنائیت، لگاؤ۔''

''یہ محبت ہے مائی ڈیئر سوفی صد محبت۔'' جواد نے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر بائیں ہاتھ پر مارا۔

''اگر یہ محبت ہے تو میں قاسم سعید، ماہین فاطمہ عرف ماہا سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

میں نے جواد کے سامنے اعتراف کیا۔ وہ اعتراف جو آج تک میں خود سے بھی نہیں کر سکا تھا۔

''ہاں...... تب ہی سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ کے چکر لگنے لگے تھے تمہارے۔ ایک بار ببین نے بتایا تھا کہ مجھے تم کسی دوست سے ملنے وہاں آتے ہو۔ میں بھی حیران تھا کہ ایسا کون سا دوست ہے تمہارا وہاں جسے میں نہیں جانتا۔ یاد ہی نہیں رہتا تھا تم سے پوچھنا۔ ہم سے بھی چھپاتے رہے یار! کب ہوا یہ حادثہ۔'' جواد شوخی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''میں نہیں جانتا جواد! رئیلی، بالکل بھی نہیں کہ اس محبت نے کب میرے دل کو اپنا مسکن بنایا لیکن اس کا انکشاف مجھ پر ابھی ابھی اس لمحے ہوا ہے۔''

''لیکن ہم نے تو بہت پہلے تاڑ لیا تھا بچو!'' جواد نے ایک دھمو کا میری پیٹھ پر لگایا۔

''لیکن جواد! ایک بات مجھے پریشان کر رہی ہے کہ جس طرح ہمارے بڑوں کے آپس میں تعلقات نہیں ہیں تو کیا وہ ہمارے رشتے پر راضی ہو جائیں گے۔ بابا، ماما کو تو میں منا لوں گا لیکن جوہی آنٹی اگر نہ مانیں تو......''

''نہیں یار! جوہی آنٹی بہت اچھی ہیں بہت سوئیٹ۔''

یہ میں جانتا تھا لیکن میں نے جواد کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں جوہی آنٹی کے گھر جاتا رہا ہوں اور یہ کہ انہوں نے مجھے اپنے گھر آنے سے منع کر دیا ہے۔ مجھے جوہی آنٹی کی گفتگو اور ماہا کا ردعمل یاد آیا۔ ماہا کا وہ ردعمل اس کا رونا......'' اف او...... میں بھی از حد بیوقوف ہوں۔

''کمال ہے ماہا بیگم یعنی ماہا بیگم...... واؤ!''

میں نے ہونٹ سکیڑے یعنی محبت کے اس سفر میں تنہا نہیں تھا میں۔ وہ بھی...... ہاں وہ بھی...... بہت سارے مناظر میری آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ ان گزرے سات ماہ میں بہت سارے ایسے دن آئے تھے جب مجھے ماہا کے التفات کو اس کے احساسات کو سمجھنا چاہیے تھا لیکن میں احمق اعظم اسے کوئی معنی ہی نہیں دے سکا تھا۔ میں نے بیڈ کے نیچے سے بیگ گھسیٹا۔

''میں واپس جا رہا ہوں یار! تم مجھے ڈائیوو کے اڈے پر چھوڑ آؤ۔''

''بکو مت۔'' جواد نے میرے ہاتھ سے بیگ چھین لیا۔

''آئے اپنی مرضی سے تھے اور اب جاؤ گے میری مرضی سے سمجھے۔''

اور کچھ دیر بعد فریش ہو کر میں جواد کے ساتھ ایک بہت اچھے لیکن چھوٹے ہوٹل میں پایوں اور نہاری کا زبردست ناشتا کر رہا تھا اور وہ جو ابھی کچھ دیر پہلے میں زندگی سے بے زار ہوا تھا بیٹھا۔ اب اس بے زاری کا نام نشان تک نہ تھا اور ہمارے بھرپور قہقہے دوسری میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو چونکاتے تھے۔ اور پھر اگلے چار دن تک جواد نے مجھے جانے نہیں دیا۔ اور اسلام آباد کی ہر قابل ذکر جگہ دکھائی۔ اس دوران میں نے ماہا کو کتنی ہی بار فون کیا لیکن یا تو اس کا فون آف ملتا یا پھر بیل ہوتی رہتی لیکن وہ اٹینڈ نہ کرتی تھی۔ پانچویں دن میں واپس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

''یار کل سنڈے ہے۔ مری چلیں گے تم پرسوں صبح چلے جانا۔''

جواد نے دوستوں کے ساتھ مری کا پروگرام بنا

رکھا تھا۔

''ماہا نے جوہی آنٹی سے کہا تھا کہ وہ جہاں دل چاہے اس کی شادی کردیں اور اگر جوہی آنٹی نے ماہا کا رشتے طے کردیا اس کی شادی کردی تو میں یارا جاؤں گا یار۔'' آدھی بات میں نے دل میں سوچی تھی اور آدھی زبان سے جواد سے کہی تھی۔

''یار ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے میرا نہیں خیال کہ آنٹی اس کی اتنی جلدی شادی کریں گی۔ وہ بھی دوران تعلیم۔''

''ان ماؤں کا کیا پتا کب ان کے دل میں بچوں کی شادی کا شوق جاگ اٹھے اور ابھی مجھے ماہا کو اپنے دل کا حال بھی بتانا ہے وہ تو جانتی بھی نہیں کہ میں اس سے اتنی محبت کرتا ہوں۔''

''حال دل بتا دینا ایک دو دن سے کیا فرق پڑے گا۔''

جواد مجھے روکنا چاہتا تھا لیکن مجھے فرق پڑتا تھا۔

☆......❁......☆

میں تو اڑ کر ماہا تک پہنچنا چاہتا تھا اور اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کہنا چاہتا تھا مجھے اپنا لو ماہا میری محبت قبول کرلو۔ سو میں مری کا پروگرام رد کرکے واپس لاہور چلا آیا۔ ماما، بابا مجھے اس وارفتگی اور والہانہ پن سے ملے جیسے میں برسوں بعد گھر لوٹا ہوں۔ میں نے ماہا کو میسج کیا لیکن اس نے ریپلائے نہیں کیا تھا اور نہ ہی میری کال اٹینڈ کر رہی تھی۔ خیر صبح یونیورسٹی میں تو ملاقات ہوگی ہی۔ میں مطمئن تھا سو ماما، بابا سے ہلکی پھلکی باتیں کرنے کے بعد کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے ماہا کے تصور میں کھویا ہوا تھا جب بابا کمرے میں آئے۔

''کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ نہیں بابا!'' میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''ہاں قاسم! اب بتاؤ کیا کچھ مسئلہ ہوا تھا تمہارے ساتھ۔'' بابا لمبی تمہید نہیں باندھتے تھے۔ فطرتاً کم گو ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ براہ راست سیدھی اور دوٹوک بات کرتے تھے۔

''نہیں...... کچھ نہیں بابا!'' میں نے نظریں چرالیں۔

''کچھ تو تھا میری جان! تمہاری وہ حالت اور پھر اس طرح بتائے بغیر چلے جانا۔ بہرحال جب تمہیں لگے کہ تمہیں مجھ سے اپنا پرابلم ڈسکس کرنا چاہیے تو بلاتکلف کرلینا۔''

''تھینک یو بابا!''

ایک لمحہ کو میرا جی چاہا کہ میں جوہی آنٹی اور ان کی تصویر کے متعلق پوچھوں لیکن اگر میں پوچھتا تو مجھے بابا کو یہ بھی بتانا پڑتا کہ میں جوہی آنٹی کے گھر جاتا ہوں اور فی الحال میں یہ بابا کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ ابھی مجھے ماہا سے بات کرنی تھی جس سے یونیورسٹی میں ہی بات ہوسکتی تھی کیونکہ وہ فون اٹینڈ نہیں کر رہی تھی بلکہ میرے چند بار فون کرنے کے بعد اس نے فون ہی آف کردیا تھا۔

اگر کوئی بات ہوئی تو آپ سے ہی ڈسکس کروں گا بابا! آپ کے اور ماما کے علاوہ اور ہے بھی کون میرا اور آپ دونوں اتنے قناعت پسند کہ ایک اکلوتے مجھ پر ہی اکتفا کرلیا۔ کیا تھا اگر دو چار بہن بھائی اور ہوتے تو......''

''چلو یار! تم قناعت پسند نہ ہونا ہماری طرح۔'' بابا ہنسے تھے اور بابا کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر ماہا کے تصور میں کھو گیا تھا۔ یہ محبت بھی کیا چیز ہے بندے کو کسی کام کا رہنے نہیں دیتی۔ بالکل ہی ناکارہ کردیتی ہے۔

☆......❁......☆

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میری پڑھائی کا حرج ہوا تھا میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتا لیکن میں ماہا کے تصور میں کھویا ہوا تھا اور میں قاسم سعید، ماہین فاطمہ عرف ماہا کی محبت میں بری طرح مبتلا ہوچکا تھا اب میری پڑھائی کا اللہ ہی حافظ تھا۔ رات میں کب سویا تھا مجھے یاد نہیں لیکن صبح میں جلدی اٹھ گیا تھا اور ماما کے ناشتا لگانے سے پہلے تیار ہوکر میز پر آگیا تھا۔ ماما حیران ہوئی تھیں لیکن بابا مسکرائے تھے جیسے انہیں اندازہ تھا کہ میرے دل پہ کوئی واردات گزر چکی ہے۔

''یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی میں نے دعا مانگی تھی کہ مجھے ماہا اکیلی مل جائے اور اللہ نے میری دعا سن لی تھی کہ وہ مجھے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جاتے ہوئے اکیلی مل گئی تھی۔

''ماہا......!''

میں بے اختیار اس کی طرف بڑھا تھا اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے حیرت سی نمودار ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں مجھے بے طرح اداس لگی تھیں۔

''میں نے تمہارے بابا کے حادثے کا سنا تھا۔ اب کیسے ہیں وہ؟ میں اسلام آباد سے رات ہی آیا ہوں۔''

''ابھی تو ہسپتال میں ہی ہیں بازو اور ایک ٹانگ میں فریکچر ہوا ہے اور ریڑھ کی ہڈی بھی متاثر ہوئی ہے کچھ۔ ڈاکٹرز ابھی ٹھیک سے کچھ بتاتے نہیں ہیں کہ کب تک ابا ٹھیک ہوجائیں گے، میں بہت کم ان سے ملی ہوں قاسم! لیکن پھر بھی وہ میرے ابا ہیں۔ میرا سائباں جب بھی خیال آتا ہے کہ اگر انہیں کچھ ہوجاتا تو میرا دل کٹنے لگتا ہے۔'' اس کی آواز بھیگ گئی تھی۔

''ان شاءاللہ تمہارے ابا ٹھیک ہوجائیں گے ماہا! جوہی آنٹی کیسی ہیں؟''

''امی تو ملتان گئی ہوئی ہیں، میں ابا کی طرف ہوں۔'' اس نے جانے کے لیے قدم اٹھایا۔

''ماہا رکو، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

''کیا کہنا ہے قاسم!'' اس کی اداس آنکھوں میں پھر حیرت نمودار ہوئی تھی۔

''یہاں نہیں، کہیں اور چلو۔ جہاں اطمینان سے بات کی جاسکے۔'' میں بے چین تھا حال دل کہنے کے لیے۔

''تمہارا کیا مطلب ہے قاسم! کہ کہیں باہر کسی ہوٹل کسی پارک میں تو سوری میں......''

''ایسا نہیں ہے ماہا!'' میں نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

''میں خود کسی ایسی جگہ پر نہیں جانا چاہتا، مجھے تمہاری عزت اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر ہے لیکن مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

''جو بھی کہنا ہے یہاں ہی کہہ دو قاسم! میں جانتی ہوں تم امی کی باتوں سے ہرٹ ہوئے تھے۔'' اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ہم جہاں کھڑے تھے ہمارے آس پاس کوئی نہیں تھا۔

''ہاں ہوا تھا لیکن بعد میں جب میں نے سوچا تو وہ مجھے حق بجانب لگیں۔ بیٹیوں کی ماؤں کو اتنا ہی محتاط ہونا چاہیے۔ مجھے کچھ اور بات کرنی ہے تمہیں کچھ بتانا ہے۔'' میری نظریں محبتیں لٹاتی تھیں۔ وہ کچھ دیر متذبذب سی کھڑی رہی اور پھر ایک گہری سانس لی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔''

''ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے پچھلے لان میں چلو وہاں اس وقت کوئی نہیں ہوتا۔ میں آتی ہوں کچھ دیر میں۔''

اور واقعی پچھلے لان میں کوئی نہیں تھا۔ کافی دور دو تین پڑھاکو قسم کی لڑکیاں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھیں۔ میں تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا تھا کچھ دیر بعد ماہا بھی آگئی تھی۔

''ہاں کہو، کیا کہنا ہے۔''

''بیٹھ جاؤ ماہا! اس طرح کھڑے کھڑے بات کرنا ہوتی تو وہاں ہی کہہ دیتا۔'' وہ خاموشی سے گھاس پر بیٹھ گئی اور میں بھی کچھ فاصلے پر اس طرح بیٹھا کہ دور سے اگر کوئی دیکھتا بھی تو یہ سمجھتا کہ ہم الگ الگ بیٹھے ہیں۔

''تم شاید اس روز کی باتوں کے متعلق پوچھنا......'' اس نے پھر کہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''نہیں...... میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں ماہا کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں بہت بری طرح تمہاری محبت میں گرفتار ہوچکا ہوں۔''

میں بھی ہاشم سعید کا بیٹا تھا جو تمہید باندھنے کے

بجائے ڈائریکٹ بات کرتے تھے۔
"قاسم......" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے، پلکیں لرز رہی تھیں۔
"محبت تو کسی انعام کی طرح ہوتی ہے ماہا! ملال تو نہیں ہوتی، یہ تو خود بخود دل میں اتر آتی ہے کسی الہام کی طرح یہ کیسے ممکن ہے ماہا کہ محبت نے تمہارے دل پر دستک نہ دی ہو۔ تم مجھے اچھی لگتی تھیں میں تمہیں ہر روز ملنا اور دیکھنا چاہتا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کیوں، میں خود پر منکشف ہی نہیں تھا۔ یہ بھید تو چند دن پہلے مجھ پر کسی الہام کی طرح ہوا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، بہت شدید محبت...... میں انکشاف کے اسی لمحے تمہارے پاس آنا چاہتا تھا تمہیں بتانا چاہتا تھا لیکن جواد نے مجھے آنے ہی نہیں دیا۔" اس کے آنسو اسی طرح بہہ رہے تھے۔
"ماہا پلیز تمہارے آنسو مجھے تکلیف دے رہے ہیں۔ اس طرح مت رو۔ اگر تمہیں میری بات بری لگی ہے تو میں معافی مانگ لیتا ہوں لیکن میرا یقین کرو یہ سچ ہے۔ مجھے اپنے دل پر اختیار نہیں ہے۔ یہ محبت شاید ایسی ہی ہوتی ہے ماہا کہ آدمی کے سارے اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ ہوسکتا ہے آج تمہیں میری محبت کا یقین نہ آئے۔ تم میرے لیے ایسا جذبہ محسوس نہ کرو لیکن ایک دن اچانک میری محبت تم پر ایسے ہی منکشف ہوگی جیسے مجھ پر اچانک منکشف ہوئی۔ اس لیے کہ میری محبت میں کھوٹ نہیں یہ خالص ہے اور......"
میں نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے نقاب سرکا کر دائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے اور میری نگاہیں اس کے چہرے کا یوں طواف کرتی تھیں جیسے صدیوں بعد اسے دیکھا ہو۔ سات ماہ میں اس سے ملتا رہا اسے دیکھتا رہا لیکن میں نے اس طرح اسے نہیں دیکھا جیسے آج دیکھ رہا تھا۔
"میں تو خود پر بہت پہلے منکشف ہو چکی تھی قاسم! تب ہی تو...... تب ہی تو......" اس نے نگاہیں جھکالی تھیں اور رخساروں پر شفق سی اتر آئی تھی۔
محبت کا یہ اعتراف مجھے اندر تک سرشار کر گیا۔
"کیا...... کیا کہا ماہا! تم نے...... ایک بار پھر کہو۔ مجھے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آرہا۔"
"قاسم......" اس کی نظریں جھک گئیں وہ اپنا نقاب درست کرنے لگی تو میں نے بے اختیار اسے منع کیا۔
"نہیں پلیز کچھ دیر مجھے دیکھنے دو۔" اس نے ہاتھ نیچے کرتے ہوئے گہری سانس لی۔
"امی کہتی ہیں قاسم! جو راستے منزلوں کی طرف نہیں جاتے ان پر چل کر پاؤں ہی زخمی ہوتے ہیں۔" اور اس کی آواز بھرا گئی تھی اور پلکیں پھر بھیگ گئی تھیں۔
"وہ نہیں چاہتیں کہ رائیگاں مسافتیں مجھے لہولہان کریں۔ اس لیے انہوں نے آپ کو منع کیا تھا۔ وہ محبت جس سے آپ بے خبر تھے اس محبت کو انہوں نے میری آنکھوں میں دیکھ لیا تھا۔ کاش آپ بے خبر ہی رہتے۔ کم از کم میرے لیے جینا آسان ہوتا کہ میرا جذبہ ایک طرفہ تھا لیکن اب اس احساس کے ساتھ کیسے جی پاؤں گی کہ اس سفر میں تنہا نہیں تھی میں۔"
"ماہا......" میں نے تڑپ کر اسے دیکھا۔
"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آنٹی کے خدشے بے بنیاد ہیں جو ماضی تھا وہ ختم ہوگیا اور وہ ناراضیاں جھگڑے بھی ختم ہوگئے۔ مجھے یقین ہے میں بابا اور ماما کو منالوں گا وہ اتنا ہی چاہتے ہیں مجھے۔ کیا اتنی سی بات کے لیے ہم اپنی محبت کو اپنے ہی ہاتھوں دفن کردیں۔"
"یہ اتنی سی بات نہیں ہے قاسم! آپ کچھ بھی نہیں جانتے...... کچھ بھی نہیں۔" وہ بے حد مضطرب اور بے چین لگنے لگی تھی۔
"جو میں نہیں جانتا وہ مجھے تم بتا دو ماہا! اس کا بھی کوئی حل نکل ہی آئے گا۔" میری آنکھوں کے سامنے جوہی آنٹی اور بابا کی تصویر آگئی تھی۔
"میں...... میں کیسے بتاؤں؟"
"تو ٹھیک ہے میں جوہی آنٹی سے ملنے آؤں گا۔ مجھے بھی ان سے کچھ پوچھنا ہے کچھ کہنا ہے۔"

"میں نے آپ کو بتایا تھا امی ملتان گئی ہوئی ہیں۔"
"لیکن وہ ہمیشہ تو وہاں نہیں رہیں گی آجائیں گی چند دنوں میں۔"
"وہ ابھی جلدی نہیں آئیں گی شاید۔ ان کی ایک ماموں زاد بہن ہے۔ امی کی ان سے بہت دوستی ہے۔ وہ بیوہ ہیں اور بے اولاد بھی، ہم اکثر ان کے پاس ملتان جاتے ہیں۔ وہ بھی یہاں آتی رہتی تھیں۔ ابھی جب ہم ملتان گئے تھے تو پتا چلا کہ انہیں کینسر ہے۔ وہ بہت بیمار تھیں، امی بہت دکھی ہوئی تھیں لیکن میری وجہ سے وہاں نہیں رہ سکتی تھیں ان کے پاس لیکن اب جب ابا ہسپتال میں ہیں تو میں ابا کے گھر آگئی ہوں۔ اماں کو ابا کے پاس ہسپتال رہنا ہوتا ہے۔ میرا ایک بھائی بہاولپور میڈیکل کالج میں پڑھتا ہے وہ آیا تھا لیکن وہ چلا گیا۔ اس کی تعلیم کا مسئلہ تھا چھوٹا کاکول گیا ہے اسی سال کمیشن ملا ہے اسے اور گھر میں سب سے چھوٹی بہن ہے چھٹی کلاس کی طالبہ۔ میں بہت کم ان سب سے ملی ہوں کئی سالوں بعد۔ وہ میری چھوٹی بہن ہے سوتیلی ہی سہی لیکن بہن ہے وہ میری، کیسے گھر میں دن رات اکیلی رہے۔ اماں ہسپتال میں رہیں یا گھر کو دیکھیں تو ان مشکل لمحوں میں مجھے لگا کہ مجھے ان کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ویک اینڈ پر میں ابا کے پاس رہ جاتی ہوں اور اماں گھر پر ریسٹ کرلیتی ہیں۔ پتا ہے جب میں ہسپتال جاتی ہوں تو ابا کی آنکھوں میں اتنی شکرگزاری ہوتی ہے کہ میں شرمندہ ہوجاتی ہوں تو میں نے امی سے کہا جب تک میں ابا کے گھر ہوں وہ آرام سے خالہ جانی کے پاس رہیں۔"
وہ میری محبت تھی میری چاہت اسے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ میں وارفتگی سے اسے تکتا تھا اور میرے یوں والہانہ پن سے تکنے پر وہ محجوب سی ہوجاتی تھی۔
"میں نے امی سے وعدہ کیا تھا قاسم کہ......" وہ یک دم پریشان سی نظر آنے لگی تھی۔
"لیکن میں آپ کی باتیں سننے لگی۔ منع نہ کرسکی۔"
"محبت آدمی کو ایسے ہی بے بس کردیتی ہے اور میرا یقین کرو میرے بابا میرے لیے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ میں جتنا اپنے بابا کو جانتا ہوں تم نہیں جانتیں، میں اگر بابا سے کہوں گا تو......"
"ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو لیکن......"
"سب فکریں میرے لیے چھوڑ دو ماہا! بس مجھے یقین دلا دو۔ میری محبت کو قبول کرلو ماہا!" اس نے میری طرف دیکھا اور کھڑی ہوگئی۔
"محبت اپنا آپ خود ہی منوالیتی ہے۔ اسے کسی یقین کی ضرورت نہیں ہوتی۔"
وہ چلی گئی اور اس کا یہ اعتراف مجھے پھر اندر تک سرشار کر گیا میں کتنی ہی دیر تک وہاں ہی بیٹھا خود کو یقین دلاتا رہا کہ اس نے میری محبت کو قبول کرلیا ہے وہ خود بھی...... اور اس روز میں کوئی بھی کلاس اٹینڈ کیے بغیر گھر واپس آگیا تھا محبت آدمی کی مت ماردیتی ہے۔
میں جوہی آنٹی کا شدت سے منتظر تھا مجھے بہت کچھ پوچھنا تھا ان سے میں نے کئی بار چاہا کہ ماہا سے اس تصویر کے متعلق پوچھوں یقیناً وہ جانتی ہوگی لیکن پھر سوچتا نہیں پہلے جوہی آنٹی سے ہی پوچھوں گا۔ مجھے ماہا کی عزت کا بہت خیال تھا اس لیے میں نے دوبارہ ماہا سے اس طرح اتنی دیر بات نہیں کی تھی۔ ہاں فون پر رات سونے سے کچھ دیر پہلے بات ہوجاتی تھی۔ وہ بھی میرے اصرار پر پہلی بار اس نے مجھے فون کیا تھا۔ ہر گزرتا دن ہماری محبت میں اضافہ کررہا تھا۔ میرے اندر ہر وقت ایک خاص خوشی اور سکون چمک دار موتیوں کی طرح بھرے رہتے تھے جھلمل جھلمل سے۔ میرا وجدان مجھ سے کہتا تھا کہ بالآخر ایک روز وہ اور میں...... میں اور وہ...... لیکن وہ کبھی ڈر جاتی پریشان ہوجاتی۔
"اگر ایسا نہ ہوسکا، اگر امی......!"
"کچھ نہیں ہوگا ماہا! مجھے یقین ہے ہم صرف ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ ہمیں قدرت نے ملایا ہے ماہا!"

''پتا ہے، امی اس روز ڈر گئی تھیں' جب میں نے ملتان والے رشتے سے منع کیا تھا۔ انہوں نے آپ کو گھر آنے سے منع کیا حالانکہ آپ کے آنے سے وہ کتنی خوش ہوتی تھیں یہ میں جانتی ہوں لیکن مجھے دکھ سے بچانے کے لیے انہوں نے اپنے دل پر پتھر رکھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ آپ نہیں آئیں گے تو میرے دل سے آپ کا خیال نکل جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا قاسم! اور میں اب کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

''تو کیا میں...... ماہا! میں بھی تمہارے بغیر نہیں جی سکوں گا لیکن تم خود کو پریشان نہ کرو۔ ان شاء اللہ سب اچھا ہوگا۔''

''آپ نہیں جانتے...... آپ کچھ بھی تو نہیں جانتے قاسم!'' وہ اپنی بات دہراتی۔

''تو تم بتا دو نا ماہا! جو تم جانتی ہوں۔'' میں بھی اپنی بات دہراتا اور وہ بات بدل دیتی۔ میں جانتا تھا کہ وہ جوہی آنٹی کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں بتائے گی اور مجھے جو کچھ جاننا تھا ان سے ہی جاننا تھا لیکن وہ آ نہیں پا رہی تھیں۔ وہ گھر میں اکیلی نہیں رہ سکتی تھیں کیونکہ اکثر ان کی طبیعت اچانک خراب ہو جاتی تھی اور ماہا کے ابا کی ٹانگ کا آپریشن ہوا پلیٹیں ڈالی گئیں۔ پھر ان کے سر کے زخموں میں انفیکشن ہو گیا حالانکہ بظاہر اسٹچز خشک ہو گئے تھے۔ ادھر جوہی آنٹی کی کزن کچھ زیادہ ہی بیمار ہو گئی تھیں اور مسلسل ہسپتال میں تھیں اور جوہی آنٹی آ نہیں پا رہی تھیں یوں بھی ماہا کی طرف سے انہیں اطمینان تھا۔ میں بھی اپنے فائنل ایگزیم کی تیاری میں مصروف ہو گیا تھا تاہم ماہا سے بات ہوتی رہتی تھی۔ میں نے اسے جب بتایا کہ دادی اور ماما انہیں جادوگرنیاں کہتی تھیں تو وہ بہت ہنستی تھی۔

''اور آپ کی ماما کی بات سچ ہو گئی قاسم! ہم نے آپ پر جادو کر دیا۔''

اور میں اس کی ہنسی کی آواز میں کھو سا جاتا تھا۔ اتنی خوب صورت ہنسی تھی اس کی پہلے' مجھے کبھی اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔

''تمہاری ہنسی ہمیشہ سے ایسی ہی تھی یا اب ہو گئی ہے ماہا!'' میں پوچھتا تو وہ شوخ ہو جاتی۔

''اب ہو گئی ہے آپ کی محبت پا کر۔''

''تمہیں اپنے روبرو کب دیکھوں گا ماہا! تمہاری ہنسی کو صرف سننا ہی نہیں چاہتا ہوں۔ پتا ہے ایک بار جب تم نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبا کر مسکرائی تھیں اور تمہاری آنکھوں میں شرارت تھی تو مجھے تمہارے چہرے سے نظر ہٹانا مشکل ہو گیا تھا۔ تمہاری مسکراہٹ سحر طاری کرتی تھی مجھ پر جادوگرنی، چپکے چپکے جادو کرتی رہی ہو مجھ پر، بے چاری میری اماں کی مجھے اس سحر سے بچانے کی ساری کوششیں بے کار گئیں۔

☆......֍......☆

ہم یوں ہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے اور خوش ہوتے تھے حتیٰ کہ میرے پیپرز شروع ہو گئے۔ ماہا کے ابا ہسپتال سے گھر آ گئے تھے لیکن جوہی آنٹی ابھی ملتان میں ہی تھیں کیونکہ ان کی کزن کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ جس روز میں آخری پیپر دے کر آیا تو ماما کے اصرار کے باوجود کھانا کھائے بغیر سو گیا تھا۔ اتنے دنوں کی تھکن تھی کہ پھر سویا تو آنکھ رات کو ماہا کی کال سے ہی کھلی۔

''امی آ گئی ہیں قاسم! اور میں بھی گھر آ گئی ہوں۔''

''ماہا!'' میرا دل یک دم اسے دیکھنے کو چاہا۔

''کتنے سارے دن ہو گئے ہیں تمہیں دیکھے ہوئے ذرا ٹیرس پر تو آؤ ایک جھلک دیکھ لوں۔ پچی بہت میٹھی اور پرسکون نیند آئے گی۔''

''یقین نہیں آتا قاسم! یہ آپ ہی ہیں، کتنے سنجیدہ اور خاموش طبع سے لگتے تھے آپ اور اب......''

''یہ اس محبت کا کمال ہے ماہا جس نے اچانک ہی میرے دل کو اپنا مسکن بنا لیا ہے۔ تمہاری محبت کا کمال ماہا۔''

وہ ہولے سے ہنسی تھی۔

''اوکے۔ میں آ رہی ہوں ٹیرس پر۔''

اور میں فون بند کر کے فوراً ہی باہر صحن میں آیا تھا اور عین اسی لمحے ٹیرس کی لائٹ جلی اور وہ ریلنگ کے پاس آئی تھی روشنی سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور وہ اس وقت اتنی حسین لگ رہی تھی کہ میں مبہوت سا اسے جانے کب تک دیکھتا رہتا اگر اچانک ہی اس نے ٹیرس کی لائٹ آف نہ کر دی ہوتی اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر واپس نہ مڑ گئی ہوتی۔ میں ابھی صحن میں ہی تھا کہ ماما بیڈ روم سے باہر آئیں۔

''تم کہیں جا رہے ہو قاسم!''

''نہیں ابھی آنکھ کھلی تھی تو ذرا ہوا خوری کے لیے باہر نکلا تھا۔

''دوپہر کو بھی تم کھانا کھائے بغیر سو گئے تھے۔ اب کھانا گرم کر دوں۔ تمہیں پتا ہے تمہارے بابا آٹھ بجے رات کا کھانا کھا لیتے ہیں۔ تمہیں جگانے سے منع کر دیا تھا کہ اتنے دنوں کی بے آرامی اور تھکن ہے۔''

''نہیں ماما مجھے بھوک نہیں ہے بالکل بھی بلکہ ابھی تک نیند کی کمی پوری نہیں ہوئی۔ شاید بھی پھر سو جاؤں۔''

''تو پھر دودھ پی لو۔''

''اوکے۔''

ماما دودھ گرم کرنے کچن میں چلی گئیں اور میں کمرے میں آ گیا۔ ماما کو کیا پتا کہ ماہا کی دید نے ساری بھوک پیاس ختم کر دی ہے۔ میں نے ماہا کو تھینکس کا میسج بھیجا اور ماما کا انتظار کرنے لگا۔

☆......֍......☆

صبح ایک بھرپور نیند لے کر اٹھا تو بہت فریش تھا۔ باتھ لے کر اور زبردست ناشتا کر کے جب میں تیار ہو کر گھر سے نکلا تو گیارہ بج رہے تھے۔ مجھے پہلے جوہی آنٹی کی طرف جانا تھا اور پھر جواد سے ملنے جانا تھا۔ وہ بھی کل کسی وقت اسلام آباد سے آ گیا ہوگا۔ جوہی آنٹی مجھے دیکھ کر حیران بھی ہوئیں اور ان کی آنکھوں میں ایک بے ساختہ خوشی سی بھی نظر آئی تھی مجھے۔

''سوری آنٹی میں آپ کے منع کرنے کے باوجود آ گیا لیکن مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے اور کچھ پوچھنا بھی ہے۔''

''قاسم بیٹا! آپ کا یہاں آنا، بیٹھنا اور ہماری چھوٹی چھوٹی باتوں میں دلچسپی لینا مجھے کس قدر خوشی دیتا تھا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ دل تو یہ ہی چاہتا تھا کہ باقی ماندہ عمر آپ کو دیکھتے آپ کو سنتے گزر جائے کہ شاید عمر بھر کی تشنگی کو کچھ آسرا ملے لیکن کبھی کبھی کچھ فیصلے دل کی مرضی کے خلاف کرنا پڑتے ہیں۔ میں نے بھی یہ فیصلہ دل کی مرضی کے خلاف کیا ہے۔ آپ مجھ سے یہ ہی پوچھنا چاہتے ہیں کہ میں نے آپ کو یہاں آنے سے کیوں منع کیا ہے۔ آپ کا یہاں آنا مجھے کبھی بھی برا نہیں لگا۔''

''آنٹی وہ......''

میں کہنا چاہتا تھا کہ میں کچھ اور پوچھنا چاہتا ہوں لیکن انہوں نے میری بات کاٹ دی۔

''بیٹا! پہلے میری بات سن لو۔ ماہا یوں بھی اس وقت یونیورسٹی میں ہے تو زیادہ کھل کر آپ سے بات ہو سکتی ہے۔ آپ کے دل کا حال تو مجھے معلوم نہیں لیکن ماہا میری بیٹی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آپ کے لیے پسندیدگی سے بڑھ کر کچھ دیکھا تو ڈر گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اتنا آگے بڑھ آئے کہ پھر پلٹنا مشکل ہو جائے اگر کسی جذبے کی کوئی کونپل اس کے دل میں پھوٹی بھی ہے تو اسے تناور درخت بننے سے پہلے ہی ختم کر دینا چاہیے کہ یہ تو طے ہے کہ اس راستے پر چل کر منزل کبھی بھی اس کا مقدر نہیں ہو سکتی۔ میں ماں ہوں قاسم بیٹے اور میں اسے اس تکلیف اور اذیت سے بچانا چاہتی ہوں جو اس راستے پر چلتے ہوئے اسے اٹھانا ہو گی اور صرف اسے ہی نہیں آپ کو بھی اس اذیت سے بچانا چاہتی ہوں میں کہ آپ بھی مجھے بہت عزیز ہو۔

''آپ ایک ماں ہیں آنٹی!''

میں نے ان کی پوری بات تحمل سے سنی تھی اور مجھے کچھ کہنا تھا۔ وہ جو میں کہنے کے لیے آیا تھا۔

''آپ نے یقیناً صحیح فیصلہ کیا لیکن شاید فیصلہ

کرنے میں آپ کو دیر ہوگئی اس لیے کہ جسے آپ ایک کونپل سمجھ رہی ہیں وہ کب کا ایک تناور درخت بن چکی۔'' میں نے ان کی طرف دیکھا ان کی رنگت یکدم زرد ہوگئی تھی۔

''ابھی کچھ نہیں بگڑا بیٹا! یہاں سے ہی واپس لوٹ جاؤ یہ راستے منزلوں کی طرف نہیں جاتے۔ ماہا کو میں سمجھا لوں گی۔ سمجھ جائے گی جانتی ہے سب۔ میں نے ہر لمحہ ہر آن آپ کی خوشیوں اور مسرتوں کے لیے دعا کی ہے پھر...... پھر آپ نے کب کیسے اس راستے پر قدم رکھ دیا۔ جو اتنا کانٹوں بھرا ہے کہ آپ کے پاؤں کو لہولہان کردے گا۔'' وہ بے حد مگر دل گرفتگی سے کہہ رہی تھیں۔

''آپ کی دعائیں رائگاں نہیں جائیں گی۔ ایک ماں کی دعائیں رائگاں جا ہی نہیں سکتیں پھر منزل پر پہنچنے کا یقین ہو اور لگن سچی ہو تو راستے کیسے بھی ہوں منزل ایک روز مقدر ہوتی ہے۔''

میں بہت پرسکون سا بیٹھا تھا۔

''نہیں بیٹا! یہ اتنا آسان نہیں بلکہ ناممکن ہے۔'' وہ مضطرب سی ہوگئی تھیں۔

''کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا آنٹی! کون سا ایک دوسرے کو قتل کیا ہے کہ ناراضیاں ختم ہی نہ ہوسکیں۔ میں بابا اور ماما کو لے کر آپ کے پاس آؤں گا۔''

''آپ انہونی باتیں کرتے ہو قاسم!'' انہوں نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔

''اگر آپ کے دل میں کوئی ایسا خیال پیدا بھی ہوا ہے تو خدارا اسے دل سے کھرچ دیں۔''

''کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر کو تو مٹایا جاسکتا ہے آنٹی! لیکن دل پر کندہ نقش مٹائے نہیں جاسکتے۔ آپ جسے ناممکن سمجھ رہی ہیں میری نظر میں وہ ناممکن ہرگز نہیں ہے۔ میرے ماما اور بابا مجھ سے بے حد، بے حساب محبت کرتے ہیں اور میری کسی بھی چھوٹی سی خواہش کو بھی پورا کرنے کے لیے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔'' میرے لہجے سے بابا اور ماما کی محبت کا مان جھلکتا تھا۔

''آپ نے مجھ سے تو یہ سب کچھ کہا ہے بیٹا لیکن ماہا سے کچھ مت کہنا۔ وہ بے وقوف لڑکی پھر سے اپنی آنکھوں میں خواب سجا بیٹھے گی۔ کتنی مشکلوں سے تو میں نے اسے سمجھایا ہے۔''

میرے لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ نمودار ہوکر معدوم ہوگئی۔ اب ان کو کیا پتا کہ اس سب کا یقین میں اتنی ہی بار اس کی ہتھیلیوں پر رکھ چکا ہوں۔

''آپ ان ساری باتوں کو چھوڑیں آنٹی! مجھے اتنا سا مان دے دیں۔ یقین کی ایک ننھی سی کرن میرے ہمراہ کردیں کہ جب بابا اور ماما، ماہا کے لیے آپ کے سامنے دامن پھیلائیں گے تو آپ انہیں مایوس نہیں لوٹائیں گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب اسی روز آپ کی سیڑھیوں پر قدم رکھوں گا جب ماما، بابا میرے ساتھ ہوں گے۔''

''قاسم! آپ کچھ نہیں جانتے کچھ بھی تو نہیں۔'' وہ پہلے ایسی بے بسی سے کہہ رہی تھیں۔

''ممکن ہے میں وہ سب کچھ نہ جانتا ہوں جو آپ جانتی ہیں لیکن مجھے اپنے ماما بابا اور اپنی محبت پر یقین ہے کہ حالات خواہ کیسے بھی رہے ہوں وہ میری خواہش رد نہیں کرسکتے۔''

''میں کیسے آپ کو سمجھاؤں قاسم! مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔''

''چھوڑیں آنٹی! کچھ بھی مت سمجھائیں۔ انتظار کریں اچھے وقت کا لیکن جانے سے پہلے آپ سے مجھے کچھ پوچھنا تھا۔ جب آخری بار میں یہاں آیا تھا تب سے ایک حیرت ایک سوال دل میں چھپائے ہوئے ہوں لیکن میں نے ماما، بابا، ماہا کسی سے کچھ نہیں پوچھا کیونکہ مجھے آپ سے پوچھنا تھا۔''

میں نے اس روز شادی کی تصویر دیکھنے والی بات بتا کر پوچھا۔

''آپ کی اور بابا کی شادی ہوئی تھی یہ تو ظاہر ہوگیا لیکن یہ شادی ٹوٹی کیوں تھی اگر آپ نہ بتانا چاہتیں تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ پوچھنے کا مقصد آپ کی یا بابا کی غلطیاں ڈھونڈنا نہیں ہے بس

تجسس ہے۔''

وہ میری بات سن کر جیسے ساکت ہوگئی تھیں۔

''سوری آنٹی! آپ کے لیے شاید یہ ذکر بہت تکلیف دہ ہے۔'' میں انہیں یوں ساکت بیٹھے دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ ''آپ ٹھیک تو ہیں نا؟''

''انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''یہ تکلیف تو میرے وجود کا حصہ بن چکی ہے۔ اب مزید تکلیف کیا ہوگی۔ ایک بار ماہا نے مجھ سے یہ ہی سوال کیا تھا اور جب آپ یہاں آنے لگے تھے تو میں سوچتی تھی شاید کبھی آپ بھی مجھ سے ایسا ہی سوال کرو اور مجھے آپ کے سوال کا جواب دینا پڑے لیکن پھر میں سوچتی تھی، نہیں بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کو کبھی اس شادی کا علم ہو۔''

''بعض اتفاقات بڑے عجیب ہوتے ہیں آنٹی!'' میں مسکرایا۔

''اگر آپ نہ بتانا چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔''

''نہیں ایسی بھی بات نہیں ہے قاسم! شاید کل پرسوں کبھی نہ کبھی آپ کو یہ سب کچھ بتانا پڑے کہ آپ نے جو سوچ رکھا ہے اس کا جب آپ گھر پر اظہار کریں گے تو یقیناً ایک پنڈورا باکس کھل جائے گا۔ میں نہیں جانتی میرے بارے میں کیا کیا کچھ کہا جائے گا۔'' وہ ایک دم بہت تھکی تھکی نڈھال سی لگنے لگی تھیں۔

''میں نہیں جانتی کہ ابا اور تایا ابا کے درمیان کب ہمارے رشتے کی بات ہوئی تھی لیکن میں نے جب ہوش سنبھالا تو مجھے علم تھا کہ میں ہاشم سے منسوب ہوں۔ ہم ایک ہی گھر میں کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ یہ والا پورشن کافی بعد میں ابا نے بنوایا تھا۔ ہم ایک گھر میں رہتے تھے اس لیے ایک دوسرے سے انسیت ہونا فطری تھا۔ قاسم اکلوتے تھے، مجھ سے چھوٹے اگرچہ دو بھائی اور تھے لیکن دونوں کا ہی کم عمری میں انتقال ہوگیا تھا۔ ایک سات سال کی عمر میں اور دوسرے کا گیارہ سال کی عمر میں، سو گھر میں ہم دو ہی بچے تھے۔ ہاشم اور میں ہمارے درمیان بے حد دوستی تھی۔ ہم دونوں اپنی ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔ جب تک میں ہاشم کو ہر بات بتا نہ دیتی مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ جب مجھے اپنے اور ہاشم کے درمیان موجود رشتے کا احساس ہوا تو مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب یہ انسیت محبت میں بدل گئی تھی۔ ہاشم بھی میرے لیے اتنا ہی حساس اور کیئرنگ تھا جتنی میں اس کے لیے، جب میں فرسٹ ایئر میں آئی تو مجھے احساس ہوا کہ تائی جان مجھے اور میری اماں کو پسند نہیں کرتیں بلکہ اگر کبھی وہ ہاشم کو مجھ سے بات کرتے دیکھ لیتیں تو بہانے بہانے ہاشم کو وہاں سے ہٹا دیتیں اور ڈھکے چھپے لفظوں میں مجھے بھی سنا جاتیں۔ اوپر والا پورشن مکمل ہوا تو ہم اوپر منتقل ہوگئے۔ تائی اماں بہت کم اوپر آتی تھیں شاید تایا ابا کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ تائی ہم سے بغض رکھتی ہیں اس لیے جب ان کی طبیعت ذرا خراب ہوئی تو انہوں نے ابا سے کہا کہ وہ میرا اور ہاشم کا نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ میں تب بی ایس سی میں تھی، ابا تایا ابا سے بہت محبت کرتے تھے اور انہوں نے اپنے بڑے بھائی کی کوئی بات کبھی نہیں ٹالی تھی۔

''مجھے تمہاری بھابھی پر اعتبار نہیں ہے وحید! میری آنکھ بند ہوتے ہی وہ اس رشتے سے مکر جائے گی۔ میں اپنی زندگی میں ہی دونوں کو نکاح کے مضبوط بندھن میں باندھنا چاہتا ہوں تاکہ میرے بعد وہ کوئی چوں چراں نہ کرسکے۔''

تایا نے ابا سے کہا تھا اور یوں میرا اور ہاشم کا نکاح ہوگیا تھا۔ رخصتی ہماری تعلیم مکمل کرنے کے بعد طے ہوئی تھی۔ وہ میری زندگی کے خوب صورت ترین دن تھے۔ آتے جاتے ہاشم کے ذومعنی جملے میرے اندر کے اس خوف کو وقتی طور پر ختم کردیتے تھے کہ تائی اماں مجھے پسند نہیں کرتیں۔ تایا ابا اور ہاشم تھے نا مجھے ہر مشکل سے بچانے والے لیکن تایا ابا کی زندگی نے وفا نہ کی۔ وہ ہمارے نکاح کے ٹھیک ایک سال بعد وفات پا گئے اور ان کے صرف چند ماہ بعد ابا بھی ان کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔ تائی اماں جو ابا کا بہرحال

کچھ لحاظ کرتی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد تو صاف صاف ہمیں سنانے کو کہتی رہتیں کہ وہ بہت جلد مجھے طلاق دلوادیں گی۔ میں آج تک نہیں جان سکی کہ وہ اماں کی اور میری اتنی دشمن کیوں تھیں۔ شاید وہ میری اماں کی خوب صورتی ذہانت، ایجوکیشن اور سلیقے سے جس کی اکثر تایا ابا تعریف کرتے تھے جلتی تھیں۔ کیا حسد میں کوئی اتنا دشمن ہوجاتا ہے کہ وہ کچھ کرے جو تائی جان نے میرے ساتھ کیا تھا۔ میں نے ایم ایس سی کرلیا تھا۔ ہاشم بھی اپنی تعلیم مکمل کرکے جاب کرنے لگے تھے۔ اماں نے میری رخصتی کی بات کی تو انہوں نے صاف اماں سے کہہ دیا کہ وہ ہرگز مجھے رخصت کرواکے نہیں لے جائیں گی اور جلد ہی ہاشم سے مجھے طلاق دلوادیں گی۔ ہاشم کی بیوی بننے کا حق صرف ان کی بھانجی ثریا کا ہے۔"

اماں جان نے ہاشم سے بات کی تو انہوں نے ہمیں تسلی دی کہ ہم پریشان نہ ہوں۔ انہوں نے اماں سے کہا تھا کہ "جوہی میری منکوحہ ہے۔ اگر ماں نہ مانیں تو میں ان کی مرضی کے بغیر بھی اسے رخصت کرواکے لے جاؤں گا لیکن میں جوہی کو اماں جان کی پوری رضا مندی اور خوشی کے ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں۔ ورنہ چاہوں تو ابھی ہاتھ پکڑ کر لے جاؤں اماں جان کیا کرلیں گی بھلا۔" اماں مطمئن ہوئی تھیں یا نہیں لیکن مجھے ہاشم پر یقین تھا کہ وہ جس طرح کہہ رہے ہیں ایسا ہی کریں گے لیکن وقت گزر رہا تھا مجھے ماسٹر کیے تین سال ہوگئے تھے۔ ہاشم تائی جان کو رضا مند نہیں کرسکے تھے۔ اماں جان نے ابا کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کرلی تھی۔ اماں اپنے اسکول اور ہاشم آفس چلے جاتے تو تائی اماں صحن میں آبیٹھتیں اور پھر وہ جو بولنا شروع کردیتیں تو ہاشم کے آنے تک بولتی رہتیں اور ایسی ایسی باتیں سناتیں کہ میرا جی چاہتا کہ اپنی زندگی ختم کرلوں۔ یہ بہت مشکل زندگی تھی اور ہاشم تھے کہ تسلی دیے جاتے۔ ایک روز اماں اسکول سے آئیں تو میں رو پڑی۔

"اماں! آپ تائی سے بات کریں وہ اس طرح تو ذلیل نہ کریں ہمیں۔"

اس روز اماں نے ہاشم کو اوپر بلا کر بات کی تھی۔ کیا بات کی تھی میں نہیں جانتی تھی۔ ہاشم نے کیا کہا تھا یہ بھی اماں نے نہیں بتایا تھا۔ اگلے روز سے گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہورہی تھیں اور ہم گرمیوں کی چھٹیوں میں ماموں کے پاس ملتان چلے جاتے تو کم از کم دو ڈھائی ماہ کے لیے تو سکون مل جاتا تھا۔ سو دوسرے دن ہی ہم ملتان آگئے۔ ماموں نے اماں سے کہا تھا۔

"ایسے کب تک چلے گا آپ جوہی کو کب تک بٹھائے رکھیں گی۔ ہاشم سے صاف بات کریں یا تو اسے رخصت کروالے یا پھر فارغ کردے تاکہ ہم مناسب عمر میں اس کی شادی کردیں۔ میرا بیٹا بھی ہے آپا فراز جوہی سے چھوٹا ہے تو کیا ایجوکیٹڈ ہے، اچھی جاب ہے۔ آپ جوہی کے لیے فکر نہ کریں بس ہاشم سے بات کریں۔"

اور میں ماموں کی بات سن کر رونے لگی۔ میں نے ہاشم کے علاوہ کبھی کسی اور کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ میرا نکاح ہاشم کے ساتھ ہوا تھا اور مجھے اسی کے ساتھ زندگی گزارنی تھی ورنہ نہیں۔ میں نے اماں سے صاف کہہ دیا تھا۔ فراز مجھ سے تین سال چھوٹا تھا اور میں نے ہمیشہ اسے اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہی سمجھا تھا۔

شاید ماموں نے ہاشم کے آفس میں فون کرکے ان سے بات کی تھی کہ ایک روز وہ ملتان آگئے اور انہوں نے ماموں سے کہا کہ "وہ اگلے ہفتے بارات لارہے ہیں اور مجھے ملتان سے ہی رخصت کرواکر لے جائیں گے ہاں ہوسکتا ہے ان کی والدہ بارات میں ان کے ساتھ نہ آئیں گو وہ اپنی پوری کوشش کریں گے لیکن انہیں یقین نہیں ہے کہ وہ آئیں گی۔ البتہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اسے رخصت کرواکے اپنے گھر ہی لے کر جاؤں گا۔"

اماں اور ماموں کچھ متذبذب سے تھے کہ تائی جان کے بغیر وہ کیسے مجھے رخصت کردیں گے۔

"یہ میری بیوی ہے میں اسے ابھی لے جاؤں تو آپ زبردستی روک نہیں سکتے لیکن میں عزت و احترام کے ساتھ روایتی طریقے سے اسے رخصت کرواکے لے جانا چاہتا ہوں۔" ہاشم نے ماموں سے کہا تو وہ راضی ہوگئے۔

اماں جان کو بالکل بھی یقین نہیں تھا کہ تائی اماں بارات کے ساتھ آئیں گی اور انہیں دیکھ کر اماں اور ماموں بے حد خوش ہوگئے تھے اتنے سارے دنوں میں پہلی بار میں نے ماموں اور اماں کے چہرے پر اطمینان دیکھا تھا۔ ماموں نے بہت خوشی سے تائی اماں کو سونے کے کڑے پہنائے تھے۔ میرے لیے تائی جان کا بارات کے ساتھ آنا بہت حیران کن تھا۔ ہاشم نے پتا نہیں انہیں کیسے رضا مند کیا تھا۔ بہرحال جیسے بھی کیا تھا وہ آگئی تھیں اور اپنے ننھیالی رشتہ داروں میں اماں کی اور میری عزت رہ گئی تھی۔ یہ راز تو شادی کے تیسرے دن کھلا تھا۔ اماں مطمئن تھیں۔ ہاشم اور میں بہت خوش تھے۔ ابھی ولیمے کی تقریب منعقد نہیں ہوئی تھی۔ ہاشم نے بتایا تھا کہ تائی جان نے ہفتے بھر بعد ولیمہ کی تقریب کرنے کو کہا ہے۔ شاید انہیں کچھ تیاری کرنا ہے اور شادی کے تیسرے دن ناشتے کی میز پر انہوں نے ہاشم سے کہا۔

"تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے اور وہ قسم جو تم نے کھائی تھی؟"

"کون سا وعدہ؟" ہاشم کو یاد نہیں آیا تھا تب وہ عجیب طرح سے ہنسی تھیں۔

"بڑی جلدی بھول گئے ہو تم، میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہاری شادی میں شریک ہونے کی تمہاری بات مان لیتی ہوں بدلے میں تمہیں بھی میری ایک بات ماننی ہوگی اور تم نے وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے قسم بھی لی تھی کہ تم میری بات مانو گے۔"

"جی اماں! آپ کہیے کیا بات منوانی ہے؟" ہاشم کا موڈ بہت خوش گوار تھا اور انہوں نے ہنستے ہوئے ان کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

اور اماں کی بات نے دوسرے ہی لمحے ان کی ہنسی چھین لی تھی۔

"جوہی کو طلاق دے دو یا تم ثریا سے شادی کرلو۔"

"اماں! کیا کہہ رہی ہیں آپ؟!" میں تو شاکڈ سی ہوکر انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"تم نے میری ایک بات ماننے کا وعدہ کیا تھا ہاشم! دونوں میں سے کوئی ایک بات تمہیں ماننی ہے ہاشم! طلاق یا ثریا سے شادی ورنہ میرا مرا منہ دیکھو گے۔"

وہ اپنے سارے مہرے بڑی مہارت سے چل رہی تھیں۔ وہ مجھ پر ایک طنزیہ نظر ڈالتی ہوئی اٹھ کر چل دی تھیں۔ پتا نہیں کتنی دیر ہم یوں ہی بیٹھے رہے، ناشتا ٹیبل پر پڑے پڑے ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ کیا خوشی کی عمر اتنی ہی کم تھی...... اتنی تھوڑی۔

ہاشم نے مجھے اپنے کمرے میں جانے کا کہہ کر خود تائی اماں کے کمرے میں چلے گئے تھے میں پتا نہیں کیسے اپنے کمرے تک آئی تھی اور کمرے میں آتے ہی میرے آنسو بہہ نکلے تھے۔ پھر پتا نہیں میں کتنی دیر تک روتی رہی بلکتی رہی۔ ہاشم بہت دیر کے بعد کمرے میں آئے تھے۔

وہ ہولے ہولے اپنی زندگی کی کہانی کے اوراق پلٹ رہی تھیں اور میں دم بخود بیٹھا سنتا تھا۔ میرے اندر جھکڑ چلتے تھے دادی کا یہ روپ میرا ذہن قبول نہیں کرتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں اور میں بھی ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ دادی کا جو تصور میرے ذہن میں تھا اس تصور میں دراڑیں سی پڑ گئی تھیں۔ کوئی ایک شخص کسی کے لیے بہت اچھا ہوتا ہے اور وہی شخص کسی دوسرے کے لیے بہت برا کیسی عجیب بات ہے۔ دادی مجھ سے بابا اور ماما سے اتنی محبت کرتی تھیں کہ میں سمجھتا تھا کہ دادی دنیا کی سب سے مہربان اور شفیق عورت ہیں۔

"ہاشم پریشان تھے اور تائی اماں نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ ہاشم کو ان کی بات قبول نہیں تھی اور وہ

اپنے مطالبے سے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھیں حتیٰ کہ ایک روز انہوں نے نیند کی کچھ گولیاں کھالیں ان کی آخری چال بہت کامیاب رہی تھی۔ ہسپتال میں جلد ہی انہیں ہوش آگیا تھا کیونکہ انہوں نے دو یا شاید تین گولیاں ہی کھائی تھیں۔ تب ہاشم گھر آئے تو رو پڑے۔

"مجھے بتاؤ جوہی! میں کیا کروں، میرے پاس کوئی راستہ نہیں رہا سوائے اس کے میں اپنی زندگی ختم کرلوں۔"

"آپ تائی جان کی بات مان لیں۔"

میں نے اس طرح روتے اور دل ہارے ہوئے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"کون سی بات جوہی! ایک بات کے تصور سے ہی روح ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتی ہے اور دوسری بات بھی مجھے قبول نہیں۔"

"آپ ثریا سے شادی کرلیں ہاشم! بس میرے ساتھ ناانصافی مت کیجیے گا۔"

جوہی آنٹی کی آنکھوں میں آنسو چمکے اور ان کی آواز بھرا گئی تو میں نے ان کے ہاتھ کو ہاتھوں میں لے کر ہولے سے تھپتھپایا۔

"آپ انہیں اجازت نہ دیتیں۔"

"ان کے پاس کوئی تیسرا آپشن تھا ہی نہیں قاسم! یوں میری شادی کے ٹھیک دس دن بعد ثریا آپی بھی ہاشم کی دلہن بن کر اس گھر میں آگئیں اور دوسرے دن ولیمے کا شاندار فنکشن ہوا لیکن اس ولیمے کی دلہن میں نہیں تھی۔ میں اوپر اماں کی گود میں سر رکھے روتی رہی۔ میری خوشیوں کی عمر کتنی تھوڑی تھی قاسم! میں نے شروع میں بہت کوشش کی کہ ثریا کے ساتھ مل جل کر رہوں۔ ہم دوستوں اور بہنوں کی طرح محبت سے رہیں تاکہ ہاشم بھی پرسکون رہیں کیونکہ ہر وقت ٹینشن میں رہتے تھے۔ میں نے اس صورت حال کو قبول کرلیا تھا اور اوپر منتقل ہوگئی تھی۔ ہاشم انصاف کرنے کی پوری کوشش کرتے تھے لیکن پھر بھی کبھی کبھی مچل جاتے۔

"کل چھٹی ہے نا، آج ادھر ہی رہ جاتا ہوں"۔

لیکن میں زبردستی بھیج دیتی میں نہیں چاہتی تھی کہ روز محشر وہ ہم دونوں کے درمیان انصاف نہ کرنے پر پکڑے جائیں۔" میں نے بے حد عقیدت سے انہیں دیکھا۔ ایک یہ جوہی آنٹی تھیں اتنی اعلا ظرف اور ایک دادی تھیں جو ساری زندگی میرے لیے شفقت و محبت کا پیکر رہی تھیں لیکن کس قدر ظالم اور بے درد۔

"ہماری شادی کو تین سال گزر گئے ان تین سالوں میں دو بار میں ماں بنی لیکن دونوں بار ہی میرے بچے دنیا میں آکر صرف چند سانس ہی لے سکے اور تائی کو ہمارے خلاف بولنے کا ایک اور موقع مل گیا۔

"اپنی ماں کی طرح مردہ بچے ہی پیدا کرے گی تیری بیوی! دودھ دینے والی گائے کی تو بندہ دولتیاں بھی سہہ لیتا ہے۔ اسے رکھنے کا فائدہ۔"

وہ ہاشم سے اتنی بلند آواز میں کہتیں کہ آواز اوپر تک آتی تھی۔ اماں رو پڑتیں۔

"کاش میں تمہارے ماموں کی بات مان لیتی۔ یہ روز روز کی اذیت برداشت نہیں ہوتی مجھ سے جوہی۔"

ہماری شادی کو پانچ سال ہوگئے تھے ان دنوں میری طبیعت بہت خراب تھی جب ہاشم کو تین چار ماہ کے لیے کمپنی کی طرف سے کسی ٹریننگ کے لیے باہر جانا پڑا۔ یہ وقت ہمارے لیے بہت مشکل تھا۔ ایک بار رات کو میری طبیعت خراب ہوگئی تو اماں کے لیے مشکل ہوگیا تھا کہ وہ آدھی رات کو مجھے ہسپتال لے کر جائیں۔ انہوں نے ماموں سے ذکر کیا تو ماموں نے کہا کہ جب تک ہاشم باہر ہیں ہم ملتان آجائیں۔ جب سے ہاشم گئے تھے دو بار ان کا فون آیا تھا ان دونوں اس طرح فون کی سہولت نہیں تھی موبائل فون عام نہیں تھے۔ وہ خود ہی دس دن بعد فون کرکے اپنی خیرت بتادیتے تھے۔ ہم ان سے رابطہ نہیں کرسکتے تھے اس لیے ہاشم کو بتا نہیں سکے تھے اور ماموں کے ساتھ ملتان آگئے پتا نہیں تائی جان نے ان سے کیا کہا

کہا اور ان کا فون آنے پر انہیں کون سی کہانیاں بنا کر سنائی تھیں کہ انہوں نے بہت غصے سے ملتان فون کیا کہ کس کی اجازت سے میں ملتان آئی ہوں اور میری بات سنے بغیر یہ کہہ کر فون بند کردیا کہ وہ واپس آکر ہی بات کریں گے۔ میں چاہتی تھی کہ جو بھی ہو میں واپس گھر چلی جاؤں میں ہاشم کی خفگی سے ڈرتی تھی لیکن مسلسل ٹینشن اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے میری طبیعت اتنی خراب رہنے لگی تھی کہ ماموں نے مجھے جانے نہیں دیا۔ تائی جان کے ایک کزن کے بیٹے ملتان میں ہی رہتے تھے۔ وہ اکثر ماموں کے گھر چلے آتے میری خیریت پوچھتے، ان کی شہرت کچھ اچھی نہ تھی اس لیے ماموں کو ان کا آنا پسند نہ تھا۔ خود وہ مجھے بھی انتہائی برے لگتے تھے لیکن ہم انہیں گھر آنے سے منع نہیں کرسکتے تھے کہ وہ کہتے تھے ہاشم بھائی نے مجھے بھابھی کی خیر خبر لیتے رہنے کی تاکید کی ہے۔ دوسری طرف تائی بھی اس بات کو لڑنے کا بہانہ بنا سکتی تھیں کہ ہم ان کے بھتیجے کو گھر آنے سے منع کردیا ہے۔ اس روز بھی میں اپنے کمرے میں سو رہی تھی مامی مارکیٹ گئی ہوئی تھیں اور اماں باہر تھیں کہ وہ آگئے۔ اماں کچھ دیر ان سے باتیں کرتی رہیں اور پھر انہیں بٹھا کر ان کے لیے چائے بنانے کچن میں گئیں اور وہ میرے کمرے میں آگئے۔ مجھے تو خبر بھی نہیں ہوئی تھی ان کے آنے کی کیونکہ رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے میں بہت گہری نیند سو رہی تھی۔ اماں چائے بنا کر لائیں تو انہیں باہر نہ پا کر سمجھا کہ وہ جاچکے ہیں اور وہ وہاں ہی بیٹھ کر اپنا کام کرنے لگیں تب ہی ہاشم آگئے، بالکل اچانک اماں حیران رہ گئیں جب ہاشم نے میرا پوچھا تو اماں نے بتایا کہ کمرے میں سو رہی ہے۔ ہاشم کمرے میں آئے تو نصیر کو میرے بیڈ کے پاس کھڑا دیکھ کر آپے سے باہر ہوگئے۔

"تو یہاں رنگ رلیاں منائی جارہی ہیں۔"

وہ اتنی بلند آواز میں بولے تھے کہ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور ابھی ہاشم کو دیکھ کر خوش بھی نہ ہوپائی تھی کہ انہوں نے اپنی زبان سے میرے لیے وہ لفظ نکالے جن کی اذیت آج بھی میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہے۔ انہوں نے کہا "وہ میرے جیسی بدکردار عورت کو دوبارہ کبھی دیکھنا نہ چاہیں گے۔"

آنسو ان کے رخساروں پر پھیل آئے تھے۔

بالکل غیر ارادی طور پر ایک بار پھر میں نے ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

"تو کیا پھر بابا نے آپ کو طلاق دے دی تھی۔"

میرا دل جیسے ان کے غم میں رو رہا تھا۔

"نہیں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"انہوں نے کہا تھا نہ وہ مجھے ساری زندگی طلاق دیں گے اور نہ کوئی تعلق رکھیں گے اور یہ ہی میری بدکرداری کی سزا ہے۔"

وہ رو رہی تھیں اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں ان کے لیے کیا کروں۔ کیسے ان کے اس دکھ کا ازالہ کروں جس کا سبب میری دادی اور بابا تھے۔

"جہاں اتنا کچھ بتادیا ہے وہاں باقی حقیقت بھی بتادیں۔"

ماہا اسی وقت یونیورسٹی سے آئی تھی اور میں اس قدر توجہ سے جوہی آنٹی کی باتیں سن رہا تھا کہ مجھے اس کے آنے کی خبر تک نہیں ہوئی۔

"نہیں...... ماہا نہیں۔" آنٹی نے بے اختیار کہا تھا۔ "جو باب بند ہوچکا اسے اب مت کھولو۔"

"نہیں ماہا! مجھے بتاؤ وہ حقیقت جو تمہیں بتانے سے آنٹی منع کررہی ہیں۔" میں نے الجھ کر کہا تھا۔

"ماہا! تم جانتی ہو میں نے قسم کھائی تھی۔"

"قسم آپ نے کھائی تھی امی، میں نے نہیں۔"

ماہا نے جوہی آنٹی کو جواب دے کر میری طرف دیکھا۔

"بہت تلخ بہت کڑوی حقیقت ہے قاسم!" ماہا کے لبوں پر بڑی تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"امی نے آپ کو یہ بتایا کہ ان کی طبیعت بہت خراب رہتی تھی اس لیے وہ ملتان چلی گئی تھیں لیکن انہوں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ وہ تیسری بار ماں بننے جارہی تھیں اور یہ بات آپ کی دادی کو گوارا نہ تھی

کیونکہ ڈاکٹر نے صاف بتا دیا تھا کہ ثریا آنٹی کبھی ماں نہیں بن سکتیں اور آپ کی دادی سارا دن صحن میں بیٹھ کر بلند آواز میں امی اور بی جی کو کوستے رہتیں۔"

ماہا پتا نہیں کیا کہہ رہی تھی لیکن میرا ذہن تو اسی ایک جملے میں اٹک گیا تھا۔ ماما ماں نہیں بن سکتی تھیں تو میں...... میں کون تھا۔ کیا وہ میرے حقیقی والدین نہیں ہیں۔ میری ماما اور بابا کیا انہوں نے مجھے اڈاپٹ کیا تھا، کسی یتیم خانے سے، ایدھی ہوم سے...... میں لمحوں میں بے سایہ ہو گیا تھا۔ بے وقت۔ کسی حقیر تنکے کی طرح میرا سارا غرور سارا مان مٹی میں مل گیا تھا خاک ہو گیا تھا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا میں نے بے یقینی سے جوہی آنٹی کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے گود میں رکھے اپنے ہاتھوں میں دیکھ رہی تھیں۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا اور آنکھوں میں ریت سی بھر گئی تھی۔ یہ ماہا نے کیا ظلم کیا تھا لمحوں میں مجھ سے میرے رشتے چھین کر مجھے تپتی زمین پر کھڑا کر دیا تھا۔

"کیا میں بابا...... کیا بابا ماما میرے حقیقی والدین نہیں ہیں؟" میرے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی تھی۔ جوہی آنٹی نے چونک کر سر اٹھایا تھا اور میرا بازو ہولے سے تھپتھپایا تھا۔

"آپ ہاشم کے ہی بیٹے ہو۔"

وہ میرا بازو تھپتھپا رہی تھیں ان کی آواز کسی ٹھنڈی میٹھی پھوار کی طرح میرے دل پر گری۔ میرا جی چاہا کہ وہ بار بار کہیں کہ میں ہاشم سعید کا بیٹا ہوں، میں نے ماہا کی طرف دیکھا وہ صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

"ہاں آپ ہاشم انکل کے سگے بیٹے ہیں لیکن ثریا آنٹی آپ کی سگی ماں نہیں ہیں۔ آپ کی سگی ماں آپ کو جنم دینے والی میری امی ہیں۔" اس نے جوہی آنٹی کی طرف اشارہ کیا۔

"جسے بدکردار کہہ کر ہاشم انکل ان کے ایک ماہ کے بیٹے کو کاٹ میں سے اٹھا لے آئے تھے۔" ماہا نے ایک اور بم مجھ پر گرایا تھا۔

"بی جی اور امی ان کے پیچھے بھاگی تھیں لیکن وہ...... ان پر کسی التجا کا اثر نہیں ہوا تھا۔ آپ کی دادی نے جو بساط بچھائی تھی اس پر سارے مہرے انہوں نے اپنی مرضی سے چلائے تھے اور کامیاب ہو گئی تھیں۔" میں نے جوہی آنٹی کی طرف دیکھا انہوں نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لی تھیں اور ہونٹ بھینچ لیے تھے لیکن بند آنکھوں سے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔

"امی جان اور بی جی اس روز ماموں کے ساتھ لاہور آئی تھیں۔ وہ آپ کی دادی کے پاؤں پر گر گئیں، منتیں کیں کہ ان کا بچہ انہیں دے دیں وہ ہاشم کی انکل کی زندگی سے نکل جائیں گی اور کبھی مڑ کر یہاں اس شہر میں نہیں آئیں گی لیکن آپ کی دادی تو اس وقت ہٹلر بنی ہوئی تھیں۔ انہوں نے امی کو دھتکار دیا اور جب امی کے ماموں جان نے کہا کہ وہ عدالت کے ذریعے بچے کو لے لیں گے تو آپ کی دادی صاحبہ نے فرمایا کہ اگر انہوں نے عدالت میں کیس کیا تو عدالت تو بعد میں فیصلہ کرے گی وہ بچے کا گلا خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیں گی بھلے وہ ان کی نسل کا امین ہی کیوں نہ تھا اور امی...... میری امی نے آپ کی زندگی کی خاطر اپنے دل پر پتھر رکھ لیا اس ماں کی طرح جو بچے کو دو ٹکڑے کر دینے کا فیصلہ سن کر اپنے دعوے سے دست بردار ہو گئی تھی۔" ماہا بول رہی تھی اور میرے کانوں میں اس کی آواز جیسے بہت دور سے آتی تھی۔

"ماموں نے ہاشم انکل کو سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن ان کے اندر اتنا زہر بھر دیا گیا تھا کہ وہ کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ تھے۔ انہوں نے عدالت کے ذریعے بچہ لے لینے کی دھمکی تو ہاشم انکل کو دی لیکن وہ جانتے تھے کہ ایسے معاملات میں عدالت میں جانے سے کتنی خواری ہوتی ہے، وکیل کس بے دردی سے کردار کے پرخچے اڑاتے ہیں۔ اس ماں کی زندگی کیسے گزری ہو گی قاسم! جس کا بیٹا اس سے چھین لیا گیا ہو اور جو فریاد بھی نہ کر سکتی ہو۔ جس کے پاس مستقبل کی بھی کوئی امید نہ ہو اور جو اس کی زندگی کی قیمت پر قسم کھا بیٹھی ہو، وہ عمر بھر یہ ظاہر نہیں کرے گی کہ وہ اس

کا بیٹا ہے۔ آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے قاسم! میں نے دیکھی ہے وہ حالت، تپتی دوپہروں اور سرد شاموں میں ٹیرس کے گرم اور ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر پلنگ کے پیچھے سے وہ اپنے بچے کو دیکھ کر اپنی ممتا ٹھنڈی کر لی تھیں اور اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھنٹوں دھوپ اور ٹھنڈ سے بے نیاز بیٹھی رہتی تھیں اور آدھی آدھی رات تک اس کی زندگی اور صحت کی دعائیں کرتی تھیں۔"

میں ساکت بیٹھا تھا یوں جیسے میرا وجود پتھر میں ڈھل گیا تھا لیکن میرے اندر دھول تھی اور میں جیسے کسی بڑی بیس منزلہ عمارت کے نیچے دبا جاتا تھا۔ میرے بابا میرا آئیڈیل تھے۔ میری دادی وہ شفقت و محبت کا پیکر، ماما جن کے لب ہر وقت میرے لیے دعا کرتے سب کے وہ بت دھڑام سے میرے اندر گر گئے تھے اور میں جیسے اس ملبے کے نیچے دبا مشکل سے سانس لیتا تھا۔ وہ سب لوگ جنہیں میں پوجنے کی حد تک چاہتا تھا وہ سب لوگ کیا نکلے تھے، ظالم، جفاکار سازشی...... نہیں میرا دل اس سچ پر یقین نہیں کرتا تھا روتے روتے جوہی آنٹی نے یکدم میری طرف دیکھا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن میں بے حس سا خالی خالی نظروں سے انہیں تکتا تھا۔ تب یکدم انہوں نے مجھے گلے لگا لیا۔ وہ مجھے چوم رہی تھیں رو رہی تھیں۔ اور ان کی آواز جیسے میرے پتھر ہوئے وجود میں زندگی دوڑاتی تھی۔

"میرا بیٹا...... ماہا صحیح کہہ رہی ہے تم میرے بیٹے ہو میں نے تمہیں جنم دیا ہے۔ تمہاری خوش خبری ملنے کے بعد سے تمہاری پیدائش تک کا ایک ایک لمحہ میں نے سہم سہم کر گزارا۔ میرا بچہ صحت و زندگی والا دینا میرے مولا! دعائیں مانگتے مانگتے میرے ہونٹ خشک ہو جاتے تھے قاسم تم میرے بیٹے ہو میں ہوں تمہاری ماں۔"

"امی......" میرے لبوں سے بمشکل نکلا تھا اور میری پتھر ہوئی آنکھوں میں ایک آنسو چمکا تھا اور پھر جیسے سیلاب آ گیا۔ میں انہیں گلے لگائے رو رہا تھا۔

"آپ کے منہ سے یہ لفظ سننے کے لیے میں کتنا ترسی ہوں قاسم!" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"جب جب آپ مجھے آنٹی کہتے تھے تو میرا دل فریاد کرتا تھا، میں تمہاری ماں ہوں قاسم! مجھے آنٹی مت کہو۔" ماہا پتا نہیں کب وہاں سے کچن میں گئی تھی اور کب چائے بنا کر لے آئی تھی۔

"بس اب ماں بیٹا یہ رونے دھونے کا سین ختم کریں اور گرما گرم چائے پئیں۔" اس کی شوخ آواز سے میں چونک کر سیدھا ہو گیا اور ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے میں نے بے حد شاکی نظروں سے اسے دیکھا اور دل میں کہا۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا، بہت ظلم کیا مجھ پر، کیا تھا اگر یہ جو چھپا تھا چھپا رہتا۔ میرا وجود اس طرح تقسیم در تقسیم تو نہ ہوتا، میں ٹکڑوں میں بٹ رہا تھا۔ میرے اندر ابھی بھی بہت ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی، میں یک دم اٹھا اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکا۔

"قاسم...... قاسم رکو...... بات سنو...... کہاں جا رہے ہو؟" ماہا اور جوہی آنٹی ایک ساتھ میرے پیچھے آئی تھیں لیکن میں جیسے ان کی بات سنے بغیر نیچے اترتا چلا گیا۔



میں اس طرح وہاں سے کیوں بھاگ آیا تھا، مجھے خود نہیں معلوم تھا۔ میں شاید یہ حقیقت قبول کرنے سے خوف زدہ تھا کہ میں ماما کا نہیں جوہی آنٹی کا بیٹا ہوں۔ میرا دل اس بات کو مانتا بھی تھا اور انکار بھی کرتا تھا شاید میں ماما اور بابا سے تصدیق کرنا چاہتا تھا شاید میرے دل میں کہیں یہ امید تھی کہ بابا اور ماما کہہ دیں گے یہ جھوٹ ہے، غلط ہے، میں ماما کا ہی بیٹا ہوں۔ مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا، میں یقین و بے یقینی کی مشکل کیفیت میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف ماما اور بابا کی شدید محبتیں تھیں جو میں بچپن سے محسوس کرتا آ رہا تھا، دوسری طرف جوہی آنٹی کے وہ آنسو، وہ کرب جو میں ان کے چہرے پر بکھرتے دیکھا تھا جب ماہا بتا رہی تھی کہ بابا نے مجھے ایک ماہ کے بچے کو ان کی گود

سے چھین لیا تھا۔ میں ان دو شدید جذبوں کے درمیان پس رہا تھا جیسے کسی نے میرا وجود چکی کے دو پاٹوں کے درمیان دبا دیا ہو۔

میں کچھ دیر اپنے گھر کے گیٹ کے پاس یوں ہی کھڑا رہا پھر گیٹ دھکیلتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا تھا۔ گیٹ کھلا تھا اس کا مطلب تھا شاید بابا آج جلدی گھر آ گئے، ابھی تو شاید تین بجے تھے ورنہ وہ عموماً پانچ بجے تک گھر آتے تھے۔

میں نے بھاری دل لیے لاؤنج میں قدم رکھا، بابا اور ماما ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ جہاں کسی مارکیٹ پر ہونے والے خودکش حملے کے متعلق بتایا جا رہا تھا، اینکر اتنا پرجوش ہو کر تفصیلات بتا رہا تھا جیسے خودکش حملے میں اموات نہ ہوئی ہوں کرکٹ ٹیم نے کوئی میچ جیتا ہو۔ غالباً اس لیے بابا جلدی آ گئے تھے کہ جس مارکیٹ کا نام لیا جا رہا تھا وہ بابا کے آفس کے نزدیک ہی تھی۔

''آپ کہاں تھے قاسم! آپ کی ماما بے حد پریشان ہو رہی تھیں۔''

میرے لاؤنج میں قدم رکھتے ہی بابا نے مڑ کر مجھے دیکھا تھا اور پھر میری سوجی آنکھیں، چٹخا ہوا چہرا دیکھ کر یک دم گھبرا کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''کیا ہوا قاسم! آپ ٹھیک تو ہیں ناں' کہیں آپ اُدھر مارکیٹ میں ہی تو نہیں تھے۔''

''کاش میں وہاں ہوتا بابا! اور اس خودکش حملے میں میرا وجود بھی پاش پاش ہو چکا ہوتا۔'' میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''قاسم......'' بابا نے متوحش ہو کر مجھے دیکھا۔

''میں آپ کو بہت آئیڈلائز کرتا تھا بابا! آپ میرے نزدیک دنیا کے سب سے اچھے بابا تھے۔'' میری آواز گر سی گئی تھی۔

''قاسم میری جان!'' انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن میں نے آہستگی سے ان کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا۔

''لیکن آپ نے کیا کیا بابا! میرا دل یقین نہیں کرتا...... کر ہی نہیں سکتا کہ آپ اتنے ظالم ہو سکتے ہیں کہ ایک ماں سے اس کا بیٹا چھین لیں۔''

''قاسم بیٹا! میری بات سنو...... تمہاری ماں ایک بد......''

''بس بابا!'' میں نے دایاں ہاتھ ذرا سا بلند کیا تھا۔

''میری پاک باز ماں کے متعلق ایک لفظ بھی مت کہیے گا۔'' ان کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

''کاش آپ میری ماں پر الزام لگانے کے بجائے یہ کہتے کہ یہ جھوٹ ہے، غلط ہے۔''

میں لب بھینچے انہیں دیکھ رہا تھا اور میرا وجود جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر رہا تھا۔ میں شاید ان سے یہ ہی سننے کی توقع کر رہا تھا شاید میرے دل میں ایک آس تھی، ایک امید تھی کہ وہ ماما کی کہی گئی بات کو جھٹلا دیں گے

''قاسم بیٹا! ایک بات بیٹھ کر اطمینان سے ہماری بات سن لو۔'' اب کے ماما نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا لیکن میں نے آہستگی سے ان کا ہاتھ بھی ہٹا دیا۔

''ہزار پردوں میں بھی چھپائیں تو حقیقت کبھی نہ کبھی ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔''

''قاسم میں نے تمہیں جنم نہیں دیا ہے لیکن میں نے تمہیں پالا ہے۔ راتوں کو تمہارے لیے ایسے ہی جاگی ہوں جیسے ایک ماں جاگتی ہے۔ تمہاری ذرا سی تکلیف پر ماں کی طرح ہی تڑپی ہوں۔''

''مانتا ہوں لیکن آپ نے ایک دوسری عورت کی گود اجاڑ کر اپنی گود آباد کی ماما! لیکن دوسروں کی روشنی چرا کر اپنے گھر میں دائمی اجالا نہیں کیا جا سکتا ماما!'' میری آواز ٹوٹ سی گئی تھی۔ ماما، بابا ساکت کھڑے تھے اور ان کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔ میں نے ایک تاسف بھری نظر ان پر ڈالی اور تیزی سے لاؤنج سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

مجھے کیا کرنا تھا، کیا مجھے یہاں رہنا چاہیے تھا یا اس ماں کی آنکھیں ٹھنڈی کرنا چاہیے تھیں جو چوبیس سال سے میرے لیے ترس رہی تھیں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا پھر بھی میں بیگ میں اپنے کچھ کپڑے اور ضرورت کی چیزیں ڈال کر باہر نکلا تو وہ دونوں اس طرح لاؤنج میں بیٹھے تھے جیسے سرِ راہ عمر بھر کی پونجی لٹا بیٹھے ہوں۔ میں ایک دکھ بھری نظر ان پر ڈالتا لاؤنج سے نکلتا چلا گیا شاید ماما نے پیچھے سے آواز بھی دی تھی اور وہ اٹھ کر میرے پیچھے بھی آئی تھیں لیکن بابا نے انہیں روک دیا تھا۔ میں بیگ اٹھائے جب اوپر والے پورشن میں آیا تھا ماہا اور جوہی آنٹی اسی طرح لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ جوہی آنٹی...... نہیں بلکہ جوہی امی کا ہاتھ ماہا کے ہاتھوں میں تھا اور وہ ہولے ہولے نرم نرم لفظوں میں کچھ کہہ رہی تھی۔

''میں آ گیا ہوں جوہی ماما!'' میں نے اپنا بیگ لاؤنج کے درمیان رکھا اور خود تھکا تھکا اور نڈھال سا صوفے پر گر سا گیا۔

''قاسم میرے بچے......!'' جوہی امی بے قراری سے اٹھ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں اور انہوں نے میرا سر سینے سے لگا لیا تھا۔ مجھے ان کے سینے سے لگ کر بہت سکون ملا اور میں نے آنکھیں موند لی تھیں، وہ ہولے ہولے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

''آپ کے پاس کوئی سکون آور ٹیبلٹ ہو تو مجھے دے دیں، میرے اعصاب چیخ رہے ہیں۔'' ماما فوراً ہی پانی اور گولی لے آئی تھیں اور میں لاؤنج میں ہی گولی پانی سے نگل کر صوفہ کم بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ میں نے ماہا کی طرف نہیں دیکھا تھا شاید میں دل میں اس سے ناراض تھا حالانکہ اس سے ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس نے تو وہی بتایا تھا جو سچ تھا لیکن اس سچ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا، سنبھلنے میں کچھ تو وقت لگنا تھا۔

''ناراض ہیں قاسم!''

''نہیں۔'' میں نے آنکھیں موند لی تھیں۔

☆......❁......☆

اگلے چھ سات روز میں گھر سے باہر نہیں نکلا تھا، میں نے فون آف کر رکھا تھا۔ مجھے کسی سے بات نہیں کرنا تھی نہ کسی کی بات سننا تھا۔

مجھے یہاں آئے سات روز ہو گئے تھے، میں ٹیرس پر تولیہ اٹھانے گیا تھا جب میری نظر بابا پر پڑی، وہ گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ اتنے سے دنوں میں جیسے وہ بہت بوڑھے اور بیمار لگنے لگے تھے۔ صدیوں کے مریض، میرے دل کو کچھ ہوا تھا عین اسی لمحے انہوں نے مجھے دیکھا تھا، ان کی آنکھوں میں حسرت تھی، کرب تھا۔ میں یک دم پیچھے ہٹ گیا تھا یہ بہت مشکل تھا اس طرح یہاں رہ کر انہیں دور سے دیکھنا، بہت مشکل اور اذیت ناک تھا۔

ماہا یونیورسٹی میں تھی امی کچن میں، ان سات دنوں میں انہیں اب میں امی کہنے لگا تھا۔ میرے امی کہنے پر ان کے چہرے پر جو رنگ بکھرتے تھے وہ مجھے لمحہ بھر کے لیے مبہوت کر دیتے تھے۔ میں کچن میں ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

''امی میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔''

''کیا؟'' ان کے ہاتھ سے پلیٹ نیچے گر پڑی اور وہ پریشان سی ہو کر مجھے دیکھنے لگیں۔

''امی جان! میں سوچ رہا ہوں ملک سے باہر چلا جاؤں، آسٹریلیا یا کینیڈا کہیں بھی۔ میرے کچھ دوستوں کا بھی پروگرام تھا ایجوکیشن ویزا اپلائی کرنے کا۔''

''نہیں قاسم! اس طرح مت کرو، عمر بھر کی تشنگی چند دنوں میں تو ختم نہیں ہوتی بیٹا!''

''لیکن یہاں رہ کر بابا......''

''میں جانتی ہوں، محسوس کر سکتی ہو، آپ کی اذیت کو۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑے پکڑے مجھے باہر لاؤنج میں لے آئیں۔

''بیٹا! انہیں معاف کر دو، اللہ کو معاف کر دینا بہت پسند ہے قاسم! اور رضیہ آپا (جواد کی امی) نے مجھے بتایا تھا تمہاری ماما بہت بیمار ہیں اور تین چار دن سے ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔''

میرے دل پر جیسے کوئی ہاتھ پڑا تھا، وہ بیمار تھیں ہسپتال میں تھی اور میں...... میں ان کے پاس نہیں تھا۔ ذرا سا سر میں درد بھی ہوتا تھا تو میں گھبرا جاتا تھا، اس

وقت تو ان کے پاس سے نہیں اٹھتا تھا جب تک وہ ٹھیک نہیں ہوجاتی تھیں، میرے پاس رشتے ہی کتنے تھے بس ماما اور بابا......

''کیسے معاف کردوں امی جان! جب ان کے سامنے جاؤں گا تو مجھے وہ سب کچھ یاد آجائے گا جو انہوں نے دادی جان کے ساتھ مل کر آپ کے ساتھ کیا۔''

''آپ کے معاف نہ کرنے سے میرے گزرے ہوئے ماہ و سال واپس نہیں آسکتے قاسم! جو اذیت سہنی تھی وہ سہہ لی۔ آپ انہیں معاف کردیں گے تو آپ کو بھی سکون مل جائے گا اور باقی سب کو بھی۔ پالنے کی محبت بھی بہت ظالم ہوتی ہے قاسم! جنم تو میں نے آپ کو دیا ہے لیکن پالا تو انہوں نے ہے نا، یقیناً آپ کی جدائی نے انہیں بیمار کرڈالا ہے۔''

میں نے امی جان کی بات کا جواب نہیں دیا تھا لیکن کچھ دیر میں ہسپتال میں ریسپشن پر کھڑا ان کے کمرے کا نمبر پوچھ رہا تھا۔

جب میں دستک دے کر ان کے کمرے میں داخل ہوا تو بابا بیڈ کی طرف رخ کیے کھڑے تھے اور شاید سہارا دے کر انہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ ماما کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ بابا نے مڑ کر مجھے دیکھا، ستا ہوا زرد چہرہ۔

''قاسم بچے...... مجھے معاف کردو۔'' وہ اس طرح ہاتھ جوڑے اٹھنے کی کوشش کررہی تھیں، میں لب سیے کھڑا تھا۔

''قاسم! آپ کو حقیقت کا علم نہیں، ٹھیک ہے ہم نے غلط کیا لیکن......''

''میں نے کہا تھا نا بابا! میں نے کچھ نہیں سننا، اپنی ماں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں۔'' میں ایک قدم آگے بڑھ کر ماما کے بیڈ کے پاس کھڑا ہوگیا۔

''ماما! آپ اپنی زبان سے وہ سچ بابا کو بتادیں جو بابا نہیں جانتے۔ آپ تو خود اس کھیل کی ایک کھلاڑی تھیں جسے آپ کی پیاری خالہ جان نے ترتیب دیا تھا۔ میں وعدہ کرتا ہوں میں سب کچھ بھول جاؤں گا، آپ میرے لیے اتنی ہی محترم اور اتنی ہی عزیز ہوں گی جیسے پہلے تھیں۔''

''قاسم! اپنی ماما کو ڈسٹرب مت کرو، وہ بار بار بے ہوش ہوجاتی ہیں تم نہیں جانتے۔'' بابا نے مجھے کچھ بھی کہنے سے منع کرنے کی کوشش کی تھی۔

''مجھے اپنی ماں کے دامن پر لگے داغ کو دھونا ہے بابا پلیز...... ماما اعتراف کرلیں گی تو ان کی یہ بے ہوشی ختم ہوجائے گی۔ ان کے احساس جرم نے انہیں بیمار کرڈالا ہے جس کا مطلب ہے ان کا ضمیر ابھی زندہ ہے۔''

''وہ سب کچھ اماں جان نے پلان کیا تھا، جب انہیں پتا چلا تھا کہ جوہی پھر ماں بننے والی ہے اور میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ میں روتی تھی کہ جوہی کی اولاد ہوگئی تو شاید ہاشم مجھے چھوڑ دیں گے لیکن اماں جان کہتی تھیں ایسا نہیں ہوگا۔ تمہاری گود میں ہاشم کا بچہ ہی کھیلے گا اور اس بار بازی میری ہوگی۔ وہ چند خطوط جو فراز اور نصیر کی طرف سے جوہی کو لکھے گئے تھے ماں نے آپ کو دکھائے تھے وہ خود ہی انہوں نے کسی سے لکھوائے تھے اور جو باتیں وہ آپ سے کرتی تھیں وہ سب جھوٹ تھیں۔ آپ کے جانے کے بعد فراز یا نصیر کبھی یہاں نہیں آئے تھے، ہاں اماں جان کا نصیر سے رابطہ تھا۔ وہ انہیں فون پر جانے کیا کیا کہتی رہتی تھیں پھر حالات خود ہی ان کے حق میں سازگار ہوگئے۔ جوہی اور بی جی ملتان چلی گئیں اور جس روز آپ ملتان گئے تھے، اماں نے فون کرکے نصیر کو بتادیا تھا کہ آپ اتنے بجے تک وہاں پہنچیں گے اور......''

وہ اعتراف کررہی تھیں اور بابا دل پر ہاتھ رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔

''ثریا میں نے کبھی آپ سے ناانصافی نہیں کی تھی پھر آپ نے کیوں ایسا کیا؟'' ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

''آپ تو اتنے سمجھ دار تھے بابا پھر آپ کیسے...... کیسے دو عورتوں کے بچھائے جال میں پھنس گئے۔'' میں نے شاکی نظروں سے بابا کی طرف دیکھا اور ماما کے بندھے ہاتھ کھول دیے۔

''میں نے آپ کو معاف کیا ماما! لیکن معافی تو آپ کو اس عورت سے مانگنی چاہیے جس کے ساتھ آپ نے ظلم کیا۔''

''وہ...... مجھے معاف کردے گی قاسم!''

''میری ماں کا ظرف بہت بڑا ہے ماما! انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا اور معاف کردینے کے لیے کہا ہے۔'' ان کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے تھے۔

''ہاں جوہی بہت اچھی تھی، ہمیشہ سے ہی اچھی تھی۔ تم آؤ گے نا قاسم! مجھ سے ملنے گھر آیا کرو گے نا۔''

''مجھے ابھی کچھ وقت چاہیے، میں ابھی بہت بکھرا ہوا ہوں، بہت بری طرح ٹوٹا ہوا لیکن میں......'' میری آواز بھرا گئی تھی اور میں بات ادھوری چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔

☆......❁......☆

اور پھر صرف ایک دن بعد ہی ماما اور بابا امی سے معافی مانگنے آئے تھے۔ بابا بھی شرمندہ سے سر جھکائے امی کے ساتھ بیٹھے تھے اور میں انہیں وہاں چھوڑ کر ٹیرس پر آگیا تھا اور صحن کی طرف دیکھنے لگا جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ بھاگتے دوڑتے کھیلتے...... کچھ دیر بعد ہی ماہا میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی تھی۔

''کیا آپ ابھی تک مجھ سے خفا ہیں قاسم؟''

''نہیں تو...... میں تو تم سے کبھی خفا تھا ہی نہیں۔''

''تو پھر مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے تھے، میری طرف دیکھتے کیوں نہیں تھے۔'' اس نے منہ بسورا۔

''میں تو خود میں الجھا ہوا تھا ماہا! اور یاد رکھنا میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہوسکتا۔ کوئی اپنی دھڑکنوں سے بھی خفا ہوکر جی سکتا ہے پگلی! تم تو میرے دل کی دھڑکنوں میں بستی ہو۔'' اس کے رخسا گلگوں ہوگئے تھے۔

میں نے کہا تھا نا یقین محکم ہو تو راستے کتنے بھی مشکل ہوں، منزلیں ضرور مقدر ہوتی ہیں۔'' اور صحن میں دیکھتے دیکھتے میں کچھ یاد کرکے ہنس پڑا تھا۔

''میری بے چاری دادی سچ ہی تو کہتی تھیں کہ ادھر نہ کبھی نہ جانا، وہاں جادوگرنیاں رہتی ہیں۔ جو

اپنے جادو سے تمہیں مکھی بنا کر دیوار پر چپکا دیں گی اور میں بے تو موت مارا گیا، ننھی جادوگرنی!" میں نے اس کی خوب صورت ناک کو چھوا، کتنے دنوں بعد میرا دل ہلکا پھلکا تھا۔

"چلیں اندر، معافی تلافی ہو چکی ہو گی۔" ماہا بھی ہنسی تھی۔

زندگی یک دم بہت خوب صورت ہو گئی تھی، اگلے چند روز بعد میں نے امی کے سامنے ماہا کی رفاقت کی درخواست رکھی تو وہ ہنس دی تھیں۔

"ماہا میری بیٹی ضرور ہے لیکن اس کے وارث تو بیگ صاحب ہیں سو یہ درخواست وہاں پہنچانی ہو گی اور میں نے ماما سے کہا تھا کہ انہیں بیگ صاحب کے گھر جانا ہے میرے رشتے کے لیے۔"

"لیکن وہ جو ہی...... وہ......" ماما تھوڑا سا پزل ہوئی تھیں۔

"انہوں نے مجھے جنم ضرور دیا ہے لیکن میری ماما تو آپ ہیں نا۔" میں نے ان کے گلے میں باہیں ڈال کر ان کا مان بڑھایا اور پھر ماما، بابا جب میرا رشتہ لے کر بیگ صاحب کے گھر گئے تو امی وہاں پہلے سے ہی موجود تھیں۔ اس روز میں نے ماما کے چہرے پر وہ چمک اور خوشی دیکھی تھی جو پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، حقیقی خوشی......

☆......❁......☆

اور اب زندگی میں رنگ ہی رنگ ہیں، حسن ہی حسن ہے۔ ماہا میری شریک زندگی ہے، اوپر والی سیڑھیوں کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے، امی، میں اور ماہا اوپر رہتے ہیں بابا اور ماما نیچے۔ امی کی ماما سے بہت دوستی ہے وہ گہری سہیلیوں کی طرح ایک دوسرے سے باتیں کرتی ہیں اور میرے بے چارے بابا ایسے میں اداس اداس سے لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہوئے گاہے بگاہے انہیں دیکھتے ہیں کیونکہ امی نے انہیں معاف تو کر دیا ہے لیکن چوبیس سالوں کا فاصلوں پاٹنے میں وقت تو لگے گا، میں کبھی کبھی شرارت سے انہیں کہتا ہوں۔

"بے چارے میرے بابا کو اپنی بارگاہ میں حاضر ہونے کی اجازت دے دیں۔ پہلے کی طرح وہ آپ دونوں کے ساتھ انصاف کریں۔"

لیکن شاید اتنے سال گزرنے کے بعد یہ ممکن نہیں، اس میں بھی ہم سب بہت خوش ہیں۔ میرا اور ماہا کا بھی زیادہ وقت نیچے گزرتا ہے، اکثر کھانا ہم نیچے ہی مل کر کھاتے ہیں، چاہے وہ ماما نے بنایا ہو چاہے امی نے اور ہاں میرے دو چھوٹے چھوٹے کیوٹ سے جڑواں بیٹے بھی ہیں، روحان اور آریان...... دونوں ماؤں نے ایک ایک بیٹے کی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے۔ امی نے میرا بچپن انجوائے نہیں کیا تھا سو روحان کی صورت میں وہ میرا بچپن انجوائے کرتی ہیں۔

دونوں اپنے دادا کی بھی جان ہیں اور میں اور ماہا ان کی ذمہ داریوں سے آزاد زندگی انجوائے کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی میں شرارت سے ماہا سے کہتا ہوں۔

"بھئی وہ دونوں تو انہوں نے سنبھال لیے ہمیں اپنے لیے......" اور ماہا کا مکا میرے بازو یا کندھے پر پڑتا ہے۔

"بچے پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا، تم مرد تو بس...... مر کر بچی تھی میں روحان اور آریان کے ٹائم۔"

"تو کسی اور کو......" میں شرارت سے اسے دیکھتا ہوں اور اس کا مکا پھر میرے بازو پر پڑتا ہے۔

"ہائے ظالم جادوگرنی...... میں بھلا کیسے کسی اور کے متعلق سوچ سکتا ہوں بقول میری دادی مرحومہ کے مکھی بنا کر دیوار سے تو چپکا دیا ہے اب میں بے چارہ......" اور پھر ہم دونوں کی ہنسی نکل جاتی ہے اور ہم دیر تک ہنستے رہتے ہیں۔

"ہاں نا...... مکھی بنا کر چپکا دیا ہے اور کبھی عمر بھر اب آزاد نہیں کروں گی۔"

"اور میں کب ان آنکھوں کے سحر سے آزاد ہونا چاہتا ہوں، ماہا...... جادوگرنی!" اور ایک بار پھر ہماری ہنسی سے کمرا گونج اٹھتا ہے۔

☆☆



ادھوری کہانی

مریم ماہ منیر

"ماہرہ۔"

پکار پر اس کے پلٹتے قدم لمحے بھر کو رکے تھے۔ چند لمحوں پہلے ہی سائیڈ ٹیبل پر دھرے چائے سے بھرے مگ سے اٹھتے دھویں پر نظر کی پھر اک گہری سانس لیے پلٹ کر دروازے کی جانب قدم بڑھائے۔

بیڈ پر لیٹا وجود جان چکا تھا کہ اس کی پکار نظر انداز ہو چکی ہے۔ پھر جیسے ہی ماہرہ کمرے کا دروازہ کھولتی۔ بیڈ پر لیٹے وجود نے ایک مرتبہ پھر پکارا۔

"میں بہت تکلیف میں ہوں۔" ماہرہ نے ایک نظر بیڈ پر لیٹے وجود کے چہرے پر ڈالی۔ واقعی وہاں تکلیف رقم تھی۔

"چائے کے ساتھ میں نے ڈسپرین کی دو گولیاں بھی رکھ دی ہیں پہلے سے۔" نرم دھیمے لہجے میں کہتی وہ پلٹی۔

"میری روح تکلیف میں ہے۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں۔ آپ کی روح ہے اور اسی سے جڑی تکلیف۔" پلٹے بنا ہی ماہرہ نے جواب دیا۔

"ایک تکلیف کی رسی ہے جو میری گردن میں



طوق کی مانند پڑی ہے اور اس تکلیف کی رسی کا ایک سرا تم تک بھی جاتا ہے۔" کمرے کی خاموش فضا میں پھر سے اس وجود کی آواز ابھری۔

"کیا چاہتے ہیں آپ۔" اس مرتبہ ماہرہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"وہ ہاتھ میں پکڑا رسی کا سرا چھوڑ دو ماہرہ۔ میری گردن کا طوق آزاد کر دو۔" ماہرہ کے اس سوال کے پوچھے جانے کی دیر تھی کہ خواہش کا اظہار کیا گیا۔

"آپ کو لگتا ہے ایسا کچھ نہیں ہے۔" اپنے طور پر ماہرہ نے اس وجود کی تسلی کرانی چاہی۔

"اپنے دل سے پوچھ کر بتاؤ کیا واقعی ایسا نہیں ہے۔" جواب میں ماہرہ خاموش رہی تھی۔ شاید کہ وہ بھی حقیقت سے باخبر تھی۔

"میرے دل پر بوجھ ہے۔" ایک مرتبہ پھر سے آواز ماہرہ کے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی۔

"دل پر بوجھ آپ نے خود لادا ہے۔ اس کو سہارنے کا طریقہ بھی خود ہی تلاش کریں۔" گہرے گمبھیر لہجے میں کہتی وہ دروازہ کھولے کمرے سے نکل گئی بستر پر لیٹے وجود کی آنکھوں میں چھائی اداسی اور پچھتاوے کے بادل مزید گہرے ہو گئے۔

☆☆☆

سب کچھ اچھا تھا زندگی میں......سوائے چند ایک باتوں کے چند ایک کاموں کے......شادی کے دو ماہ بعد ہی ثاقب کو دبئی جانا پڑا۔ کچھ ایسا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اکیلا جا رہا تھا، یہ بھی ماہرہ کے لیے بہت بڑی بات نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی مسئلہ کھڑا ہوا تھا ان دونوں کے مابین۔ شادی کے دو ماہ بعد پہلا مسئلہ جس نے ان دونوں کے درمیان ایک انجانی ان دکھائی دیتی دیوار کھڑی کر دی تھی۔

"ثاقب آپ کو مجھے بتانا تو چاہیے تھا۔"

"اب بتا رہا ہوں نا۔" نرم لہجے میں اس نے بات سنبھالنی چاہی۔

"ویزا آنے کے بعد......!" شکوہ کناں لہجہ تھا ماہرہ کا۔

"تو ایسا کیا ہو گیا ہے جو تم یوں ناراض ہو رہی ہو۔" ثاقب بدستور ماہرہ کو اپنی بات پر قائم دیکھتے اپنے لہجے پر بھی نرمی کا خول زیادہ دیر چڑھا نہیں پایا۔

"آپ کے خیال میں اس میں ناراضی والی کوئی بات نہیں ہے؟" ہر گزرتے پل کے ساتھ شریک سفر کی زبان سے ادا ہوتا ہر جملہ ماہرہ کو حیرت کے نئے جہانوں کی سیر کرا رہا تھا۔

"قطعاً نہیں۔" سختی کے ساتھ نفی کے انداز میں ثاقب نے سر ہلایا۔

"ثاقب۔" ماہرہ نے تڑپ کر کہا۔

"کیا ہو گیا یار......" ثاقب اس کی آنکھوں کو بھیگتے دیکھ کر قدرے الجھا۔

"آپ کو مجھے بتانا تو چاہیے تھا۔" آنسوؤں نے سامنے بیٹھے ثاقب کا وجود دھندلا دیا۔

"یار پلیز بس کرو پچھلے آدھے گھنٹے سے تمہاری اسی فقرے کی گردان سن رہا ہوں۔ مجھے بتانا چاہیے تھا۔ اور میں تم سے لگاتار یہی کہہ رہا ہوں کہ بتا رہا ہوں۔ تمہیں بتا کر ہی جا رہا ہوں۔ بھاگ کر نہیں جا رہا۔ ویزے کا انتظار کر رہا تھا۔ کنفرم ہو جاتا تو ہی تمہیں بتاتا۔" اس مرتبہ ثاقب کے لہجے میں قطعیت اور سختی ہی نہیں تھی بلکہ اس مرتبہ اس کی آواز بھی خاصی اونچی تھی۔

"آسیہ کو تو پتا تھا۔" ایک شکوہ تھا جو اس کے ہونٹوں سے نکلا۔

"وہ میری بہن ہے۔ اسے بتا بھی دیا تو کیا ہو گیا۔ اگر تمہیں اس بات سے ایشو ہے کہ میں نے اسے بتایا اور تمہیں نہیں تو تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ اس سے بھی سرسری سا ذکر کیا تھا۔" دو بدو جواب دیا تھا ثاقب نے۔

"جیسے اس سے سرسری سا ذکر کیا تھا ویسے ہی مجھ سے بھی کر دیتے۔" تیکھے نقوش اور گندمی رنگت لیے دکھے دل سے اپنے ہمسفر کو دیکھا۔

"اف تم عورتوں کی بحث......پلیز خدا کا نام ہے اب اس بحث کو ختم کرو۔ دو دن رہ گئے

ہیں میرے جانے میں۔ آفس بزنس ڈیل کے سلسلے میں جانا ہے۔ مجھے ابھی اس سلسلے میں فائل ورک بھی کرنا ہے۔ اور پھر تیاری بھی کیونکہ وہ بھی لگتا ہے مجھے ہی کرنا پڑے گی اس ماحول میں میرا نہیں خیال کہ تم کچھ میرے لیے کرو گی۔" قطعیت سے کہتے ہوئے اس نے ماہرہ کو جیسے مزید بحث سے روک دیا۔

"تو کیا ان دو ماہ میں......میں نے آپ کے لیے کچھ نہیں کیا۔" ماہرہ نے آنکھیں مسلیں۔ کچھ ہلکی دھند چھٹی پھر چڑھ گئی۔

"وہ تو دکھائی دے ہی رہا ہے آج کے اس ڈرامے سے۔" وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ثاقب کے غصے کا گراف چڑھتا جا رہا تھا۔

"ڈراما......اگرچہ ڈرامہ ہے تو پھر وہ میری جاب......اس کا کیا ہے جو آپ کے کہنے پر چھوڑی ہے۔" بے اختیار ہی سسکی ماہرہ کے ہونٹوں سے نکلی۔

"میرے سر پر احسان نہیں ہے۔" ہنوز تپے ہوئے لہجے میں جواب آیا۔

"بات احسان کی نہیں احساس کی ہوتی ہے۔ آپ نے کہا کہ شادی کے بعد آپ کو ٹائم دوں اور جاب کرنا مطلب کہ آپ کو ٹائم نہیں دے پاؤں گی تو میں نے آپ کی خواہش کا احترام کیا۔" ایک بات سے اگلی بات نکل رہی تھی۔ ایک شکوہ ختم نہیں ہوتا تھا کہ اگلا شکوہ جنم لیتا تھا۔ بحث اچھی خاصی طول پکڑتی گرما گرمی کی شکل اختیار کر گئی۔

"شکریہ......اگر یہ احترام تھا۔ تو بھی ایک احترام اور کر کے مجھے مزید شکریہ کا موقع دیں کہ مجھے ہنسی خوشی دبئی جانے دیں۔" طنزیہ لہجے میں ثاقب نے کہا۔

"میں آپ کو روک بھی نہیں رہی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ جو شوہر مجھے بنا بتائے زندگی کا اہم فیصلہ کر سکتا ہے وہ میری خوشی کی پروا کیے بنا اس فیصلے پر عمل درآمد بھی کر سکتا ہے۔"

اس نے ثاقب سے بحث کی جھگڑی، روئی پیٹی اور پھر تھک ہار کر خاموش ہو بیٹھی۔ اس سے الجھتے شاید اسے احساس ہونے لگا تھا کہ وہ کسی پتھر کی مورت سے سر ٹکرائے جا رہی ہے۔ اور اس سر ٹکرانے کا سراسر نقصان اپنا ہی ہے۔

وہ اپنی کلاس میں ایم بی اے ٹاپ تھری اسٹوڈنٹس میں سے تھی۔ رزلٹ آتے ساتھ ہی ایک ماہ بعد اس نے مقامی پرائیویٹ کمپنی میں سی ای او۔ اکاؤنٹنٹ کی جاب کے لیے اپلائی کیا۔ اگلے تین دن کے اندر اسے کال لیٹر ملا۔ تین دن کے بعد اس کا انٹرویو تھا اور انٹرویو ختم ہونے کے دس منٹ کے اندر اس کے ہاتھ میں اس کی قابلیت کے بل بوتے پر اپوائنٹ منٹ لیٹر پکڑا دیا گیا۔ زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی تھی۔ خاندان، رشتہ دار محلہ دار حتیٰ کہ دوست احباب میں اس کی قابلیت کے گن گائے جا رہے تھے اس کی قابلیت کی مثالیں دی جا رہی تھیں۔

ابھی چار ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ اس کی شادی کا ذکر نکل پڑا۔ دوست کی بہن کی شادی میں رضیہ بیگم نے اپنے پرائیوٹ سیکٹر میں مکینکل انجینئر کے عہدے پر فائز بیٹے کے لیے اسے پسند کر لیا۔ دوست کی والدہ کی وساطت سے رشتہ گھر آیا اور مناسب چھان بین کے بعد قبول کر لیا گیا۔

جہاں ماہرہ کے ماں باپ مطمئن تھے وہیں پر ماہرہ بھی خوش تھی۔ شادی کے معاملے اس نے فرماں بردار بیٹی ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن آئندہ زندگی میں اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس سے فرماں برداری کے کتنے ہی امتحان لیے جائیں گے اور اس سے ہر حال میں توقع کی جائے گی کہ وہ ان امتحانات میں اعلا نمبروں سے سرخرو بھی ہو کہ فیل ہونے کا امکان بھی نہیں دیا جائے گا۔ پہلے ہی امتحان کے طور پر اس سے شادی شدہ زندگی میں جاب کی قربانی دینی پڑی تھی۔ جو اس نے دل پر جبر کر کے قبول کر لی تھی۔ ماں باپ کو بتایا تھا اس آس کے تحت کہ شاید کوئی حمایت کا جملہ اس کی جانب سے سسرال میں بولا جائے لیکن اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

اس کے بعد گاہے بہ گاہے اسے بہت سی

قربانیاں صرف اسی توقع کے تحت دینی پڑی تھیں کہ وہ فرماں بردار بیوی کہلا سکے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشات جن میں اس کا اوڑھنا پہننا، ملنا ملانا دوست احباب حتیٰ کہ اسے کب ماں سے ملنے جانا ہے کب شاپنگ پر جانا ہے کس وقت وہ کمرے میں سونے جا سکتی ہے صبح کس وقت اسے اٹھنا ہے قربانیوں کی ایک لمبی فہرست تھی۔ اس نے ہنسی خوشی قبول کی کہ اس کا ہمراہی اس کے لیے شجر سایہ کی مانند تھا۔ وہ اس کے قرب میں سکون میں تھی کہ اس کے زندگی کے ساتھی کا دل اس کا تھا۔ لیکن دبئی جانے کے فیصلے سے لے کر ویزا اپلائی کرنے اور اس کو اس سارے معاملے میں بے خبر رکھنے پر وہ تڑپ اٹھی تھی۔

قربت کے لمحے میں جذبات سے بوجھل آواز میں جب اس کے ہمسفر نے کہا میں ہوں نا تمہارا پورے کا پورا۔"

کہیں دل میں یہ کہا جملہ چبھا تھا۔ "سوائے دل کے" دل کے ایک کونے میں کسی سرگوشی کی مانند نکلا تھا اور اس کی دونوں آنکھوں سے ایک ایک آنسو نکل کر گالوں کی سوکھی سرزمین کو سیراب کر گیا۔

☆☆☆

دبئی دو ہفتے کے کاروباری دورے کے بعد ثاقب لوٹ آیا تھا ہنستا مسکراتا اپنے ہمراہ تحائف لیے پہلے کی مانند اس کی دلداریاں کرتے۔ لیکن ثاقب کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ جس زندہ دل بیوی کو چھوڑ کے گیا تھا محض دو ہفتے کے فاصلے پر اس زندہ دل بیوی کا دل مردہ ہو کر پتھر ہو گیا تھا۔ جس پر اس کی دلداریوں کا رتی بھر بھی اثر نہ تھا۔

"خوش ہو۔"

جواب میں وہ خالی نگاہیں اس کے چہرے پر ڈالے ہونٹوں کو مسکراہٹ کے انداز میں پھیلا گئی کہ ماں کی تاکید تھی۔ شوہر کی خوشی میں خوش رہنا ہی فرماں بردار بیوی کی نشانی ہے۔

"اب تو ناراض نہیں ہونا۔" وہ دبئی سے لائے سونے کے دو کڑے اس کی کلائیوں پر چڑھاتے اس کی ناراضی کا سودا کرتے ہوئے بولا۔ بے ساختہ کی وہ نظر جھکا گئی جسے اس کے ہمسفر نے فطری شرم پر فرض کیا۔ "مجھے لگا تھا کہ تمہیں بہت منانا پڑے گا۔"

"کیوں؟"

"تم ناراض جو تھیں میرے دبئی پر بنا بتائے ویزا لگوانے پر۔" وہ اسے اپنے قریب کیے بولا۔ "کیا ہونا ناراض۔" وہ چپ رہی۔

"سچ میں تم ناراض نہیں تھیں۔" اس کی آواز میں محلول حیرت اور سوالیہ انداز میں پوچھے جانے والے جملے پر وہ اب بھی خاموش رہی تھی۔ جس کے معانی ثاقب نے اپنے طور پر اخذ کیے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ ثاقب کی ہمراہی میں تھکنے لگی تھی کہ ماہ وش کی دنیا میں آمد نے اس کے مردہ دل میں جان سی ڈال دی تھی۔ اسے زندگی کا مقصد سمجھ آنے لگا تھا۔ وہ جینے کا فن سیکھنے لگی تھی۔

ماہ وش میں ثاقب کی جان تھی۔ ماہرہ کی بے چین روح کو قرار آنے لگا تھا۔ کہ پری وش کی سال بعد آمد نے اس کی فیملی کو جیسے مکمل کر دیا تھا۔ دو بچوں کے ساتھ میں دونوں میاں بیوی خوش تھے کہ یکایک ماہرہ کو احساس ہوا کہ جسے وہ مکمل فیملی کا نام دے رہی ہے ابھی تک وہ نامکمل ہے۔ کہ وہ اولاد نرینہ کی نعمت سے محروم ہے۔

اس دوپہر وہ کچن میں دوپہر کا کھانا پکا کر فارغ ہوئی اور کمرے میں جانے کے خیال سے کچن سے نکلی کہ کچن کے ساتھ ڈرائنگ روم سے ملحقہ ڈائننگ روم سے آتی ساس نند کی آوازوں نے اس کے اپنے کمرے کی جانب بڑھتے قدموں کو روک دیا تھا۔ چھپ کر دوسروں کی باتیں سننا اس کی فطرت کا خاصا نہیں تھا لیکن اپنے کانوں میں سنائی دیے اپنے نام کے ذکر نے اسے اس فعل پر راضی کر لیا تھا۔

"امی! دوسری مرتبہ بھی بیٹی ہوئی ہے۔ مجھے تو خود امید تھی کہ بھائی کا بیٹا ہوگا۔"

"مجھے بھی پوتا گود کھلانے کی حسرت ہے۔"

"بھائی نے کچھ کہا آپ سے۔"

"زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن بظاہر خاموش ہے۔ ماں ہوں اس کی۔ اس کی چپ سمجھتی ہوں۔"

"آپ نے بھائی سے پوچھنا تو تھا۔"

"پوچھ کے دل دکھاتی اس کا...... اب تو ڈر سا لگنے لگا ہے کہ تیسری مرتبہ بھی بیٹی ہوئی تو میرا بیٹا تو بھری جوانی میں بوڑھا ہو جائے گا۔"

"امی کیسی منحوس باتیں کرتی ہیں۔ اچھا سوچیں، اچھا بولیں۔" آسیہ کے لہجے میں انجانے خوف کی سی کیفیت تھی۔

"دو بیٹیوں کی ذمہ داری کم تو نہیں ہوتی۔" مائرہ نے ساس کی آواز سنی تھی۔ نظر نہ آنے کے باوجود ماہرہ آواز کے انداز سے بتا سکتی تھی کہ اس وقت ان کے چہرے پر کتنی پریشانی چھائی ہو گی ماہرہ حقیقت میں پریشان ہو گئی تھی ساس نند کی باتیں سن کر......

شام میں ثاقب سونے لیٹا تو وہ بے اختیار ہی پوچھ گئی۔

"آپ کو بیٹیاں پسند نہیں۔"

"کیا مطلب؟" آنکھیں موندے ثاقب نے بے اختیار آنکھیں کھولیں۔

"سیدھی سی بات ہے۔ کہ آپ کو بیٹے پسند ہیں۔" وہ پری وش کو سلاتے تھپکتے بولی۔

"یہ نیا خناس تمہارے ذہن میں کہاں سے چلا آیا۔" آنکھیں سکیڑے ثاقب کے لہجے میں قدرے ناگواری تھی۔

"آیا نہیں بس ایسے ہی پوچھ لیا۔" وہ چاہتے ہوئے بھی اسے بتا نہیں سکی کہ وہ دوپہر میں اس کی ماں بہن کی باتیں سن چکی ہے۔

"الٹی سیدھی سوچیں نہ سوچا کرو۔" مشورہ آیا تھا۔

"آپ نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔" وہ ابھی تک اپنی بات پر قائم تھی۔

"دے تو دیا ہے۔" سیدھا کھرا جواب آیا۔

"نہیں......" ماہرہ کا لہجہ بھی قطعی تھا۔

"پھر کیسے دوں؟" الٹا سوال کیا تھا ثاقب نے۔

"آپ کو بیٹیاں نہیں پسند۔ آپ چاہتے تھے کہ دونوں مرتبہ آپ کے بیٹے ہوں۔" اس مرتبہ ماہرہ نے لگی لپٹی لیے بغیر دوٹوک انداز میں دل کی بات زبان سے ادا کی۔

"فضول باتیں نہیں کرو۔ پری وش سو گئی ہے تو تم بھی آرام کرو۔ میری بچیاں ہیں میں جانتا ہوں کہ مجھے کتنی پیاری ہیں اور یہ بات مجھے تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہتے ساتھ ہی ثاقب نے اس کی جانب سے کروٹ بدل کر گویا بحث ختم کرنے کا الٹی میٹم دے دیا تھا۔ وہ خاموشی سے پری وش کو تھپکتی سوچتی رہ گئی کہ ثاقب نے یہ تو بتا دیا کہ اسے بچیاں پیاری ہیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ بیٹوں کو بیٹیوں پر فوقیت دیتا ہے یا نہیں۔ بہرحال اس نے ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی اپنے دل کو یہ سمجھا کر مطمئن کر لیا تھا کہ جو بھی ہے یہ دونوں ثاقب کی بیٹیاں ہیں جنہیں وہ بہت پیار کرتا ہے۔

زندگی اسی سوچ کے سہارے اچھی خاصی گزرنے لگی تھی کہ اس کی زندگی کے بہتے خاموش دریا کی خاموش لہروں میں طغیانی سی آئی جب معلوم ہوا کہ ثاقب دوبارہ سے دبئی جا رہا ہے لیکن اس مرتبہ وہ آفس کی طرف سے نہیں جا رہا بلکہ اس کی نند اسے وزٹ ویزا پر تین ماہ کے لیے بلوا رہی ہے۔

پہلے کی طرح اس مرتبہ اس نے ویزے کا سن کر کوئی بحث نہیں کی۔ کوئی عملی مظاہرہ نہیں ظاہر کیا۔

"تمہیں برا نہیں لگا۔" ثاقب کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کیوں......؟"

"پہلے تو تم خاصی ناراض ہوئی تھیں۔ تو میرا خیال تھا!"

"ہر مرتبہ زندگی آپ کے خیال کے مطابق نہیں چلتی۔" دوٹوک انداز میں ماہرہ نے جواب دیا۔

"میچور ہو گئی ہو۔"

"پہلے سے ہی تھی آپ نے کبھی غور نہیں کیا۔"

"ادھر آؤ میں بھی تو دیکھوں۔" ثاقب نے

ذو معنی انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچنا چاہا کہ وہ نرمی سے ہاتھ چھڑا گئی۔

"دیکھتے رہیے گا پہلے پیکنگ تو کرلوں۔"

"کل شام کی فلائٹ ہے۔ صبح کرلینا۔"

"نہیں ٹائم کم ہے۔" وہ سہولت سے پلو چھڑا گئی۔ بات یہیں تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن اسے علم نہیں تھا کہ آئندہ زندگی اس کے اور اس کی بیٹیوں کے لیے کتنا کٹھن امتحان لانے والی ہے۔

☆☆☆

"ماہرہ...... ثاقب کا میں نے عقد ثانی کر دیا ہے۔ اسمارا کے پڑوس میں بہت نیک بچی تھی اسی سے ہی کچھ عرصہ سے بات چل رہی تھی۔

"امی جان......" حیرت کے کئی پہاڑوں تلے اس کا جسم روح سمیت دب گیا کہ وہ ٹھیک سے آواز بھی نہیں نکال پائی۔

"آج ثاقب کا فون آئے گا۔ بہت خوش ہے میرا بیٹا...... تم اپنا واویلا لے کر نہ بیٹھ جانا۔ کچھ امید تو ہوئی۔ نہیں تو مجھے لگتا تھا کہ پوتے کی خواہش دل میں دبائے ہی قبر نصیب ہوگی۔"

وہ گنگ سی رہ گئی تھی۔ اس کی چپ ثاقب کے رات کو آنے والی فون کال پر ٹوٹی وہ بھی اسی جملے پر۔

"کبھی تو آپ بتاتے کہ بیٹے کی خواہش ہے۔ میں ایک اور کوشش......" ابھی ماہرہ نے اپنی بات بھی پوری نہیں کی تھی کہ ثاقب نے اسے بولنے سے ٹوک دیا۔

"تمہیں بتایا تھا مجھے بیٹیاں بہت پیاری ہیں۔"

"یہ بھی تو نہیں بتایا کہ بیٹے کی خواہش میں عقد ثانی بھی کر سکتے ہیں۔" دھیمے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہلکا سا شکوہ اس کے لبوں سے نکلا تھا آخر وہ بھی انسان تھی۔

"امی نے مجبور کیا تھا۔" ثاقب گویا سارا ملبہ اپنی ماں کے کندھوں پر ڈال کر خود بری الذماں ہوا۔

"مجبوری۔" اس معاشرے کے مرد کی زبان پر مجبوری کا لفظ جتنا مضحکہ خیز لگتا ہے اسی قدر حساب سے بولا جاتا ہے۔ چند لمحوں کے لیے اس کے مقفل ہونٹوں سے قفل ٹوٹا تھا۔ پھر سے لگ گیا تھا۔ شادی کے ان چھ سالوں میں اس نے شروع کے چند سال ہمیشہ سوچا تھا بارہا کہ...... وہ ثاقب سے الگ ہو جائے۔ زندگی کی ہر خواہش پر یوں گھٹ گھٹ کر جینا اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ لیکن اس کے بے قرار دل کو ماہ وش کی پیدائش نے قرار دے دیا تھا۔ اس نے ماہ وش کی ننھی ننھی اداؤں اور معصوم باتوں، مسکراتی کلکاریوں میں خود اپنی دنیا بسالی تھی۔ ماہ وش کے بعد پری وش نے اس کی دنیا میں ہی جنت بنادی تھی۔

دونوں بچیوں کے ساتھ کے بنا بہت آسان لگتا تھا اسے ثاقب سے الگ ہونے کا سوچنا...... اور اب اسے اس دنیا کا سب سے مشکل عمل لگ رہا تھا۔ وہ صرف اس کا شوہر ہی نہیں اس کی معصوم بچیوں کا باپ تھا۔ جس کی جگہ دنیا کا کوئی دوسرا مرد نہیں لے سکتا تھا۔

ثاقب جو تین ماہ کے وزٹ ویزے پر گیا تھا وہ طویل ہو کر ایک سال پر محیط ہو گیا۔ اس کی آفس برانچ دبئی میں کھل گئی تھی وہیں پر اس نے اپنی ٹرانسفر کرالی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ اپنی بیٹیوں سے غافل نہیں تھا۔ باقاعدگی سے ایک اچھی رقم ہر ماہ اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتا تھا۔ باقاعدگی سے ان سے واٹس ایپ اور اسکائپ کے ذریعے رابطے میں رہتا تھا لیکن پھر بھی کمی تھی۔ وہ کمی صرف ثاقب کی پاکستان موجودگی ہی پوری کر سکتی تھی۔

☆☆☆

زندگی نے ایک اور پینترا بدلا تھا۔ ثاقب کی دبئی میں ایک صبح آفس جاتے ہوئے کار ایکسیڈنٹ میں ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ وہ اگلے چھ ماہ کے لیے بستر پر آ رہا تھا۔ محض دو ماہ کے بعد ہی ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا یہ کہہ کر صرف بیس فی صد چانسز ہیں کہ ثاقب اپنے قدموں پر دوبارہ کھڑا ہو سکے گا۔ اس خبر کے محض ایک ماہ بعد ہی ثاقب کی دوسری بیوی نے اس سے طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔ زندگی عجیب سے دوراہے پر کھڑی ہو کر ثاقب پر ہنس

رہی تھی۔ اور ماہرہ خاموش تماشائی بنی ہونٹوں پر قفل ڈالے ہوئے تھی۔ ثاقب واپس پاکستان آ گیا تھا۔ آفس والوں نے اتنا رحم کیا کہ اس کی جاب رہنے دی لیکن سیلری بند کر دی تھی۔ یہ رعایت بھی اس لیے کہ وہ اپنی کمپنی کا بہت محنت اور ایماندار ورکر تھا۔ جاب کی کنڈیشن تھی کہ جوں ہی وہ صحت یاب ہوتا ہے واپس آفس جوائن کر سکتا ہے۔ دبئی پر اس کی سیٹ پر ایک اور ورکر کو بھیج دیا گیا تھا بہر حال کمپنی کا بزنس تھا بزنس مین کبھی بھی اپنے پیسے کا نقصان نہیں کرتا۔

وہ ثاقب سے بہت لیے دیے انداز میں رہتی تھی۔ بہت ہی جلد ثاقب کو بھی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ اسے بولنے پر اکسانے کی کوشش کی لیکن وہ ہنوز ہونٹوں پر چپ شاہ کا روزہ لیے بیٹھی رہی۔

"تم کچھ کہتی نہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔"

"کچھ نہ بولنے کا مطلب صرف ناراضی ہی تو نہیں ہے۔"

"تو پھر اور کیا مطلب ہے یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"کچھ بھی نہیں...... قسمت کی رضا میں ہی رضا مندی۔ رب کی خواہش میں ہی آمادگی۔"

"کچھ تو بولونا۔"

"آپ یاد سے دوائی کھا لیجیے گا۔ میں ماہ وش کو اسکول سے لینے جا رہی ہوں۔" یہ کہتے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل گئی تھی ویسے بھی وہ کوشش کرتی تھی کہ زیادہ ٹائم ثاقب کے قریب نہ رہے۔ اس کے نظر آتے ہی وہ اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا اور وہ بڑی آسانی سے کنی کترا جاتی تھی۔

☆☆☆

"ماہرہ! تم سے ایک بات کرنی تھی۔"

اس رات وہ بہت دیر بعد کمرے میں آئی تھی اس بات کا خیال کرتے کہ ثاقب اب تک سو چکا ہوگا لیکن ثاقب کا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ اسی کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔

"جی کہیے۔" وہ ہمہ تن گوش تھی۔

"تم نے ایم بی اے کیا ہوا ہے نا۔" سوالیہ انداز تھا۔ "جی...... معلوم تو ہے نا آپ کو۔"

"تمہاری ڈگری کہاں ہے؟" اگلا سوال۔

"امی کی طرف ہے۔" صاف سیدھے لہجے میں ماہرہ نے جواب دیا۔

"وہاں کیوں رکھی ہوئی ہے؟" پھر ایک اور سوال۔

"کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ شادی کے بعد جاب بھی چھوڑ دی تو پھر یہاں لانے کا کیا جواز۔" ماہرہ کا لہجہ ہنوز سادگی لیے ہوئے تھا۔

"تم دوبارہ جاب کر سکتی ہو۔" جواب میں وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہارا اور بچوں کا خرچا افورڈ نہیں کر سکتا ہوں۔ اگر ابھی کچھ اور سال بھی کام نہ کروں تو بھی ان شاء اللہ روپے پیسے کی طرف سے ذرا بھی تنگی نہیں ہوگی۔"

"تو پھر۔"

"ہر وقت گھر کے کاموں میں ہی لگی رہتی ہو یا پھر میری تیمارداری پر۔ اس طرح تو تمہارے ذہن کو زنگ لگ جائے گا۔" جواب میں وہ ایک گہری سانس لیے رہ گئی۔

"زنگ تو کب کا لگ چکا ہے آپ نے ہی کبھی غور نہیں کیا۔" چاہتے ہوئے بھی وہ ان الفاظ کو ہونٹوں تک نہیں لا سکی تھی۔

"تم اگر جاب نہیں کرنا چاہتیں اور آگے پڑھنا چاہتی ہو تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ گھر کے کاموں کے لیے ماسی رکھ لو...... اور میرے لیے میل نرس کا انتظام ہو جائے گا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تمہیں پڑھنا چاہیے یا پھر جاب کرنی چاہیے۔" جواب میں وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"کیا دیکھ رہی ہو...... امی کو میں سنبھالوں گا تمہیں امی کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

”جاب مجھے پیسے کے لیے نہیں کروائی......دو بیٹوں کا ساتھ ہے دنیاداری نبھانی آنی چاہیے۔“

”کیا یہ وہی ثاقب ہے جسے میری ڈگری ہولڈر ہونے اور جاب کرنے پر اعتراض تھا۔“ اس مرتبہ جواب میں خاموش رہنے کی باری ثاقب کی تھی۔

”آپ نے جب جاب چھڑا ہی دی تو دوبارہ شروع کروانے کی کیا ضرورت۔“ ماہرہ نے سرسری سے انداز میں کہا تھا۔

”تمہارے لیے۔“ دوٹوک، دو حرفی جواب تھا۔

”میرے لیے؟“ اسے ثاقب کے جواب پر خاصی حیرت ہوئی۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے قدموں پر کھڑی ہو جاؤ۔ میرا کچھ پتا نہیں ہے۔ چانسز ڈاکٹروں نے بہت کم بتائے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں ساری عمر ایک محتاج کے ساتھ ملے۔ ابھی تم جوان ہو...... تمہیں صحت مند ساتھ مل سکتا ہے۔ بچیوں کی تم فکر نہ کرنا۔“ ثاقب اپنے طور پر سب کچھ طے کیے بیٹھا تھا۔

”ثاقب...... پلیز۔“

”میں غلط نہیں کہہ رہا...... میں بلاوجہ تمہیں اپنے ساتھ باندھے نہیں رکھنا چاہتا۔ تم جب کہو گی تمہیں آزاد......“ اس کی آدھی ادھوری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے ماہرہ غصے میں چلا اٹھی۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا اس بیماری میں۔ میں کوئی زرخرید لونڈی نہیں ہوں جس کے بارے میں آپ جو بھی فیصلہ کریں میں زبان پر قفل ڈالے قبول کرتی جاؤں۔ انسان ہوں میرا بھی دل ہے میری بھی خواہشیں ہیں۔ احسان فراموش نہیں ہوں۔ کہ آج آپ پر برا وقت پڑے تو خاموشی سے اپنا راستہ الگ کر لوں۔“

”میں نے کیا احسان کیا ہے تم پر......“

”اس وقت میں تھکی ہوئی ہوں مجھے نیند آرہی ہے۔ آپ بھی آرام کریں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور پیروں کی طرف آکر چادر کھول کر ثاقب پر ڈالی۔ اس کے پلستر لگی ٹانگ کے نیچے تکیہ رکھ کر اسے اونچا کیا پھر اپنی طرف چلی آئی۔ بیڈ پر لیٹتے ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ کا سوئچ آف کر دیا تھا۔ گھپ اندھیرے میں جہاں ماہرہ نے اپنی آنکھوں سے گالوں پر اترے آنسو صاف کیے وہیں پر ثاقب کا ذہن اس سوچ پر لگ گیا تھا کہ ایسا کون سا احسان ہے جو اس نے ماہرہ کی ذات پر کیا ہے۔

☆☆☆

اگلے چھ ماہ بعد ......خدا کے کرم اور ماہرہ کی تیمارداری کی بدولت ثاقب اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ ثاقب کو قدموں پر کھڑا دیکھ کر ساس نے جس گرم جوشی سے ماہرہ کو اپنے سینے سے لگایا تھا ماہرہ کے لیے وہ کسی خوش گوار حیرت سے کم نہ تھا۔

”یہ سب میری بیٹی کی خدمت کا نتیجہ ہے۔ میری بیٹی ہے ہی اتنی قسمت والی کہ اس کے ساتھ جس کی قسمت جڑے، بدل جاتی ہے۔“ شادی شدہ زندگی میں پہلی مرتبہ ماہرہ نے اپنی خاطر ساس کے انداز میں محبت محسوس کی۔

”اور آپ کی پوتیاں......!“ عجیب الجھے ہوئے انداز میں ماہرہ نے ساس سے سوال کیا۔

”ان میں تو میری جان ہے۔ میرے بیٹے کا اصل ہیں۔“ اس کی ساس کے لہجے میں دادی کا پیار چھلک رہا تھا۔ سچ ہے کہ اصل سے سود پیارا ہوتا ہے۔ اس کی ساس کی زبان اور ہونٹوں نے ان الفاظ کو آواز کا روپ دیا تو ماہرہ کے بے چین دل کو سکون کا احساس ہوا وہیں پر ثاقب اپنی نگاہوں میں حیرانگی لیے ماہرہ کو دیکھ رہا تھا۔ بہت کچھ سمجھ میں آرہا تھا اور بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ماہرہ کی خاموشی اپنے اندر اس قدر گہرائی لیے ہوئے تھے وہ اتنے سالوں میں سمجھ ہی نہیں پایا تھا اور جب سمجھ میں آیا تو بہت سی ماہرہ کی ان کہی باتوں نے اسے پچھتاووں کے گھیرے میں ڈال دیا تھا۔ پچھتاوے کے احساس نے ثاقب کو کم کر دیا تھا۔ اس

نے دوبارہ آفس جوائن کر لیا تھا۔ روزمرہ کی معمولات واپس لوٹ آئے تھے۔ لیکن ثاقب کی کم گوئی اب ماہرہ کو کھلنے لگی تھی۔

”آپ اتنے خاموش کیوں ہو گئے ہیں؟“

”تمہیں محسوس ہو رہا ہے۔“

”کہیں پر تیسرے نکاح کی تیاری تو نہیں۔“ اپنے تئیں اس نے مذاق کے ہلکے پھلکے انداز میں کہا لیکن اگلے ہی لمحے اس احساس ہو گیا تھا کہ سادہ سے لہجے میں کہی ہوئی بات نے اگلے فریق کے دل کو دہلا کر رکھ دیا ہے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

”سوری۔“

”نہیں...... اس میں سوری کی کیا بات ہے۔ جیسا سلوک میں نے تم سے رکھا تھا شادی کے بعد اس کے بعد تو تمہیں سوچنے کا حق ہے۔“

”اچھا چھوڑیں کوئی اور بات کریں۔“

”وہی تو تم مجھ سے نہیں کرتی ہو۔ اور تم جو مجھ سے پوچھتی ہو کہ میں اتنا خاموش کیوں ہو گیا ہوں تو سچ پوچھو تو یہی سوچتا رہتا ہوں کہ تم کیوں خاموش ہو۔ میری ہمراہی میں کیوں مرجھا گئی ہو......اور کون سا ایسا احسان ہے جو میں نے تمہاری ذات پر کیا ہے کہ تم مجھے چھوڑنے پر بھی آمادہ نہیں ہو۔“

جواب میں وہ ایک لفظ بھی کہہ نہیں پائی تھی کہ قریب سوئی ماہ وش باتوں کی آواز سے کسمسا کر اٹھ گئی۔ ایک گہری سانس لیے اس نے ماہ وش کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور اٹھ کر ثاقب کے قریب چلی آئی۔ بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھے ثاقب کو گود میں جھک کر ننھی روتی ہوئی ماہ وش کو ڈالا۔

بے اختیار ہی ثاقب نے بازوؤں میں ماہ وش کو اٹھا کر جھلایا پھر اسے اپنے سینے سے لگا کر تھپکا۔ باپ کی پرشفقت گود کی مانوسیت کا احساس لیے ماہ وش خاموش ہو کر پھر سے نیند کی اتھاہ وادیوں میں اتر گئی تھی۔

ماہرہ...... ثاقب کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی اور ننھی ماہ وش کو ثاقب کے سینے سے لگے سوتے دیکھ کر ہاتھ بڑھا کر اس کے ننھے سر کو سہلایا۔

”یہ ہیں وہ دو احسان ...... جو آپ کی ذات کی بدولت میری زندگی پر آپ نے کیے میری گڑیاں...... میری سہیلیاں۔ میری دکھ سکھ کی ساتھیاں...... میرے دل کا سہارا۔“ حیرت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ثاقب نے حیرت سے اپنے سامنے بیٹھی نصف بہتر پر نگاہ ڈالی اور عورت کی عظمت کو سلام کیا تھا۔

عورت کا ظرف واقعی سمندر کی گہرائیوں سے بھی گہرا ہے۔

”اور میرے اللہ کا کیا کم احسان ہے میری ذات پر کہ اس نے میری بیٹیوں کا اتنا احساس والا باپ دیا۔ جس باپ کو اپنی بیٹیاں اتنی پیاری ہوں مجھے اس مرد کی بیوی ہونے پر فخر ہے۔ خدا آپ کا سایہ میری اولاد اور مجھ پر سلامت رکھے۔“

”یہ بات تو غلط ہے بھئی۔“

”کیا......؟“ ماہرہ نے حیرت سے سوالیہ انداز میں بھوئیں اچکائیں۔

”تمہیں تمہاری سہیلیاں تو مل گئی لیکن سہیلیے کے بارے میں تم نے کچھ نہیں کہا۔“

”ڈھونڈنے تو گئے تھے سہیلیے کو۔“ ماہرہ کی بات پر ثاقب نے چونک کر ماہرہ کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ ماہرہ کے ہونٹوں کی دبی مسکراہٹ اور آنکھوں میں چھپی مسکراہٹ عیاں تھی۔

”میری توبہ ...... آئندہ جو ایسی جرات کی۔“ ثاقب کی بھی شرارت کی رگ پھڑکی۔ جواب میں وہ بہت عرصے بعد کھل کر ہنسی تھی۔

”میری سہیلیاں ......بس یہی ہیں...... میری جنت ......ہاں اگر تم چاہو تو میں تمہارا سہیلا بن سکتا ہوں۔“ مسکراتے ہوئے ثاقب نے کھلی آفر کی۔

”وہ تو پہلے سے ہی ہیں۔“ مسکرا کر کہتے ساتھ ہی اس نے ثاقب کے کاندھے پر سر رکھ دیا تھا۔ عام سی زندگی کی عام سی کہانی قربانیوں اور احساس کے رنگوں میں نہائی اپنے خوب صورت انجام کو پہنچی۔

☆☆

سالگرہ نمبر



من موركھ كى بات نہ مانو

آسیہ مرزا

چوبیسویں اور آخری قسط

عباد گیلانی بلڈ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی بیوی مومنہ کو طلاق دے کر اپنے بیٹے حازم کو اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور دوسری شادی عاظمہ سے کرلیتا ہے۔ حازم اپنی ماں عاظمہ اور بھائی بابر کے ساتھ اچھی زندگی گزار رہا ہوتا ہے، مگر اپنے باپ عباد گیلانی کی بیماری کی وجہ سے فکر مند رہتا ہے۔ جب کہ عاظمہ اور بابر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ عباد گیلانی کو اپنی بیماری میں احساس ہوا ہے کہ اس نے حازم کی ماں مومنہ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ عباد گیلانی مومنہ کے باپ یاور علی کو بلاتا ہے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہے اور حازم کو خاص طور سے اس کے نانا یاور علی سے ملواتا ہے، مگر حازم اپنے نانا سے مل کر اچھے تاثرات کا اظہار نہیں کرتا، مگر بعد میں اپنے باپ کی خواہش پر ان کے ساتھ اپنے نانا کے گھر جاتا ہے اور اپنی ماں مومنہ سے ملتا ہے۔ ماں سے مل کے تمام شکوے بھول جاتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔



خون اس وقت زندگی کی علامت ہے جب یہ انسانی رگوں میں دوڑ رہا ہو۔ بہنے والا خون، سوائے خوف ناک اور وحشت ناک موت کا پیغام کے کچھ بھی نہیں۔

حوریہ! ہسپتال کے بیچ پر بیٹھی تھی اس کی نظریں اسٹریچر پر کسی تڑپتے زخمی مریض پر جمی تھیں۔ جن کے لواحقین زار زار رو رہے تھے۔ اسے لگا یہ زخمی بابر ہو خون میں لت پت...... پھر یک دم جھرجھری لے کر اس نے اپنی ابھرنے والی سسکی کو دباتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

عاظمہ غم سے نڈھال تھیں، مومنہ انہیں سنبھالے ہوئے تھی، ان کا وجود جو اجاڑ دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے کبھی آباد ہی نہ ہوا ہو، کوئی صحرا جس میں شام اتر آئی ہو۔ وہ مومنہ کے سینے سے لگ کر ایک بار پھر رو دی تھیں۔

''میرے بچے کو بچالو مومنہ! میرا اس کے علاوہ کوئی نہیں۔ میں بالکل خالی ہو چکی ہوں۔ میرا بچہ، میرا بابر ہی میرا آخری سہارا ہے۔''

''حوصلہ کرو عاظمہ!'' مومنہ خود بھی اس اندوہ ناک حادثے پر بکھری ہوئی تھی، اس کی نظریں بار بار آپریشن تھیٹر پر جا رکتیں جہاں عادل بھائی اور یاور علی کھڑے تھے۔ ایک خوف سمیٹے، ہر آنے والے لحہ دلوں کو دھڑکا کر جا رہا تھا۔ ایک مدھم سی امید کی لو کو تھامے، آپریشن تھیٹر سے باہر نکلنے والی نرس ڈاکٹر کے پیچھے لپک رہے تھے۔

حوریہ میں تو اتنا بھی حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اس حصے کی طرف جاتی، اس کا دل وحشت سے بھرا ہوا تھا۔ ہر آہٹ پر لگتا ابھی دل دھڑکنا بند ہو جائے گا۔

عاظمہ حوریہ کے پاس آ کر بیٹھیں اور حوریہ کو یک دم خود سے لپٹا لیا۔

''حوریہ! تم بابر کو روک لو پلیز، اسے کہو مجھے چھوڑ کر نہ جائے۔ اگر وہ چلا گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔''

''اللہ نہ کرے۔'' حوریہ کا رواں رواں جیسے چیخ بنا تھا مگر اس چیخ کو اس نے ہونٹوں پر ہی دبا لیا تھا۔

''اسے کچھ نہیں ہوگا، وہ زندہ رہے گا۔'' اس نے کرب سے گزرتے ہوئے عاظمہ کے کندھے کو تھپکا۔

بڑے اعصاب شکن لحات تھے، مومنہ ایک احاطے میں جائے نماز بچھا کر دعا مانگنے لگی۔

''مجھے تو دعا مانگنی بھی نہیں آتی، کتنی بدبخت عورت ہوں۔ اپنے بچے کے لیے کیا مانگوں، کیسے مانگوں کچھ نہیں پتا۔'' عاظمہ کی نظریں مومنہ پر تھیں، ان کا رواں رواں ندامت سے چور ہونے لگا۔

''حوریہ پلیز، مجھے بتاؤ، میں کیا پڑھوں...... کیسے پڑھوں، کوئی آیت...... کوئی دعا سکھاؤ مجھے۔ تمہیں تو آتی ہیں ناں، تم تو اللہ سے بہت نزدیک ہو ناں۔ مجھے سکھاؤ پلیز۔'' وہ یک دم حوریہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپکنے لگی۔

''کچھ ایسا بتاؤ جو قبول ہو جائے، ایسی دعا جو میرا رب سن لے۔'' وہ مومنہ کو دیکھ رہی تھیں جو آنکھیں بند کیے گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہی تھی۔ اتنی گڑگڑاہٹ، اتنی تڑپ سے وہ بابر کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ عاظمہ کا دل لہو لہو ہونے لگا۔

''مجھے کیوں نہیں آتا اس طرح مانگنا، مجھے تو کوئی قرآنی آیت بھی یاد نہیں ہے حوریہ! مومنہ کیا پڑھ رہی ہے، مجھے بھی سکھا دو حوریہ!'' وہ اپنا دوپٹا سر پر لپیٹنے لگیں۔

''وہ صلوٰۃ حاجت پڑھ کر دعا مانگ رہی ہیں۔'' حوریہ کے آنسو بندھ توڑ کر رخساروں پر بے آواز بہنے لگے تھے۔ عاظمہ کی تڑپ، ان کی بے بسی اس کے دل پر جیسے شگاف ڈال رہی تھی' اسے اپنے حوصلے ٹوٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

''آپ اللہ سے ہاتھ اٹھا کر بابر کی زندگی کی دعائیں مانگیں اپنی زبان میں، اپنے لفظوں میں۔ وہ سننے والا

ہے، اسے لفظوں کی حاجت نہیں ہے۔ اسے تو جھکا ہوا سر اور اس کی بارگاہ میں دل کی سچی لگن چاہیے آنٹی! وہ ہر زبان سمجھتا ہے، ہر لہجہ پہچانتا ہے۔''

''کیا میری بھی سن لے گا؟''

''کیوں نہیں، وہ تو اپنے بندے کی پکار کا منتظر رہتا ہے۔'' حوریہ نے کہا تو عاظمہ جلدی سے فرش پر ہی دو زانو بیٹھ گئیں اور ہاتھ اٹھا کر گڑگڑانے لگیں۔ الفاظ ان کی زبان سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے مگر وہ رب العالمین تو آنسوؤں کی زبان سن رہا تھا۔ وہ تو نیت دیکھ رہا تھا، لگن دیکھ رہا تھا، اپنے بندے کا خشوع و خضوع دیکھ رہا تھا۔

حوریہ کو شدید گھٹن کا احساس ہونے لگا تو وہ اٹھ کر گیلری کی ریلنگ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہاں سے آپریشن تھیٹر کی راہ داری دکھائی دے رہی تھی، جہاں یاور علی اور عادل بھائی کے علاوہ بہت سے ناآشنا چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کسی کو نہیں جانتی تھی مگر سب کے چہروں پر ایک ہی پریشانی اور خوف رقم تھا، آنے والے لمحے کا۔

''اُف...... کب گزریں گی یہ کڑی ساعتیں، کب ختم ہوگا یہ خوف کا عفریت۔

مگر خبر نہیں آنے والے لحات کیا لائیں گے خوش خبری یا...... اس سے آگے کا سوچ کر ہی اسے وحشت ہونے لگی۔ اچانک آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر باہر آئے۔ عادل بھائی لپک کر ان کے پاس گئے اور ان سے باتیں کرنے لگے۔ ان کے چہرے پر خوشی جھلکنے لگی تھی، وہ پھر یاور علی سے یک دم لپٹ گئے تھے۔

''او خدایا...... تیرا شکر ہے۔'' وہ بولے۔

ڈاکٹر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ان کے ہمراہ ایک طرف چلتے ہوئے جانے کیا کہنے لگا کہ عادل بھائی کے چہرے کا رنگ یک دم اڑ گیا، وہ پھیکا نظر آنے لگا۔

ڈاکٹر ان کا کندھا تھپک کر آگے بڑھ گیا مگر وہ یوں ہی کھڑے رہ گئے۔ یاور علی نے ان کا کندھا ہلایا تو وہ چونکے اور ایک افسردہ سانس بھر کر یاور علی کو دیکھا' حوریہ لپک کر آئی تھی۔

''کیا کہہ رہا ہے ڈاکٹر...... بابر...... ٹھیک ہے ناں وہ۔'' اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ مومنہ اور عاظمہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئیں، دوسرے پل عاظمہ دیوانے کی طرح دوڑتی ہوئی آئیں۔

''کیا ہوا عادل...... بابر...... بابر میرا بچہ ٹھیک تو ہے نا۔''

''بہت مبارک ہو، اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔'' عادل بھائی ہلکے سے مسکرائے مگر ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی، کبھی کبھی خوشی بھی غم کے گلے سے لگ کر ملتی ہے کہ خوشی کا احساس جھاگ کی طرح بیٹھنے لگتا ہے۔

بابر زندہ تھا وہ خطرے سے باہر تھا مگر اس کا دایاں پیر ہمیشہ کے لیے اس کے وجود سے جدا کر دیا گیا تھا۔ میجر آپریشن کی باوجود بابر کی ٹانگ کو بچا نہ سکے تھے جو بری طرح مسخ ہو چکی تھی۔ اس روح فرسا انکشاف نے سب کو رلا دیا۔

بابر کے زندہ بچ جانے کی خوشی اور اس کے یوں معذور ہو جانے کا غم، دل پر بیک وقت طاری تھا۔ یوں جیسے بے پایاں ملنے والی خوشی یکلخت دکھ کے ملبے کے نیچے دبنے لگی ہو۔ ایک افسردہ سی خوشی کا احساس باقی رہ گیا تھا۔

حوریہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی اس کے اعصاب تو پہلے ہی متاثر تھے اب تو نیم سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔

بابر کو آپریشن تھیٹر سے آئی سی یو منتقل کر دیا گیا تھا، جب تک اس کی حالت ٹھیک نہیں ہوتی، اسے روم میں

منتقل نہیں کیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ راہ داری میں سناٹا ہونے لگا اور اس سے کہیں گہرا سناٹا حوریہ اپنے دل میں اترتا محسوس کر رہی تھی۔

بڑی مشکل سے وہ اٹھی اور ہسپتال سے نکل آئی۔

☆......☆......☆

نہ گنواؤ ناوک نیم کش، دل ریزہ ریزہ گنوادیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تن داغ داغ لٹادیا
میرے چارہ گر کو نوید ہو، صف دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر، وہ حساب آج چکا دیا

بابر کو تیسرے روز اس روح فرسا خبر کا انکشاف ہوا تھا جب اس کو اپنے وجود میں کسی خالی پن کا احساس ہونے لگا۔ اسی شاک سے باہر نکلنے میں اسے چند گھنٹے لگے تھے، بظاہر تو وہ اس تکلیف دہ احساس سے باہر نکل آیا تھا مگر اس کو لگ رہا تھا زندگی ٹھہر سی گئی ہے۔

امیدیں، ولولے دم توڑ گئے ہیں اور جب امید امنگ' خواہش مر جائے تو آدمی دنیا کا ایک بے کار عضو خود کو محسوس کر کے رہ جاتا ہے بلکہ زندہ رہنا ہی بے کار شغل لگنے لگتا ہے۔

بابر بھی خود کو اندر سے ایسا ہی خالی خالی محسوس کر رہا تھا کہ جینے کی خواہش تھی نہ موت کی تمنا، ایک خلا سا جس میں کوئی تیرتا ہوا بے حیثیت ذرہ۔ جہاں ہوا اڑائے لے جائے۔ شاید ایسے ہی سکوت کو دل کی موت کہتے ہیں۔

''ہم ابروڈ جائیں گے، تم سرجری کے قابل ہو جاؤ گے تو مصنوعی پیر بھی لگ جائے گا۔'' عاظمہ تسلی دینے لگیں۔

''تم زندہ ہو یہ ہی بہت ہے میرے لیے بابر!''

''زندہ......!'' بابر کے لبوں پر تلخ افسردہ مسکراہٹ ابھر کر منجمد ہو گئی۔

''ہاں، تمہیں دیکھ دیکھ کر تو میں جیتی ہوں بابر! سب اچھا ہو جائے گا۔'' عاظمہ کی سسکیاں بہلاوے طفل تسلیاں تھیں اس کے لیے، اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اپنے جوان توانا بیٹے کو یوں معذور ہوتے دیکھنا عاظمہ کے لیے بھی کم آزمائش نہیں تھا۔ وہ اپنے سارے آنسو سینے میں اتار کر اس کو تسلی دینے کی کوشش میں لگی رہتیں۔ امیر علی الگ اس کے آگے پیچھے رہتا، اس کی خدمت کرتا، اسے خوش رکھنے کے جتن کرتا۔ علی شاہ کو اس کے پاس لاتا رہتا، اسی کی باتیں کرتا مگر بابر کی چپ ایسے میں اور بھی گہری ہو جاتی۔

☆......☆......☆

''گیلانی ہاؤس میں تو گویا موت کی سی ویرانی اتر آئی تھی۔ گھر جتنے بھی بڑے ہوں، عالی شان ہوں، کشادہ ہوں مگر انسانوں سے آباد ہوتے ہیں۔ گھروں کی رونق سجاوٹ کی چیزوں اور خوش نما دیواروں سے نہیں ہوتی۔ انسان کی موجودگی سے زندگی کا احساس ہوتا ہے۔

محلات بھی اجڑ جاتے ہیں، جب انسان مر جائے، چاہے یہ جسمانی موت ہو یا روحانی۔

گیلانی ہاؤس بھی کچھ اسی طرح اجڑا اجڑا دکھائی دینے لگا تھا۔

کون سوچ سکتا تھا تکبر سے ادھر اُدھر حکمرانی کرنے والا عباد گیلانی موذی مرض میں مبتلا ہو جائے گا اور سینے پر جوان بیٹے کی موت کا داغ لیے کردار فانی سے کوچ کر جائے گا۔

ہنستا مسکراتا حازم دلوں میں اپنی نشانیاں چھوڑ کر داغ مفارقت دے جائے گا۔ زندگی کو موج مستی سمجھنے والا بابر، بے بسی کی تصویر بن کر رہ جائے گا۔ وقت کے کمان سے جانے کون سا تیر نکلتا ہے یہ کس کو خبر ہے۔

یاور علی نے حوریہ کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ اپنی سوچوں سے باہر نکلی۔

''جتنا اکیلے بیٹھ کر سوچتی رہو گی، یہ درد بڑھتا رہے گا اور سوچیں تو زخمی کر ڈالتی ہیں انہیں جھٹک دیا کرو، ان کا گھیرا اپنے گرد تنگ نہ ہونے دو۔ اس میں انسان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔'' وہ حوریہ کے نزدیک بیڈ کے کنارے بیٹھ گئے۔

''سانس لینا ہی تو محال ہو گیا ہے داجی!'' اس نے افسردہ سانس بھر کر ان کے کندھے پر سر ڈال دیا۔

''سوچتی ہوں کہ کہاں غلط تھی میں، کہاں غلطی کر ڈالی میں نے۔ کیا بابر میری وجہ سے اس حال پر پہنچا ہے؟'' وہ افسردگی سے بولی۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے یہ سب انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ موت زندگی، حادثات...... ہاں کہیں کہیں انسان کی غفلت ضرور آڑے آجاتی ہے۔ زندگی گزارنے کا آسان طریقہ بس یہ ہی ہے کہ کم سے کم سوچا جائے، نہ سوالات میں الجھا جائے، آنے والے گزرے لمحات کو فیس کرتا رہے۔''

یاور علی کا لہجہ تسلی آمیز تھا، وہ جانتے تھے حوریہ کس کرب سے گزر رہی تھی۔

''بابر جیسا شخص یہ سب کیسے فیس کرے گا داجی! جس نے کبھی خود کو کمزور اور بے بس نہیں دیکھا۔'' اس نے تڑپ کر کمرے کے دروازے پر کھڑی مومنہ کو دیکھا۔

''کوئی نہیں کرتا، نہ کرنا چاہتا ہے۔ کیا بااختیار، کیا بے اختیار، کیا قوی، کیا کمزور...... مگر تقدیر کرواتی ہے۔ قدرت اپنی طاقت کا احساس دلواتی ہے، ہمارے قدم چاہے جتنے بھی مضبوطی اور طاقت کے ساتھ زمین پر اٹھیں مگر زمین کو پھاڑ نہیں سکتے۔ ہم جتنے بلند ہو جائیں آسمان کو چھو نہیں سکتے۔ بس انسان کو آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ایک کمزور مخلوق سمجھ کر زندہ رہنا چاہیے کہ جانے کب موت کا تیز جھونکا آئے گا اور اسے اڑا لے جائے گا۔''

''مگر وہ تو بہت بدل گیا تھا داجی! اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا احساس ہونے لگا تھا تو کیا رب کو اس کی یہ ادا پسند نہیں آئی۔'' حوریہ کے آنسو اس کی پلکوں کی باڑھ توڑ کر پھسلنے لگے تھے۔

''ضرور آئی ہوگی، وہ تو اپنی مخلوق سے بہت محبت کرتا ہے، اس کی محبت تو لامتناہی ہے کہ کیا سمندر ہوں گے مگر وہ جسے محبوب کر لیتا ہے نا، تو چاہتا ہے کہ اسے پاک صاف کر دے، اسے ہلکا پھلکا کر دے۔ کسی آزمائش میں ڈال کر، کبھی تکلیف دے کر، گناہ دھو ڈالتا ہے۔ ہاں مگر بندوں کی حق تلفیاں، بندوں سے کی گئی زیادتیاں، یوں معاف نہیں ہوتیں۔ یہاں بندہ پھنس جاتا ہے، مار کھا جاتا ہے کہ بڑا انصاف رکھا ہے رب العالمین نے، کہ مخلوق سے کی گئی زیادتیاں تو مخلوق ہی معاف کرے گی تو بات بنے گی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو یہ دنیا جابروں، ظالموں اور بے رحموں سے ہی بھر جاتی۔ ہر کوئی درندہ بن جاتا۔ وہ سمجھتا اس رب العالمین سے معافی تلافی کر لیں گے، مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ مخلوق سے معاملہ صاف نہ کرایا تو خسارہ ہی خسارہ۔

تم پریشان نہ ہو، ہاں غم بہت بڑا ہے، بھرتے بھرتے وقت لگے گا مگر کیا یہ کم نہیں کہ وہ زندہ بچ گیا ہے۔ سنبھل جائے گا وہ بھی، وہ بہت سمجھدار اور بردبار ہو چکا ہے۔ دنیا کی حقیقت کو سمجھنے لگا ہے، قدرت کو ماننے لگا ہے، اس کے فیصلوں کو قبول کرنے لگا ہے یہ بھی کر لے گا۔

''جانتی ہوں جہاد اکبر کیا ہے، اپنے نفس سے جہاد کرنا اور یہ باطنی دشمن بڑا خطرناک ہے۔ اسے شکست دینا بڑا مشکل ہے، یہ وہ دشمن ہے جو انسان کو اندر سے کھوکھلا کر کے جہنم کے گڑھے میں گرانا چاہتا ہے۔ اسی سے

جہاد کرنا جہادِ اکبر ہے اور بابر نے اپنے آپ کو بدلا۔ اس کا مطلب ہے اس نے اپنے نفس سے جہاد کیا ہے، نفس کو مارا ہے، اپنی خواہشوں اور بدعادتوں کو شکست دی ہے۔'' یاور علی کے الفاظ مومنہ کے دل کو گداز کر رہے تھے، وہ آہستگی سے دروازے سے ہی پلٹ گئی۔

حوریہ یاور علی کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

''ہم انسان بہت ظالم ہیں، بہت ظالم...... معاف کرنے کے لیے ہمارے دل بہت تنگ ہو جاتے ہیں۔''

حوریہ کا دل بین کر رہا تھا، پتا نہیں اسے اپنی زیادتیاں یاد آ رہی تھیں یا بابر کی تکلیف کا احساس ستا رہا تھا۔ ایک سوگوار ماحول ہو کر رہ گیا تھا، یاور ہاؤس کا بھی۔

☆......☆......☆

''بابر! یاور ہاؤس سے فون آتے ہیں تمہارے لیے، یاور علی بھی تمہارا پوچھتے ہیں۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔'' عاظمہ اس کے پاس بیٹھ کر اسے بتانے لگیں۔ ''عادل بھائی بھی کئی بار کال کر چکے ہیں اور مومنہ بھی۔''

''پلیز مام! ان سب سے ایکسکیوز کر لیں، مجھے نہیں ملنا کسی سے بھی۔'' وہ ناراضی سے بولا۔

''اور حوریہ! وہ بھی یہاں آنا چاہتی ہے۔''

''خدا کے واسطے......'' وہ یک دم بدکا۔ عاظمہ کے باقی الفاظ اس کے ہونٹوں پر ہی چپکے رہ گئے۔

''میں نے کہا نا، نہیں ملنا مجھے کسی سے بھی۔ کون ہوتے ہیں وہ سب میرے۔'' پھر عاظمہ پر نظر پڑی تو اس کا لہجہ نرم پڑ گیا، اس نے عاظمہ کے ہاتھ تھام لیا۔

''بس آپ میرے پاس رہیں، مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔'' عاظمہ نے جواباً نم پلکوں کو جھپکتے ہوئے اسے دیکھا اور اس کے ہاتھ پر بوسہ لیا۔

''ابھی تو میں اس حقیقت کو قبول کرنے کی کوشش کر رہا ہوں یا شاید اس احساس کو بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لوگوں سے مل کر یہ احساس بڑھنے لگے گا۔''

''میں تمہاری ذہنی حالت کو سمجھ سکتی ہوں بابر! مگر بے اختیار ہو کر رہ گئی ہوں، سمجھ نہیں آتا تمہیں بہلاؤں یا پہلے خود کو۔'' وہ دھیرے دھیرے رونے لگیں۔

''او نو مام! میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔'' بابر نے جلدی سے انہیں خود سے لگا لیا پھر بڑے پیار سے ان کے آنسو پونچھنے لگا۔

''جانے کس کی نظر کھا گئی تمہیں، سوچ بھی نہیں سکتی تھی کبھی ایسا بھی ہوگا۔'' وہ کسی بچے کی طرح بابر کے مضبوط سینے سے لگ کر بلکنے لگیں۔

''نظر نہیں آہ کھا گئی مجھے، بددعائیں لگ گئیں مجھے۔'' بابر کا دل افسردگی سے سوچ کر رہ گیا۔ ''ایک فضا ہی کہاں، جانے کس کس کو کیا کیا خواب نہ دکھائے ہوں گے، کس کس کے دل توڑے ہیں، کیا کیا ظلم ڈھائے ہیں میں نے۔'' وہ عاظمہ کو روتے دیکھتا رہا، عاظمہ کی سسکیاں کتنی دیر گونجتی رہیں۔

بہت سا رونے کے بعد انہوں نے سر اٹھا کر بابر کو دیکھا۔ اب ان کے لب افسردہ مسکراہٹ لیے ہوئے تھے، وہ اپنے رخساروں کا گیلا پن پونچھتے ہوئے بولیں۔

''تم زندہ ہو، میری نظروں کے سامنے۔ یہ ہی بہت ہے میرے لیے' میں نے سرجن ہمایوں سے بات کی ہے، بس تمہارے زخم بھر جائیں ہم ابروڈ جائیں گے۔ بہت جلد تم چلنے پھرنے بلکہ دوڑنے لگو گے۔ خدا نے تمہیں زندگی دے دی، ایک ماں کی دعا سن لی، اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے میری جان!'' وہ یوں اسے بہلانے لگیں جیسے وہ کم سن بچہ ہو۔ اس کے بالوں کو پیار سے پیشانی سے ہٹا کر اس کی کشادہ پیشانی پر اپنے بھیگے لب رکھ کر

پورے جذب سے چومنے لگیں۔

بابر نے آنکھیں بند کر لیں، اسے بھی لگنے لگا وہ چھوٹا سا بچہ ہو اور ماں کے پیار کا پہلا پہلا لمس محسوس کر رہا ہو۔ کبھی کبھی ہمارے شب و روز کے طریقے ہماری طرزِ زندگی، ہمیں کتنی فطری خوشیوں اور راحتوں سے محروم کر دیتا ہے سوچنے لگتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ کتنے بڑے زیاں اور نقصان سے گزرے ہیں کہ ان لمحات کی تلافی کا بھی سوچا نہیں جا سکتا۔

آج عاظمہ کو بھی اپنی گزری زندگی کے ملال رلا رہے تھے، اپنی زیادتیاں، لاپروائیاں، غیر ذمہ دارانہ رویے، سب یاد آ رہے تھے۔ ایک پل تو ان کا دل چاہا، بابر پھر وہی بچہ بن جائے اور وہ ملازموں کے حوالے کرنے کے بجائے اپنے سینے سے چمٹائے بیٹھی رہیں۔ وہ ان کی گود میں ہمکتے ہمکتے سو جائے۔

کتنے لمحے بے آواز سرک گئے، بابر کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں، عاظمہ نے اس کا سر تکیے پر رکھ دیا۔ وہ دواؤں کے زیرِ اثر تھا، عاظمہ پیار سے اسے سلانے لگی، اس کے اوپر کمبل ڈال کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆......☆......☆

حوریہ ''گیلانی ہاؤس'' آئی تھی، بابر سے ملنا چاہتی تھی، اسے ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنے دل کی اس خواہش کو وہ دبا نہ سکی تھی اور اسی خواہش کی روانی میں بہتی چلی آئی مگر اسے دھچکا لگا جب عاظمہ نے اسے بتایا کہ بابر اس سے ملنا نہیں چاہتا بلکہ کسی سے بھی نہیں۔

''کیوں...... کیوں آنٹی!'' وہ تڑپ کر رہ گئی۔

''اسے سنبھلنے دو حوریہ! اسے کچھ وقت چاہیے، اپنے آپ کو جوڑنے کے لیے۔ وہ بکھر گیا ہے، اس حادثے نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا ہے۔''

''مگر میں اس سے ملنا چاہتی ہوں، اسے کہیے نا آپ۔''

''وہ خفا ہو جائے گا، بہت برہم ہو گیا تھا اس روز بھی جب میں نے اس سے پوچھا تھا۔''

''ہاں میں جانتی ہوں، وہ مجھ سے خفا ہے۔'' ایک تکلیف دہ رنگ حوریہ کی چہرے کو چھو گیا۔

''نہیں وہ تم سے خفا نہیں ہے۔'' عاظمہ پیار سے بولیں اور چائے کا کپ اسے تھمایا۔ ''وہ کیوں خفا ہوگا تم سے بھلا، بس میں نے کہا نا، اسے ان ساری باتوں کو قبول کرنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔'' حوریہ نے ایک مضمحل سی سانس بھر کر چائے کا مگ تپائی پر رکھ دیا۔

''میں اسے حوصلہ دوں گی، صرف ایک بار اسے مل لینے دیجیے۔'' وہ یک دم تڑپ کر بولی، عاظمہ نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ ناراض ہو کر تمہیں کچھ الٹا سیدھا بول دے گا حوریہ! تم نہیں جانتیں اس کی ذہنی حالت کو۔'' اس وقت ان کے لہجے میں بے نام سا خوف تھا۔

''میں سہہ لوں گی اس کی ہر ناراضی، سارا غصہ۔'' وہ صوفے سے اٹھی۔

''وہ بے عزتی کر دے گا تمہاری حوریہ!'' عاظمہ نے گھبرا کر اسے روکنا چاہا۔

''مجھے کچھ بھی برا نہیں لگے گا آنٹی!'' وہ افسردگی سے مسکرا دی اور پلٹ کر بابر کے روم کی جانب بڑھ گئی۔

عاظمہ اسے دیکھتی رہ گئی پھر اضطراری انداز میں اٹھ کر لابی سے باہر نکل گئیں۔

☆......☆......☆

بابر کا کمرہ علی شاہ کے کھلونوں سے بے ترتیب پڑا تھا، خوش نما غالیچے پر جا بجا کھلونے بکھرے پڑے تھے۔ ایک طرف علی شاہ کھیل رہا تھا کسی کھلونے کے بٹن میں الجھا ہوا مست مگر مسرور......

بابر اپنے جہازی سائز بیڈ پر لیٹا ہوا تھا، پیروں سے لے کر سینے تک لحاف اوڑھے، موبائل میں مصروف تھا۔ آہٹ پر نظروں کا رخ ذرا سا موڑا، دوسرے پل اس کے لب بھنچ گئے۔ موبائل پر اس کی گرفت غیر محسوس طور پر ڈھیلی پڑ گئی۔ حوریہ دروازے پر رک کر اسے اجازت طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی، جواباً بابر نے رخ پھیر لیا۔

"کیسے ہو بابر!" وہ اندر چلی آئی اور اسے مخاطب کرنے کے لیے مناسب لفظ تلاش کرتے ہوئی بس یہ ہی کہہ سکی۔

بابر کے چہرے پر ایک پتھریلی سنجیدگی ٹھہر گئی تھی، گویا حوریہ کی موجودگی اس کے لیے ناگواری کا باعث تھی۔

"اگر کہوں گا کہ ٹھیک ہوں تو تم یقیناً دل میں ہنسو گی اور اگر یہ کہوں گا کہ ناٹ بیٹر تو تمہارے دل کو تسکین پہنچے گی۔" وہ ہلکے سے ہنسا، خود آزار قسم کی ہنسی۔ حوریہ کے دل پر چھائی رنجیدگی میں اضافہ ہو گیا۔

"نہیں، نہ میرا دل ہنسے گا نہ تسکین پائے گا۔ تم میرے لیے اتنا غلط کیوں سوچتے ہو؟"

بابر نے اسے دیکھا پھر نظروں کا زاویہ بدل کر علی شاہ پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"اگر علی شاہ کو لینے آئی ہو تو اسے لے جا سکتی ہو، یوں بھی مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ رکھائی سے کہتے ہوئے کروٹ بدل گیا تھا۔

"میں علی شاہ کو لینے نہیں آئی، علی شاہ اب تمہاری ذمہ داری ہے اور یہ ذمہ داری تم نے خود قبول کی ہے۔" وہ اس کے تلخ رویے پر برا مانے بغیر اعتماد سے قدم اٹھاتے ہوئے بولی اور اندر آکر علی شاہ کے نزدیک چلی آئی۔

"کیا تم اس ذمہ داری سے جان چھڑانا چاہ رہے ہو؟" بابر کے اعصاب پر ضرب سی پڑی تھی، وہ کھنچنے لگے۔ "تھک گئے اتنی جلدی، ہاں ماں سے زیادہ بھلا کون پیار دے سکتا ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ یک دم بھبکا تھا اور جھٹکے سے اس کی طرف کروٹ لی کہ پیر میں شدید درد کی ٹیسیں اٹھیں وہ کراہ کر رہ گیا۔ حوریہ جو جھک کر کارپٹ سے علی شاہ کے کھلونے سمیٹ رہی تھی گھبرا کر اٹھی اور بیڈ کی طرف آئی مگر دوسرے پل جھجک کر فاصلہ پر رک گئی۔

بابر تکلیف کے احساس سے آنکھیں میچ گیا تھا، اس کا چہرہ درد کی شدت سے تمتمانے لگا تھا۔

"میں عاظمہ آنٹی کو بلاتی ہوں۔" حوریہ کو لگا وہ شدید تکلیف میں مبتلا ہے اور درد برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔" وہ بامشکل بول پایا تھا پھر ہلکے سے سانس کھینچ کر آنکھیں کھولیں، جو بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

"کوئی میڈیسن دوں۔" وہ اس کی سائڈ ٹیبل پر رکھے دوائیوں کے ڈھیر پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

"نو تھینکس، بس تم یہاں سے چلی جاؤ۔" وہ تپتے لہجے میں بولا۔ حوریہ کی موجودگی اس کے اعصاب پر گراں گزر رہی تھی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اسے اٹھ کر خود ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکال دے۔

"بابر! میں تم سے ہمدردی نہیں کرنے آئی، نہ ہی تمہاری بے بسی کا تماشا دیکھنے آئی ہوں، قسم سے میں تو......" وہ وضاحت دینے لگی۔

"بے بس میں ہوں بھی نہیں، تم کیا تماشا دیکھو گی۔" وہ اس کی بات کاٹ کر تڑختے لہجے میں بولا۔

"اور تم سے مجھے ہمدردی کی امید ہے نہ خواہش، بس...... چلی جاؤ یہاں سے۔" حوریہ پریشان ہو کر دوائیوں کے ڈھیر سے پین کلر ڈھونڈنے لگی، جب بابر نے اس کا ہاتھ نفرت سے جھٹکا۔

"گیٹ آؤٹ حوریہ! آئی سے گیٹ آؤٹ......" اس نے کچھ ایسی تپتی آنکھوں سے اسے دیکھا اور چلایا کہ حوریہ کو اپنے پہلو سے گویا آنچ سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ اسے ایسے جارحانہ رویے کی امید نہیں تھی، مزاحمت کی

ساری طاقت سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ بے اختیار آنکھیں بھیگ گئیں، وہ بکھری ہوئی دواؤں پر ایک نظر ڈال کر کمرے سے نکل گئی۔

"مائی فٹ۔" بابر نے بیڈ پر پڑا تکیہ پوری طاقت سے دیوار پر دے مارا پھر بے بسی سے سر تکیے پر پٹخا اور آنکھیں بند کر لیں۔

تمہیں معلوم ہے جاناں
کہ تم بھی ایک قاتل ہو
میرے اندر کا ایک ہنستا ہوا انسان
تم نے مار ڈالا ہے

☆......☆......☆

بابر کا یہ ناروا رویہ، اسے پہلی بار بے رحمانہ نہیں لگا تھا بلکہ اس کا دل اس کے درد سے اور بھی بھر گیا تھا۔ وہ اس کے کمرے سے نکل کر لابی میں چلی آئی جو سنسان پڑی تھی۔ ملازم اپنے اپنے کوارٹر میں تھے، ایک امیر علی ہی جاگ رہا تھا۔

اس نے امیر علی سے علی شاہ کو بابر کے کمرے سے لے آنے کا کہا تو امیر علی نے اسے منع کر دیا۔

"بابر صاحب کا حکم ہے، علی شاہ ان ہی کے کمرے میں سوئے گا۔ علی شاہ کا بستر وہیں لگتا ہے اب۔" امیر علی نے ادب اور احترام سے اسے جواب دیا تھا، وہ چپ رہ گئی۔

امیر علی پلٹ کر چلا گیا، وہ وہیں کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

وہ اپنے تئیں بابر کی ایک ہمدرد رفیق ثابت ہونا چاہ رہی تھی مگر بابر اس کی ہمدردی اور محبت سے جس طرح لگا تھا اس کا دل درد کا پھوڑا بن کر رہ گیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کس طرح وہ اس کے دل کو صاف کر دے، اس کی بدگمانیاں نکال باہر کرے۔

اس کی ساری سرکشی، ضدی پن، غصہ، انا...... جانے کہاں بہہ کر رہ گیا تھا۔

وہ خود کو ایسا نقطہ خیال کر رہی تھی جو ایک مدار کے گرد چکر کھانے لگا ہو اور وہ مدار بابر تھا۔

"اس طرح کیوں سو رہی ہو حوریہ!" عاظمہ کے ہاتھوں کا لمس اپنی پیشانی پر محسوس کر کے اس نے آنکھیں کھولیں۔

وہ اس پر جھکی ہوئی تھیں پھر اس کا سر اٹھا کر کشن اس کے سر کے نیچے رکھ دیا اور خود بھی اس کے نزدیک بیڈ ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔

"ہرٹ ہوئی ہو ناں، میں نے کہا تھا ناں وہ کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتا۔" وہ پرملول نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"نہیں ہرٹ نہیں ہوئی، بس سوچ رہی ہوں کہ میں کہاں غلط تھی۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "ٹھیک ہی کہتے ہیں کہنے والے، غلطیوں کی کھڑکی کھلنے کے بعد ہی احساس کا دریچہ وا ہوتا ہے۔"

عاظمہ کے چہرے پر ایک متاسفانہ رنگ چھو گیا، انہوں نے نرمی سے اس کے کندھے کو تھپکا، وہ جانتی تھیں اس کے دل کی رگوں کو بابر کی بے بسی لاچاری کا دکھ کاٹ رہا ہے۔

"تم حوصلہ مت ہارنا حوریہ! تم حوصلہ ہار دو گی تو میرے بچے کو زندگی کی طرف کون کھینچ لائے گا۔

ہاں حوریہ! تم میری آخری امید ہو، تمہارے آنے سے مجھے بہت سہارا ملا ہے۔ جیسے بجھتے ہوئے دیے میں تیل پڑ گیا ہو، جان آگئی ہو اس میں۔"

"وہ مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے آنٹی!" حوریہ ملول سی ہو کر بولی۔

"نہیں، وہ تم سے نفرت کیسے کر سکتا ہے۔ اس پگلے نے تو تم سے محبت کی ہے...... سچی محبت۔"

"سچی اور خالص محبت کے ساتھ یہ ہی تو مسئلہ ہے کہ اس میں ذرا سا ناخالص احساس کانٹے کی طرح لگتا ہے۔ یہ پودا ذرا سی ناموافق ہوا سے مرجھانے لگتا ہے، ایک باریک لکیر ہوتی ہے محبت اور نفرت کے مابین۔ محبت کی انتہا پر پہنچا ہوا جب ٹوٹتا ہے تو نفرت کی گہرائی میں جا گرتا ہے۔" حوریہ دل گرفتگی سے سوچنے لگی۔

☆......☆......☆

ناشتے کی میز انواع و اقسام کے کھانوں سے سجی ہوئی تھی مگر ساری کرسیاں خالی تھیں، کوئی موجود نہیں تھا۔ بابر اپنی وہیل چیئر پر باغیچے میں تھا۔ علی شاہ نزدیک فٹ بال کھیل رہا تھا، وہ گیند بابر کی طرف اچھالتا پھر خود گیند پکڑ کر لے آتا۔

حوریہ اس کی طرف چلی آئی، اس کے لبوں پر بڑی دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

سبز اور سفید رنگ کی کرتی اور ٹراؤزر میں ہم رنگ دوپٹا سلیقے سے اوڑھے، وہ اس پل بہار کا ہی کوئی حصہ لگ رہی تھی۔ بابر نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا تھا مگر دوسرے پل نظروں کا زاویہ بدل کر علی شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ناشتا نہیں کرو گے۔" وہ اس کے نزدیک چلی آئی۔

"امیر علی نے تمہاری پسند کی ساری چیزیں بنائی ہیں۔" اس کا لہجہ بھی دوستانہ تھا۔

"وہ ہمیشہ ہی میری پسند کی چیزیں بناتا ہے۔" وہ رکھائی سے کہہ کر پیروں میں لڑھکتی بال کو اٹھانے لگا۔

"تو پھر ناشتا کر لو۔"

"تم نے یہ ڈیوٹی کب سے سنبھال لی ہے۔" وہ ابرو کو جنبش دے کر استہزائیہ آمیز نظر اس پر ڈالتے ہوئے بولا۔

"کیسی ڈیوٹی؟"

"مجھے ناشتا کرانے کی۔" حوریہ کو اس کے لہجے اور نگاہوں نے ایک پل خفیف سا کر دیا۔ اسے اپنی پیشانی جلتی محسوس ہوئی۔

"تم جاؤ، میں کر لوں گا۔" وہ رخ پھیر کر امیر علی کو پکارنے لگا۔

"امیر علی...... علی شاہ کو لے جاؤ، اسے ناشتا کراؤ اور مجھے ایک کپ چائے دے جاؤ۔"

"امیر علی......" حوریہ نے پلٹ کر جاتے امیر علی کو روکا۔ "امیر علی! بابر کا ناشتا بھی یہیں لگا دو۔" بابر نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا تھا مگر اس کے لہجے اور ذات میں موجود اعتماد نے اسے کچھ کہنے سے باز رکھا۔ امیر علی سر ہلا کر چلا گیا، وہ بابر کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرائی۔

"سوری...... یہ ڈیوٹی میں نے از خود لگائی ہے خود پر۔" اس کے چہرے پر پھیلی دوستانہ اور خوش گوار مسکراہٹ نے بابر کو نظریں پھیرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

حوریہ کے گیلانی ہاؤس میں آ جانے سے عاظمہ حقیقت بہت خوش تھیں، افسردگی اور تنہائی کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ ایسا ہی بابر کو بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ بجھے بجھے دیے میں جیسے جان پڑ گئی ہو، روشنی کا احساس اٹھنے لگا تھا تاہم وہ کبھی کبھی چڑ جاتا۔ ایسی چڑ جو دل کو جکڑ کر اسے دیوانہ کر دیتی۔

اس کی قربت اس کے اندر لگی آگ پر تیل کا کام کر جاتی۔

اسی روز بھی وہ اسے ٹرالی گھسیٹ کر چائے اور دوسرے لوازمات لاتے دیکھ کر بھڑک اٹھا تھا۔

"کیوں، تم میرا پیچھا نہیں چھوڑ دیتی ہو حوریہ! کس بات کا انتقام لے رہی ہو مجھ سے۔ قدرت نے لے لیا، بہت نہیں ہے۔" اس نے چائے کا کپ دیوار پر دے مارا، حوریہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

"میں جانتا ہوں، تم میری بے بسی کا تماشا دیکھ رہی ہو، مزا آ رہا ہے تمہیں، تسکین مل رہی ہے۔ ماضی کے بابر اور حال کے بابر کا موازنہ کر کے لطف لے رہی ہو۔ سوچ رہی ہو ناں کہ بابر سے قدرت نے کیا خوب انتقام لیا ہے، اسے کھا گئی آہیں، سسکیاں، بددعائیں...... کھینچ لی قدرت نے اس کے پیروں تلے سے زمین۔"

حوریہ ششدر رہ گئی، یہ لہجہ بابر کا تو نہ تھا ایک ایسے شخص کا تھا جو مسلسل اذیت کی فضا میں سانس لے رہا ہو، جس کی برداشت آخری سطح پر پہنچ کر چیخ رہی ہو۔

"پلیز چپ ہو جاؤ بابر!" وہ رنج سے پھٹ پڑی۔

بابر کی یہ بدگمانیاں یہ نفرت اس کے دل کو چھیدنے کو کافی تھیں۔ اس نے ٹوٹے کپ کی کرچیوں کو دیکھا اسے اس پل بابر بھی ایک ٹوٹا ہوا کانچ ہی دکھائی دے رہا تھا جو زخم ڈال رہا تھا، اس کے سینے پر اس کے دل کی ہر رگ کو چھید رہا تھا۔

"حوریہ عادل اتنی گری ہوئی بھی ہو سکتی ہے کہ تمہارا تماشا دیکھنے چلی آئے گی۔ تمہیں اس حال میں دیکھ کر لطف اٹھائے گی، اگر تمہاری نظر میں، میں اتنی ہی گر چکی ہوں تو پھر مجھے چلے ہی جانا چاہیے۔" وہ اذیت کے احساس سے گزرتے ہوئے بابر کو ایسے دیکھنے لگی جیسے کوئی مقتول قاتل کو دیکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے اس خنجر کو، جس سے وہ اس پر وار کر رہا ہے۔ وہ اس پر نظر ڈال کر کمرے سے نکلنے لگی مگر اس کے گزرنے پر بابر نے اس کی کلائی جکڑ لی، کوئی شعلہ سا لپکا تھا۔

"تم" وہ اس کی کھلی وحشت سے پھیلی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ دوسرے پل یک دم جھٹکے دے کر اپنی وہیل چیئر پیچھے ہٹائی' اس جھٹکے پر وہ ذرا سا لڑکھڑائی تھی، دوسرے پل بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

بابر چند لمحے بے بسی کے احساس سے کڑھتا رہا پھر سائڈ ٹیبل سے پانی سے بھرا گلاس اٹھا کر ایک سانس میں خالی کر گیا مگر آگ بجھنے کے بجائے اور بھڑک رہی تھی۔

اس نے سگریٹ کیس سے آخری سگریٹ بھی نکال کر لبوں کے درمیان پھنسا کر اسے لائٹر کا شعلہ دکھا کر ایک گہرا کش لیا اور دھواں آنکھوں کے سامنے پھیلا لیا۔

☆......☆......☆

شام وہ حوریہ کے کمرے میں آیا تو وہ علی شاہ کے کپڑے وارڈ روب میں رکھ رہی تھی، اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

"تمہیں خفا ہونے کا حق ہے، مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے شاید تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔"

"شاید......" وہ تلخی سے ہنسی۔

"یقیناً۔" اس نے دل گرفتی سے سر اثبات میں ہلایا۔ "سوری! میں تمہیں ہرٹ کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

"اس کے باوجود ہر بار ہرٹ کیا ہے۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولی اور وارڈ روب کا دوسرا پٹ کھولنے لگی کہ بابر نے جھنجلا کر کھلا ہوا پٹ زور سے دھکیل کر بند کر دیا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔

"تم جانتی ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔" اس نے اندر سے اٹھتے غصے کے ابال کو بامشکل دبایا تھا پھر اس کی اٹھنے والی استفہامیہ نظروں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"صرف یہ ہی کہ تم میرے سامنے مت آیا کرو، مجھے اذیت ہوتی ہے۔ میرے اعصاب بکھرنے لگتے ہیں،

خود کو جوڑے رکھنے کا عمل بکھر جاتا ہے۔"

"اسی لیے تو جا رہی ہوں یہاں سے۔" وہ عجیب افسردگی سے ہنسی۔ "یوں ہی ایک خوش فہمی کے ہاتھوں چلی آئی تھی کہ میری دل جوئی شاید تمہارے کام آجائے، تمہاری اذیت کو کم کردے۔ نہیں جانتی تھی کہ یہ اذیت بڑھ جائے گی۔"

"ہاں، یہ اذیت بڑھ جاتی ہے۔" اس نے برہم نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کی سفاکی پر کٹ کر رہ گئی، اس کا دل سینے میں گویا ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔

"تم میری نظروں میں نہیں گری ہو بلکہ میں گر چکا ہوں اپنی ہی نظروں میں اور ایک بات سمجھ لو حوریہ! میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ تم ایک مکمل انسان ڈیزرو کرتی ہو میرا جیسا نامکمل نہیں۔"

"بابر!" حوریہ نے ہاتھ میں پکڑے علی شاہ کے کپڑے بیڈ پر پھینکے اور اس کے نزدیک آئی۔

"فیصلے کے کچھ حق میرے پاس بھی رہنے دو، ہر فیصلہ تم ہی کیوں کر رہے ہو۔"

"فیصلہ تو ہو چکا ہے، وقت نے کر دیا ہے اور اب اس پر ہم دونوں کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہم ہمیشہ سے الگ الگ راستوں کے مسافر تھے، تم میری منزل تھی ہی نہیں۔ بس کچھ ایسی پگڈنڈیاں آئیں کہ ہم الجھتے چلے گئے تھے۔ مجھے خوش فہمیوں نے باندھ لیا تھا مگر وہ سب سراب تھا، دھوکا تھا جو میں خود کو دیتا تھا اور اب تم خود کو دے رہی ہو اور مجھے بھی۔"

"میں نہ خود دھوکے میں ہوں نہ تمہیں دے رہی ہوں۔" وہ اس کی بات رد کرتے ہوئے بولی۔

یک دم اس کا حلق آنسوؤں کے غبار سے بھرنے لگا، آنکھوں میں مرچیں سی لگتی محسوس ہونے لگیں۔

"دھوکے سے ہی تو نکلی ہوں، زندگی کو سمجھنے لگی ہوں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"اچھی بات ہے، حقیقت پسند ہوگئی ہو۔" بابر نے گویا سراہنے کے انداز میں سر ہلایا تھا اور دھیرے سے مسکرایا تھا۔

حوریہ نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا، نظریں ملیں تو اس کی آنکھوں کے چمکتے سنہری کانچ پر نمی دیکھ کر بابر نے نظروں کا زاویہ بدل لیا۔

"میں نے کہا نا، تم بہت اچھے اور ایک مکمل انسان کو ڈیزرو کرتی ہو۔" وہ وہیل چیئر کے ہمراہ چلنے لگا۔

"بابر!" حوریہ اس کی سامنے آگئی۔ "ہم سب ادھورے ہیں، مکمل تو کوئی نہیں ہوتا۔"

"تمہاری ان باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تمہارے یہ میری جانب بڑھتے قدم، میرے دل میں کوئی پھول نہیں کھلا سکتے۔ کوئی شعلہ نہیں جلا سکتے۔" وہ گھائل تھا ہی نہیں گھائل کر بھی رہا تھا۔

وہ کمرے سے نکل گیا، وہ اسے کوئی رعایت دینے کو تیار نظر نہیں آرہا تھا۔ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے بداعتمادی، بے اعتنائی اور بے اعتباری کی انتہا، جذبوں کا گلا گھونٹ دیتی ہے یا جذبوں کو بے حسی کے سخت خول میں بند کر دیتی ہے۔ بابر نے بھی اپنے جذبوں کی لو کو نیچے کر لیا تھا۔

وہ صحرا بن گیا تھا، ویران صحرا...... جس میں اترنے والے کو سوائے دھوپ اور تپش کے کچھ نہیں ملتا۔

کچھ وقت کی روانی نے ہمیں یوں بدل دیا محسن
وفا پر اب بھی قائم ہیں مگر محبت چھوڑ دی ہم نے

☆......☆......☆

"کیا بات ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" رات کے کھانے پر عاظمہ اسے میز پر موجود نہ پا کر لابی میں چلی آئیں جہاں وہ ایک سنگل صوفے پر بیٹھی علی شاہ کو ادھر ادھر سائیکل بھگاتے ہوئے خالی خالی نظروں سے

دیکھ رہی تھی۔

"آؤ، کھانا کھالو، میں نے بھی نہیں کھایا۔" عاظمہ نے اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا، وہ چونکی۔

"آپ کھالیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"بھوک کیوں نہیں ہے۔" عاظمہ اس کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"بابر سے کوئی جھگڑا ہوگیا ہے۔"

اس نے سر نفی میں ہلایا۔ "اس سے جھگڑے کا کیا سوال۔"

"میری طرف دیکھو حوریہ! ادھر دیکھو۔" عاظمہ نے پیار سے اس کا رخ اپنی طرف کیا۔ "ایسا لگتا ہے یہاں آکر تم بہت ڈسٹرب ہوگئی ہو۔"

"شاید۔" اس نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی مگر مسکراہٹ جیسے لبوں پر ابھر کر ٹوٹ گئی۔ "میں سوچ رہی ہوں مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔" ایک لمحے توقف کے بعد وہ بولی پھر علی شاہ پر نظریں ڈالتے ہوئے بولی۔

"علی شاہ کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جانا چاہتی ہوں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو حوریہ!" عاظمہ نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

"بالکل درست فیصلہ ہے بلکہ بروقت بھی۔" بابر کی آواز پشت سے ابھری تو عاظمہ چونکیں پھر قدرے متاسفانہ نظروں سے بابر کو دیکھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ کہ...... اس کا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔"

"بابر...... تم......" عاظمہ اپنی جگہ سے اٹھنے لگیں۔ بابر نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر انہیں بولنے سے روک دیا۔

"اس کے رہنے کا کیا جواز بنتا ہے، کیا رشتہ ہے اس کا یہاں کسی سے، ہم لوگوں سے۔ محض علی شاہ کی ماں ہو کر وہ یہاں رہے یہ مناسب نہیں۔"

"بابر! تمہیں اندازہ ہے تم کیا کہہ رہے ہو اور کس لہجے میں۔" عاظمہ نے حوریہ پر ایک نظر ڈال کر بابر کو ترش نظروں سے گھورا۔ حوریہ نے سر جھکا لیا تھا وہ بابر کی طرف دیکھ رہی تھی نہ عاظمہ کی طرف۔

"اپنے اس حادثے کا ذمہ تم حوریہ کو کیوں ٹھہراتے ہو۔ اس پر اپنا غصہ کیوں نکالتے ہو۔" وہ خفا ہونے لگیں۔ "اس سارے حالات میں اس کا کیا قصور ہے۔"

"میں غصہ نہیں نکال رہا، نہ اسے اس حادثے کا ذمہ دار ٹھہرا رہا ہوں۔ میں ایک عقل کی بات کر رہا ہوں کہ اس کا یہاں رہنا......"

"بس...... انف......" عاظمہ نے اسے ٹوک دیا۔ "یہ فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہیں، یہ میرے لیے یہاں رہ رہی ہے، میں نے اسے روکا ہے۔"

"نہیں آنٹی! بابر ٹھیک کہہ رہا ہے، جذبات سے نہیں عقل سے دیکھا اور سوچا جائے تو میرا یہاں رہنے کا واقعی کوئی جواز نہیں بنتا۔" وہ جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔

"اور جب میری ضرورت بھی نہ ہو، یوں بھی میں کسی کے لیے اذیت کا باعث نہیں بننا چاہتی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بڑی زخمی نظروں سے بابر کو دیکھا تھا پھر رکی نہیں۔

بابر کے چہرے پر لحظہ بھر کو تغیر رونما ہوا تھا، دوسرے پل وہ نارمل دکھائی دے رہا تھا۔ عاظمہ نے اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا اور خود بھی صوفے سے اٹھ گئیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم اپنی زندگی کو کیوں مشکل بنا رہے ہو۔" ان کے لہجے میں دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔

''میں مشکل بنا رہوں؟'' بابر نے بھنویں اچکائیں۔

''ہاں ...... تم۔ وہ تم تک آنا چاہتی ہے تو تم کیوں اس کا راستہ روک رہے ہو، کیوں جھٹک رہے ہو اس کا ہاتھ۔ وہ تم سے محبت ......''

''شٹ ......'' اس نے بے حد برہمی سے عاظمہ کی بات پوری نہ ہونے دی۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا، جیسے غصے کے شدید ابال کو بامشکل دبا پا رہا ہو۔

''نہیں چاہیے مجھے اس کی یہ محبت، یہ ہمدردیاں، مجبوریوں کے ریپر میں لپٹی عنایتیں اینڈ آئندہ آپ مجھ سے اس ٹاپک پر بات بھی نہ کیجیے گا۔'' وہ عاظمہ کو ناراض نظروں سے دیکھتا ہوا پلٹ گیا۔

گرل کے پاس کھڑی حوریہ نے بابر کو اس کی خواب گاہ کی طرف جاتا دیکھا اس کا دل سلگتا ہوا پھوڑا بن کر رہ گیا۔ وہ ذہنی آزار سے گزرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس نے بابر کو اپنے ہاتھوں سے کھو دیا تھا، یہ بازی وہ ہار گئی تھی۔

وہ اسے یہ یقین نہیں دلا سکتی تھی کہ وہ اس سے ہمدردی نہیں کر رہی ہے بلکہ وہ تو اسے یہ یقین دلانا چاہ رہی تھی کہ میرے دل میں جھانکو بابر، کتنا اندھیرا ہے، کتنی اداسی ہے۔ میں اس میں تمہارے وجود سے تمہاری چاہت سے اجالا کرنا چاہتی ہوں مگر وہ سنتا تو وہ کہتی ناں۔ وہ تو اگلے پچھلے سارے حساب بے باق کرنے کو تیار دکھائی دے رہا تھا۔

اور اب علی شاہ کو یہاں رکھنے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا اس نے سوچا۔

☆......☆......☆

وہ یاور ہاؤس چلی آئی تھی، عاظمہ نے بہت روکا مگر وہ وہاں رہ کر بابر کو اذیت دینا نہیں چاہتی تھی۔ سو اٹھ کر چلی آئی تھی۔

اور جب برداشت نہ ہوا تو ایک دن مومنہ کے سینے سے لگ کر وہ سارا درد بہا بیٹھی، اتنا روئی کہ جیسے اب عمر بھر نہ رو سکے گی۔

''میں ہار گئی پھپھو! میں ہار گئی۔ میں اس شخص کو نہیں منا سکتی، اس کا دل نہیں جوڑ سکتی۔ ٹوٹے ہوئے دل نہیں جڑتے ناں۔''

کبھی کبھی انسان اپنی بے بسی پر اتنا کڑھنے لگتا ہے کہ تقدیر کو کوسنے لگتا ہے، اس پل مومنہ کا بھی دل چاہا وہ حوریہ کی تقدیر کو دوش دے۔ اسے کوسے۔

اسے آج ہی تو عاظمہ نے فون کر کے کہا تھا کہ بابر کے ہمراہ وہ ابروڈ جا رہی ہے۔

''دعا کیجیے گا مومنہ! اس کی سرجری کامیاب ہو جائے، وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔''

''وہ جا رہا ہے پھپھو! اور میں جانتی ہوں وہ نہیں آئے گا، پلٹ کر نہیں آئے گا۔'' حوریہ تڑپ کر کہہ رہی تھی۔

''وہ بہت ضدی اور اڑیل ہے جس طرح اپنی محبت میں اڑیل رہا، ضدی رہا اسی طرح وہ نفرت میں بھی ضدی ہے۔ وہ پلٹ کر نہیں آئے گا۔'' حوریہ کے آنسو مومنہ کے دل میں شگاف ڈال رہے تھے۔

وہ اسے تسلی دینا چاہ رہی تھی مگر اپنے لفظوں کی کم مائیگی کا احساس کر کے الفاظ گرفت میں نہیں آ رہے تھے۔

اس کا دل حوریہ کی باتوں اس کے خوف، اس کے اندیشوں کی تائید کر رہا تھا۔ وہ بھی بابر کی ضد سے واقف تھی ، جس طرح وہ حوریہ کی محبت میں ثابت قدم رہا، ضدی اور اڑیل رہا اور اب نفرت میں بھی وہ اتنا ہی ثابت قدم دکھائی رہا تھا۔ کسی طور یہ فاصلے سمٹنے کو تیار نہیں تھا۔

''وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے، یہ ہی بہت ہے میرے لیے پھپھو۔'' بہت سا رونے کے بعد وہ آنسو پونچھنے لگی۔

مومنہ رنج سے شق دل لیے بیٹھی رہی، اسے اپنے دل و دماغ کے سب ہی راستے بند ہوتے محسوس ہو رہے

تھے، اعصاب کھنچے جا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کسی بھی پل کھٹ سے ٹوٹ جائیں گے۔

''خدایا! یہ محبت مرتی نہیں ہے مار ڈالتی ہے۔''

☆......☆......☆

جسم کی داڑوں سے روح نظر آنے لگی
بہت اندر تک توڑ گیا مجھے عشق تیرا

حوریہ تو چلی گئی گیلانی ہاؤس سے مگر بابر کو لگا وہ جاتے جاتے کوئی بھاری پتھر رکھ گئی ہو اس کے سینے پر۔ اعصاب شل سے ہو کر رہ گئے، ویرانی تو پہلے ہی تھی اب تو ایسی وحشت تھی کہ اعصاب چٹخے جا رہے تھے۔ وہ خالی خالی نظروں سے امیر علی کو اپنا سفری بیگ بھرتے دیکھ رہا تھا۔ امیر علی کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں، اسے بھی بابر کی جدائی کا غم رلا رہا تھا، تاہم اس کے جلد صحت یاب ہو جانے کی تمنا میں وہ بڑی محبت سے اس کا بیگ پیک کر رہا تھا، اس کی وارڈ روب کھولے اس پوچھتا جا رہا تھا، یہ کپڑے ڈالوں، یہ چیزیں ڈالوں۔ اور بابر خالی ذہن بس سر اثبات میں ہلاتا جا رہا تھا۔

وہ وہیل چیئر کے ہمراہ ٹیرس پہ چلا گیا، بڑا سا خوش نما ٹیرس جس کی ریلنگ کے پاس وہ عموماً اسے دکھائی دیتی تھی۔ اس کا مہکتا آنچل ہوا سے سرسراتا نظر آتا تھا، اس کی سنہری آنکھوں کی روشنی پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی تھی۔ کبھی وہ علی شاہ کے پیچھے یہاں سے وہاں بھاگتی دکھائی دیتی، کبھی اس کے لیے ٹرالی میں چائے کے لوازمات سجائے لا رہی ہوتی۔ کبھی امیر علی کو رعب دکھا کر اس کا ناشتا تیار کرا رہی ہوتی، کبھی عاظمہ کو دلاسا دے رہی ہے تو کبھی اس پر طنز، خفگی، کبھی نرمی، اپنائیت ......

بابر کو لگ رہا تھا ہر شے میں وہ ہی دکھائی دے رہی ہو، وہ ایک وحشت کے عالم میں یہاں سے وہاں چکر پھیریاں کھا رہا تھا۔

آج رات وہ عاظمہ کے ہمراہ یہ ملک چھوڑ کر جا رہا تھا، سرجن عثمان اور سرجن ہمایوں بھی یو کے میں تھے اور وہیں اس کی سرجری ہونا تھی۔ اس کا مصنوعی پیر لگ جانا تھا۔ اسے پتا تھا وہ چلنے لگے لگا مگر اب اسے دلچسپی نہ رہی تھی شاید وہ وہیل چیئر کا عادی ہو گیا تھا اور اس معذوری کا بھی یا پھر ہر شے سے بے زار اور بددل ہو گیا تھا۔ تو پھر وہ اسے کیوں یاد آ رہی تھی، اس کی کمی کو کیوں محسوس کر رہا تھا۔

اس نے اپنے دل میں جھانکا پھر کچھ سوچ کر موبائل اٹھایا۔

دل شدت سے خواہش کر رہا تھا کہ اسے ایک بار خدا حافظ کہہ دے۔

اسے بتائے کہ وہ جا رہا ہے، اس کی زیادتیوں کو وہ معاف کر دے اور علی شاہ کا بہت خیال رکھے اور اپنا بھی۔ اس کی انگلیاں موبائل پر کانپنے لگیں، یک دم اس کے ہاتھ کی گرفت موبائل پر ڈھیلی پڑ گئی۔ ایک گہری سانس سینے کی تہ سے کھینچتے ہوئے اس نے موبائل گود میں ڈال دیا۔

☆......☆......☆

اداسی
تم اسے کہنا!
ہوا کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے
اور صدا ویران پھرتی ہے
تیرا بچھڑا ......
اجڑے ہوئے شہروں میں اکثر بھاگتا پھرتا ہے

سرورق کی شخصیت
ماڈل ---------- ایشا نور
میک اپ -------- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی -------- موسیٰ رضا

اکثر جاگتا پھرتا ہے
سو پایا نہیں ہے
اور اداسی تم اسے کہنا
تم ہی دکھ میں نہیں ہو
ہم بھی اپنی راکھ
ہاتھوں میں لیے اور سسکیاں لیتی ہوئی
تنہائیوں کے بال کھولے بین کرتے ہیں
اداسی تم اسے کہنا
تم ہی دکھ میں نہیں تنہا
یہاں پر بھی ہوا کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے
خلا جو ذات کی چار دیواری کے اندر ہے
کبھی بھی بھر نہ پائے گا
یہاں بھی
ہر صدا ویران پھرتی ہے

☆......☆......☆

عاظمہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب بابر پیروں پر چلتا ہوا عاظمہ سے ملا، سرجن عثمان اس کے ہمراہ تھے۔

"مبارک ہو۔" وہ عاظمہ کو کامیاب سرجری کی مبارک دے رہے تھے۔ عاظمہ بابر سے لپٹی تو آنسوؤں پر اختیار نہ رہا، وہ پاگلوں کی طرح بابر کو چومنے لگیں۔

بابر کے چہرے پر بھی افسردہ مسکراہٹ تھی، ایک مصنوعی ٹانگ اس کے دل پر بوجھ کی طرح تھی۔ خوشی تو جیسے اس کے اندر سے گم ہو گئی تھی، مگر وہ عاظمہ کے لیے مسکرایا تھا جیسے وہ زندہ ہی عاظمہ کے لیے تھا۔

☆......☆......☆

اس روز عاظمہ اس سے اصرار کرنے لگیں۔

"بابر! چلو اپنے ملک چلتے ہیں، اپنا گھر، اپنا شہر، اپنے لوگوں میں۔ بہت یاد آ رہے ہیں سب۔"

"کیا رکھا ہے مام! وہاں کون ہے آپ کا منتظر۔" وہ لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کرنے لگا۔

"مجھے علی شاہ بہت یاد آ رہا ہے۔" عاظمہ نے کہا تو وہ جیسے تڑپ کر رہ گیا، عاظمہ نے گویا وائلن کے تنے تاروں پر کھٹ سے ہاتھ مار دیا تھا، ہر تار جھنجھنا اٹھا تھا۔

اسے یک لخت علی شاہ کی چہکاریں سنائی دینے لگیں۔ حوریہ کا اسے پکڑنے کے لیے بھاگنا اور اس کا چاچو چاچو کہہ کر اس کے پیروں سے لپٹ جانا پھر اس کی گود میں ہمک کر چڑھ جانا۔ یہ سب زندگی کا احساس دلاتا تھا۔ اتنا ویران تو شاید وہ پہلے نہ تھا جتنا اب ہو گیا تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

لمبی لمبی چکر کھاتی دیدہ زیب سڑکیں، جہاں زندگی رواں دواں تھی۔ گاڑیوں میں بیٹھے انسانوں کا ہجوم، فٹ پاتھ پر پیدل چلتے، سائیکلوں پر بھاگتے دوڑتے، ہر کوئی اپنے آپ میں مگن دکھائی دے رہا تھا۔ ایک بہتر زندگی حاصل کرنے میں سرگرداں دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ ہی زندگی ہے ان ہی میں کہیں خوشیاں ہیں، کہیں دکھ چھپے ہیں۔" عاظمہ اس کے ساتھ کھڑکی سے نیچے جھانکنے لگیں۔

"وقت کسی کے حصے میں خوشیاں، کسی کی جھولی میں غم ڈالتا گزرتا جاتا ہے۔"

"ہوں تو پھر اس دلیل سے یہ دل بہل کیوں نہیں جاتا۔" اس نے فقط سوچا۔ عاظمہ نے بات کا تسلسل توڑا نہیں۔

"کسی کے لیے نہ مستقل غم ہے نہ خوشی اور کبھی کبھی تو سوچتی ہوں کہ غم اور خوشی کا اصل تعلق تو دل سے جڑا ہے۔ دل خوش ہونا چاہے تو بہت سے بہانے ہیں اور نہ ہونا چاہے تو خوشیوں کے ہجوم میں بھی افسردگی ہے۔" بابر کو معاً حبس بڑھتا محسوس ہونے لگا حالانکہ کھلی کھڑکی سے ہوا کے خوش گوار جھونکے آ رہے تھے مگر وہ کیا کرتا کہ ایک حبس اس کے اندر تھا بے حد و بے حساب۔

☆......☆......☆

کوئی بھی لمحہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا
وہ شخص ایسا گیا پھر نظر نہیں آیا
پلٹ کے آنے لگے شام کے پرندے بھی
ہمارا صبح کا بھولا مگر نہیں آیا
کسی چراغ نے پوچھی نہیں خبر میری
کوئی بھی پھول میرے نام پر نہیں آیا

اس نے صحن میں پھیلتی ہوئی دھوپ کو دیکھا جو آہستہ آہستہ دیواروں سے ہوتی فرش پر بھی اترتی جا رہی تھی۔ ایسی ہی دھوپ اس کے دل کے صحن میں بھی اب ہمیشہ کے لیے ٹھہر گئی تھی۔ وہ چمپا کے درخت کے نیچے بنے بنچ پر بیٹھ گئی۔

"ماما...... مما......" علی شاہ کی پکار پر وہ اپنے خیالات سے نکلی، علی شاہ نوری کے ہمراہ اس طرف آتا دکھائی دیا، اس کے ہاتھ میں موبائل تھا۔

"چاچو کا فون۔" وہ اپنی توتلی زبان میں بولا پھر کان سے موبائل لگا کر اس سے باتیں کرنے لگا۔

"چاچو......" اس کی ساری حسیات بے دار ہو گئیں، وہ جھٹکے سے کیاری سے اٹھی۔

"ہاں جی وہ بابر صاحب کا فون ہے، آپ کا بھی پوچھ رہے تھے پھر بولے علی شاہ سے بات کرا دو۔" نوری اسے بتانے لگی پھر علی شاہ کو دیکھ کر ہنس کر بولی۔ "کب سے لگا ہوا ہے ان سے باتوں میں، پر جی نہیں بھر رہا ہے اس کا۔" نوری وہاں سے کہتی چلی گئی۔ اس نے لپکتے جھجکتے دل کو سنبھال کر علی شاہ کی طرف دیکھا۔

"چاچو ہیں، کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"بولو، مما بات کرنا چاہتی ہیں۔" اس نے کہا تو علی شاہ نے جھٹ سے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا، اس نے یوں موبائل اس کے ہاتھ سے لیا جیسے برسوں کا پیاسا پانی کو دیکھ کر لپکتا ہے۔

"ہیلو...... بابر!" اس کے لہجے میں بے تابیاں چیخ رہی تھیں مگر دوسری جانب خاموشی تھی۔

"بابر...... کک...... کیسے ہو تم...... میں تم سے بات......" اس کی خاموشی پر وہ جلدی سے بولی مگر دوسری طرف اسی خاموشی کے ساتھ لائن منقطع ہو گئی، وہ دل گرفتہ سی کھڑی رہ گئی۔ علی شاہ اس کے ہاتھ سے موبائل چھیننے لگا، اس کے ہاتھ کی گرفت خود بخود ڈھیلی پڑ گئی۔

"چاچو...... ہیلو چاچو!" علی شاہ اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر اپنے کان سے لگا کر پکارنے لگا بابر کو، پھر بسورنے لگا۔

"مما...... چاچو!" وہ خفا ہو کر موبائل کو نوچنے لگا۔

"چاچو! بہت خفا ہو گئے ہیں مما سے بیٹا۔" وہ افسردگی سے بولی اور علی شاہ کو تھام کر کیاری پر ہی بیٹھ گئی، اس

کے معصوم چہرے اور آنکھوں میں بابر کا ہر رنگ بھرا ہوا تھا۔

"وہ بہت زیادہ روٹھ گئے ہیں ہم سے۔" وہ اس کا ننھا منا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا کر چومنے لگی۔ "اور مما کو منانا نہیں آتا یا مما کے لفظوں میں تاثیر ہی نہیں ہے۔" وہ اس کے ہاتھ اپنی بھیگی آنکھوں سے لگانے لگی۔

☆......☆......☆

شگفت گل کی صدا میں، رنگ چمن میں آؤ
کوئی بھی رُت ہو، بہار کے پیرہن میں آؤ

وہ باتھ روم سے نکلا اور تولیے سے گیلے بال پونچھتے ہوئے موبائل اٹھا کر دیکھا تو حوریہ کا میسج اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ تولیہ کندھے سے ہٹا کر بیڈ پر پھینک کر خود بھی بیڈ پر بیٹھ گیا اور میسج پڑھنے لگا۔

کوئی سفر ہو تم ہی کو منزل سمجھ کے جاؤں
کوئی مسافت ہو تم میری ہی لگن میں آؤ
وہ جس غرور اور ناز سے تم چلے گئے تھے
کبھی اسی تمکنت اسی بانکپن میں آؤ
یہ کیوں، ہمیشہ میری طلب ہی تمہیں صدا دے
کبھی تو خود بھی سپردگی کی تھکن میں آؤ

بابر کا دل پہلو میں دھڑکنے لگا، دھڑکن جیسے کانوں میں سنائی دینے لگی۔

"کہتے ہیں محبت تو دل کو وسیع کر دیتی ہے، یہ کیسی محبت تھی جس نے تمہارے دل کو اتنا سخت، بے رحم بنا ڈالا کہ اس میں باقی ساری محبتوں کی گنجائش بھی نہ رہی۔ علی شاہ کو بھی تم بھول گئے، چلو ایک حوریہ کی محبت میں طاقت نہیں تھی، کیا علی شاہ کی بھی محبت اتنی کمزور ہے کہ تمہیں کھینچ کر نہیں لا سکتی۔ وہ تو ہر آہٹ پر چونک اٹھتا ہے، ایک کا انتقام تم اتنے بہت سوں سے لو گے۔ نفرت مجھ سے کرو بابر! نفرت کے قابل میں ہوں، علی شاہ تو نہیں۔ کیا اس کی محبت اتنی طاقت ور نہیں کہ تمہیں کھینچ کر لا سکے۔ بابر اس سے پہلے کہ اسے تمہاری محبت پر سے اعتبار اٹھ جائے اس کی آنکھیں تمہاری راہ تکتے تکتے مایوس ہو جائیں، تم پلٹ آؤ۔"

جتنے موسم تیرے ساتھ گزرے
نجانے تیرے واسطے ان کی صورت ہے کیا
جو تجھے یاد کرتے ہیں ان کے لیے
اب خزاں کے سوا کوئی موسم نہیں

بابر کی نظریں میسج کے متن پر یوں مرکوز تھیں جیسے وہ حوریہ کا چہرہ کھوج رہا ہو۔ اسے لگ رہا تھا ہر لفظ میں اس کا چہرہ ابھرتا جا رہا ہو۔

اس کی نگاہیں موبائل سے پھسلتی اپنے پیروں پر ٹھہر گئیں، بظاہر تو وہ اب مکمل دکھائی دے رہا تھا مگر وہ جانتا تھا وہ مکمل نہیں ہے۔

"ہم سب ادھورے ہیں، مکمل تو کوئی بھی نہیں ہے بابر!" اس کی آواز جیسے بے حد قریب سے سنائی دینے لگی۔

یہ کیوں ہمیشہ میری طلب ہی تمہیں صدا دے
کبھی تو خود بھی سپردگی کی تھکن میں آؤ

"ہا......" ایک گہری سانس اس کے سینے کی تہ سے خارج ہو گئی۔ اس نے یوں آنکھیں جھپکیں جیسے ماضی کی چلتی تصویروں سے نگاہیں ہٹانا مقصود ہو۔ اس میسج نے دبے شعلوں کو پھر سے بھڑکا دیا تھا۔

"تم مجھے کسی حال میں سکون نہیں لینے دو گی حوریہ! جینے کیوں نہیں دیتی ہو تم۔" اس نے موبائل کو یوں بے بسی سے دیکھا گویا وہ حوریہ ہو۔

اسے لگنے لگا اس کی دل کی جھیل پر پھر سے بہت سے پتھر پھینکے گئے ہوں، ہر شے منتشر ہو گئی ہو۔

☆......☆......☆

آج گھر میں خلاف معمول خاموشی تھی یا اسے ہی محسوس ہو رہی تھی، رقیہ بھابھی، عادل بھائی کے ساتھ گھر سے باہر نکلی تھیں۔ مومنہ، علی شاہ کے ساتھ یاور علی کے کمرے میں تھی۔ نوری کپڑے تہ کر رہی تھی جو رسی سے اتارے تھے۔

حوریہ اپنے کمرے میں آ کر اپنے کپڑے نکالنے وارڈروب کی طرف آئی تو اس کے قد آدم آئینے پر نظر پڑی تو ٹھٹک گئی۔

تھکا تھکا مضمحل چہرہ، بجھی بجھی آنکھیں، وہ یوں ہی اپنا سراپا دیکھتی رہی پھر بال لپیٹ کر کپڑے وارڈروب سے نکال کر باتھ روم میں جا گھسی۔

نہا کر بال سلجھا کر وہ باورچی خانے میں آئی تو نوری ٹرے میں پلیٹیں سجا رہی تھیں اور فرائڈ نگٹس نکال رہی تھی، دو پلیٹوں میں بسکٹ سجے ہوئے تھے، وہ چونکی۔

"خیریت تو ہے، یہ سب اہتمام کس کے لیے ہو رہا ہے، داجی نے تو ابھی کھانا کھایا ہے۔"

"مہمان کے لیے ہے۔ مومنہ باجی نے کہا ہے میں یہ سب لے کر آؤں اور چائے حوریہ کے ہاتھ کی پئیں گے اباجی! پر آپ نہا رہی تھیں میں نے سوچا پانی چڑھا لوں اور یہ سب فرائی کر لوں۔"

"خاصی سمجھ دار ہو گئی ہو۔" وہ کھولتے پانی میں پتی ڈالنے لگی۔ "بائی داوے، مہمان کون ہیں، تم جانتی ہو؟"

"بابر صاحب ہیں۔"

نوری ٹرے اٹھا کر باورچی خانے سے نکلتے ہوئے گویا کوئی بم ہی بلاسٹ کر کے گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی، اس کا ہاتھ یوں ہی ساکت رہ گیا مگر لمحہ بھر کے بعد وہ جھٹکے سے پلٹی مگر نوری جا چکی تھی۔ ٹرالی گھسیٹ کر وہ باورچی خانے سے باہر نکلنے لگی۔ دل اتنے زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے سینے کی دیوار توڑ کر باہر آ گرے گا، اس کا دل چاہا وہ بھاگ کر یاور علی کے کمرے میں جائے۔

وہ آ گیا تھا، چھ ماہ کے انتظار کے بعد، وہ اسے ایک نظر دیکھنے کو بے تاب ہو گئی مگر کسی نادیدہ قوت نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ قدم جیسے پتھر سے ہونے لگے، وہ باورچی خانے کے دروازے تک ہو کر دوبارہ اندر آ گئی اور دیوار سے لگ کر کھڑی رہ گئی۔

اس کی سماعتیں بصارتوں کا روپ دھارنے لگیں کہ شاید بابر کی آواز سنائی دے۔ وہ یاور علی کے کمرے سے نکلے تو اس کا چہرہ دکھائی دے۔ شاید یہ قبولیت کی گھڑی تھی، اسے یک دم آوازیں سنائی دینے لگیں، یاور علی بابر سے کہہ رہے تھے۔

"تم بیٹھو کچھ دیر اور...... رقیہ اور عادل بھی آتے ہوں گے، وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"ہاں بابر! ابھی تو بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے۔" مومنہ کی آواز ابھری۔ "کھانا بھی کھا لیتے ہمارے ساتھ رات کا۔"

"نہیں پھر کبھی سہی، آج تو ڈنر آپ سب لوگ گیلانی ہاؤس میں میرے اور مما کے ساتھ کیجیے گا اور باتیں بھی خوب ہوں گی۔" بابر کی بھاری آواز ابھری۔

حوریہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ باورچی خانے کی جالی سے جھانکا اسے مومنہ کا چہرہ دکھائی دیا جو چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ انوکھی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں جیسے بابر نہیں حازم آیا ہو اور برسوں بعد

اپنے بیٹے سے مل رہی ہوں۔ بابر، یاور علی سے مل کر ذرا سا آگے بڑھا اور جیسے حوریہ کی نگاہوں میں پورا کا پورا سما گیا، بلیک پینٹ اور وائٹ شرٹ میں، ہلکی ہلکی شیو کے ساتھ وہ کچھ تھکا تھکا نظر آ رہا تھا۔

''چلو جیسی تمہاری خوشی۔'' مومنہ کے ہمراہ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا لابی کی طرف جا رہا تھا۔

''سچ پوچھو تو تمہیں دیکھ کر یقین نہیں آ رہا کہ تم آ گئے ہو۔ ایسی ضد پکڑلی تھی تم نے کہ دل ڈر سا گیا تھا۔'' مومنہ اس سے کہہ رہی تھی۔

''ہاں، میں سوچتا رہا کہ فرار کی یہ کوشش تو سراسر خود غرضی ہوئی۔ اتنے بہت سے رشتوں کی محبت سے منہ موڑ کر صرف اپنے لیے زندہ رہنا تو خود غرضی ہی ہے نا۔'' وہ علی شاہ کو گود میں اٹھا کر بے حد محبت سے اسے چومنے لگا۔

''اس کے بغیر تو بالکل ادھورا ہو گیا تھا۔''

حوریہ دیوار سے پشت ٹکا کر آنکھیں بند کر کے اس کی آواز کی گونج اپنے دل پر محسوس کرنے لگی اور یقین کرنے لگی کہ آیا یہ کوئی خواب تو نہیں کہ آنکھ کھلنے پر گم ہو جائے گا۔

''تو کیا وہ میرا میسج پڑھ کر آیا ہے، علی شاہ کی محبت اسے کھینچ لائی ہے۔ ہاں علی شاہ کی معصوم، بے غرض محبت یقیناً اسے کھینچ لائی ہے۔''

''تمہارے ہاتھ کی بنی چائے کا تو انتظار کرتا ہی رہ گیا۔'' بابر کی آواز قریب سے ابھری، وہ گھبرا کر اچھلی پھر دم سادھے رہ گئی۔ اُدھر بابر بھی جیسے مبہوت سا کھڑا رہ گیا تھا، وہ ہی مانوس سی خوشبو دل کی سرزمین سے اٹھنے لگی، دل وہ ہی نادان سا مچل جانے والا بچہ بن جانے کا خواہاں تھا۔

''سوری! سوچا تم تو ملنے آؤ گی نہیں، تمہیں ڈھونڈتا چلا آیا۔'' اس کا لہجہ دھیما تھا، نگاہیں اس کے وجود کو حصار میں لیے ہوئے تھیں۔

حوریہ جیسے عالم مدہوشی سے عالم خود شناسی میں آ کر گھبرا اٹھی، جیسے کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہو۔

''تت...... تم...... یہاں...... میرا مطلب ہے کب آئے پاکستان؟'' وہ خود کو سنبھال کر اس کی آنکھوں کی محویت سے نکل کر بولی، پہلا دھیان اپنے دوپٹے کی جانب گیا، وہ جلدی سے سلیقے سے اوڑھنے لگی۔

''تم نے جب آواز دی، تب آیا۔'' اس نے براہ راست اس کی کھلی کھلی شہد رنگ آنکھوں میں جھانکا۔

وہ گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگی مگر ممکن نہ ہوا، پیچھے دیوار تھی۔ بابر قدم اٹھا کر اندر آیا، چھوٹا سا باورچی خانہ جسے اس کے لمبے چوڑے وجود سے پورا بھر سا گیا تھا، دونوں ایک دوسرے کے سامنے، ایک ہی کیفیت میں جیسے بنا سانس لیے کھڑے تھے۔

کتنی بے قراریاں تھیں جو سمٹ ہی نہ رہی تھیں، کتنی پیاس تھی مگر بجھانے کا اختیار بابر کے پاس تھا نہ وہ اسے دے رہی تھی۔

اچانک وہ گھبرا کر ایک طرف ہو گئی دروازے کی جانب بڑھی کہ بابر نے جلدی سے اس کی کلائی پکڑلی۔ حملہ اتنا اچانک تھا کہ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگی، بابر نے دیوار پر ایک ہاتھ جمایا اور قدرے اس کی جانب جھکا۔

''سپردگی کی تھکن میں آیا ہوں، بولو سمیٹو گی تھکن۔'' بابر کا لہجہ ہی نہیں آنکھیں بھی جذبے لٹا رہی تھیں۔

حوریہ کا دل سینے کی دیوار میں سکڑا پھیلا اور اس کی رگوں میں خون نہیں گویا طوفان امڈنے لگا ہو، اسے تو ایسا ہی لگنے لگا۔

وہ یک دم اس کی گرفت سے خود کو چھڑا کر کسی جھونکے کی طرح وہاں سے چلی گئی۔ بابر کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''سمیٹنا تو اب تمہیں ہی پڑے گا حوریہ!''

وہ چلا گیا تھا مگر حوریہ کو لگ رہا تھا، وہ اپنا ہر رنگ اس کے ارد گرد چھوڑ کر گیا ہو۔

یاور ہاؤس کا ہر فرد بابر کی کامیاب سرجری اور اس کے لوٹ آنے پر بے حد مسرور دکھائی دے رہا تھا۔

☆......☆......☆

گیلانی ہاؤس کی ایک عرصے بعد رونقیں لوٹی تھیں، کوٹھی بقعہ نور بنی ہوئی تھی، سب اس طرح خوش تھے جیسے اس کوٹھی میں پہلی خوشی آئی ہو۔ مہکتی، البیلی خوشی، برسوں کا جمود ٹوٹا تھا۔ دل گرفتہ اور مضمحل خاموشی میں ساز اٹے تھے، اکتائے ہوئے افسردہ اندھیرے تھے جن کا دم ٹوٹا تھا اور روشنیاں ہی روشنیاں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیل گئی تھیں۔

عاظمہ کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا، بابر کے نام کی انگوٹھی حوریہ کی انگلی میں ڈال کر انہیں لگ رہا تھا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔

مومنہ نے حوریہ کی پیشانی کو محبت سے بوسہ دیا تو کوئی آنسو دل میں گرنے لگے مگر آنکھوں کی مضبوط باڑھ انہیں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''پتا نہیں یہ خوشی بھی کبھی کبھی رلا کر رکھ دیتی ہے۔'' وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑنے لگی پھر حوریہ کے گرد اپنا بازو حمائل کرتے ہوئے اسے خود سے قریب کر لیا۔

''مجھے بڑی آسودگی ہو رہی ہے، تمہیں جس گھر میں بھیج رہی ہوں اس آنگن سے تم آشنا ہو۔ ان ہواؤں میں آج بھی تمہارے لیے مسرتیں پنہاں ہیں، میں بہت خوش ہوں حوریہ! بہت خوش۔ دل کے کسی بھی گوشے میں کوئی بے اطمینانی، کوئی بے سکونی نہیں ہے۔''

وہ بابر کو حوریہ کے پہلو میں بٹھا کر وہاں سے اٹھ گئی، نیلے اور سرخ امتزاج کے جدید تراش کے سوٹ میں ملبوس حوریہ بابر کی نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

وہ جو بے دلی تھی صدف صدف
وہ جو خاک اڑتی تھی ہر طرف
مگر اک نگاہ سے جل اٹھے
جو چراغ جاں تھے بجھے ہوئے
مگر اک سخن سے مہک اٹھے
میرے گلستاں، میرے آئینے
کسی خوش نظر کے حصار میں
کسی خوش قدم کے جوار میں
کوئی چاند چہرہ کشا ہوا
میرا سارا باغ ہرا ہوا

بابر کی نگاہیں اس کے سراپے پر ٹھہری سی گئیں، جہاں سے عجیب شعاعیں اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اس نے کہیں پڑھا تھا عورت جب کسی سے محبت کرتی ہے تو اس کے من پسند مرد کے لیے اس کے جسم کی ساری خوب صورتیاں خود بخود ظاہر ہو جاتی ہیں لیکن ناپسند مرد کے لیے عورت اپنی ساری خوب صورتیاں کو کسی کچھوے کی طرح اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے، وہ ایسا کسی شعوری کوشش کے تحت نہیں کرتی بلکہ خود بخود ہو جاتا ہے۔

اور آج حوریہ کے وجود کی ساری خوب صورتیاں ظاہر تھیں۔

مہمان رخصت ہو چکے تھے، بابر اسے لیے باغیچے کے ایک خوش نما احاطے میں لے آیا۔

"کل تک میں کس قدر مایوس تھا، مایوسی اور اداسی بے رحم موت کی طرح تھی، میں خود کو ایسا دیا محسوس کر رہا تھا جو ویران کھنڈر میں پڑا ہو جو کبھی نہ جلے گا۔ کبھی روشنی نہ ہو گی اس میں، مگر تمہاری اس پکار میں جانے کیا تھا اس بجھے دیے میں جان پڑ گئی۔ جیسے تیل ڈال دیا ہو تم نے، تمہارا مہکتا وجود میرے سامنے ہے ایسا لگ رہا ہے میری دنیا مکمل ہو گئی ہو۔" بابر نے ایک سرخ گلاب اس کی طرف بڑھایا۔

"میرا وجود بھی اسی گلاب کی طرح مہک رہا ہے حوریہ!"

حوریہ نے ہاتھ بڑھا کر گلاب تھامنا چاہا کہ بابر نے اس کا نرم گداز ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں جکڑ لیا۔ حوریہ کو لگا کسی نے یخ بستہ پانی میں یک دم دھکیل دیا ہو، دھڑکنیں رکتی محسوس ہونے لگیں۔

"تمہارا یہ گلاب گلاب وجود ہی تو تھا جس نے مجھے وہاں ویران ہوتے ہوئے بھی ویران نہ ہونے دیا بلکہ میری ویرانی کو بھی مہکائے رکھا۔ تمہاری محبت کے احساس نے مجھے آباد رکھا۔" اس کا لہجہ دھیما لو دیتا ہوا تھا، اس کے لبوں پر دل فریب مسکراہٹ پھیلی۔ آنکھوں میں خمار چھلکا جو حوریہ کو پلکیں جھکانے پر مجبور کر گیا۔

حوریہ کو بابر کی ساری محبت، وہ ساری بے تابیاں وہ جنوں خیزیاں یاد آنے لگیں۔

وہ اب سحر بن کر اس کی اندھیری زندگی میں طلوع ہونا چاہ رہا تھا۔ کیا میں اتنی ناقدری بھی تھی؟

"حوریہ!" بابر کے لہجے میں بے تابیاں چٹخنے لگیں۔ "کیا میں آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں یہ ہاتھ میں نے مکمل تمہاری رضا سے تھاما ہے۔ یہ مسکراہٹ جو تمہارے لبوں سے پھوٹ رہی ہے میری محبت کا اعجاز ہے۔ میں یقین کر لوں کہ میرے تمام بے نشان راستوں کو منزل مل گئی ہے۔" وہ جذب سے بول رہا تھا۔

"ہم نے اس سفر میں بہت کچھ کھویا ہے بابر! زندگی نے بہت کچھ چھین لیا ہے ہم سے، مگر اب کچھ کھونا نہیں چاہتی۔" اس کا دل ہم کلام تھا بابر سے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بابر کے وجود کی گھنیری چھاؤں میں سکون پانا چاہتی تھی۔

اور بابر اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا تھا، اسے سمجھ ہی آج آیا کہ "خاموشی کی بھی اپنی ہی زبان ہوتی ہے اور حوریہ کی بھی خوش نما آنکھیں لفظ و معنی کے سارے در کھول رہی تھیں۔ وہ جو کہہ نہیں پا رہی تھی وہ آنکھیں وہ ہونٹ کہہ رہے تھے۔

☆......☆......☆

آج حوریہ یاور ہاؤس سے رخصت ہو کر گیلانی ہاؤس جا چکی تھی۔

مومنہ نے ایک طویل عرصے کے بعد وہ سیاہ بیگ نکالا تھا، جس میں حازم کی سیاہ ڈائری جس کے اندر قلم دبا ہوا تھا اس کی رسٹ واچ، ایک گلاب کا سوکھا ہوا پھول، جو اس نے بے حد احتیاط سے اس ڈائری میں رکھا تھا۔ اس کی نظریں گلاب کے سوکھے پھول پر جم گئیں، یہ وہ ہی پھول تھا جو حازم نے بے حد محبت سے مومنہ کے سر پر لگایا تھا اور اس نے وہ گلاب بالوں سے اتار کر لبوں سے لگا کر حازم کے کُرتے کی اوپری جیب میں اٹکا دیا تھا۔

"تم نے سچ کہا تھا عباد! یہ فاصلے اور قربتیں تو یوں ہی بے معنی اور بے حقیقت مہریں ہیں۔ تمہاری موجودگی کے احساس سے ایک پل بھی یہ دل غافل نہیں رہا۔

آج تمہاری ایک اور خوشی بھی یاور ہاؤس والوں نے پوری کر دی۔ گیلانی ہاؤس کے ویرانے کو آباد کر دیا، اب تو خوش ہو کہ مومنہ نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔" اس نے ڈائری سینے سے لگالی اور آنکھیں موند لیں۔

"عباد! رفاقت وہ ہی تو نہیں جو دکھائی دے، رفاقت وہ بھی ہے جو محسوس کی جاتی ہے، قربتیں فاصلے روح اور دل کے تعلق میں بے معنی ہوتے ہیں، جدائیاں ہی تو محبت کو عشق بناتی ہیں۔"

دو نمکین قطرے مومنہ کی پلکوں پر چمک کر ٹوٹے اور رخساروں پر بہنے لگے۔

☆☆



نادیہ احمد

جب وی ویڈ



میں سوچ بھی نہیں سکتی وہ میرے ساتھ ایسا سلوک بھی کرسکتا ہے...... میرے ساتھ؟

وہ مجھے اتنا سب کیسے کہہ سکتا ہے؟ نہیں یہ سب جھوٹ ہے۔ بھلا کوئی اتنی جلدی کیسے بدل سکتا ہے۔ پتا نہیں اب یہ سچ ہے یا پھر وہ جھوٹ تھا جو دو سال سے وہ مجھے کہتا آرہا تھا۔ اتنے بہت سے وعدے، ساتھ نباہنے کی قسمیں، کبھی نہ ساتھ چھوڑنے کے وعدے اور......اور...... بے تحاشا محبت کے دعوے۔

اف میرے اللہ! یہ سب میرے ساتھ کیسے ہوگیا؟ زندگی کیا اتنی تلخ، اتنی بھیانک بھی ہوسکتی ہے بھلا۔ وہ بھی میری زندگی...... میں نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ گھر، فیملی، دوست، آس پڑوس میں کوئی ایک بھی تو ایسا نہیں جسے میری وجہ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو بلکہ الٹا میں نے تو سب کی مدد کی ہے۔ آج بھی یونیورسٹی کی فاریہ پورے پانچ سو روپے کی مقروض ہے میری۔ پتا نہیں کس کس کو سموسے، دہی بڑے اور چائے کولڈ ڈرنک ٹھنسائی رہی تھی کمینی، جب بل دینے کا وقت آیا تو پرس میں بس سو کا نوٹ تھا اور واپسی کا کرایہ بھی نہیں تھا۔ اس وقت میں نے ہی بل دیا۔ بس اتنا ہی تو کہا تھا نا کہ آرڈر کرنے سے پہلے پرس چیک کرلینا چاہیے کہ والٹ ہے یا نہیں۔ اب بھئی اتنا کہنا تو میرا حق بنتا تھا لیکن اس نے کیا کیا۔ ادھار لے کر واپس ہی نہیں کیا اور میں نے پورے پانچ سو روپے کا نقصان برداشت کیا۔

خیر جو بھی ہوا اس پہ مٹی ڈالو مگر اب یہ جو سب ہورہا ہے اس کو کیسے برداشت کروں۔ ہائے کہاں سے لاؤں اتنی ہمت۔ اس کے اندر اس پل طوفان مچا تھا۔ سر تھامے وہ شاک کی سی کیفیت میں بیڈ پہ بیٹھی تھی جب چونک کر دانیال کی آواز پہ سر اٹھایا۔

''تم اب تک مراقبے میں بیٹھی ہو۔ اٹھنا نہیں، میرے پاس ٹائم نہیں ہے، تمہیں بتایا بھی تھا رات کو؟'' وہ نک سک سا تیار ماتھے پہ بل ڈالے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں کب سے چھپے آنسو جھلمل موتیوں کی طرح برسنے لگے تھے۔ وہ یقیناً اس برسات کے لیے ذہنی طور پہ تیار نہ تھا اسی لیے تو ایک دم بوکھلا گیا۔

''سونا کیا ہوا ہے یار! تم رو کیوں رہی ہو بے بی؟'' ہاتھ میں پکڑا کوٹ صوفہ پہ پھینکتا وہ گھبرا کر اس کے سامنے آبیٹھا۔

''تم مجھے کیسے وہ سب کہہ سکتے ہو دانی؟'' اس نے روتے ہوئے احتجاج کیا تھا۔

''میں نے کیا کہا ہے تمہیں؟'' ابھی چند منٹ پہلے تو وہ نیند سے جاگی تھی اور محض ان گنے چنے لمحوں میں اس کی زبان سے ایسا کیا نکل گیا جس نے سونیا کو یوں موں سون بہانے پہ مائل کردیا تھا۔

''تم نے کہا میں انتہائی ''سست عورت'' ہوں۔'' اس نے ہچکیوں کے ساتھ روتے ہوئے شکوہ کناں لہجے میں بتایا۔

''یار تمہاری وجہ سے دو دن سے مسلسل لیٹ ہورہا ہوں آفس کے لیے، الارم بجتا رہتا ہے اور تم سر تکیے میں چھپائے دو منٹ دو منٹ کرتی لیٹی رہتی ہو۔ یار میری جاب کا معاملہ ہے پلیز سمجھنے کی کوشش کرو ڈارلنگ۔'' وہ وضاحتی انداز میں بولا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے گال کو چھوتے پچکارہ تھا۔

''لیکن تمہیں مجھے اتنی بڑی بات کہنے کا کوئی حق نہیں تھا''۔ سونیا نے خفگی سے اس کا ہاتھ پرے دھکیلا۔

''اچھا میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں تم ہرگز سست نہیں ہو بلکہ ایک انتہائی ایکٹیو اور چاق چوبند عورت ہو۔ اب پلیز جلدی سے اٹھ کر مجھے ناشتا بنادو سونا میں میٹنگ سے لیٹ ہورہا ہوں''۔ دانیال نے کھلے دل سے اپنی غلطی مانتے اعتراف کیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے کلائی پہ بندھی گھڑی پہ نگاہ ڈالی جس کی سوئیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اسے آج آفس جلدی پہنچنا تھا لیکن یہاں تو پہلے ہی شکایات کا دفتر کھلا ہوا تھا۔

''عورت! تم نے پھر مجھے عورت کہا دانی! میں تمہیں ساری عمر معاف نہیں کروں گی۔''

''تم ایک بیس سال کی لڑکی کو عورت کیسے کہہ سکتے ہو؟'' دانیال نے اپنا دلیاں ہاتھ ماتھے پر دے مارا۔

''یار سب لڑکیاں عورتیں ہی ہوتی ہیں نا، اس لیے میں نے تمہیں بھی کہہ دیا ''عورت''۔'' وہ منمنایا پر سونیا کو تو جیسے پتنگے لگ گئے تھے۔

''اُف دانیال...... اب ایک بار بھی تم نے یہ لفظ میرے سامنے کہا تو میں...... میں تم سے ساری عمر بات نہیں کروں گی۔'' وہ سینے پہ ہاتھ رکھے جذباتی انداز میں بولی۔

''او کے، آئی ایم سوری۔ اب میں کبھی تمہیں دوبارہ ''عورت'' نہیں کہوں گا۔ پلیز اب تو کچن میں چلو اور میرا ناشتا بنادو۔'' اس کے پاس پہنچ کر اسے خود سے قریب کرتے دانیال نے بغیر کسی حجت کے معذرت کی تھی۔ اس کے پاس اپنی نئی نویلی بیگم کو منانے کے سوا دوسرا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

☆☆☆

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب آتش جوان تھا یا نہیں پر سونیا اور دانیال کی منگنی نئی نکور تھی اور اس کے ساتھ دل میں امنگیں، لمبے چوڑے وعدے معاہدے اور مرتے دم تک ساتھ نباہنے کی قسمیں صبح شام کھانسی کی دوائی کی طرح پابندی سے کھائی جاتی تھیں۔ دانیال دراصل سونیا کا پڑوسی تھا۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ کچھ عرصہ پہلے ہی وہاں شفٹ ہوا تھا اور ان ہی کی کالونی میں گھر کرائے پہ لیا تھا۔ سونیا اور دانیال کی پہلی ملاقات روڈ سائڈ پہ ہوئی تھی جب وین کا ٹائر پنکچر ہونے کے بعد سونیا اور اس کی دونوں یونیورسٹی فیلوز منہ بسورے کھڑی تھیں۔ ڈرائیور ادھار جیک مانگنے کے چکر میں سگریٹ پینے نکل گیا تھا اور وہ تینوں وہاں کھڑی اس کی جان کو رو رہی تھیں جب دانیال نے سونیا کو پہچان کر ازراہ ہمدردی اور پڑوسی ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے لفٹ دی تھی۔ نہ وہ ملاقات آخری ثابت ہوئی تھی نا ہی لفٹ دینے کا سلسلہ اور پھر ان دونوں کی دوستی کا انجام منگنی کی صورت ہوا۔

عشق کا جادو دونوں ہی کے سر چڑھ کر بول رہا تھا ایسے میں دانیال خود کو میاں مجنوں ثابت کرنے پہ تلا بے دام کا غلام بنا اپنی لیلیٰ کے لیے کچھ بھی کرنے کو ہر دم تیار رہتا تھا البتہ لیلیٰ کو بھی بس مجنوں کو گول گپوں اور دہی بڑوں پہ ہی آزمانا آتا تھا۔ اکثر رات دس بجے میسیج کیا جاتا، ''دانی مجھے چاٹ والے گول گپے کھانے ہیں'' اور دانیال صاحب پھرتیاں دکھاتے پہنچ جاتے گول گپے والے کی ریڑھی پہ اور پھر سونیا کے کمرے کی بالکونی کے راستے گول گپوں کا لفافہ اوپر پارسل کیا جاتا۔ یقین واثق ہے اس شہر کے گول گپے اور دہی بڑے بیچنے والے ان دونوں کی منگنی کے دور میں کروڑ نا سہی تو لکھ پتی ضرور بن چکے ہوں گے۔ اب بھلا ہو وارث شاہ کا جس نے رانجھے سے ہیر کی بھینسیں چرا کر دور حاضر کی ہیروں کے دماغ ساتویں آسمان پر پہنچادیے۔ اب انہیں خوش رکھنے کی خاطر دانیال کو یہ پاپڑ تو بیلنے ہی تھے۔

لیکن یہ سب تو اب قصہ چہار درویش کی طرح ماضی کی باتیں بن چکی تھیں۔ حال کی صورتحال یہ تھی کہ دانیال اور سونیا کی شادی کو آج پورے پندرہ دن ہوچکے تھے۔ شادی کے اگلے ہی دن وہ دونوں اپنے ہنی مون پہ روانہ ہوگئے تھے۔ یہ فرمائش بھی سونیا ہی کی تھی کہ اسے رشتے داروں کے ساتھ دعوتیں کھا کر بور نہیں ہونا پھر دانیال نے بھی آفس سے ہفتے بھر کی چھٹی لے رکھی تھی۔ نتھیا گلی اور کاغان کی مزے دار سیر کے بعد سونیا ابھی رومانس کے سہانے خوابوں میں ہی تھی کہ دانیال کو حقیقت میں واپس آنا پڑا۔

اس کا آفس شروع ہوتے ہی روٹین کی بھاگ دوڑ شروع ہوگئی تھی۔ سونیا ابھی اس حقیقت کو ماننے کو ہرگز تیار نا تھی کہ وہ محبوبہ سے بیوی بن چکی ہے۔ دانیال خود بھی اسے اس مقام سے ہٹانا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ نا تو اپنی ذمہ داری سمجھنے کو تیار تھی نا ہی دانیال کی۔ ایسے میں اگر وہ اسے کچھ کہہ دیتا تو واویلا مچ جاتا پھر دانیال کو ہی اسے منت سماجت کرکے منانا پڑتا کیونکہ وہ اپنی نئی نئی شادی شدہ زندگی کو ہرگز خراب

نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب محبوب کو اتنی بے نیازی تو سوٹ بھی کرتی ہے لیکن شاید سونیا بھی اس کا صبر آزمانے پہ تلی ہوئی تھی۔ آج صبح بھی کچھ یہی ہوا تھا۔ اس کی ذرا سی بات کو رائی کا پہاڑ بنا کر اس نے کیا ہی طوفان مچا دیا تھا۔ ایک تو آج کل آفس کا ضرورت سے زیادہ ورک لوڈ اس پہ سونیا کی ناراضی وہ واقعی بوکھلا گیا تھا۔

☆☆☆

اس نے آئینے کے سامنے کھڑے خود پہ ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ عورت لفظ اب تک دماغ میں پھنسا اسے خوار کر رہا تھا۔ یقیناً اس کے چہرے پہ ہی کوئی تاثر ہوگا جس نے دانیال کو اسے عورت کہنے کی ترغیب دی۔ اپنے دل میں اٹھتے شبہات سے خوف زدہ ہو کر وہ بھاگم بھاگ بیوٹی سیلون چلی آئی تھی۔

فیشل، مینی پیڈی کے ساتھ نیا ہیر اسٹائل اور ڈائی لگوا کر جب اس نے آٹھ ہزار سیلون کا بل دیا تو اللہ جانے عمر کچھ کم دکھائی دی تھی یا نہیں البتہ سلامی میں ملے پیسوں میں کمی ضرور آگئی تھی۔

''ارے واہ آج تو محترمہ غضب ڈھا رہی ہیں۔'' دانیال نے گھر پہنچ کر حسب عادت اس کی تعریف کی تھی۔ وہ جو آج نک سک سی تیار اس کی آمد کی منتظر تھی اس کمنٹ پہ دل ہی دل میں اپنی عقل کو داد دی تھی جس نے بروقت اسے درست سمت دکھائی تھی۔

''اس کا مطلب یہ نیا ہیر اسٹائل اور کلر مجھ پہ سوٹ کر رہا ہے؟'' اس نے بالوں میں انگلیاں گھماتے دانیال کی طرف دیکھا۔ دانیال جو اپنے فون میں سر دیے بیٹھا فیس بک دیکھ رہا تھا اچانک اس کی بات سن کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم نے بال کٹوائے ہیں؟'' ماتھے پہ شکن ڈالے وہ کچھ کنفیوز ہوا۔

''کیوں، تمہیں محسوس نہیں ہوا دانی؟'' سونیا نے کچھ مایوسی سے پوچھا۔

''محسوس کیوں نہیں ہوا۔ اندر آتے ہی پتا چل گیا تھا کہ یو آر لکنگ ڈفرنٹ۔'' دانیال کھسیانا ہوا لیکن سونیا کی شکل پہ نظر آتی پریشانی محسوس کرتے ہوئے اس نے فورا بات بنائی تھی۔

''اچھا لگ رہا ہے نا؟'' وہ ایک دم ایکسائیٹڈ ہوگئی۔

''تم تو ہر انداز میں ہی حسین لگتی ہو میری جان۔ چلو اب اسی خوشی میں جلدی سے کھانا لگا دو۔ بھوک سے پیٹ میں چوہے ڈانس کر رہے ہیں''۔ اس نے پیٹ پہ ہاتھ پھیرتے صوفہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''دانی آج باہر چل کر ڈنر کرتے ہیں نا''۔ سارا دن بیوٹی سیلون کی نظر کر کے جب وہ گھر واپس آئی تو تھکاوٹ عروج پہ تھی۔ پھر شام سے اپنی تیاری میں مگن رہی ایسے میں کھانا کہاں سے بنتا۔ اس نے تو خود شام کو چائے کے ساتھ رس کھا کر پیٹ بھرا تھا۔

''کمال کرتی ہو سونا، ایسے تھوڑی ڈنر کرنے منہ اٹھا کر جایا جاتا ہے''۔ وہ کچھ خفا ہوا تھا۔

''ہم اب ویک اینڈ پہ ہی باہر جائیں گے۔ ویسے بھی کچھ دن پہلے ہم ہنی مون سے واپس آئے ہیں۔ روز باہر کا کھانا ہی کھاتے تھے وہاں۔ میرے مطابق اتنی زیادہ ہوٹلنگ صحت کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔'' دانیال صبح کا تھکا ہارا اب شدید سستی کا شکار تھا۔ اس کے لیے تو اس وقت کھانا کھا کر بیوی کی کمپنی کو انجوائے کرتے آرام کرنا دنیا کی سب سے قیمتی شے تھا۔ الٹا واپس ٹریفک میں پھنس کر دو تین گھنٹے سڑکوں پہ خوار ہوتا پھرے۔

''تم کتنے بدل گئے ہو نا دانی۔ شادی سے پہلے میری چھوٹی سے چھوٹی فرمائش کو بھی تم نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ یاد ہے میرے کہنے پہ رات کو دہی بڑے اور گول گپے لا کر دیا کرتے تھے۔'' اس نے شکوہ کرتے منہ بنایا۔

''سونا وہ اور بات تھی۔ اب تو ہماری شادی ہوگئی ہے نا۔'' دانیال نے اپنے تئیں سمجھانا چاہا لیکن سونیا پہ اس کا الٹا اثر ہوا تھا۔

''اس کا مطلب اب تمہاری نظر میں میری اہمیت ختم ہوگئی ہے۔ مجھے پتا ہوتا تو میں کبھی تم سے شادی نا کرتی کہ تم میرے ساتھ ایسا سلوک کرو گے۔'' وہ تقریباً رونے والی ہوگئی تھی۔

''یار سونا میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے۔ اتنا تو خیال رکھتا ہوں تمہارا۔ ابھی چار دن پہلے شاپنگ کرائی ہے۔ اتنی سیر کرا کے لایا ہوں وہ بھی تمہاری پسند کی جگہ پہ، اب آج نہیں جا سکتا باہر ڈنر پہ تو تم سلوک گنوا رہی ہو۔ شادی سے پہلے تم بھی تو مجھے ایسے ٹریٹ نہیں کرتی تھیں۔ کتنا خیال رکھتی تھیں میرا۔ آئے دن وہ بریانی اور شامی کباب بنا بنا کر بھیجا کرتی تھیں۔ دن میں دس دس بار میسج پہ میری خیریت پوچھتی تھیں میں نے کھانا کھایا یا نہیں۔ خود بتاؤ آج سارا دن میں تم نے ایک بار بھی مجھ سے پوچھا میں کیسا ہوں۔'' خلاف توقع وہ بھی سیدھا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے تو اس نے کبھی سونیا سے شکایت نہیں کی تھی الٹا ہر بار اپنی غلطی قبول کر کے اسے منانے کے ساتھ معذرت کرتا تھا۔

''وہ میں...... سیلون میں تھی نا تو یاد نہیں رہا۔'' وہ کچھ شرمندہ ہوئی۔ کہہ تو وہ بھی ٹھیک ہی رہا تھا۔ پچھلے دنوں اس نے بس اپنے نخرے ہی اٹھوائے تھے کہ یہ اس کا حق تھا۔ دانیال کی ضروریات کیا ہیں یہ تو اب تک اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ یہ بھی زور زبردستی وہ اس سے اپنے چند کام کروا لیتا تھا جنہیں کرتے وہ اس پہ احسانِ عظیم کیا کرتی تھی۔

''اچھا اپنی دفعہ یاد نہیں رہا اور مجھ سے شکوے کرنا سب یاد رہتا ہے۔'' وہ بھی شاید آج معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''بہت بھوک لگی ہے مجھے، جاؤ جلدی سے کچھ بنا لو۔ آملیٹ بھی چلے گا۔ مجھے شدید تھکاوٹ ہو رہی ہے۔'' سونیا کے چہرے پہ نظر آتی مایوسی کو خاطر میں نا لاتے ہوئے اس نے قدرے سنجیدگی سے کہا تھا۔ خود تو وہ کپڑے بدلنے کمرے میں چلا گیا پیچھے چار و نا چار سونیا کو کچن میں گھسنا ہی پڑا۔ پراٹھوں کے ساتھ آملیٹ بنا کر وہ سوجے منہ کے ساتھ کچن سے نکلی تو دانیال فریش ہو کر ہاتھ میں ریموٹ تھامے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس کا منہ بنا دیکھ کر بھی وہ کچھ نہیں بولا اور مزے سے کھانا کھانے لگا۔ پہلے تو اس کا ارادہ نخرے دکھا کر کھانے سے انکار کرنے کا تھا لیکن جب دانیال نے اسے آفر کیے بغیر ہی کھانا شروع کر دیا تو مجبوراً وہ بھی کھانا کھانے لگی۔ بھوک سے پیٹ میں بل تو اس کے بھی پڑ رہے تھے۔

☆☆☆

شادی کے فوراً بعد چھوٹی چھوٹی باتوں پہ ہونے والی تکرار اور دنوں میں پڑی بدگمانی کی گرہ اس رشتے کے حسن کو ماند کر دیتی ہے۔ دانیال اگر روایتی شوہر بننے کی کوشش کر رہا تھا تو سونیا کو بہر حال اس کی بات ماننا ہی تھی کیونکہ یہ تو طے تھا وہ اسے دل و جان سے چاہتی تھی۔ اب وہ سنڈریلا کی سی زندگی گزارنے والا خواب پورا نہیں ہو رہا تھا تو کیا ہوا شوہر تو اس کا من پسند ہی تھا نا۔ اسے دل ہی دل میں دانیال سے شکوہ تو تھا کہ وہ بہت جلد بدل گیا ہے۔ ہر وقت اس کے سر پہ دفتر سوار رہتا ہے یا پھر کھانا پینا۔ اپنی شادی کو لے کر سونیا کے تو ارمان ہی نہیں پورے ہوئے تھے کہ دانیال نے اس پہ اپنے پورے گھر کی ذمہ داری ڈال دی۔ اس میں اب کچھ قصور دانیال کا بھی نہیں تھا وہ بہت عرصے سے اکیلا رہ رہا تھا۔ گھر تھا بھی تو بس سرائے کی طرح جہاں رات گزاری جاتی تھی۔ جب بھوک لگی جو ہاتھ لگا کھا لیا۔ اب اس کی خواہش [illegible] گھر بسایا ہے تو بھرپور اور پرسکون زندگی گزارے۔ سونیا کے لیے اس کی یہ چھوٹی سی خوشی دردِ سری ہوئی تھی کیونکہ وہ دانیال کے جذبات نہیں سمجھ رہی تھی، پھر بھی اس نے اپنے موڈ کے برخلاف گھر کے کاموں میں دلچسپی لینی شروع کر ہی دی تھی۔ اگلا پورا ہفتہ اس نے دانیال کو ایک بھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ صبح اس کے کہے بغیر ہی اس کے کپڑوں سے لے کر ناشتا تک وقت پہ ریڈی تھا تو گھر واپسی پہ شام کی چائے اور ڈنر پورے لوازمات کے ساتھ سرو کیا جاتا رہا۔ گھر

میں باقی سب کاموں کے لیے ماسی آتی تھی جس کی وجہ سے سونیا کو بہت زیادہ مشقت تو نہیں کرنی پڑتی تھی۔ہاں دانیال کواس کے ہاتھ کی کوکنگ پسند تھی اور وہ اس کے پکائے کھانے پہلے بھی رغبت سے کھاتا تھا۔آج کل وہ بھی سب اس کی پسند کی ڈشز بنا رہی تھی۔ بریانی، چکن کڑاہی، شامی کباب، نہاری اور قورمہ دانیال کو بہت پسند تھا اور یہ سونیا جانتی تھی۔لہٰذا پچھلے دنوں ایک ایک کر کے سب کچھ پکا ڈالا۔ یہ اور بات وہ خود ان دنوں میں خاصی بجھی بجھی سی نظر آرہی تھی۔ سجنا سنورنا ان دنوں موقوف تھا بس شام کو نہا کر نیا سوٹ پہن لیتی۔ میک اپ سے عاری چہرہ دیکھ کر بھی دانیال ہمیشہ کی طرح ہر روز اس کی تعریف کرتا تو وہ کچھ بدمزا سی ہو جاتی۔ پتا نہیں کیوں اسے احساس ہو رہا تھا دانیال اس کی طرف سرے سے توجہ دیتا ہی نہیں ہے اسی لیے تو اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا کہ وہ اب پہلے کی طرح اس کے لیے خاص طور پہ تیار نہیں ہو رہی۔ یہ سوچ کر وہ اندر ہی اندر کچھ اور بھی چینخی تھی۔ مرد کی محبت میں حدت اور وعدوں کی پاسداری فقط اس وقت تک محدود ہے جب تک وہ اسے حاصل نہ کر لے۔ جس دن وہ اس پہ دسترس پا لیتا ہے وہ مرد کے لیے گھر میں پڑی کوئی بھی عام سی شے میں بدل جاتی ہے۔اس کا وہ خاص مقام گھٹ کر اس آئینے سا رہ جاتا ہے جسے صبح شام دیکھا تو جاتا ہے پر اس کی اہمیت کو کبھی تسلیم نہیں کیا جاتا اور ایک ہلکی سی دراڑ کی صورت اسے گھر سے باہر نکال کر بدل دیا جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی بدگمانی بھری سوچوں کے ساتھ وہ ان دنوں شدید بوجھل رہنے لگی تھی۔ وہ بات بے بات روٹھنا، چھوٹی چھوٹی باتوں پہ ضد کرنا یا پھر نان اسٹاپ دنیا جہان کی باتیں آج کل وہ دانیال کے ساتھ نہیں کرتی تھی۔ دانیال کا انداز اتنا نارمل تھا کہ سونیا کو رونا آرہا تھا۔

آج بھی وہ اسی اطمینان سے کھانا کھانے کے بعد اس کا ہاتھ تھامے صوفہ پہ چلا آیا تھا۔حسبِ عادت ٹی وی دیکھتے اس نے حالیہ سیاست پہ سونیا سے تبادلۂ خیال کیا جس کے جواب میں اس نے فقط ہاں، نہیں اور اچھا ہی کہا تھا۔ایک اچھے سامع کی طرح وہ بس اس کی سنتی رہی تھی۔

"یعنی اسے تو کوئی فرق ہی نہیں پڑتا میں کوئی بات کروں یا نا کروں"۔ بستر پہ لیٹتے وہ جی بھر کے بدمزا ہوئی تھی۔ دل میں دانیال کے لیے شکوہ اور بڑھا تھا۔ لیکن پھر سر جھٹک کر سونے کی کوشش کرنے لگی کیونکہ صبح اٹھنا بھی تو تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی دانیال کو اس کی وجہ سے آفس سے دیر ہو جائے۔

☆☆☆

"سونا کہاں ہو یار؟" دانیال کی آمد آج وقت سے پہلے ہی ہو گئی تھی اور گھر آتے ہی اس نے اپنا مخصوص جملہ کہتے اس کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔

"دانی میں کچن میں ہوں"۔ سونیا کو اس کے جلد گھر آنے پہ حیرانی تو ہوئی تھی کیونکہ اکثر وہ فون پہ اسے اپنی واپسی کے متعلق پہلے ہی بتا دیا کرتا تھا۔ بہر حال وہ اس وقت جس مشقت میں پھنسی تھی وہاں سے نکلے بغیر اس نے کچن سے ہی بلند آواز میں جواب دیا۔ دانیال مسکراتا ہوا کچن میں ہی آ گیا تھا۔

سونیا اس کی موجودگی سے بے نیاز اپنی کوکنگ میں بزی تھی۔ گوشت کو مسالا لگا کر وہ اب پیاز براؤن کر رہی تھی۔ دانیال سینے پہ دونوں ہاتھ باندھے کاؤنٹر سے ٹیک لگائے محو سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم یہاں کیوں کھڑے ہو۔ کپڑے بدل لو نا جا کر۔ میں کھانا پکا کر آتی ہوں"۔ اسے اپنی طرف اتنی توجہ سے دیکھتا محسوس کر کے سونیا نے دانیال کو دیکھا۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔ سونیا کو اس بے معنی سی مسکراہٹ کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی اس کا ذہن اس نئی ترکیب میں الجھا تھا جو وہ آج ٹرائی کر رہی تھی۔

"میں بہت برا ہوں نا سونا؟" اس کے بے ترتیب بالوں سے نکلتی چند لٹوں کو انگلی میں گھماتے وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ سونیا کچھ کنفیوز ہوئی۔

"دانی میں......" اسے سمجھ میں نہیں آیا وہ اس بات کا کیا جواب دے۔ ویسے بھی پیاز براؤن ہو چکا تھا۔

"چھوڑو یہ سب۔" دانیال نے آگے بڑھ کر چولہا بند کرتے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا۔ کھانا خراب ہو جائے گا تمہارے اس بے وقت رومانس کے چکر میں۔" سونیا کے احتجاج کا دانیال پہ کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں اس میں وقت برباد کرنے کی آج ہم ڈنر باہر کریں گے۔" اس نے سونیا کی آنکھوں میں دیکھتے شرارت سے کہا۔

"اچھا جی! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے ابھی ویک اینڈ میں پورے چار دن باقی ہیں۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں یاد دہانی کراتے اسے پرے دھکیلنا چاہا۔

"تو کیا ویک اینڈ کے علاوہ باہر نکلنے پہ کرفیو ہے؟" وہ ہنسا۔

"یہ کرفیو بھی تو جناب کا ہی لگایا ہوا ہے"۔ سونیا کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"تو مابدولت اسے جب چاہے ہٹا سکتے ہیں۔" اس کے انداز میں بے نیازی تھی۔

"تم بھی نادانی......! کیا چاہتے ہو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" سونیا نے اسے پرے دھکیل کر اس کی دسترس سے نکلنا چاہا۔

"کم سے کم تمہیں اس طرح الجھا ہوا اور ناخوش نہیں دیکھنا چاہتا۔" دانیال نے اس کا بازو تھام لیا۔

"میں خوش ہوں۔" اس نے پلٹ کر دانیال کو دیکھتے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"تم مجھ سے جھگڑا، شکوے شکایات اور روٹھے بغیر کبھی خوش نہیں ہو سکتیں۔" وہ اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔

"دماغ خراب ہے تمہارا بھلا جھگڑا کر کے کون پاگل خوش رہتا ہے۔" سونیا کچھ جھینپ سی گئی۔

"تم......" اس نے وثوق سے کہا تھا۔

"اچھا تو میں پاگل ہوں؟" وہ خفا سی بولی

ساتھ ہی ناراضی سے منہ بنایا تھا۔

"نہیں میں پاگل ہوں تمہارے عشق میں......" دانیال نے سینے پہ ہاتھ رکھتے سر جھکایا۔ سونیا نے بے اختیار نچلا لب کاٹا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے ناراض ہو۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے تم میری روٹین کو فالو کرتے بہت تھک جاتی ہو۔ میں خود بھی تمہیں تھکانا نہیں چاہتا۔ تمہیں لگتا ہوگا میں اب تم سے محبت نہیں کرتا، تمہارا خیال نہیں رکھتا۔ مجھے تمہاری فکر نہیں۔" سنجیدگی سے کہتے اس نے سونیا کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔ وہ نظریں جھکائے خاموش کھڑی تھی۔

"ایسی بات نہیں"۔ سونیا نے نفی میں سر ہلایا۔

"تمہارے اس چھوٹے سے دماغ میں جو کچھ بھی چل رہا ہوتا ہے نا سب پتا چل جاتا ہے مجھے۔" اس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگاتے وہ ہنسا تھا۔ بے اختیار سونیا کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"یہ غلط ہے کہ مجھے تمہاری فکر نہیں یا میری محبت میں کمی آگئی ہے۔ انفیکٹ اب تو مجھے تم سے اور بھی شدید محبت ہوگئی ہے کیونکہ اب تم صرف میری ہو۔ شادی سے پہلے کے چند منٹ یا چند گھنٹے ایک مختصر سی ملاقات یا فون کال کی صورت ساتھ گزارنے میں سب وہی گنی چنی اور نپی تلی باتیں کر سکتے ہیں جو ہم کیا کرتے تھے لیکن اب تم میری بیوی ہو۔ میری زندگی کی ساتھی اور اس رشتے میں محبت اور چاہت کے ساتھ ساتھ کچھ حقوق و فرائض بھی ہیں۔ میں چوبیس گھنٹے تمہیں آئی لو یو کی گردان نہیں سنا سکتا۔ ٹرسٹ می تم خود بور ہو جاؤ گی۔" وہ اس کے دل میں بسی بدگمانیوں سے غافل نہیں تھا۔ پر یہ بھی چاہتا تھا وہ اس رشتے کی حقیقت کو سمجھے۔

"یہ ہماری زندگی ہے کوئی فیری ٹیل نہیں جس کا اختتام "دے لیو ہیپلی ایور آفٹر" کے نوٹ پہ ہوگا اور سب پلکوں پہ جھلملاتے آنسو پونچھ کر کتاب بند کر دیں گے۔ سونا اسے خوش اور مطمئن بنانے کے لیے ہم دونوں کو کوشش کرنا ہوگی اور وہ صرف اس وقت ممکن ہے جب ہم اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں۔" شادی کے بندھن کی مضبوطی ایک دوسرے کے احساسات کو سمجھ کر آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی خواہشات کے احترام میں پوشیدہ ہے۔

پہلے میں اکیلا تھا، من موجی تھا۔ اب تم ہو میرے ساتھ اور میں نہیں چاہتا تمہیں زندگی میں کسی کمی کا سامنا ہو۔ کل ہماری فیملی بڑھے گی اور اس کے ساتھ ضروریات بھی۔ ہماری مصروفیات کا دائرہ بدل جائے گا تو کیا ہمارا رشتہ کمزور ہو جائے گا؟" سونیا نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا تھا۔ وہ واقعی اس کا موقف سمجھ چکی تھی۔

دانیال درست کہہ رہا تھا ہر رشتے کا اپنا حسن اور اس کی ڈیمانڈز ہوتی ہیں۔ ایسے میں وہ اگر سونیا کی طرف سے کوئی غفلت نہیں برت رہا تھا تو اسے بھی اپنی ذمہ داریاں بوجھ سمجھنے کے بجائے خوش دلی سے پوری کرنی چاہئیں۔ گھروں کے کام ماسیاں چند روپوں کے عوض کر جاتی ہیں، کھانا ہوٹلوں سے سستے داموں کھایا جا سکتا ہے لیکن نا تو اس میں بیوی کی محبت شامل ہوتی ہے نا ہی اس کی پروا کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔ مرد منہ سے نہیں کہتا پر غیر محسوس سے انداز میں یہ سب اس کی ذات کا حصہ بنتا جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں شامل اس عورت کا عادی بن جاتا ہے۔ محبت پہ عادت حاوی ہونے لگتی ہے۔

"میں تمہاری بات سمجھ گئی ہوں دانیال"۔ سونیا کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ دانیال اس سے غافل نہیں اور بہر حال زندگی اس چند ثانیے کے رومانس سے آگے بڑھ چکی ہے بلکہ اصل زندگی تو شروع ہی اب ہوئی ہے۔

"تو چلو پھر جلدی سے ریڈی ہو جاؤ۔ پہلے کی طرح مہکتی ہوئی میری سونا بن کر دکھاؤ۔" اس کا ہاتھ تھامے وہ کچن سے باہر نکل آیا تھا۔

"تمہیں کون سا فرق پڑنے والا ہے۔ تم کون سا میری تیاری کا نوٹس لیتے ہو دانی!" نا چاہتے ہوئے بھی یہ شکایت زبان پہ آ ہی گئی تھی اس کے۔

"سب پتا چلتا ہے مجھے۔ یہ ماسیوں والا حلیہ کس احتجاج میں بنایا جا رہا تھا پچھلے دنوں۔" دانیال کی بات پہ اس نے بے اختیار اس کے سینے پہ ہاتھ مارا۔

"ایک بات کہوں۔ تم کسی بھی حلیے میں ہو میری محبت نہیں بدلے گی کیونکہ میں نے تمہارے ظاہر کو نہیں باطن کو چاہا ہے اور تم اس سے زیادہ بری بھی لگو گی نا جتنی اس وقت لگ رہی ہو تو یقین جانو میں تمہیں اتنا ہی پیار کروں گا۔" سونیا کو آج اپنی قسمت میں واقعی رشک آیا تھا۔ قدرت نے دانیال کا ساتھ واقعی اسے کسی انعام کی صورت عطا کیا تھا۔

"کیا واقعی میں بہت بری لگ رہی ہوں دانی؟" دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے اس نے دانیال سے سوال کیا۔ دانیال نے بے اختیار سر اثبات میں ہلایا۔

"تم سچ میں بہت برے ہو۔" اس نے تو اس امید پہ پوچھا تھا شاید دانیال اس کی تعریف کرے گا لیکن وہ کچھ زیادہ ہی سچ بولنے کے موڈ میں تھا۔ دانیال بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"ویسے تم آج جلدی کیوں آگئے؟" یہ بات تو وہ کب سے پوچھنا چاہ رہی تھی۔

"اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ آج میری پرموشن ہوئی ہے۔" دانیال نے پر جوش ہو کر بتایا۔

"اچھا تو اس لیے جناب ڈنر پہ لے کر جا رہے ہیں۔ چھوڑو نا دانی میں کھانا گھر پہ ہی پکا لیتی ہوں۔" سونیا تفصیل جان کر بہت زیادہ خوش ہو گئی تھی لیکن ایک تو وہ کھانا تقریباً پکا چکی تھی دوسرے اسے دانیال کا بھی خیال تھا وہ اب سارا دن کا تھکا ہارا پھر اسے آؤٹنگ پہ لے کر جائے گا تو اور تھک جائے گا۔

"بالکل نہیں۔ آج تو ہم ڈنر باہر ہی کریں گے۔" وہ نا ماننے والے انداز میں بولا۔

"اور وہ دوسری خوشی کیا ہے۔" سونیا پر تجسس تھی۔

"آج ہم دونوں کی شادی کو پورا ایک ماہ ہو گیا ہے۔ ایک ماہ پہلے آج ہی کے دن تم میری زندگی میں بلا بن کر نازل ہوئی تھیں۔" اپنے انکشاف کے ساتھ اس کے لہجے میں بے پناہ شرارت تھی۔

"دانیال آئی ول کل یو۔" سونیا نروٹھے پن سے بولی۔ واقعی اسے یاد نہیں تھا پر یہ جان کر خوش گوار حیرت ہوئی تھی کہ دانیال بھولا نہیں تھا۔

"آپ کے اس انداز پہ بندہ روز مرنے کو تیار ہے۔" دانیال سر تسلیم خم کرتا سونیا کی طرف بڑھا۔ اس کے ارادوں کو بھانپ کر وہ ایک جست میں کمرے میں جا گھسی۔ آخر اسے ڈنر کے لیے تیار بھی تو ہونا تھا اور آج کی تیاری میں وقت بھی زیادہ لگنے والا تھا کیونکہ آج اسے دانیال کی فرمائش پہ اس کے لیے سجنا سنورنا تھا۔

☆☆

سالگرہ نمبر





مکمل ناول

امت العزیز شہزاد

سونے دی تاویتڑی



''نہ! اج تو مینوں دس ہی دے...... توں سمجھا کی اے مینوں؟'' سرخ چہرے، مسلسل پھڑکتے چکتے نتھنوں اور پھڑ پھڑاتی تلوار نما گھنی مونچھوں والے چوہدری عبدالکریم نے کھا جانے والی نگاہوں سے اپنے اکلوتے، ناخلف و ناہنجار وغیرہ وغیرہ۔ سپوت کو گھورتے ہوئے اس بار بڑے ہی سخت لہجے میں استفسار کیا۔ پچاس روپے والے غبارے نما پھولی ہوئی توانا توند سے نیچے سرکتا چیک دار نیلا سوتی ٹراؤزر، قمیص یا شرٹ نامی کسی بھی قسم کی شے سے ہمیشہ کی طرح قطعی بے نیاز......

''اوہ گاڈ!'' نفاست پسند ایبک کا آرٹسٹک ''جی'' اپنے والد بزرگوار کا ناگوار حلیہ دیکھ کر اس قدر مکدر ہوا کہ اس نے بجائے ان کی جھاڑ پر اپنے ''کان'' دھرنے کے، اپنی عینک زدہ آنکھیں ہی میچ لیں۔

''اب کیا ئستا بن گیا اے۔'' وہ بالکل اس کے نزدیک تر آ کر اپنی ببر شیر نما، کسی بھی قسم کے لحاظ سے قطعی عاری آواز میں دہاڑے اور...... یہیں ایبک کی بس ہوگئی۔

''فار گاڈ سیک ڈیڈ!'' وہ بلبلا کر اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا، یہاں کوئی ''مولا جٹ ریٹرنز'' کی شوٹنگ نہیں چل رہی جو آپ خواہ مخواہ اتنا اونچا اونچا بول کر ہمارے کانوں کے پردے پھاڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔'' وہ نزاکت آمیز، نخوت زدہ لہجے میں برے برے منہ بنا کر بولا تو اس بار وڈے چوہدری کی واقعی گویا ''بس'' ہوگئی۔

''اوئے۔'' وہ بپھر کر بولے۔ ''دن رات زنانیوں کے کپڑے سی سی کر تیرے اندر کا بچا کھچا مرد بالکل ہی مر کھپ گیا ہے جو یہاں کھڑا اپنے پیو کو ناز نخرے دکھا رہا ہے۔'' انہوں نے لپک کر اس کا داہنا کان پکڑا اور بری طرح مروڑ کر رکھ دیا۔

''آ...... آ...... ابا...... وہ میرا مطلب ہے کہ ڈیڈ!'' ایبک بے ساختہ اپنا پورا منہ بھاڑ سا کھول کر تکلیف سے چلایا۔

''خدا کا خوف کریں چوہدری صاحب!'' اتنی دیر سے باپ بیٹے کے درمیان ہوتی تکرار بڑی بے بسی اور بے چارگی سے سنتی مہر النساء جھلا کر سرعت سے آگے بڑھیں۔

''اب یہ بچہ نہیں رہا، جوان ہو چکا ہے۔ آپ کچھ تو خیال کریں۔'' انہوں نے چوہدری صاحب کا ہاتھ، ایبک کے کان سے علیحدہ کرتے ہوئے قدرے ناراضی سے انہیں گویا یاد دہانی کروائی اور نامحسوس انداز سے ان دونوں کے بیچ حائل ہو گئیں اور ان کے عقب میں موجود اس ''جوان ہو چکے بچے'' نے اپنا کان بے بسی سے سہلاتے ہوئے سخت تلملاہٹ آمیز ناراضی سے والد صاحب کی جانب یوں دیکھا گویا بزبان نگاہ کہہ رہا ہو۔

''والدہ درست فرما رہی ہیں؟ ان کی بات پر غور کیا جائے۔''

''جوان ہو گیا ہے تو کیا میں ڈر جاؤں گا اس سے۔'' اور والد گرامی چونکہ نگاہوں کی زبان سے قطعی نابلد واقع ہوئے تھے اس لیے ان کی التجائیہ نگاہوں پر غور کرنے کے بجائے اپنا بایاں ہاتھ نچا کر مزید بگڑ کر بولے۔

''خدانا خواستہ! میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔'' مہر النساء جلدی سے انہیں ٹھنڈا کرنے کی خاطر بولیں۔ ''ڈریں آپ کے دشمن، آپ باپ ہیں اس کے...... ڈانٹ ڈپٹ کرنا آپ کا حق ہے مگر اس طرح جوان بیٹے پر ہاتھ اٹھانا......''

''نہ تو پھر تُو ہی بتا......'' وہ ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے جھلاہٹ سے بول پڑے۔ ''پھر اور کیسے مانے گا یہ کھوتے دا پتر میری بات۔'' اس عزت افزائی پر کھوتے دا پتر برے برے منہ بنانے لگا۔

''دیکھیں بچہ ہے، ذرا پیار سے......'' انہوں نے ابھی منمنا کر کچھ کہنا شروع ہی کیا تھا کہ چوہدری صاحب نے اس مرتبہ پھر ان کی بات تیزی سے پکڑ کر کاٹ ڈالی۔

''پر ابھی تو تُو نے کہا کہ یہ جوان ہو چکا ہے۔''

''اوفوہ، میرے اللہ......'' مہر النساء نے زچ

ہو کر بے بسی سے اپنا سر پکڑ لیا۔

''آپ ایک بار اطمینان سے میری پوری بات تو سن لیں۔'' انہوں نے منت بھری نگاہوں سے آگ بگولا ہوئے شوہر نامدار کو دیکھا تو وہ انہیں دیکھ کر اس بار کچھ دھیمے سے پڑ گئے۔

''چل...... سنا!'' انہوں نے نروٹھے پن سے اجازت مرحمت فرمائی۔

''دیکھیں چوہدری صاحب!'' مہر النساء نے موقع غنیمت جان کر جلدی جلدی اپنا موقف ان کے گوش گزار کرنے کی سعی کی۔ ''کسی بات کو سمجھ کر قبول کرنے میں انسان کو کچھ وقت تو لگتا ہی ہے نا...... ابھی کل ہی تو آپ نے اس کے سامنے اس ''راز'' سے پردہ اٹھایا ہے اور آج یہاں کھڑے ہو کر اسے زور وز بردستی وہاں بھیجنے پر اصرار کر رہے ہیں۔''

''اصرار......؟'' وہ جو متانت اور روانی سے چوہدری صاحب کے سامنے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کر رہی تھیں معاً اپنے عقب سے بلند ہونے والی اس دردناک احتجاجی صدا پر بری طرح چونک اٹھیں۔

''آپ ڈیڈ کی اس کھلی ''غنڈہ گردی'' کو اصرار کا نام دے رہی ہیں؟'' صدمے سے آواز اور آنکھیں دونوں پھٹ سی گئیں۔

''تم بیچ میں کیوں بولے؟'' وہ بھنا کر اس کی جانب گھومیں۔

''کیوں نہ بولوں؟ میری زندگی کا سوال ہے، میں بیچ میں تو کیا...... شروع اور آخر میں بھی خوب زور زور سے بولوں گا اور چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاؤں گا کہ اے لوگوں دیکھو! میرے ذاتی والدین کس طرح اپنی بات منوانے کی خاطر میرے بنیادی انسانی حقوق پامال کر رہے ہیں۔'' وہ ناک چڑھا چڑھا کر ''بلاول زدہ'' لہجے میں بولتا گیا۔

''ہیں ہیں......'' اس کی بے تکی باتوں پر مہر النساء نے متحیر ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔ ''تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟ یہ کیا اول فول بک رہے ہو؟''

''پاگل تیرا بیٹا نہیں۔'' چوہدری صاحب طنزیہ مسکرا کر بولے۔ ''پاگل تو تُو ہے مہرو! جو اس لاتوں کے بھوت کو باتوں سے قابو کرنے کی سوچ رہی ہے...... خیر میں پھر بھی تیرے خاطر اسے تین دن کی مہلت دے رہا ہوں مگر اسے اچھی طرح سمجھا دے کہ تین دن بعد ہو گا وہی جو میں کہہ چکا ہوں۔ میں اپنی مرتی ہوئی بے بے سے کیا ہوا وعدہ ہرگز نہیں توڑ سکتا۔ میں نے پہلے ہی بڑا ظلم کمایا ہے ان کا دل دکھا کر۔'' وہ انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کرتے ہوئے نم آنکھوں کے ساتھ کمرہ عبور کر گئے۔

''تم میری بات سنو۔'' ان کے جاتے ہی مہر النساء سرعت سے اپنے ناراض ناراض سپوت کی جانب گھومیں۔

''کیا سنوں میں مام! ہاں......؟'' وہ سخت گلہ آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ کیا سنائیں گی مجھے...... آپ تو خود ڈیڈ کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔'' وہ انہیں کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر تن فن کرتا، فی الفور کمرہ عبور کر گیا۔ مہر النساء اس کے ردعمل پر جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئیں۔

آج سے کئی سال قبل عبدالکریم نے ان کی خاطر اپنی بے بے کو مشکل میں ڈالا تھا اور آج اتنے برس بیت جانے کے بعد وہ اپنی بے بے کے لیے مہر النساء کے سامنے سراپا امتحان بن کر ایستادہ ہو گئے تھے۔

اور کون کہتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان بدل جاتا ہے، عادتیں شاید تبدیل ہو جاتی ہوں مگر فطرت کبھی بھی نہیں بدلتی، تھوڑا بہت تو کیا رتی تولہ ماشہ بھی نہیں۔

☆......❁......☆

ایبک کے دادا چوہدری عبدالشکور کوئی روایتی زمین دار یا جاگیر دار نہیں تھے البتہ ان کے پاس تھوڑی بہت زمین ضرور تھی جہاں وہ اپنے دونوں بیٹوں عبدالکریم اور عبدالسلام کے ساتھ مل کر کاشت کاری کیا کرتے تھے۔ جڑاں والا کے نزدیک چھوٹا سا پنڈ تھا، سارے میں ان کی بڑی عزت تھی۔ وقت آگے بڑھا چوہدری عبدالشکور کو ملی مہلت جسے زندگی کہتے

ہیں تمام ہوئی اور وہ اپنے حصے کا کام مکمل کر کے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ پیچھے رہ جانے والی زمین پر عبدالسلام خوب محنت کرنے لگا اور محنتی تو خیر عبدالکریم بھی بہت تھے مگر انہیں شروع سے ہی یہ کام پسند نہیں تھا۔ وہ ابتدا ہی سے کاروبار کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے مگر کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی پھر والد کا رعب بھی تھا کہ اپنی من مانی کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔

ان ہی دنوں ان کے یار بیلی کی ایک رشتہ دار فیملی کھیت کھلیانوں کی سیر کرنے کی غرض سے کراچی سے پنڈ آئی ہوئی تھی۔ بیلی کے یہ ماموں زاد "المعروف اچھے بھائی" میری خالہ کے بڑی داماد کے ساتھ بزنس پارٹنر تھے" شہر میں...... قصہ مختصر، بیلی نے اچھے بھائی سے ان کا ذکر کیا کہ انہیں شہر میں کاروبار کرنے کا بہت شوق ہے مگر کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ اب اچھے بھائی بڑے ایک کائیاں، جہاں دیدہ کاروباری شخص دو تین ملاقاتوں ہی میں ان کے اندر چھپے اوصاف کا اندازہ لگالینے کے بعد انہیں کراچی آکر اپنے ساتھ کاروبار کرنے کی پیش کش کر ڈالی۔

دراصل وہ ان دنوں اپنا کاروبار بڑھانے کی سوچ رہے تھے جس کے لیے انہیں کچھ سرمائے کے ساتھ ساتھ ایک ایمان دار، قابل بھروسا شخص کی بھی تلاش تھی...... جو پنڈ آکر چوہدری عبدالکریم سے ملنے کے بعد تمام ہوگئی۔

بہر حال! عبدالکریم نے چند دن اچھی طرح سوچ بچار اور چند مخلص دوستوں سے مشورہ کرنے کے بعد کراچی جانے کی ٹھانی۔ کراچی آئے، کچھ دن رہے، کاروباری ماحول اور مواقعوں کا جائزہ لینے کے بعد اچھے بھائی کی پیش کش پر ہامی بھرلی اور واپس جا کر دھماکا کر دیا کہ میں تو وہاں کراچی میں اپنے ذاتی کاروبار کی بنیاد رکھ آیا ہوں۔ بے بے بالا ہی بالا سارے فیصلے ان سے مشورہ کیے بغیر تن تنہا کر لینے پر بہت زیادہ ناراض ہوئیں۔ ظاہر ہے وہ ماں تھیں اور یہ ان کے بڑے بیٹے......" یہاں تک کی کتھا سنانے کے بعد مہر النساء نجانے کیوں یکدم خاموش سی ہوگئیں۔

"پھر...... آگے کیا ہوا آنٹی؟" اور ان کی یہ دلچسپ کہانی پورے انہماک سے سنتے مراد نے ان کے یوں خاموش ہو جانے پر بے ساختہ بے چینی سے استفسار کیا۔

"ہاں تو بس بیٹا......" مہر النساء نے کسی سوچ سے دامن چھڑاتے ہوئے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "تمہارے انکل ہمیشہ ہی سے اپنی ضد کے بڑے پکے واقع ہوئے ہیں، ایک بار جو ٹھان لیا سو ٹھان لیا۔ انہوں نے کہاں ماننی تھی کسی کی بات، پھر انہیں یہ اطمینان بھی تھا کہ ان کی بے بے وہاں اکیلی نہیں، عبدالسلام کے علاوہ ماشاء اللہ ان کا اپنا پورا میکا وہیں اسی پنڈ میں آباد ہے۔ عبدالسلام نے بھی انہیں بہت سمجھایا کہ کاروبار ہی کرنا ہے تو یہی فیصل آباد میں کرلیں۔ وہاں اتنے کوسوں دور جانے کی کیا ضرورت ہے مگر ان کے سر میں تو سودا سما ہی چکا تھا سو وہ یہاں آکر رہے۔

"اور آپ؟" مراد کے شریر چہرے پر یک دم ہی ڈھیر سارا اشتیاق ابھر آیا۔

"آپ انہیں کیسے اور کہاں ملیں؟" وہ تو باقاعدہ انٹرویو لینے پر اتر آیا تھا کہ چلو اب از خود اگر وہ سب کچھ بتانے پر آمادہ ہی ہیں تو لگے ہاتھوں پر "اہم سوال" بھی پوچھ ڈالو۔

"میں یہیں تھی تو یہاں ہی ملی۔" ان کی آنکھوں میں دبا دبا تبسم آٹھہرا۔ "اور کہاں ملنا تھا؟" وہ اسے دیکھنے لگیں، مراد نے جلدی سے سر ہلا دیا۔

"دراصل میں جب دس برس کی تھی تو ان ہی دنوں میرے والدین مجھے میری خالہ جان کے پاس چھوڑ کر حج کے لیے اور اس مقدس سرزمین نے ان دونوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے سینے میں چھپا لیا۔" مہر النساء اپنے مرحوم والدین کے ذکر پر رنجیدہ خاطر سی ہوگئیں۔ مراد بھی یہ سن کر قدرے افسردہ سا ہو گیا۔

"یوں تو میری خالہ جان کی اپنی بھی دو بیٹیاں تھیں مگر انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھ یتیم و یسیر بچی کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ خالو جان بھی

نیک شریف النفس آدمی تھے سو بھلی ہی گزری۔ میں نے ابھی تمہیں بتایا نا کہ اچھے بھائی، خالہ کے بڑے داماد اختر شجاع بھائی کے بزنس پارٹنر تھے۔ سو اچھے بھائی، اختر بھیا اور تمہارے انکل کی ایک کاروباری تکون سی بن گئی۔ چوں کہ یہ شہر میں نو وارد اور تنہا تھے اس لیے اکثر و بیشتر کبھی اچھے بھائی اور کبھی اختر بھیا انہیں اپنے ہاں کھانے وغیرہ پر مدعو کرتے رہتے تھے۔ ان ہی دنوں باجی فرحی کی خرابی طبع کی بنا پر ان کی تیمارداری کے سلسلے میں مجھے ان کے ہاں جا کر رہنا پڑا کیونکہ باجی ناہید کے ان دنوں پرچے ہو رہے تھے۔ الغرض بیٹا ہونی ہو کر رہتی ہے، وہیں کہیں چوہدری صاحب کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور اس کے بعد انہوں نے میرا اور بذریعہ اختر بھیا خالہ جان کا وہ پیچھا لیا ہے کہ نہ پوچھو۔"

"نہیں نہیں میں تو ضرور پوچھوں گا پلیز آنٹی! ضرور بتائیں۔" اس پیارے پھیکے سیٹھے قصے میں ایک یہی تو مزے دار بات تھی بھلا وہ کیوں نہ پوچھے؟ بس اسی لیے بچوں کی طرح ٹھنک کر بول پڑا۔

"اونہوں!" مہر النساء نے منہ بنایا۔ "بات درمیان میں کیوں کاٹی؟ وہی تو بتا رہی ہوں...... خیر چونکہ اچھے بھائی کے ساتھ ساتھ اختر بھیا اور تو اور جناب بیلی صاحب بھی ان کی گارنٹی لینے کو تیار تھے اور ظاہر ہے کہ اس رشتے میں میری بھی پسندیدگی شامل تھی لہٰذا خالہ جان کو مانتے ہی بنی۔ ہاں البتہ خالہ جان نے یہ شرط ضرور لگا دی کہ رشتے کے لیے اپنی بے بے کو لے آؤ تو ہمیں چنداں اعتراض نہیں۔ اس مرحلے پر چوہدری صاحب وہاں گئے اور وہاں تو جیسے ان کی بات سن کر زلزلہ ہی آ گیا۔ ان کی بے بے نے مجھے بہو بنانے سے صاف انکار کرتے ہوئے بتایا کہ وہ تو ان کا رشتہ اپنی بہن کی بیٹی سے طے کیے بیٹھی ہیں۔ الغرض کافی گرما گرمی ہوئی مگر نہ بے بے نے ہتھیار ڈالے اور نہ ہی یہ اپنی خواہش سے دست بردار ہونے کو تیار ہوئے اور یوں ہی واپس آکر خالہ جان کے سامنے ساری بات رکھ دی۔ خالہ ان کی سچائی اور پائے استقلال سے متاثر ضرور ہوئیں مگر وہ ابھی بھی متامل تھیں کہ ایک روز بے بے سے چھپ کر عبد السلام شہر چلا آیا اور دیگر لوگوں کی طرح اس نے بھی خالہ جان کو اس بات کی یقین دہانی کروادی کہ ایک بار یہ رشتہ جڑ جائے۔ بے بے کی ناراضی اپنی موت آپ مر جائے گی مگر وہ تب بھی رضا مند نہ ہوئیں کہ جانتی تھیں میری زندگی بھر کا سوال ہے۔"

"پھر آخر وہ رضا مند ہوئیں کیسے؟" مراد نے اس بار ذرا کی ذرا اکتاہٹ سے پوچھا، اسے کسی بھی لو اسٹوری میں خواہ مخواہ بن جانے والے ولن یوں بھی خاصے زہر لگتے تھے۔

"تم چوہدری صاحب کو جانتے نہیں ہو نا بیٹا جی!" مہر النساء معنی خیزی سے مسکرائیں۔ "اس لیے یہ غیر ضروری سوال کر رہے ہو۔"

"اوہ، آئی سی۔ اس وقت کی ساری صورت حال سمجھ کر مراد کے رگ وپے میں سنسنی سی دوڑ گئی (ہائے کاش! اس وقت میں بھی وہاں موجود ہوتا)۔

"یعنی انکل نے آپ کے گھر جا کر پھڈا ڈال دیا کہ "ایہہ او کڑی لینی اے" اس کی باچھیں چر کر کانوں سے بھی باہر جانکلیں۔

"شریر کہیں کے۔" مہر النساء جھینپ سی گئیں پھر قدرے سنجیدہ جون میں واپس آتی ہوئی بولیں۔

"خیر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا جیسا کہ تم سوچ رہے ہو ہاں مگر یہ اپنی ضد چھوڑنے کو تیار نہیں تھے، کچھ خالہ جان کو یہ تسلی بھی تھی کہ لڑکا قابل بھروسا، محنتی، شریف اور خاندانی ہے۔ اس لیے بالآخر وہ مان ہی گئیں، اسی وقت سب ہی کا یہ ہی خیال تھا کہ اگرچہ چند روز لگیں گے لیکن بالآخر بے بے مجھے قبول کر ہی لیں گی لیکن گزرتے وقت نے ہم سبھی کو یکسر غلط ثابت کر دیا۔" انہوں نے تاسف سے اپنے لب بھینچ لیے۔

"اچھا...... کیا مطلب؟" مراد نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"ہماری شادی کے بعد جلد ہی چوہدری صاحب اپنی جلد بازی پر پچھتانے لگے۔" مہر النساء سپاٹ لہجے میں مزید بتانے لگیں۔ "کبھی کبھار بہت زیادہ رنجیدہ ہو کر خود کو لعنت ملامت بھی کرنے لگتے

مگر یہ ہونا تھا ہو چکا تھا اور اب بے بے سے معافی مانگنے کے علاوہ کیا راستہ باقی تھا؟ اسی لیے یہ بار بار اپنے پنڈ، اپنی بے بے سے معافی مانگنے کی خاطر جاتے رہے مگر......"

"مگر انہوں نے کبھی معاف نہیں کیا...... ہے نا؟" مراد نے تیزی سے ان کی بات اچک کر لقمہ دیا۔

"ایک سات یا آٹھ برس کا تھا۔" مہر النساء نے اپنی بات درمیان سے قطع کیے جانے پر اسے سرزنش کی۔ نہ ہی اس کی بات پر تبصرہ بلکہ کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں یک لحظہ توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوگئیں "کہ ایک روز انہیں عبدالسلام کی کال موصول ہوئی کہ بے بے کی حالت بہت نازک ہے ان سے آ کر مل جاؤ۔"

وہ کچھ روز سے مستقل بیمار تھیں مگر انہوں نے سب کو سختی سے چوہدری صاحب کو اپنی حالت کی اطلاع دینے سے منع کر رکھا تھا لیکن ان کی بتدریج بگڑتی حالت کے پیش نظر اس بھلے انسان سے رہا نہیں گیا اور اس نے انہیں فون کر دیا۔ یہ نجانے کیا سوچ کر ایک کو ساتھ لیتے ہوئے افتاں و خیزاں وہاں پہنچے۔ بے بے واقعی بستر مرگ پر تھیں اور شاید ان ہی کی منتظر تھیں۔" مہر النساء کی آنکھیں وہ وقت یاد کر کے بھر آئیں' مراد نے اپنے ہونٹ "او" کے سے انداز میں گول کر لیے۔

"چوہدری صاحب نے اس مرتبہ معافی کا کوئی لفظ بھی اپنے منہ سے نکالے بغیر بس خاموشی سے چھ سالہ ایک کو ان کی نظروں کے سامنے جا کھڑا کیا اور اس جذباتی لمحے کے زیر اثر آ کر بالآخر بے بے کا دل پسیج ہی گیا۔ کچھ اپنی زندگی کی بجھتی لو کا خیال بھی رہا ہوگا بہرکیف جو بھی تھا، ہمیں اس روز ایک کے طفیل معافی مل ہی گئی۔" مہر النساء یہاں تک کی کتھا سنا کر تھکے تھکے سے انداز میں خاموش ہوگئیں۔

"کسی بھی وجہ سے ہی۔" مراد نے کہا۔ "معافی تو انکل کو مل ہی گئی تھی نا...... تب پھر انکل کو اب کیا پرابلم ہے؟" وہ جواب طلب نگاہوں سے ان کا کسی گہری سوچ میں ڈوبا چہرہ دیکھنے لگا۔

"بیٹے!" مہر النساء سنجیدگی سے لب کشا ہوئیں۔ "مسئلہ تمہارے انکل کا نہیں، اس وعدے کا ہے جو ان کی بے بے اپنی "تاویتری" کے ساتھ ایک کے گلے میں باندھ گئی تھیں اور آج میں نے دراصل تمہیں اسی سلسلے میں یہاں بطور خاص بلوایا ہے۔ بولو بیٹے! کیا تم اس مرحلے کو آسان بنانے کے لیے میرا ساتھ دو گے؟" وہ بہت پر امید نگاہوں سے اسے دیکھتی ہوئیں قدرے التجائیہ انداز میں بولیں تو اب تک بہت مطمئن انداز میں ان کی داستان یہاں تک سنتے آئے مراد نے اس بار مہر النساء کے لہجے کی گمبھیرتا پر خود کو واقعتاً بے چینی محسوس کرتے ہوئے بے ساختہ پوچھا۔

"وعدہ...... کیسا وعدہ؟" وہ بہت الجھ کر انہیں دیکھ رہا تھا اور اس کے اس سوال پر ایک لمبی ٹھنڈی ٹھار سانس لے کر اس بار مہر النساء نے بہت مدھم لہجے میں اسے جو کچھ بھی بتایا وہ سب سن کر حقیقتاً اس کے ہوش اڑ گئے۔

☆......❁......☆

"تم بھی لو نا ایک! تکلف کیوں کر رہے ہو؟" مراد نے اپنے ساتھ میز پر رکھے ہوئے کلب سینڈوچز سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے میز کی دوسری جانب سینے پر دونوں ہاتھ باندھے، سنجیدہ و ناراضی لیے بیٹھے ایک کو فراخ دلی سے اپنا ساتھ دینے کے لیے مدعو کیا۔

"ظاہر ہے پیسے مجھے دینے ہیں؟ میں تو کھا ہی لوں گا۔" جواباً سینڈوچ کھانے کے بجائے کھا جانے والی نظروں سے مراد کے بے فکر مسکراتے چہرے کو دیکھ کر خاصے جارحانہ لہجے میں ایک گویا ہوا۔

"تم مجھے وہ بات بتاؤ، جو کرنے کے لیے تم نے آج مجھے بطور خاص یہاں بلوایا ہے۔" دراصل مہر النساء کی زبانی ساری روداد سننے کے بعد مراد وحید جو نہ صرف ایک کے بچپن کا دوست بلکہ مزاج آشنا ہونے کے علاوہ بہت سے معاملات کا رازدار و مددگار و غم خوار وغیرہ وغیرہ بھی تھا، خاصی غرق ریزی سے اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ایک کے پاس اپنے والد کی

بات مان لینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں اور نہ ہی خود اس کے پاس، اسے قائل کر لینے کے سوا کوئی چارہ ہے لہٰذا آج اس نے وہی "چارا" اس ضدی اڑیل گھوڑے کے سامنے ڈالنے کے لیے سہانی شام کے اس ڈھلتے پہر میں اس کے پسندیدہ پرتعیش و دیدہ زیب کیفے میں اسے ملنے کے لیے بلایا تھا۔

"آہم...... آہم۔" وہ سینڈوچ نگلنے کے بعد ٹشو سے ہونٹ تھپتھپاتے ہوئے دھیرے سے کھنکارا اور ایک کے بگڑے زاویوں والے خاصے خوبرو چہرے کی جانب دیکھنے سے دانستہ گریز کرتے ہوئے لب کشا ہوا۔

"دیکھو میرے پیارے، نئے نویلے کاپی مارقسم کے ڈیزائنر دوست!"

"یہ کاپی مار ڈیزائنر کسے کہا ہے تم نے ہاں؟" سلگ تو وہ پہلے ہی رہا تھا اس نازیبا القاب پر تو پورا بھڑک ہی اٹھا۔

"اوہ آئم سو سوری یار!" وہ تو بات بنانے آیا تھا مگر یہاں تو معاملہ الٹا بگڑتا دکھائی دے رہا تھا اس لیے جلدی سے بوکھلا کر وضاحتی لہجے میں بولا۔

"جانتے ہو نا مجھے کہ بس کتنا جولی ہوں، بس ذرا تم سے مذاق کر رہا تھا مگر تم دل پر مت لو، ارے میں تو کہتا ہوں کہ تم جیسا پیدائشی ماہر ڈیزائنر اس روئے زمین پر تو کیا ساتوں آسمان پر بھی نہ ملے گا۔"

"تم جولی ہی نہیں۔" ایک نے اس کی لن ترانی پر دانت پیستے ہوئے کہا۔ "بچپن ہی سے انتہائی دروغ گو اور رذیل واقع ہوئے ہو۔"

"شکریہ!" مراد نے انکساری سے مسکراتے ہوئے سر کو ذرا سا خم کیا۔ "میں جانتا تھا کہ تم میرے بارے میں کبھی غلط سوچ ہی نہیں سکتے۔"

"ان دونوں الفاظ کا مطلب سلیس اردو میں "جھوٹا اور کمینہ" ہوتا ہے۔" ایک نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"تو پہلے مشکل الفاظ استعمال کر کے مجھے خوش فہمی میں کیوں ڈالا؟" وہ روہانسا سا ہو کر شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم تو ٹھہرے سدا کے بے کار انسان...... مگر میرا وقت بہت قیمتی ہے مراد۔" ایک اپنے بیش قیمت آئی فون میں وقت دیکھ کر جھنجلاتے ہوئے بولا۔ "اسے برباد مت کرو، کوئی کام کی بات ہے تو کرو ورنہ میں چلتا ہوں۔ یوں بھی پیک آور شروع ہونے والا ہے اور مجھے اس وقت یقیناً اپنی آؤٹ سیٹ پر ہونا چاہیے، تمہارے جیسے سدا کے فارغ انسان کے ساتھ نہیں۔" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا تو اس بار مراد واقعی سنجیدہ سا ہو گیا۔

"دیکھو یار!" اس نے نپے تلے لہجے میں کہا۔ "پرسوں مجھے آنٹی نے گھر بلا کر تجھے تیری بچپن کی منگ محترمہ انجمن صاحبہ سے بہ خوشی شادی پر رضامند کرنے کا انتہائی خطرناک ٹاسک سونپا ہے۔"

"اوہ۔" اور ایک کو شاید ایسی ہی کسی بات کی واثق امید تھی تب ہی چونکے بنا تلخی سے مسکرایا۔ "تو وہ اب تمہارے ذریعے مجھ پر دباؤ ڈلوائیں گے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے یار!" مراد نے وضاحتی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تمہارے والدین ہیں ان کا حق ہے تم پر اور پھر انکل اور آنٹی جیسے والدین جنہوں نے بچپن سے لے کر آج تک تمہاری ہر خواہش منہ سے نکلتے ساتھ ہی پوری کرنا اپنا فرض سمجھا ہے...... کیا تم اس محبت کا احساس کر کے ان کی بات نہیں رکھ سکتے؟"

"ان کا مجھ پر حق اور محبت کا احساس اپنی جگہ۔" ایک بے طرح چڑ کر بولا۔ "لیکن کیا تجھے ذرا بھی اندازہ ہے کہ وہ مجھ سے کس قسم کی ڈیمانڈ کر رہے ہیں؟ ہاں تو نے ٹھیک کہا انہوں نے بچپن سے لے کر آج تک میری ہر خواہش پوری کی تو کیا وہ اس محبت کا تاوان ایسی صورت میں لیں گے مجھ سے؟" وہ تو پھٹ ہی پڑا۔

"بات تو تیری بھی ٹھیک ہی ہے۔" مراد نے ازحد تاسف سے سر ہلایا۔

"ہاں تو اور کیا۔" مراد کی تائید پر وہ مزید

جذباتی اور غصیل مگر دکھ سے چُور چُور آواز میں بولا۔

"یعنی کہ میں...... زمانے سے ہم آہنگ، اعلا تعلیم یافتہ...... مستقبل قریب کا نامور ڈیزائنر ایک چوہدری...... ساری چیزوں کو پس پشت ڈال کر صرف اپنی ڈیڈ کا اپنی والدہ سے کیا گیا وہ اسٹوپڈ سا وعدہ نبھانے کی خاطر اس دور دراز کے پنڈ جاکران کی بھتیجی اس بارہ من کی دھوبن شدید پینڈو قسم کی لڑکی انجمن سے بیاہ رچا کر اسے یہاں لاکر اپنے سر پر بٹھالوں، بس ان کا وعدہ پورا ہوجائے بھلے سے میری زندگی ادھوری ہی کیوں نہ رہ جائے۔"

"وہ...... انجمن...... ایسی ہے؟" مراد تو یہ سن کر قریب المرگ ہوگیا۔ "مگر تو نے کہاں دیکھ لیا اسے؟"

"تجھے یاد نہیں، آج سے چار پانچ سال پہلے جب ہمارے انٹرمیڈیٹ کے امتحانات ہورہے تھے تب مام اور ڈیڈ چچا کے انتقال پر پنڈ گئے تھے مجھے تمہاری طرف چھوڑ کر...... وہیں کسی موقع پر لی ہوگی مام نے اس کی پک۔ وہ دیکھی تھی میں نے ان کے سیل میں۔" وہ منہ بگاڑ کر کڑوے اور ناک تک بے زار لہجے میں بولا۔

"اوہ نو۔" مراد افسوس آمیز بے یقینی سے بولا۔

"پھر تو بہت ہی بے جوڑ رشتہ ہے یہ انکل کو سوچنا تو چاہیے۔" اس نے نظر بھر کر اپنے سامنے شدید تفکرات میں گھرے بیٹھے ایبک کو دیکھا، سفید و سیاہ دھاری دار موری بند پینٹ، سفید بے داغ شوز، چست کالی آدھی آستین والی ٹی شرٹ سے جھانکتے کسرتی بازو، کلائی میں پڑا اس کی اپنے برانڈ کا سلور بینڈ، فوجی ہیئر کٹ اور خوبرو چہرے پر سجی فرنچ، گہری ذہین آنکھوں پر سجا موٹے فریم والا عینک اور اس کے وجود سے اٹھتی بھینی بھینی خوشبو جو اس کے نفیس مزاج کا پتا دے رہی تھی اور اس کے ساتھ بیٹھی وہ......

تیل چپڑے بالوں میں لال پراندہ جھلاتی، ہرے، پیلے نیلے لاچے کرتے میں اٹھلاتی، لال ہونٹوں اور سفید یا اللہ جانے پیلے دانتوں کو دکھا کر شرمیلے انداز سے مسکراتی...... اس کی متوقع نصف بہتر، یا نصف بدتر۔

"لاحول ولا قوۃ...... استغفر اللہ!" بس کوئی لمحاتی سا تصور ابھرا تھا مراد کے ذہن میں، جھرجھری لے کر جیسے جھٹکتے ہوئے وہ بڑی ترحم آمیز نگاہوں سے ہنوز متفکر بیٹھے ایبک کو دیکھنے لگا۔

"یہ مسئلہ تو میری سوچ سے زیادہ گمبھیر ہے یار!" اس نے افسوس آمیز لہجے میں کہا۔

"دراصل کہنے کی ضرورت مجھے نہیں ڈیڈ کو ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ اتنی آسانی سے تو ہرگز نہیں سمجھیں گے۔"

"ہاں! یہ تو ہے۔" مراد نے ایک بار پھر جلدی سے اس کی تائید کی۔

"کیا تو صرف میری ہاں میں ہاں ملانے کے لیے یہاں بیٹھا ہے؟" ایبک نے دانت پیسے۔

"نہیں تو اور میں کیا کروں؟ خود جاکر اس انجمن سے بیاہ رچالوں؟ یا پھر کراچی کے مشہور زمانہ "نامعلوم افراد" وہاں بھیج کر اس کی ٹارگٹ کلنگ کرواکر تجھے شادی سے پہلے بیوہ کروادوں؟" وہ بھی بھنا کر بولا۔

"اوہ گاڈ!" ایبک نے اپنے مخصوص انداز میں ٹھنڈی سانس بھر کر خدا کو یاد کیا۔

"مرد بیوہ نہیں رنڈوا ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہوگا...... میں کیا کروں۔" اس نے لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچایا۔

"مشکل وقت میں دوست ہی دوست کے کام آتا ہے، کیا تم مجھے اس مشکل سے نکالنے کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتے؟" اس نے بجائے منت کرنے کے اپنے ابرو تیکھے کرکے رعب جمایا۔

ٹھیک ہے سوچتے ہیں کچھ فی الحال بل ادا کرکے میری جان چھوڑو اور اپنی درزی کی دکان پر جاکر بیٹھ اور ہاں جانے سے پہلے میرے لیے ایک کپ گرما گرم کافی کا اور منگوادو۔ تمہارے تو دکھڑے سن سن کر میرا دماغ ہی پلپلا ہوکر رہ گیا ہے بھائی!" وہ برے برے منہ بناتا ہوا، دوسری جانب دیکھنے لگا۔

"ایبک اس کی نیم رضا مندی پر زیر لب مسکرادیا اور قدرے مطمئن سا ہوکر ویٹر کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا کہ جانتا تھا اس کے دماغ کی جگہ ایک ایسا جادوئی آلہ فٹ ہے جو ہر "مسئلے" کا حل چٹکیوں میں نکالنے کی بڑی بھرپور صلاحیت سے مالا مال ہے۔

☆......❁......☆

اور پھر دو دو چار روز اس گمبھیر مسئلے پر ہر زاویے سے اچھی طرح غور و خوض کرنے کے بعد مراد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ پنڈ جائے بغیر اس کے اس مسئلے کا حل ہونا ممکن ہی نہیں اور جب اس نے یہ ہی بات ایبک سے کی تو وہ ہتھے ہی سے اکھڑ گیا۔

"اتنے دن ٹائم ویسٹ کرنے کے بعد تُو نے یہ حل نکالا ہے میرے مسئلے کا؟" وہ سارے "مینرز" اور "اسٹائل" کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دانت پیس کر غرایا۔

"دیکھ!" مرادن ے ٹھنڈی سانس لے کر کہنا شروع کیا۔ "انکل یہ رشتہ کروانے کے لیے جس قدر جذباتی اور پرعزم دکھائی دے رہے ہیں ان سے کچھ بھی بعید نہیں، ہوسکتا ہے وہ تجھے اغوا کرواکر پنڈ لے جائیں اور گن پوائنٹ پر اس انجمن سے تیرا نکاح پڑھوا کر دم لیں۔"

"اس میں کون سی نئی بات ہے۔" ایبک منہ بنا کر بولا۔ "یہ تو میں جانتا ہوں۔"

"آگے تو سن لے مافوق الفطرت انسان!" وہ ٹوکے جانے پر سخت بے مزا ہوا۔

"یہ خواہ مخواہ مافوق الفطرت کس لیے بولا ہے تُو نے مجھے؟" ایبک چیخا۔

"خدا کی قسم!" مراد بے ساختہ گڑبڑا گیا۔ "اگر یہ کوئی گالی ہے تو اس کے لیے سوری دراصل کل میں "ٹارزن اور مصری لاشیں" نامی پانچ روپے والا ایک ناول پڑھ رہا تھا یہ لفظ اسی میں کہیں لکھا تھا...... اچھا لگا تو تجھے بول دیا۔"

"تُو نہیں سدھرے گا۔" اس کی وضاحت پر ایبک پریشانی کے باوجود مسکرادیا کہ اس کی "اردو دانی" سے اچھی طرح واقف تھا۔ "چل آگے بتا۔"

"ہاں تو پیارے۔" مراد نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "اب جو میں تجھے کہنے جارہا ہوں یہ تُو غور سے سن...... اور میری ذہانت کی داد دے۔"

☆......❁......☆

"جیتے رہو بچے!" مہر النساء نے فرط انبساط سے مراد کی روشن پیشانی چوم کر بے ساختہ اسے دل سے دعا دی۔

"تم نہیں جانتے کہ تم نے ایبک کو گاؤں جانے پر رضا مند کرکے میری کتنی بڑی پریشانی دور کردی ہے۔" وہ مطمئن سے لہجے میں کہہ کر سرشاری سے سامنے والے صوفے پر براجمان ہوگئیں اور بھلا کیوں نہ مطمئن اور شاد ہوتیں؟ اتنے دن سے گھر بھر پر چھائے تفکر کا خاتمہ جو بالخیر ہوگیا تھا اس مراد کے ہاتھوں۔ وہ دراصل آج ہی مژدہ جاں فزا انہیں بطور خاص سنانے کی خاطر یہاں آیا بیٹھا تھا۔

ایبک اس وقت اپنی آؤٹ لیٹ جب کہ چوہدری صاحب اپنی "دکان" پر ہوتے تھے۔

"لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" اس نے چہرہ پر سوچ بناتے ہوئے مزید کہا۔ "ایبک کی شادی تو آپ لوگوں نے ہر حال میں وہیں کرنی ہے تب پھر اسے ابھی سے اس طرح وہاں بھجوانے کا کیا مقصد ہے؟"

"دیکھو بیٹا!" مہر النساء کا مسکراتا چہرہ یہ بات سن کر کچھ پھیکا سا پڑ گیا۔ "اس رشتے کو ہر حال میں جوڑنے کے پیچھے چھپی وجہ میں تمہیں تفصیلاً بتا چکی ہوں لیکن ساتھ ہی مجھے اپنے بچے کے جذبات و احساسات کا بھی خیال تو ہے اور تجھے ہی کیا خیال تو خیر چوہدری صاحب کو بھی ہے۔"

"تبھی انکل یہ بے جوڑ رشتہ زبردستی جوڑنے پر بضد ہیں۔" وہ ناچاہتے ہوئے بھی طنز کر گیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" مہر النساء نے برا مانتے ہوئے کہا۔ "انجمن بیٹی واقعی بہت خوب صورت اور

گنوں والی ہے۔اس کا جوڑ سجتا ہے میرے ایبک کے ساتھ، سچ پوچھو تو اس سے پہلی بار ملنے سے پہلے تک میرے دل میں بھی اس رشتے کے حوالے سے ہزار ہا خدشات تھے اور میں جبری رشتے کو ایبک کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہی سمجھتی رہی تھی ہمیشہ اور شاید اسی لیے میں نے ایبک کے سامنے بطور خاص کبھی اس بات کا تذکرہ بھی نہیں کیا تھا۔ میرے ذہن میں یہی تھا کہ وقت آنے پر دیکھی جائے گی مگر تم یقین مانو بیٹا! اس من موہنی لڑکی سے ملنے کے بعد تو مجھے یوں لگا گویا اسے بنایا ہی میرے ایبک کے لیے گیا ہو۔ میرے دل سے ہر قسم کی فکر بھاپ بن کر اڑ گئی۔'' وہ خوشی سے بتائے گئیں۔

''یعنی کہ آپ کا ووٹ سو فیصد اس کے حق میں ہے...... ہوں۔'' مراد نے سوچتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''میرا ہی کیا......'' وہ تیقین سے بولیں۔ ''اس سے ایک بار ایبک کو مل تو لینے دو تم دیکھنا ان شاء اللہ ایبک کا فیصلہ بھی اسی کے حق میں ہوگا۔ بس کل پرسوں تک یہاں سے روانہ ہونے کی تیاری کرو......اوہو!'' انہیں بولتے بولتے اچانک خیال آیا۔ ''دیکھو تم سے باتوں میں لگ کر میں بھول ہی گئی......تم چائے پیو گے یا کوئی جوس لے آؤں؟''

''کھانا!'' مراد بے ساختہ اترے منہ کے ساتھ بولا۔ ''دراصل صبح کا ناشتا کیا ہوا ہے صرف۔''

''اوہو۔'' مہر النساء یک دم اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے بولیں۔ ''تو پہلے بتا دیتے نا خواہ مخواہ اتنی دیر سے یوں ہی بیٹھے ہو۔ میں بس ابھی تمہارے لیے کھانا لے کر آتی ہوں تب تک تم آرام سے بیٹھو۔'' وہ کہہ کر باورچی خانے کی جانب بڑھ گئیں اور مراد نے نڈھال سا ہو کر صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ پتا نہیں وہ لوگ جو کرنے جا رہے تھے وہ صحیح بھی تھا یا نہیں......اور نجانے اس حماقت کا نتیجہ کیا نکلنا تھا؟

☆......❁......☆

''او نیڑے آ......آ......آ، ظالماوے...... میں مر گئی آں......آں......آں۔'' کھچاڑا (ٹوٹی پھوٹی' خستہ حال) سی بس کا پھٹا ہوا اسپیکر ضرورت سے کہیں زیادہ بلند آواز سے بج کر ایبک کی سماعت کا امتحان لینے پر مصر تھا۔

''وہاٹ دا ہیل از دس......'' اس نے اٹھا کر شعلہ بار نگاہوں سے اپنے عین سر پر ''سر بکھیرتے'' بھونپو کو دیکھ کر غراتے ہوئے کہا۔

''یہ......؟'' اس کے ٹھیک برابر میں بیٹھے رف سی نیلی جینز اور آرام دہ سی ٹی شرٹ میں ملبوس، نیلی پی کیپ سر پر الٹی ٹکائے مراد نے ایبک کی خون آشام نگاہوں کی تقلید کرنے کے بعد بڑی حیرت سے چیونگم چباتے ہوئے اس کے استفسار کا جواب عنایت فرمایا۔ ''اسے اسپیکر کہتے ہیں یارا! کیا تجھے نہیں معلوم؟''

''میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔'' ایبک نے بے بسی سے اپنی کنپٹی پر ہاتھ رکھ کر دہائی دیتے ہوئے کہا۔ ''خدا کا واسطہ ہے تجھے، اسے کسی طرح بند کروا دے۔'' اسکن کلر کی ڈھیلی سی پینٹ، کالی شرٹ پر کمانڈو جیکٹ اور سر پر اسٹائل سے باندھا گیا چیتا پرنٹ کا رومال اور خوبرو چہرے پر سجے نخوت زدہ سے بےزار تاثرات......

''تم جڑاں والا کی حدود میں داخل ہو چکے ہو نادان لڑکے۔'' مراد نے منہ بنا کر اسے جھڑکا۔ ''اب تو اپنی یہ برگر حرکتیں بند کر دو۔''

''تُو یہ بکواس بند کروا۔'' وہ تحکمانہ انداز میں دہاڑا۔

''آخر تجھ سے دوسروں کی خوشی برداشت کیوں نہیں ہوتی؟''

''یہ بے ہودہ گانا سن کر کون خوش ہو سکتا ہے؟'' ایبک نے دانت کچکچائے۔

''یہ دیکھو۔'' مراد نے اپنی بتیسی باہر نکال کر انگشت شہادت سے اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں......میں خوش ہو رہا ہوں یہ ''ہاٹ سونگ'' سن کر۔''

''تُو تو ہے ہی بدذوق۔'' ایبک پھاڑ کھانے کو دوڑا اور کیوں نہ دوڑتا...... طے یہ پایا تھا کہ وہ لوگ فیصل آباد ہوائی اڈے پر اتریں گے جہاں چاچی صغراں کے بہنوئی بھا الیاس اپنی گاڑی سمیت ان کا استقبال کرنے کو تیار کھڑے ہوں گے مگر شومئی قسمت سے ہوا کچھ یوں کہ ہوائی اڈے پہنچنے سے قبل ہی بھا الیاس کی گاڑی بیچ راستے میں دغا دے گئی جب کہ دوسری جانب ان کا ''لوکل طیارہ'' قرب قیامت کی نشانیوں میں سے کسی ایک کو پورا کرتے ہوئے بالکل ٹھیک وقت پر فیصل آباد رن وے پر آ گیا۔ وہ دونوں باہر آئے، حسب توقع اپنے استقبال کے لیے کسی کو نہ پا کر بھا الیاس کو فون کھڑکایا تو یہ روح فرسا خبر سننے کو ملی۔ بھا الیاس نے کہا بھی کہ وہ کچھ دیر وہیں انتظار کریں، وہ اپنی سفید سوزوکی کی مرمت کروا کر بس انہیں لینے آ ہی رہے ہیں مگر اتنی دیر میں ایبک کا نازک مزاج برہم ہو ہی چکا تھا اس لیے اس نے بھا الیاس کو انتظار کرنے سے صاف انکار کرتے ہوئے از خود وہاں پہنچ جانے کا اعلان کر کے فون بند کر دیا۔ مراد نے اس کی ''تھم ٹھونکی'' آخر وہ اس گھر کا ہونے والا ''شہری داماد'' تھا بھئی اور پھر یہی سب کچھ کرنے کی خاطر تو یہاں آیا تھا تو پھر اچھا ہی ہوا نا کہ یہاں پہنچتے ساتھ ہی قدرت نے ایک نادر موقع اسے فراہم کر دیا بہر حال......

وہ دونوں مختلف لوگوں سے پوچھ پاچھ کر بس اڈے تک پہنچے، اب یہ الگ بات کہ لاری اڈے تک پہنچتے پہنچتے ان دونوں......بالخصوص ایبک کی حالت خاصی دگرگوں ہو چکی تھی۔ گرمی، بھوک سفر کی تھکان سے برا حال تھا، اوپر سے جس بس میں انہیں سیٹ دستیاب ہوئی اس کا حال حکومت پاکستان سے بس تھوڑا ہی بہتر تھا ایسے میں اگر اس شاہانہ مزاج نکمے چوہدری کے ضبط کا پیمانہ لبریز نہ ہوتا تو پھر اور کیا ہوتا؟

''ہاں...... بدذوق ہوں تب ہی تو تجھ جیسے سڑیل انسان کو دوست بنا رکھا ہے۔'' مراد ترخ کر ترنت بولا۔

''کیا کہا؟'' ایبک اس کا جواب سن کر تلملا اٹھا مگر وہاں کسے پروا تھی۔ مراد اس کے تلملانے کی قطعاً پروا کیے بغیر شیشے سے ازلی محروم بھاڑ جیسی بغیر کھڑکی سے باہر وقفے وقفے سے چھب دکھلاتی ہریالی کو دیکھنے لگا۔

شام اب ڈھل رہی تھی اور ان کی منزل قریب ہی تھی اور کون جانے آنے والا کل انہیں زندگی کے کس نئے رنگ سے روشناس کروانے والا تھا؟

☆......❁......☆

''نہ......اس مسخرے مراد کو ایبک کے ساتھ وہاں بھیجنے کی کیا تک تھی بھلا؟'' چوہدری صاب اپنے من پسند حلیے میں، آرام دہ کرسی پر جھولتے ہوئے ڈیک پر عارف لوہار کے گانے سننے میں منہمک تھے، مہر النساء دھلے ہوئے کپڑے الماری میں رکھنے کے لیے اندر آئیں تو انہیں دیکھ کر نجانے کیا سوچتے ہوئے سوال کر ڈالا۔

''اوہو بھی......'' مہر النساء نے کپڑے احتیاط سے الماری میں رکھ کر الماری بند کی اور ساتھ ہی حلق پھاڑتا ڈیک بھی...... اور ان کے سامنے بستر پر آ بیٹھیں۔

''سمجھا کریں نا، پہلی بار جا رہا تھا وہ...... ذرا جھجک سی محسوس ہو رہی تھی اسے، اچھا ہے نا، مراد کی موجودگی سے اسے ڈھارس رہے گی۔'' وہ ملائمت سے بولیں۔

''چھیل چھبیلی زنانیوں کے ناپ لینے پر تو تیرا بیٹا کبھی شرمایا نہیں۔'' وہ طنزیہ بولے۔ ''اپنے چاچے کے گھر جاتے اسے بڑی شرم آ رہی ہے بلے بئی۔''

''آپ بھی نا ایک بات کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں قسم سے۔'' مہر النساء غصیل آمیز ناگواری سے بولیں۔ ''حالانکہ وہ آپ کو کتنی بار وضاحت دے چکا ہے اس بات کی کہ کسٹمرز سے ایسی ڈیلنگ......وہ نہیں اس کی ہیلپر زوبی کرتی ہے مگر بس آپ تو آپ ہیں، کبھی نہیں مانیں گے اور جہاں تک سوال ہے اس کے چاچے کے گھر کی......اب وہ اس کے چاچے کا گھر نہیں اس کا ہونے والا سسرال ہے اور وہاں جانے پر اس کا جھجکنا فطری ہے۔''

''اچھا چل...... ناراض نہ ہو۔'' وہ ان کی

ناراضی پر ان کا موڈ بدلنے کی خاطر بولے۔ ”ویسے ماننا پڑے گا تجھے...... کہاں تو وہ اڑیل ٹٹو سرے سے وہاں جانے ہی سے انکاری تھا پھر تُو نے ایسا کون سا منتر پڑھ کر پھونکا اس پر کہ وہ دنوں ہی میں نہ صرف وہاں جانے پر بلکہ انجو بیٹی سے شادی پر بھی خوشی خوشی رضا مند ہوگیا؟“ چوہدری صاحب کے سراہتے جملوں پر مہر النساء کے ماتھے کی شکنیں کچھ کم ہوئیں۔

”ماں ہوں نا۔“ وہ گمبھیرتا سے بولیں۔ ”محبت سے سمجھایا تو بس مان گیا۔“ انہوں نے دانستہ اس مراد نامی مسخرے کو درمیان میں ڈالنے والی بات گول کردی کہ چوہدری صاحب سے بعید نہیں، وہ بات کو کہاں سے کہاں لے جائیں۔

”اور اس کے آسانی سے راضی ہوجانے پر تو مجھے حیرانی ہے۔ تیرا بیٹا اتنا فرماں بردار تو نہیں لگتا۔“ وہ کہنے سے باز نہ رہ سکے۔

”ضروری نہیں کہ اگر آپ اپنی والدہ کے نافرمان تھے تو آپ کا بیٹا بھی ایسا ہی ثابت ہو۔“ مہر النساء جلبلا کر بول گئیں۔ ”آپ شک کی عینک اپنی آنکھوں سے ہٹا کر دیکھیں چوہدری صاحب! آپ کا بیٹا آج کے دور کا ہونے کے باوجود اتنا فرماں بردار تو بہر حال ہے ہی کہ آپ کی ضد پوری کرنے کی خاطر شہر کی ساری لڑکیاں چھوڑ کر پنڈ سے دلہن لینے گیا ہے اور آپ ہیں کہ اب بھی یہاں بیٹھے اس کی نیت پر شکوک و شبہات کا اظہار کررہے ہیں، حد ہوگئی۔“ وہ یقیناً ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بول گئی تھیں، جب خاموش ہوئیں تو چوہدری صاب کے افسردہ چہرے پر لرزاں ملال اور پچھتاوؤں کے سائے دیکھ کر اندازہ ہوا۔

”ٹھیک کہا تُو نے۔“ وہ دل گرفتی سے بولے۔ ”نافرمان...... نانہجار تو میں ہوں۔“

”چچ...... اوفوہ۔“ مہر النساء ان کے لہجے کی یاسیت پر جھنجلا سی گئیں۔ ”اب میرے کہنے کا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا۔“

”مطلب جو بھی تھا، بات تو تیری سولہ آنے ٹھیک ہے مہرو۔“ وہ اثبات میں سر ہلانے لگے۔ ”اور اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ کم از کم بے بے کی وہ آخری خواہش تو میں پوری کردوں نا۔“ ان کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

”ہاں ہاں...... میں جانتی ہوں۔“ مہر النساء نے ان کا ہاتھ تھام کر دل جوئی کرنے والے لہجے میں کہا۔ ”اور آپ فکر نہ کریں، بے بے کی آخری خواہش ان شاء اللہ ضرور پوری ہوگی۔ اب آپ مطمئن ہوجائیں، میں آپ کے لیے الائچی والی دودھ پتی اور چنے کا حلوہ لے کر آتی ہوں' ٹھیک ہے؟“ وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

”تُو بہت اچھی ہے مہرو!“ چوہدری صاحب نے نرمی سے ان کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر ان کا داہنا گال تھپتھپاتے ہوئے محبت سے لبریز، متشکر لہجے میں کہا۔ ”میں نے ہمیشہ تجھ پر فخر کیا ہے، بس دعا کر اپنی انجو بھی تیرے بیٹے کے لیے تیرے جیسی ہی ثابت ہو۔“ مہر النساء اس اظہار پر کچھ جھینپ سی گئیں۔

”اب جا، جا کر چائے لے کر آ...... حلوے کا بتا کر تو تُو نے میری نیت ہی خراب کردی ہے۔“



”ماں صدقے! جی آیا نوں میرا پتر۔“ خاصے خوب صورت نین نقش اور سادہ سے حلیے والی چاچی صغراں، ایبک اور مراد کے صحن میں داخل ہوتے ہی ان کے استقبال کو والہانہ آگے بڑھیں۔ انہیں پنڈ تک پہنچتے پہنچتے تقریباً مغرب ہوگئی تھی، بس تو انہیں اپنے مخصوص اڈے پر اتار کر آگے روانہ ہوگئی تھی۔ چہار اطراف بڑی تیزی سے پھیلتا اندھیرا اور قطعی اجنبی علاقہ، ناچار انہیں وہیں کھڑے ہوکر ایک مرتبہ پھر بھا الیاس کو مدد کے لیے پکارنا پڑا اور اس مرتبہ بھا الیاس لمحہ تاخیر کیے بنا فوراً ہی بوتل کے جن کی طرح، اپنی مرمت شدہ گاڑی سمیت انہیں لینے کے لیے حاضر ہوگئے کہ دوپہر سے وہ انہیں وقت پر لینے نہ پہنچ سکنے کے نتیجے میں اتنا کچھ سن چکے تھے کہ اب مزید کسی غلطی کی گنجائش نہ تھی۔ اس لیے ان دونوں کو بصد احترام و صحیح سلامت صغراں کے گھر کے قدرے پرانے مگر بڑے سارے لوہے کے کالے رنگ کے دروازے کے آگے اتارنے کے بعد خود آگے بڑھ گئے کہ ان دنوں خود ان کی بڑی بیٹی کوثر کی شادی کی تقریبات چل رہی تھیں اور خود ان کے گھر میں ہزار ہا کام ان کے منتظر تھے۔

”السلام علیکم چاچی!“ ایبک نے صغراں کے تاثرات کے برعکس خاصی سنجیدگی سے انہیں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام! آؤ...... آؤ اندر تو آؤ۔“ لیکن اس بے مروت قسم کے سلام کا جواب بھی اسے ماتھا چوم کر خاصی گرم جوشی سے دیا گیا۔ وہ خفیف سا ہوگیا پھر اس دوران خاموشی سے اردگرد کا جائزہ لیتے مراد کا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

”یہ مراد ہے، میرے بچپن کا دوست۔“ مراد نے اپنے تعارف پر چونک کر انہیں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام!“ صغراں نے بڑی ملائمت سے اس کے سلام کا جواب دیا اور مسکرا کر بولیں۔

”ہاں میں جانتی ہوں، بھرجائی مہرو نے فون پر بتادیا تھا کہ منڈا اکیلے آنے سے شرما رہا ہے۔“ مراد ان کی اس بات پر بلا ارادہ خواہ مخواہ ہنسنے لگا اور منڈا جو پہلے ہی یہ سن کر چیں بہ چیں تھا، اس مار آستین کے یوں دانت نکالنے پر پوری طرح بھنا گیا اور اپنا آگے بڑھاتا دایاں پیر پوری قوت سے مراد کے پاؤں پر رکھ کر دبادیا۔

”آ...... آ......“ اور ”ہر عمل“ کا فوری ”ردعمل“ تو مراد پر فرض تھا، بس اسی لیے بلا تاخیر حلق پھاڑ کر تکلیف کا اظہار بھی کرڈالا۔

”ربا خیر...... کیا ہوا؟“ ان کے آگے چلتیں صغراں نے دہل کر بے ساختہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔

”وہ...... کچھ نہیں چاچی جی! بس ذرا تھک گیا ہے یہ اس لیے اس سے اب اور چلا نہیں جارہا۔“ اور اس سے پہلے کہ مراد کچھ کہہ پاتا، ایبک ہی نے جلدی سے اس کے یوں چلانے کی توجیح دی۔

”ہاں پتر۔“ صغراں قدرے شرمندہ سی ہوگئیں۔ ”لینے تو بھا الیاس تم دونوں کو وقت سے ہی نکلے تھے مگر وچارے کی گاڑی منحوس راستے ہی میں خراب ہوگئی، بس اسی لیے تم لوگوں کو اتنی تکلیف اٹھانی پڑی اور پھر پہنچنے میں......“ اسی اثنا میں وہ لوگ یہ کشادہ، صاف ستھرا، سرخ اینٹوں والا صحن عبور کرکے برآمدے میں داخل ہوچکے تھے۔ دو چار قدم مزید چل کر صغراں برآمدے سے بائیں جانب مڑ کر ایک مقفل کمرے کا تالا کھولنے لگیں۔

”آپ کے گھر میں اور کوئی نہیں؟“ مراد ہی کی زبان میں کھجلی ہوئی۔

”خیر سے سب ہیں...... مگر اس وقت دوسرے محلے میں میری چھوٹی بہن کے گھر شگن کے گیت گانے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ اس کی بیٹی کوثر کی شادی ہے ناپرسوں...... اب تم دونوں ایسا کرو پہلے نہا دھو کر تازہ دم ہوجاؤ، پھر میں کھانا لگادوں گی۔“ وہ کمرے کا دروازہ وا کرکے اندر داخل ہوکر بتی جلاتی ہوئی بولیں۔ وہ دونوں بھی اندر داخل ہوگئے۔

خاصا کشادہ، صاف ستھرا، ہوادار اور نفاست سے آراستہ کمرہ تھا۔ ایبک کی نگاہوں سے بھی بے ساختہ ستائش جھلکی اور مراد تو خیر تھا ہی من موجی سا بندہ اسے بھلا کسی بات پر کیا اعتراض ہونا تھا۔

”کچھ چاہیے ہو تو پتر شرمانا مت...... تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔“ صغراں خوش خلقی سے بولیں۔

”دراصل میں گرم پانی سے نہانے کا عادی ہوں، مجھے شاور لینے کے لیے گرم پانی چاہیے۔“ ایبک نے کہا، مراد نے بے ساختہ تعجب سے اسے دیکھا۔

”اچھا۔“ صغراں نے مسکرا کر کہا۔ ”ویسے موسم اتنا سخت تو نہیں لیکن اگر تم عادی ہو تو تھوڑا رکو، میں گرم کرکے لے آتی ہوں تب تک آرام سے بیٹھو۔“ وہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

”ابے جھوٹے!“ ان کے باہر نکلتے ہی مراد نے اسے شرم دلانے والے لہجے میں کہا۔ ”تُو تو سردیوں میں بھی ٹھنڈے پانی سے نہاتا ہے پھر خواہ مخواہ انہیں پریشان کرنے کا مطلب؟“

”واہ رے بھلکڑ۔“ ایبک نے بیگ کندھے

ے اتار کر بستر پر پھینکتے ہوئے دانت پیسے۔ ''بھول گیا یہ تیرا ہی تو مشورہ تھا کہ یہاں پہنچتے ساتھ ہی ہر ہر بات پر ان لوگوں کو ناک تک پریشان کر دینا ہے۔''

''اوہ ہاں ......'' مراد کھسیا کر مسکرایا۔ ''میں واقعی بھول گیا تھا، دراصل تیری چاچی اتنی محبت دار عورت لگ رہی ہیں کہ سچ پوچھ تو مجھے تیرا انہیں یوں پریشان کچھ کرنا پسند نہیں آیا۔'' اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

''تو سیاست میں کیوں نہیں چلا جاتا؟'' ایبک نے اپنے شوز اتارتے ہوئے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تیرے اندر تو لوٹوں والے سارے اوصاف موجود ہیں' آل ریڈی۔''

''لے بھائی!'' مراد جوتوں سمیت بستر پر اوندھا گرتے ہوئے بولا۔ ''تیرے رشتے دار ہیں جب تجھے ہی ان کا کچھ خیال نہیں تو مجھے کا ہے کی فکر۔''

'ہاں تو فکر کر کے کیا کروں' اس جاہل، گنوار' اجڈ انجمن سے شادی ...... جب کہ تو جانتا ......'' وہ کلس کلس کر بہت کچھ بول رہا تھا مگر اس لمحے تھکے ہارے مراد کو اس کے بیان میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو اسی وقت صرف اور صرف ایک میٹھی، پرسکون سی نیند درکار تھی اس لیے اس نے اپنے کان پر رکھا تکیہ اور گہرے اطمینان سے آنکھیں موند لیں۔

☆......۞......☆

''ویر جی، سویر ہوگئی ہے جاگ جائیں ...... ماسی ناشتے پر بلا رہی ہے۔'' کوئی بڑی زور زور سے دروازہ، کنڈی کی مدد سے متواتر بجا رہا تھا۔ مراد تو غالباً بروز قیامت بے دار ہونے کا ارادہ لے کر سویا تھا البتہ ایبک کا ایسا کوئی پلان نہ تھا۔ اس لیے اس شور پر وہ دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے، مندی مندی آنکھوں سے چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے ذہن پر زور ڈال کر صورت حال سمجھنے کی کوشش کی، اسی اثنا میں دروازہ ایک مرتبہ پھر بجایا گیا۔

''ویر جی ......'' کوئی نسوانی آواز بند دروازے کے اس پار سے پھر ابھری۔

''ہم جاگ گئے ہیں، پلیز دروازہ بجانا بند کر دو، فریش ہو کر آ رہے ہیں۔'' اور مراد کو اٹھایا، دونوں فریش ہو کر باہر نکلے۔

☆......۞......☆

''رات تم لوگ واقعی تھکے ہوئے تھے؟'' صغراں نے ان کے تازہ دم ہو کر کمرے سے باہر صحن میں نکلتے ہی انہیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''جب تک میں نے تمہیں چائے بھجوائی، تم دونوں سو چکے تھے۔ اچھا ہوا، نیند تو پوری ہوگئی، آؤ ...... آؤ پہلے اندر بیٹھ کر ناشتا کر لو۔'' وہ انہیں اپنی معیت میں اس بڑے سارے ہال نما کمرے جو گھر کے عین وسط میں واقع تھا بٹھا کر تیزی سے واپس مڑ گئیں۔ گو کہ گھر گاؤں میں ہی تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اپنی ضرورت اور سہولت کے حساب سے بہت سی تبدیلیاں کر دی گئی تھیں اور ایبک جو کسی کچے سے گھاس پھونس سے بنے گاؤں کے روایتی سے گھر کا تصور لے کر یہاں آیا تھا یہ گھر بہر حال ویسا تھا نہیں۔

وہ دونوں فوم کے گدوں والے صوفے پر براجمان ہوگئے اور ایبک عادتاً اس کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ کمرے کی چھت بہت اونچی اور لینٹر کی تھی، دیواروں پر آسمانی رنگ پوتا گیا تھا، سامنے کی دیوار کے ساتھ لکڑی کا شوکیس سجا تھا جس میں کچھ چینی کے برتن وغیرہ اور مختلف ڈیکوریشن پیس سجے دکھائی دے رہے تھے۔ اونچے طاقچوں میں دھرے پیتل کے شمع دان' جھالر والے سفید پردے، دائیں ہاتھ کی دیوار کے ساتھ رکھی چارپائی اور اس پر ڈالی گئی سفید، رنگین دھاگوں والی چادر اور اس پر سجے لال مخملیں گاؤ تکیے۔

''یقیناً یہ کمرہ اس گھر میں بطور ڈرائنگ روم استعمال کیا جاتا ہے۔'' وہ سوچنے لگا اور ابھی اس کا جائزہ مکمل نہ ہوا تھا کہ صغراں کی چہکتی آواز پر وہ چونک پڑا۔

''ایبک پتر!'' اس نے دیکھا، ان کے ہمراہ ایک سن رسید مگر مضبوط ہاتھ پیر والی خاتون جو کالے

جیب والے کرتے پاجامے میں ملبوس، سر پر سفید دوپٹا منڈھے ہوئے تھیں، کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

''ان سے ملو ......'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑا نمکین لسی کا جگ اور گلاس ان کے سامنے موجود لکڑی کی چھوٹی سی پرانی میز پر دھرتے ہوئے بتایا۔ ''یہ بے بو ہیں۔'' اور خود بھی چارپائی پر ان خاتون کے برابر جا کر براجمان ہوگئیں۔

''بے بو ...... کون میں پہچانا نہیں؟'' ایبک نے ذرا مدھم سے لہجے میں شرمندگی سے اعتراف کیا جب کہ اس کے ساتھ بیٹھا مراد تو جیسے کسی گہرے صدمے کے زیر اثر آ گیا تھا۔

''اگر یہ بے بو ہیں تب تو کرینہ کو چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر جانا چاہیے۔'' وہ زیر لب بدبدایا۔ اس کی بھنبھناہٹ پر ایبک نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''ارے ہاں۔'' صغراں نے اپنے ماتھے پر ہلکے سے ہاتھ مارا۔ ''تم یہاں دوبارہ کبھی آئے بھی تو نہیں تو پھر کیسے پہچانو گے؟ پتر ...... یہ میری ماں اور تمہاری دادی کی چھوٹی بہن ہیں، اس رشتے سے تمہاری بھی دادی ہی ہوئیں۔ تمہارے چاچا کے دنیا چھوڑ جانے کے بعد میرے اکلاپے کا خیال کر کے یہیں، میرے ساتھ رہنے لگی ہیں۔'' انہوں نے مفصل تعارف کروا دیا۔ مراد اکتاہٹ سے اپنے دائیں کان کی لو مسلنے لگا جب کہ ایبک نے گویا سب کچھ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

''اوہ ...... آئی سی!''

''ناں کی ہے تیرا؟'' دادی نے اچانک ہی اپنی پاٹ دار آواز میں گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''جی ایبک!'' اس نے تابعداری سے بتا بھی دیا۔

''ایں ......'' انہوں نے ازحد تعجب خیزی سے اپنی لمبی کھڑی ناک پر انگلی دھر لی۔

''بک ...... بک ...... یہ کیہڑا ناں اے۔''

''واہ!'' اس کے شاہانہ نام کی کیا درگت بنائی تھی دادی محترمہ نے؟ مراد بے ساختہ پوری بتیسی نکال کر ہنسنے لگا۔

''اوہ ہو بے بو!'' صغراں نے ہونے والے داماد کے چہرے کے بگڑتے زاویے دیکھ کر جلدی سے انہیں ٹوکا۔ ''بک ...... بک نہیں اے بک ...... مغل شہزادوں والا نام ہے۔''

''پراں مر مغل ......'' بے بو ذرا جو متاثر ہوئی ہوں۔ ''یہ لگ ریا اے کوئی چوہدریوں والا ناں اور کھڑ کا کریے، شہر جا کر مہاجراں دی کڑی نال ویاہ۔'' اب وہ غائبانہ عبدالکریم کو سخت سست سنانا شروع ہوگئیں، ایبک پہلو بدل کر رہ گیا۔

''اچھا خاصا ادھر رہ کر اپنے پرکھوں کی زمین پر ہل چلاتا تھا، ہورے کون سا کیڑا شہر جا کر ''بج نچ'' (بزنس) کرنے کا دماغ میں کلبلایا۔ بس سب کچھ چھوڑ چل پڑا ...... ہائے او ربا! کی دساں .... ذات کا چوہدری اُتھے بیٹھا ''کھڈی نالیوں'' والا کم کردی ای' لکھ دی لعنت ہووے ایسے شوق تے۔''

''واٹ ...... کھڈی نالیوں والا بزنس؟ دادی پلیز وہ امپورٹڈ سینٹری کا بزنس کرتے ہیں، بہادر آباد میں شوروم ہے ان کا۔'' اس نے بگڑ کر کہا۔ صغراں اس کے انداز پر گھبرا کر بے بو کو خاموش کروانے لگیں مگر اس دوست نما دشمن کو کون خاموش کرواتا؟

''واہ بے بو!'' اس نے بے ساختہ سراہا۔ ''کیا ترجمہ کیا ہے آپ نے واہ۔'' وہ سر دھننے لگا۔

''تو کون ہے؟'' بے بو کی نظر کرم اب اس کی جانب ہوئی، اس کی ہنسی کو بریک لگ گئی۔

''یہ مراد وحید ہے۔'' گھبرائی ہوئی سی صغراں نے جلدی سے بتایا۔ ''ایبک کا دوست اور بھرجائی مہرو کی دور کی بہن کا لڑکا۔''

''لو دسو ......'' بے بو نے ہاتھ نچایا۔ ''اس کا ناں وی پٹھا۔''

''سلام ویر جی۔'' اور اس کے قبل کہ بے بو اس بے چارے مراد وحید کے ''پٹھے نام'' کے بخیے اپنے

مخصوص انداز میں ادھیڑنا شروع کرتیں، نارنجی لباس میں، سر پر ہم رنگ دوپٹا اوڑھے کوئی شوخ سی دوشیزہ، اپنے ہاتھوں میں اسٹیل کی جہازی سائز ٹرے تھامے کمرے میں داخل ہوئی اور اشتیاق آمیز مسرت سے ایبک کو دیکھتے ہوئے خاصی گرم جوشی سے سلام جھاڑا۔

"ایبک نے چونک کر، اسے پہچاننے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے "وعلیکم" کہنے پر اکتفا کیا۔ مراد بھی کچھ "ڈیسنٹ" سا بن کر بیٹھ گیا۔

"لگتا ہے آپ مجھے پہچانے نہیں؟" موصوفہ نے ٹرے ان کے سامنے دھرتے ہوئے لگے ہاتھوں شکوہ بھی کر ڈالا۔ "خیر چھڈو، آپ آئے بھی تو پہلی واری ہونا ادھر، ویسے میں صائمہ ہوں۔ بے بو کی نواسی، آپ کی صغراں چاچی میری سگی خالہ لگتی ہیں۔" وہ ایبک کی مسلسل سنجیدگی کے برعکس خوش خلقی سے اپنا تعارف کروانے لگی۔

"مجھے ناچی...... آپ کو دیکھنے کا بڑا ہی شوق تھا۔" اس نے اپنی بتیسی سے نکالتے ہوئے اطلاع بہم پہنچائی۔ ایبک نے اس بیان پر بے چینی سی محسوس کی البتہ مراد کا معاملہ ذرا مختلف رہا اس نے جو کچھ محسوس کیا جھٹ سے کہہ بھی ڈالا۔

"کیوں؟ کیا یہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہیں؟" معصومیت آنکھوں اور لہجے میں کوٹ کوٹ کر بھرتے ہوئے سوال کیا۔

"میرے ویر جی کیوں ہونے لگے عجوبہ ایویں ای۔" موصوفہ نے ازحد برا مانتے ہوئے اسے دیکھا۔ "ویسے آپ کی تعریف؟" چتون تیکھے اور لہجہ حتی المقدور "کوڑا" کر کے پوچھا۔

"کوئی نہیں کرتا۔" سرد آہ بھر کے بتایا۔ "دراصل میں پیدائشی بدقسمت ہوں۔"

"وے کیا بھنبھنا رہا ہے نامراد۔" چونکہ مراد نے اپنی آواز دانستہ دھیمی کر لی تھی اس لیے سامنے بیٹھی بے بو تلملا کر بولیں۔

"جی کچھ نہیں بے بو۔" مراد نے جلدی سے کہا۔ "بس ذرا اپنا تعارف کروا رہا تھا۔"

"ناشتا پڑا پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" صغراں نے بھی کہا۔ "چلو پتر! جلدی سے شروع کرو نا۔" انہوں نے میز پر سجائے گئے ناشتے کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ایبک جو اس ساری گفتگو کے دوران منہ بنائے بیٹھا تھا، صغراں کے اشارہ کرنے پر پلیٹوں کی جانب دیکھا۔

گرما گرم خستہ سنہری بل دار بڑے بڑے دیسی گھی میں تلے پراٹھے، سرسوں کے ساگ پر پگھلتی سفید مکھن کی ڈلی، آملیٹ...... انڈوں کا ملائی والا خوشبو دار حلوہ اور دودھ پتی سے بھرا تھرماس......

"اوہ نو چاچی!" ناشتے کے آئٹمز پر غور فرمانے کے بعد اس کے منہ کے زاویے مزید بگڑ سے گئے۔ "اتنا ہیوی ناشتا میں بالکل نہیں کر سکتا، آئم سو سوری! میرے تو سارے ورک آؤٹ کا ستیاناس ہو جائے گا۔" اس نے انتہائی بے مروّتی سے کہا۔ آن واحد میں صغراں کا مسکراتا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ صائمہ کے چہرے سے بھی حیرانی جھلکنے لگی جب کہ بے بو کے لبوں پر خواہ مخواہ ایک طنز آمیز مسکراہٹ آٹھہری۔

"پر مجھے تو بھرجائی مہرو نے بتایا تھا کہ تمہیں ساگ اور پراٹھے بہت پسند ہیں۔" وہ فکرمندی سے بولیں تو ایبک ان کی اس بات پر ذرا کی ذرا گڑبڑا سا گیا۔

اوہ نو...... یہ مام کی مخبریاں بھی نا۔

"وہ پرانی بات تھی۔" وہ قدرے سنبھل کر بولا۔ "اب میری پسند بدل چکی ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں ان لوگوں کو نجانے کیا جتانا چاہ رہا تھا۔ پتا نہیں یہاں موجود ان تینوں خواتین کی سمجھ میں اس کا مدعا آیا یا نہیں، ہاں مگر وہ جو اس کمرے سے باہر دروازے کی اوٹ میں کھڑی الہڑ مٹیار تھی، وہ یہ سب سن کر بہت بھاری دل کے ساتھ مگر خاموشی سے فی الحال یوں ہی واپس پلٹ گئی۔

"یعنی آپ یہ سب چکھیں گے بھی نہیں؟" صائمہ نے تعجب سے پوچھا۔ "وچاری انجو نے آپ

کی خاطر یہ سب کچھ بڑی محنت سے بنایا تھا۔" اس نے احساس دلانے والے لہجے میں جتایا تو وہ جھنجلاتا ہوا اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"سو واٹ......" اس نے انتہائی کھردرے لہجے میں کہا۔ "میں کسی کی خاطر اپنے آپ پر ظلم نہیں کر سکتا، میں نہیں کھا سکتا تو بس نہیں کھا سکتا۔"

"اچھا...... اچھا۔" اس کے انداز پر صغراں بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "نئی تے ناں سئی پر تُو بیٹھ تے سئی پتر! میں کرواتی ہوں تیری خاطر کچھ شہری ناشتے کا بندوبست۔" وہ سرعت سے اس کے نزدیک آ کر اسے پچکارنے لگیں تو اسی لمحے ایبک نے سخت بے بسی محسوس کی ان کا حواس باختہ چہرہ دیکھ کر......

"اوکے۔" اس نے ٹھنڈی ٹھار سانس بھری اور دھپ سے واپس صوفے پر بیٹھ گیا۔

"جیوندا رہ میرا پتر!" صغراں اتنے ہی میں کھل گئیں۔

اور عجیب سی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھتی صائمہ کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے باہر نکل گئیں۔

"چل صیمہ...... جلدی چل! کاکا تو ہوگا نا اس ویلے گھر پر؟"

"وے مراد!" بے بو نے ایبک کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے مسمی سی صورت بنا کر بیٹھے مراد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تُو تو بسم اللہ کر یا پھر تجھے بھی موت پڑتی ہے یہ سب کھانے سے۔"

"ارے نہیں نہیں بالکل نہیں بے بو...... میں کوئی پاگل ہوں جو اُن نعمتوں سے منہ موڑ کر گناہ گار بنوں۔ مجھے تو ایسا دیسی ناشتا بے حد پسند ہے بلکہ میں تو اکثر وہاں کراچی میں اپنی اماں سے......" اس کے ہاتھ اور زبان فراٹے بھرنا شروع ہو گئے تھے۔ بے بو کی نگاہوں میں اب اس کے لیے قدرے نرمی کا تاثر ابھر رہا تھا جب کہ اس کے ساتھ بیٹھے ایبک کا بس نہ چلتا تھا کہ اس پیدائشی کمینے انسان کو یہیں، ہر لحاظ اور احتیاط بالائے طاق رکھتے ہوئے دھونا شروع کر دے۔



"بس پھر خالہ نے اور کیا کرنا تھا؟" صائمہ نے کوثری کے جہیز کے زرق برق کپڑے، جواب سے کچھ دیر قبل لڑکیاں بالیاں، بڑے شوق اور دلچسپی سے دیکھ کر یہاں سے روانہ ہوئی تھیں، سمیٹ کر سوٹ کیس میں احتیاط سے بند کرتے ہوئے کوثر کے سامنے آج صبح کا قصہ دہراتے ہوئے کہا جو خود بھی "میڈم انجمن چوہدری" کے ہونے والے شہری دولہا کے دیدار کی مشتاق تھی اور جس سے تاحال اس کی ملاقات نہ ہو سکی تھی۔

"کاکا کو بلوا کے فیقے کی دکان سے ڈبل روٹی منگوائی، کچے پکے انڈے (ہاف فرائی) بناسپتی میں تل کے دیے اس نخریلے شہزادے کو ناشتے کے لیے۔" اس نے سوٹ کیس ایک جھٹکے سے بند کیا اور دھکیل کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

"ہاہائے نی!" کوثری نے اپنے حیرت سے کھلے منہ پر ہاتھ رکھ کر کافی دیر سے یوں ہی گہری خاموشی اوڑھے، اپنے ساتھ چارپائی پر بیٹھی انجو کو تاسف سے دیکھا۔

"انا نخریلا تے بے مروت......"

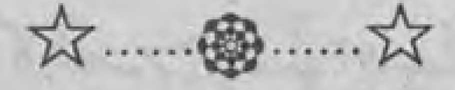
"تے ہور کی؟ میں نے بتایا وی کہ آپ کے واسطے انجو نے بڑی محنت کی ہے پر ناں جی...... انہیں تو جیسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پیا......" صائمہ افسوس سے سر نفی میں ہلا کر بولی۔

"ہائے نی انجو!" کوثری نے اب کی بار گم صم بیٹھی انجو کا کندھا جھنجوڑتے ہوئے گویا اسے جگانے کی کوشش کی۔ "فیر تیرا گزارا کیسے ہوگا اس شہری بابو دے نال۔" وہ فکرمندی سے لبریز لہجے میں بولی۔

"اور تُو نے تو اب تک انہیں دیکھنے کی خواہش بھی نہیں کی، کل سے یہیں دبکی بیٹھی ہے۔" صائمہ نے کمر پر ہاتھ ٹکاتے ہوئے تفتیشی انداز سے اس کی جانب دیکھ کر متعجب لہجے میں کہا۔ "کیا تیرے من میں ان کے لیے کوئی جذبہ نہیں...... لیکن ایسے کیسے ہو سکتا ہے، آخر کو بچپن سے تو ان کی منگ ہے، کچھ تو

بول...... یوں منہ لٹکائے کیوں بیٹھی ہے؟"

اوران میں سے کسی ایک سوال کا جواب بھی فی الحال انجو کے پاس موجود نہیں تھا اور شاید وہ اس طرح خاموش رہ کر ان ہی گنجلک سوالوں کے مناسب جواب ڈھونڈنے کی سعی کررہی تھی...... یا کرنا چاہتی تھی۔



"زمانے بھر کے بھوکے، ندیدے انسان......" کمرے میں واپس لوٹتے ہی پہلی فرصت میں ایبک نے لپک کر اس مار آستین کی گچی مروڑتے ہوئے بھنائے لہجے میں کہا۔ "مجھ سے اتنے زبردست سے ناشتے سے انکار کروا کر خود کیسے حلق تک ٹھونس رہا تھا وہاں بیٹھا ہوا...... تجھے ذرا بھی شرم نہیں آئی، مجھے بیماروں والا ناشتا کرتے دیکھ کر......"

"ابے او بک بک چوہدری!" مراد نے ایک جھٹکے سے اپنا آپ بپھرے ہوئے ایبک سے چھڑوایا اور کمال پھرتی سے مناسب دوری پر جا کر اسے غصیلے لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اپنے ہاتھ قابو میں رکھ اور میں نے تجھے کب منع کیا تھا ناشتا کرنے سے...... ذرا بتا تو سہی، ہاں۔" اس نے ناراضی سے پوچھا۔

"کیوں؟ یہ تیرا مشورہ نہیں تھا کہ ان کی ہر بات کو رد کر کے الٹا کام کرنا، انہیں دق کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دینا۔" ایبک کے نتھنے پھول گئے اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

"لے بھائی!" مراد دھپ سے بیڈ پر گرتا ہوا تعجب خیزی سے بولا۔ "مجھے جب "دق" کرنے کا مطلب ہی نہیں معلوم تو میں نے تجھے "یہ" کرنے کا مشورہ کیسے دے دیا جھوٹے انسان۔"

"اوہ مائے گاڈ!" ایبک نے بے ساختہ دانت کچکچاتے ہوئے اپنے بال دونوں مٹھیوں میں جکڑ لیے۔ "میں ہی گھامڑ اور الو ہوں جو تجھ سے بحث میں پڑا ہوا ہوں۔"

"ہاں۔" مراد نے تیزی سے تائیداً سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ تو خیر تُو ہے مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی؟" وہ بستر پر نہایت ہی سکون سے نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔ اس کا پیٹ کیا حلق تک بھرا ہوا تھا ایسے میں اگر وہ پرسکون نہیں ہوتا تو اور کیا دو سوکھے توس، کچے انڈے سے نگلنے والا ایبک پرسکون و مطمئن ہوتا؟

"وہ کیا؟" کھانا تو کھا نہیں سکا تھا اس کی باتوں میں میں آ کر لہٰذا اسی کو پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

"یہ انجمن صاحبہ ابھی تک ہمارے سامنے کیوں نہیں آئیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ تجھ سے پردہ کررہی ہوں؟" اس نے آنکھیں چھوٹی کرتے ہوئے پرسوچ سے لہجے میں کہا، ایبک یک بیک چونک پڑا۔

"ہاں یار!" وہ اس کے قریب آ کر پریشانی سے بیٹھ گیا۔ "اس بات پر تو میں نے اب تک دھیان ہی نہیں دیا تھا، اگر ایسا ہوا تو بہت مسئلہ بن جائے گا۔"

انجمن کے دیدار ہی پر تو یہ سارا کھیل منحصر تھا اور واقعی اگر وہ سامنے ہی نہ آتی تو...... مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ اس نے بہت جلد ان کے سامنے آ جانا تھا تمام تر ہتھیاروں سے لیس ہو کر......



"جے میں ہوندی ڈھولنا وے ڈھولنا...... سونے دی تاویتری۔" لال بھڑ کیلے کرتے، پیلے لاچے اور نیلے دوپٹے میں ملبوس، اونچی لمبی، بڑی بڑی آنکھوں کو سرمہ دانی بنائے اور تراشیدہ بھرے بھرے ہونٹوں کو سرخ رنگ سے "لتھڑے" پس منظر میں اونچی آواز سے سنائی دیتی موسیقی کے ساتھ ساتھ محو رقص یہ الہڑ مٹیار کون تھی؟ کہ جسے دیکھ کر محترم ایبک چوہدری کی نگاہیں خیرہ...... خیرہ تو خیر کیا ہوتیں البتہ پھٹی کی پھٹی ضرور رہ گئی تھیں۔

دراصل آج کوثری کی شادی تھی اور ظاہر ہے کہ وہ دونوں بھی یہاں مدعو تھے، گاؤں میں دن کے وقت ہونے والی یہ شادی مراد کے لیے ایک انوکھا، دلچسپ تجربہ تھا۔ اپنی باتونی اور "دوسروں کے کام آنے والی" فطرت کی وجہ سے وہ ان تمام لوگوں سے یوں گھل مل گیا تھا گویا برسوں سے یہیں کا رہائشی رہا ہو۔ کاکا نے تو صبح سے اس کی خدمات کو دیکھتے ہوئے اسے باقاعدہ اپنے پائی جان کے منصب پر فائز کر دیا تھا اور جہاں تک رہا ایبک کا سوال، ایک تو وہ پہلے ہی ہے "سچ مچ" خاصا نخریلا، اکڑو کسی حد تک بدتمیز اور مزاج دار واقع ہوا تھا اور پھر اسے تو یہاں سب پر اپنے ان اوصاف کی دھاک بھی بٹھانا مقصود تھا لہٰذا ایسے میں وہی ہوا جس کی توقع تھی یعنی وہ لوگ اسے دامادوں والا مخصوص پروٹوکول تو دے رہے تھے مگر سچ پوچھیں تو وہ ان کے دلوں کو بھایا نہیں تھا۔

آج مراد صبح سے کاکا کے ساتھ ساتھ تھا کہ یوں ایک کمرے میں بند بیٹھے بیٹھے اس کا دم گھٹنے لگا تھا (بقول خود اس کے) کاکا نے تو بڑے خلوص اور محبت سے ایبک کو بھی اپنے ساتھ چلنے کی آفر دی تھی مگر وہ سدا کا نازک مزاج...... اس سے کہاں یوں بھری دوپہر میں پھرا جاتا، اس لیے وہ انہیں صاف انکار کرتے ہوئے اپنے کمرے میں بند ہو کر نام نہاد تھری جی نیٹ ورک کے مزے لینے لگا پھر زوال کے وقت صغراں کے بلاوے پر باہر نکلا تو وہ کوثری کی طرف جانے کو تیار کھڑی تھیں۔ باقی سب تو خیر پہلے ہی سے ادھر تھے اب وہ بھی اس طرف جا رہی تھیں اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا، پہلے تو اس نے حسب عادت انکار کرنا چاہا پھر نجانے کیا سوچ کر ان کے ساتھ چلا آیا۔

دو گلی چھوڑ کر کوثری کا گھر تھا، وہ لوگ دیگر پنڈ والوں کی بہ نسبت صاحب حیثیت تھے لہٰذا ان کے ہاں شادی کے انتظامات بھی اسی حساب سے کیے گئے تھے۔ عورتوں کی بیٹھک و طعام کا انتظام گھر کے کشادہ آنگن میں کیا گیا تھا جب کہ مردوں کے لیے گھر کے پچھلے وسیع و عریض خالی احاطے میں شامیانہ لگوایا گیا تھا۔ صغراں اسے یہیں چھوڑ کر اندر چلی گئیں، وہ شامیانے کے داخلی دروازے پر کھڑا کشمکش کا شکار ہو گیا کہ آیا اندر جائے یا نہیں اگرچہ چار پانچ پیڈسٹل فینز اندر ہوا دے کر گرم ماحول کو ٹھنڈا کرنے کی اپنی سی ناکام کوشش کررہے تھے مگر پھر بھی ایبک کو تو وہاں بیٹھنے کے خیال ہی سے وحشت ہوئی اور اس سے پہلے کہ اندر موجود جملہ حاضرین میں سے اس کا کوئی فلاں چاچا کے بیٹے کا لڑکا یا فلاں پھوپھی کے نواسے کے بھائی ٹائپ رشتے دار اسے دیکھ پاتا وہ الٹے قدموں وہاں سے واپس ہو لیا اور اس بے مروت و نامراد کی تلاش میں اپنا رخ کوثری کے گھر کی جانب کر لیا اور ابھی وہ ڈھیلے قدموں سے جھجکتے ہوئے، کالے رنگ کے بڑے سارے کھلے دروازے سے اندر صحن میں داخل ہوا ہی تھا کہ سامنے کمرے میں دکھائی دیتے منظر نے اسے یہیں منجمد کر دیا۔

کھلے دروازے سے اندر، باہر دیوانہ وار بھاگتے دوڑتے مختلف ڈیزائن کے بچے، سامنے موجود رنگا رنگ ملبوسات زیب تن کیے بھانت بھانت کی خواتین، اونچی آواز سے بجتی موسیقی، گرم ہوا، تیز دھوپ، گوشت والے چاولوں اور زردے کی نامعلوم سمت سے اڑ کر آتی خوشبو ایک لحظہ کے لیے گویا سب کچھ پس منظر میں چلا گیا اور سامنے صرف وہ...... ہاں وہ تیل چپڑے بالوں میں شیشے والا پراندہ لہرا کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتی وہ حسینہ رہ گئی اور اس کے آس پاس اکڑے ہوئے سلطان راہی مرحوم کا بہروپ بھرے، ڈانگہ پکڑے ہوئے اس کی وہ پارٹنر بھی جو یقیناً صائمہ تھی۔

"وے...... دیکھو تو سئی یہ کون شوخا اندر گھستا چلا آ رہا ہے۔" کسی معمر خاتون کی چنگھاڑتی ہوئی سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"پکڑ کر لا اسے۔" وہ جلالی انداز سے موڑھے سے اٹھتی ہوئی نجانے کسے مخاطب کر کے بولیں۔ "میں اس کی گچی مروڑتی ہوں۔"

ان کے شور مچا کر توجہ دلانے پر کئی ایک نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا، آن واحد میں صورت حال نے اتنا عجیب رخ اختیار کر لیا تھا کہ وہ فی الفور یہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا نتیجتاً گوڈے گوڈے شرمندگی

میں غرق، وہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔

''وڈا آیا...... شان نہ ہووے تے...... دس دے کون ہے تُو؟'' ایک اور بھاری بھرکم تھانیداری ٹائپ خاتون نے آنکھوں میں قہر بھرتے ہوئے ہاتھ نچا کر غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''میں...... وہ...... میں جی...... میں میں......''

اس نے ہکلاتے ہوئے کہنا شروع کیا مگر......

''اچھا!'' تھانیداری پھر بولی۔ ''لیلا ہے تُو؟'' ہاتھ کمر پر پہنچ گیا اور وہ قدم بہ قدم اس کے نزدیک جانے لگیں۔ جب سب کو معلوم تھا کہ مردوں کا اس طرف آنا سختی سے منع ہے تو پھر اس کی اتنی جرأت ہوئی کیسے؟ نہ صرف ادھر بلکہ گھر ہی میں گھستا چلا آیا۔ اب ایسے ناقابل معافی جرم پر ٹھکائی تو لازمی تھی۔

''ہائے ہائے رضیہ!'' معاً کمرے کے دروازے سے صغراں کی بوکھلائی آواز پہلے آئی، صورت بعد میں دکھائی دی کہ صغراں سے رضیہ تک درمیان میں خواتین کا ہجوم حائل تھا۔

''رک جانی......'' وہ بھیڑ کو چیرتی ہوئی افتاں و خیزاں آگے بڑھیں۔ ''جوائی ہے میرا...... بھا کریم دا پتر۔'' انہوں نے لپک کر گھبرائے ہوئے ایک کا بازو مورل سپورٹ کے لیے تھام کر سخت لہجے میں کہا۔

''وہ کراچی والا؟'' اس بار رضیہ نے جھینپتے ہوئے تصدیقاً پوچھا اور پیچھے ہٹنے لگی۔

''ہاں وہی...... دو دن پہلے تو آیا ہے۔'' انہوں نے فہمائشی نگاہ سب پر ڈال کر کہا۔

''اچھا اچھا......'' ان ہی معمر خاتون نے اپنے موڑھے پر اطمینان سے دوبارہ براجمان ہوتے ہوئے کہا۔ ''فیر تے ٹھیک اے۔'' مجمع بھی جواب سے کچھ دیر پہلے ناراضی کے بعد اشتعال کی حدود میں داخل ہوا چاہتا تھا یہ سن کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا بلکہ اب بعد اشتیاق، مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک کی نظر جو جھکی ہوئی تھی، کسی احساس کے تحت اچانک ہی کمرے کی جانب اٹھ گئی۔ وہ ہونق تاثرات والی الھڑ مٹیار، سرخ ہونٹوں کے ایک کونے میں دوپٹا، دانتوں سے پکڑے اسی کی جانب بغور دیکھ رہی تھی۔ نظریں چار ہوئیں تو بری طرح گڑبڑائی، پھر جبراً مسکرائی پھر عجیب سے تاثرات اپنے چہرے پر لیے اندر کہیں بھاگتی چلی گئی۔

''جنج آ گئی اوئے......'' اور اس سے پہلے کہ کوئی اور تماشا ہوتا کسی بچے نے خوشی سے بے قابو ہو کر نعرہ مارا اور ساتھ ہی فضا میں ڈھول باجوں کے ساتھ ساتھ پٹاخوں وغیرہ کی آواز بھی گونجنے لگی۔

عورتیں یہ سن کر ہوشیار باش ہو گئیں اور ایک دو، اندر سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس کوثری کی جانب تیزی سے روانہ ہو گئیں اور صغراں یہ موقع غنیمت جان کر، ایک کا ہاتھ تھامے تیزی سے گھر سے باہر نکلتی چلی گئی۔

اور اس نے اس مرتبہ اندر جانے کے بجائے واپس گھر جانے کو ترجیح دی اور تب سے لے کر اب تک وہ یہاں بیٹھا مختلف سوچوں میں گھرا ہوا تھا مراد کو دیکھتے ہی پھٹ پڑا۔ ''مل گئی تجھے واپسی کی فرصت۔''

''ہاں...... ہو گئی رخصتی کوثری کی۔'' وہ بستر پر نڈھال سا گرتے ہوئے بولا۔ ''اب تو فرصت ہی فرصت ہے۔''

''یہیں سے واپس کیوں آ گئے؟'' ایک نے طنزیہ مسکرا کر کہا۔ ''اسے اپنے کندھے پر اٹھا کر ساتھ والے گاؤں چھوڑ کر آتے نا۔''

''خواہ مخواہ طنز مت کر یار!'' اس نے خلاف معمول لہجے میں کہا۔ ''بیٹیاں اور بہنیں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں اور پھر میں یہاں تیری طرح کمرے میں بند ہو کر بیٹھنے تو آیا نہیں ہوں مجھے یہاں کا ماحول انجوائے کرنے دے۔''

ایک بے بسی سے اسے دیکھ کر اس وقت کو کوسے گیا کہ جب اس نے اس جیسے عجیب و غریب انسان کو شرف دوستی بخشا۔

☆......❀......☆

''مام روزانہ فون کر کر کے مجھ سے اس انجو کے بارے میں پوچھ رہی ہیں کہ پسند آئی؟ اور وہ محترمہ ہیں کہ سامنے آنے پر تیار ہی نہیں۔ ایک ہفتہ تو ہو گیا ہے ہمیں یہاں آئے ہوئے، وہاں میرے کام کا الگ نقصان ہو رہا ہے تُو بتا؟ ایسا کب تک چلے گا۔ آخر میں اور کتنے دن انتظار کر سکتا ہوں اس سے ملاقات ہونے کا جب کہ میرا خیال ہے کہ وہ جان بوجھ کر میرے سامنے آنے سے گریزاں ہے۔'' شادی کے دوسرے دن ایک بے زار لہجے میں اپنے ساتھ چلتے مراد سے مخاطب تھا۔

رات پڑ چکی تھی، گرم موسم قدرے خوش گوار ہو چلا تھا۔ چاول کے کھیت نزدیک ہونے کی وجہ سے نم مٹی اور چاول کے پودوں کی مخصوص سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں چکراتی پھر رہی تھی، ایسے میں ایک مراد کو لیے چہل قدمی کی غرض سے باہر چلا آیا تھا۔

''ہوں۔'' مراد نے مکمل سنجیدگی پر سوچ ہنکارا بھرا۔ ''بات تو تیری ٹھیک ہی لگتی ہے مگر مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ اگر آنٹی مہر النساء یہ بات جانتی تھیں کہ انجو کو تجھ سے یہاں پردہ کروایا جائے گا تب انہوں نے کیا سوچ کر تجھے یہاں بھجوایا ہے؟''

''یہ ہی پوائنٹ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا نا۔'' اس نے زچ ہو کر کہا۔ ''گو کہ اس دن اس کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد، اس کے بارے میں میرے اندازوں کی تصدیق ہو چکی ہے مگر اس اتفاق کو ہم ملاقات کا نام تو دے نہیں سکتے اور نہ ہی وہ ملاقات تھی ہی، تب پھر میں کس بات کو بنیاد بنا کر ڈیڈ کو واضح انکار کر سکتا ہوں۔ وہ تو فوراً کہہ دیں گے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں، ضد کر رہا ہوں، بہانے بازی سے کام لے رہا ہوں۔'' وہ یقیناً بہت متفکر تھا، یہاں آ کر تو اسے اب ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے محض وقت ضائع ہی کیا ہے اور یہ بات کسی حد تک شاید درست بھی تھی۔

''ہو سکتا ہے اس روز والی وہ ''پرفارمر'' خاتون کوئی اور ہو؟'' مراد نے نجانے کیا سوچ کر کہا۔

''ہرگز نہیں۔'' ایک قطعیت سے بولا۔ ''میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہی تھی، دراصل مجھے اس کا چہرہ اچھی طرح یاد ہے۔''

''تب پھر ہم کیوں نہ ایسا کریں کہ بجائے ملاقات کا انتظار کرنے کے ملاقات کا انتظام کر لیں؟'' مراد کے کارخانے میں جھٹ سے ایک آئیڈیا تیار ہوا۔

''کیا مطلب؟'' وہ دونوں چلتے چلتے اب گاؤں کی مرکزی سڑک تک پہنچ گئے تھے۔ سڑک سے ایک ٹرک تیزی سے ہارن بجاتا ہوا گزرا غالباً اسی لیے ایک مراد کی بات ٹھیک طرح سے نہیں سن سکا تھا۔

''دیکھو! ہم ایسا کرتے ہیں کہ......'' مراد اپنے ذہن میں آنے والا منصوبہ دھیرے دھیرے اس کے گوش گزار کرنے لگا۔ جسے سن کر ایک دھیرے دھیرے تائیداً سر ہلائے گیا اور آخر میں اس کی پریشان نگاہوں سے گہری طمانیت مترشح ہونے لگی۔

''بہت خوب...... واقعی! اتمام حجت کے لیے یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔''

''اتمام حجت...... یہ کون سا بے ہودہ کام کرنے جا رہا ہے تُو ان کے ساتھ بھائی! اپنی نہیں تو میری ہی عزت کا کچھ خیال کر لے۔ یہ لوگ میرے بارے میں کتنی پوزیٹو رائے رکھتے ہیں اور تُو ہے کہ سب کچھ ملیامیٹ کرنے پر تل گیا ہے۔'' وہ متوحش سے انداز سے بولتا گیا اور ایک کے پاس سوائے ضبط کر کے اسے سننے کے علاوہ اور راستہ ہی کیا تھا۔

☆......❀......☆

''تُو جو میرے ہمیشہ کول رہوے......
تے میں دنیا نوں کہنا پرے پرے
دل دے کے دنیا توں کون ڈرے......''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں، اس وقت آپ کا مخاطب کون ہے؟'' ہلکے گلابی اور گہرے نیلے جوڑے میں ملبوس صائمہ بہت مگن سے انداز میں لہک لہک کر گنگناتی ہوئی، صغراں کی چھت پر موجود اس وقت چارپائی پر سوکھنے کے لیے ڈالی گئی مرچیں اکٹھا کر رہی

تھی، تب ہی اس کے عقب سے کوئی آواز گونجی، نتیجتاً وہ ڈر کر بری طرح اچھل پڑی اور ساتھ ہی ہاتھ میں پکڑا، کپڑے کا سرمئی تھیلا ہاتھ سے چھوٹ گیا اور یہاں سے وہاں تک لالی ہی لالی بکھر گئی۔

"تہاڈا بیڑہ تر جائے۔" وہ بھنا کر بولنے والے کی جانب گھومی۔ "اوہ بھا مراد آپ...... آپ اس وقت ادھر کیا کرنے آ گئے ہو؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"قسمت......" بھا مراد نے اس لمحے بڑے غور سے غلافی آنکھوں میں در آئی حیرانی دیکھی۔ "قسمت کے کام ہیں یہ...... اب دیکھو نا کیا یہ ضروری تھا کہ وہ بک بک چوہدری مجھے اپنے ساتھ پنڈ لے کر آتا اور یہاں آ کر آج اس مقام پر میں تمہیں یوں غور سے دیکھتا؟"

"ہاں بھا مراد!" نجانے وہ کیا سمجھی بے چاری جھٹ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ "اچھا ہوتا اگر ویر جی اکیلے ہی آ جاتے تو اب دیکھو نا، انجو وچاری آپ کی وجہ سے ویر جی کے سامنے بھی نہیں آ پا رہی۔ کیا اس کا جی نہیں چاہ رہا ہوگا ان سے مل کر گلاں کرنے کا۔" حالانکہ انجو نے اس سے ایسی کوئی بات بھی نہیں کی تھی مگر اس کا ننھا سا ذہن از خود اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔

"کتنی ذہین ہو تم صائمہ!" پہلے تو مراد چونکا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے متاثر لہجے میں اسے سراہتے ہوئے بولا۔ "میں تو یہی بات سوچ سوچ کر پاگل ہونے والا تھا کہ آخر انجو بھا بھی ایبک کو لفٹ کیوں نہیں کروا رہی ہیں۔ اب تم نے یہ بات بتا کر میری آدھی پریشانی ہی حل کر دی، بس تم سے ایک گلہ ہے۔" آن واحد میں اس کا لہجہ رنجیدہ خاطر سا ہو گیا۔

"وہ کیا بھا مراد؟" اور اپنی اس قدر تعریفیں پورے یقین سے سنتی اس معصوم سی دوشیزہ نے اس گلے پر از حد بے چینی سے پوچھا۔

"تم چاہے مجھے نامراد کہہ لیا کرو بس یہ لفظ بھا مراد مت کہا کرو۔"

"وہ کیوں بھا...... بھا...... مطلب ہے کہ مراد جی!" اس نے تعجب سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"چھوڑو...... یہ موقع ان باتوں کا نہیں پھر کبھی بتاؤں گا، اس وقت تو میں تمہارے پاس اپنے ایک کام سے آیا تھا اور خواہ مخواہ تمہارا کام بڑھا دیا۔" اس نے گری ہوئی لال مرچوں کی جانب افسوس سے اشارہ کیا۔

"ان کا کوئی مسئلہ نہیں۔" وہ فراخ دلی سے بولی۔ "آپ اپنا کام بتاؤ؟" وہ استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"دیکھو......" اس نے سنبھل کر محتاط لفظوں میں کہنا شروع کیا۔ "ملنا تو ایبک بھی انجو سے چاہ رہا ہے۔"

"تو مل لیں نا۔" وہ جوش و خروش سے اس کی پوری بات سنے بغیر بولی۔ "وہ گھر ہی میں تو ہیں۔"

"گھر میں تو چاچی صغراں اور بے بو وادی بھی ہیں نا......" اس نے گویا اشارتاً سمجھانا چاہا۔

"ہائے ہائے تو کیا اب میں انہیں گھر سے باہر نکال دوں؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں نہیں......" مراد کو اس کی کج فہمی نے بے مزا کر دیا۔ "اپنی انجو کو...... آج شام میں گھر سے باہر نکال کر نہر پر لے آؤ...... کہو کر سکتی ہو نا یہ کام؟" مراد نے چیلنج دیتی مسکراہٹ سے اسے دیکھا، صائمہ سوچ میں پڑ گئی۔

☆......❁......☆

"ساری برادری باتیں کر رہی ہے...... جے منڈے نے کسے نال ملنا ای نہیں سی، فیر اتھے آن دی کی لوڑ سی؟" صحن میں مشرقی دیوار بچھی چارپائی پر تکیے کے سہارے نیم دراز بے بو نے ناپسندیدہ سے لہجے میں کہا۔

"مراد کو دیکھو......" اب کے لہجے سے پسندیدگی جھلکنے لگی۔ "وہ بھی تے ہے نا آخر...... کیا ملن جلن والا منڈا اے، اک تیرا جوائی...... توبہ توبہ!" انہوں نے اپنے کلے پیٹے۔

"ششش......" اور ان کے قریب ہی نیچے موڑے پر بیٹھ کر پالک کترتی صغراں نے بے ساختہ چھری سلور کے تسلے میں پٹختے ہوئے گھبرا کر بے بو کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آہستہ بے بو...... وہ اندر اپنے کمرے میں ہی ہے، خواہ مخواہ کچھ سن لیا تے چنگا نئیں۔"

"پراں مرے......" بے بو نے بے زاری سے ہاتھ ہلا کر بے پروائی سے کہا۔ "سنتا اے تے سن لے، سانوں کی، اور سن وے صغراں! توں وی اس دی ایڈی فکراں نہ پال۔" انہوں نے نصیحت آمیز لہجہ اختیار کر لیا۔

"کیسے نہ پالوں بے بو!" وہ تسلہ پرے کھسکا کر سر پر ہاتھ رکھ کر بے بس لہجے میں بولیں۔ "بچپن سے اس کے نال لگی ہے انجو! فکر تو کرنی پیندی اے۔"

"ہاں تو کر فکر۔" بے بو جھلا کر بولیں۔ "پر مہرو سے اتنا تو پچھ لے اس کو ادھر خواہ مخواہ بھیجا کس واسطے ہے؟"

"کیا پوچھوں کہ کس واسطے بھیجا ہے؟" اسی وقت میتھی کا گٹھا ہاتھ میں پکڑے انجو پچھلے صحن سے نکل کر ادھر آ رہی تھی۔ صغراں نے یہ جملہ خاص طور پر اسے شاکی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا (گویا واقف ہیں کہ کس واسطے بھیجا ہے)۔

اور انجو اس گفتگو کے سیاق و سباق سے اچھی طرح واقف ہی تھی کہ آج کل جب دیکھو تب یہی ایک موضوع تو تھا جو ان کے درمیان زیر بحث رہتا تھا۔ صغراں کی جتاتی نظروں پر جز بز ہو گئی اور میتھی صغراں کے موڑھے کے پاس رکھ کر یوں ہی الجھی الجھی سی خاموشی سے پلٹ گئی۔

"ویر جی ملنا چاہتے ہیں تجھ سے۔" ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو صائمہ نے کمال سادگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مراد سے ہوئی بات چیت من و عن اسے بتاتے ہوئے شوخ و شنگ لہجے میں اسے چھیڑا تھا۔ "دیکھ اب انکار نہ کریں، پہلے ہی تو نے اپنی پھٹی سیدھی سوچوں میں غرق رہ کر اتنا وقت برباد کر ڈالا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ اسی وجہ سے اتنے اکھڑے اکھڑے رہ رہے ہیں سب سے...... پھر بتا...... چلے گی نا نہر پر؟"

اور اس وقت تو انجو نے خیر صائمہ کو کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر اب سوچ رہی تھی کہ واقعی بہت ہو گئی یہ آنکھ مچولی، اب تو جو ہوگا سو ہو جائے، اسے یہ ملاقات کرنی ہی تھی۔

☆......❁......☆

"سلام مالیکم......" انجو نے اعتماد سے قطعی عاری آواز میں سلام جھاڑا تو ایبک جو پہلے ہی انجو محترمہ کا "چوتھی کی دلہنوں والا لباس اور تیاری" اس بھری گرم دوپہر میں دیکھ کر سخت الجھن آمیز ناگواری محسوس کر رہا تھا، اس کے اس قدر اجڈ انداز سے سلام کرنے پر مکمل بھنا ہی تو گیا۔

یہ فرمائشی ملاقات اسی دن شام کو نہر پر تو نہیں، اگلے دن بے بو اور صغراں کے صائمہ کی والدہ کے بلاوے پر ان کے گھر جانے کے بعد انجو ہی کی گھر کی چھت پر، سر پر چمکتے سورج کے عین نیچے ہو رہی تھی۔ جگہ اور وقت کا تعین خود انجو نے کیا تھا اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اس وقت بے بو اور صغراں دونوں ہی گھر پر موجود نہیں تھیں۔ ہاں البتہ مراد اس وقت گھر سے کہیں باہر نکل گیا تھا جب کہ صائمہ، انجو کی "مورل سپورٹ" کی خاطر نیچے صحن میں الرٹ بیٹھی تھی۔

"وعلیکم السلام!" ایبک نے اپنے لہجے میں ابھرتی شدید ناگواری کو چھپانے کی کوئی کوشش نہ کرتے ہوئے جواباً کہا۔ "تم اتنے دن خواہ مخواہ مجھ سے چھپی رہیں حالانکہ میں تم ہی سے ملنے کی خاطر یہاں آیا تھا۔" اس نے لگے ہاتھوں جتانا ضرور سمجھا۔

اس کی اس بات پر چھت سے دکھائی دیتے عقبی صحن پر نظریں جمائے، ایبک سے دانستہ رخ موڑے کھڑی انجو نے بے ساختہ پورا گھوم کر اس کی جانب دیکھا۔

وہ سرمئی رنگ کی ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر کے اوپر

ایک مشہور برانڈ کی سفید ٹی شرٹ پہنے اور سر پر سرمئی، سفید اور کالے رنگ کی پی کیپ اوڑھے کھڑا تھا۔ دائیں ہاتھ میں اس نے پانی کی ایک لیٹر والی بوتل تھام رکھی تھی جس میں سے وہ وقفے وقفے سے گھونٹ لے رہا تھا۔ انجو کے یوں منہ اٹھا کر خود کو دیکھنے پر اب کی بار اس نے بھی ذرا تفصیلی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا (حلیہ تو خیر پہلے ہی دیکھ کر اسے نان سینس کا خطاب دے چکا تھا)۔ ستواں ناک میں بڑا کوکا؟ شہد رنگ بادامی، بڑی بڑی پلکوں سے سجی آنکھیں، کمان دار بھنویں، بھرے بھرے ہونٹ...... کالے گھنگھریالے بال، لمبا قد، متناسب سراپا...... اس لڑکی سے اگر جہالت اور حماقت آمیز تاثرات منہا کر دو تو ٹھیک ٹھاک خوب صورت اور دلکش لڑکی تھی مگر وائے افسوس......

''آپ کیوں ملنا چاہتے تھے جی مجھ سے؟'' انجو نے ایبک کی گہری جائزہ لیتی نظروں کے ارتکاز پر شرما کر چہرہ جھکاتے ہوئے گھبراہٹ زدہ لہجے میں پوچھ کر ایبک کی کوفت میں اضافہ کیا......

''ہیل......!'' ایبک نے جو اسے دیکھتے ہوئے نجانے کن سوچوں میں مستغرق تھا اس کے سرخ پڑتے رخسار اور لڑکھڑاتی آواز پر گویا ہوش میں آ کر بے طرح جلبلاتے ہوئے نجانے کس ذات شریف پر لعنت بھیجی۔ اب پتا نہیں کیا سوچ اور سمجھ کر شرما رہی تھیں محترمہ!

''پاگل تھا، دماغ خراب ہو گیا تھا میرا۔'' اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔

''تو آپ کا علاج نہیں کروایا تایا جی نے؟'' انجو نا محسوس انداز سے اس سے دو تین قدم مزید دور ہو کر ہراساں نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں پوچھنے لگی۔

''اوہ مائے گاڈ!'' بے بسی سی بے بسی تھی، اسی لیے ایبک کو اس بات کا کوئی جواب دینے کے بجائے اس لمحے خدا کو یاد کرنا زیادہ بہتر لگا مگر اس وقت تپش کے بادشاہ اپنے مکمل جوبن پر تھے اس لیے جلد ہی اپنا چہرہ ایبک کو نیچے کرنا پڑا اور سورج کی روشنی سے اپنی چندھیائی ہوئی آنکھیں ہنوز اپنی جانب دیکھتی انجو کو دیکھ کر برا سا منہ بنا کر بولا۔

''علاج کی ضرورت دراصل مجھے نہیں تمہیں ہے۔''

''نہیں جی...... میرا علاج تو پچھلے سال ہو گیا تھا، آپ کو بتایا نہیں تائی جی نے۔'' اس نے گڑبڑاتے ہوئے کہا تو اس بار وہ چونک پڑا۔

''تمہارا علاج؟'' اس نے پوچھا۔ ''تمہارا کس چیز کا علاج ہوا تھا؟''

''وہ ناجی مجھے ''تھے پھیڈ'' ہو گیا تھا۔'' اس نے گردن جھکا کر مجرمانہ لہجے میں بتایا۔

''واٹ......'' اس نے عجیب سے لہجے میں دہرایا۔ ''تھے پھیڈ...... یہ کون سی بیماری ہے۔''

''وہ...... وہ جی تھے پھیڈ نہیں ہوتا...... وہ تپ...... میرا مطلب ہے جی کہ بخار جو آسانی سے جان نہیں چھوڑتا، سوئیاں لگوانی پڑتی ہیں اور ہاں وہ ڈرپاں وی (یعنی ڈرپس)۔''

''تم غالباً ٹائی فائیڈ کہنا چاہ رہی ہو؟ ایم آئی رائٹ؟'' ایبک ٹھہر ٹھہر کر سوچتے ہوئے اس کی جانب تائیدی نگاہوں سے دیکھ کر کہا، وہ بے طرح خوش ہو گئی۔

''جی ہاں...... رائٹ رائٹ...... وہی تو ہوا تھا۔'' اور خوش بھلا کیسے نہ ہوتی اس نے اتنی مشکل پہیلی جو بوجھ لی تھی۔

''مائے گاڈ......!'' وہ دونوں ہاتھ سے اپنا سر تھامتے ہوئے یوں ہی زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

''کیا ہوا جی...... کیا ہوا؟'' انجو لپک کر اس تک آئی اور گھبرا کر پوچھنے لگی۔

اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے ہاتھ میں پکڑی بوتل سے دو گھونٹ پانی پیا' یک لحظہ کسی بات پر غور کرنے کے بعد دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا تو ضرورت سے زیادہ سنجیدہ دکھائی دیتا تھا جب کہ بے چاری انجو اس دوران ہونق بنے سے مسلسل اس کی حرکات و سکنات کو

بغور دیکھ رہی تھی۔

''تمہاری ایجوکیشن...... میرا مطلب ہے کہ تعلیمی کتنی ہے؟'' یہ اٹھنے کے بعد ایبک کا انجو سے پہلا سوال تھا۔

''آپ کو نہیں بتایا تائی جی نے؟'' اس کے پاس غالباً ایبک کے ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا۔

''مجھے ان لوگوں نے کچھ بھی نہیں بتایا سوائے اس کے کہ تم دادی محترمہ کی خواہش پر میری زندگی میں شامل کی جا رہی ہو۔'' وہ ناراضی سے بولا۔

''اچھا جی؟'' انجو نے حیرت سے کہا۔ ''آپ نے خود سے پوچھ لینا تھا اگر ان لوگوں نے آپ کو کچھ نہیں بتا رکھا تو...... اب دیکھیں نا...... مجھے تو آپ کے بارے میں سارا کچھ پتا ہے۔'' اس نے سیانے پن سے کہا۔

''مثلاً کیا پتا ہے؟'' ایبک نے آنکھیں چندھی کر کے اسے دیکھا، کیوں کہ سورج اب عین اس کی پشت پر آ گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی جانب دیکھنے میں ایبک کو اب دقت محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ اب یا تو جس رخ پر وہ کھڑی تھی اسے تبدیل کر لیا جاتا یا اپنے زاویہ نگاہ کو بدل لیا جاتا کیونکہ ہوتا ہے نا کبھی ایسا بھی کہ آپ کا پس منظر آپ کی ذات کو اوروں کی نظر میں دھندلا کر دیتا ہے، اس کے ساتھ بھی ابھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

''یہی کہ آپ باقاعدہ پڑھ لکھ کر درزی بنے ہو۔'' اس نے مسکرا کر بتایا۔

''اوہ......'' اس نے خفگی سے اس کی تصحیح کی۔ ''درزی نہیں...... فیشن ڈیزائنر ہوں میں۔''

''اچھا'' وہ قدرے خجل ہو گئی۔ ''درازی کو انگریزی میں یہ کہتے ہیں، مجھے معاف کر دیں مجھے معلوم نہیں تھا۔'' وہ اداس ہو گئی۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' جب سب کچھ سامنے اور واضح تھا ایسے میں ایبک کو انجو سے مزید سوالات کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف محسوس ہوا اور اسی لیے اب اس نے صاف صاف وہ کہنے کی ٹھانی جو کرنے آیا تھا۔

''اگر ہم دو مختلف ماحول میں پلے بڑھے، مختلف خیالات کے مختلف انسان ایک ہو بھی گئے تو کیا ہم اپنی آئندہ زندگی میں خوش رہ سکیں گے؟'' اس نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا اس بات پر انجو کے چہرے پر سوچ کے سائے لرزاں ہو گئے تھے (صد شکر...... اتنی عقل مند تو بہر حال وہ تھی)۔

''میں سوچ بھی لوں تو اس سے کیا فرق پڑے گا، وہ تو دادی......'' اس نے تاسف سے کچھ کہنا چاہا مگر ایبک نے اس کی بات تیزی سے قطع کر دی۔

''دادی کی خواہش اپنی جگہ لیکن کیا کسی کے دنیا سے چلے جانے والے شخص کی خواہش اتنی اہم ہے کہ اسے پورا کرنے کی خاطر دو جیتی جاگتی زندگیاں تباہ و برباد کر دی جائیں؟'' ایبک نے فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے اسے سمجھانا چاہا۔ ''دیکھو انجو! اگر یہ شادی ہو بھی گئی تب بھی ہمیں حاصل کچھ نہیں ہو گا۔ کیوں کہ میں ایک پریکٹیکل قسم کا انسان ہوں مجھے ویل ایجوکیٹڈ، ماڈرن اسمارٹ جیون ساتھی کی خواہش ہے اور اپنا لائف پارٹنر چوز کرنا میرا حق ہے، کیا سمجھیں؟'' اس نے اپنی بات مکمل کر کے یونہی سر جھکائے گو مگو سی کھڑی انجو کو دیکھا۔ اسے یقیناً ایبک کے سخت الفاظ نے اندر سے کہیں زخمی کر دیا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اسے اپنی باتوں سے مضمحل کر دینے کے بعد اس کا اترا چہرہ دیکھ کر خود اسے بھی کوئی خاص اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر وہ بھی کیا کرتا۔ عبدالکریم صاحب کی بے جا ضد اور حالات نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے یہ بوگس تاویل دے کر خود کو مطمئن کیا اور گلا کھنکارتے ہوئے گویا خواہ مخواہ محسوس ہوتی شرمندگی کو زائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نپے تلے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''آئی ہوپ...... تم نے میری کسی بات کا برا نہیں منایا ہو گا، دراصل میں تم سے یہ ہی باتیں کرنے کے لیے ملنا چاہ رہا تھا، اب چلتا ہوں، دیر ہو رہی ہے۔ ابھی پیکنگ بھی کرنا باقی ہے، او کے گڈ بائے گڈ

گرل، زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔" اس نے خود غرض لوگوں کی طرح اپنی بات مکمل کی اور بنا اس کی سنے واقعی مڑ کر چلا بھی گیا۔

انجو نے بڑی خاموش نظروں مگر استہزائیہ مسکراہٹ سے اس کی پشت کو دیکھا تھا۔ ایبک اپنے زعم میں تھا اس لیے غور نہیں کر سکا کہ کچھ سوالوں کے جواب انجو کو بھی درکار تھے اور جو اس ملاقات کے بعد اسے مل چکے تھے مگر اسے اس وقت خاموش ہی رہنا تھا، واضح رہے صرف اس وقت......

☆......❁......☆

"دیکھا! تو یہ تھی مام اور ڈیڈ کی نظر میں میرے لیے سو کالڈ ہر لحاظ سے بہتر لڑکی۔" ایبک کے بلند لہجے میں اپنے اندازوں کے سو فیصد درست ثابت ہو جانے کا غرور بدل رہا تھا۔ باہر شام ڈھل رہی تھی، ڈوبتا سورج اور پرندے واپسی کے سفر پر تھے اور خود ایبک اور مراد بھی اس وقت کمرے میں اپنا مختصر سامان سمیٹتے ہوئے محو گفتگو تھے۔

"چل اب غصہ مت کر۔" مراد خلاف طبیعت بجھے بجھے سے لہجے میں بولا۔ "تُو جس لیے یہاں آیا تھا، تیرا وہ کام تو آخر کار ہو ہی گیا نا۔" اس نے بے دلی سے اپنی شرٹ بیگ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

"کہاں ہوا ہے یار!" ایبک نے ڈیوڈرنٹ بیگ کی باہر کی جیب میں ڈال کر زپ بند کی۔ "ابھی آدھا اور بنیادی کام تو باقی ہے۔"

"اب وہ کیا ہے؟" مراد کی پیکنگ مکمل ہو گئی تھی، اس نے بیگ بند کیا اور سامنے والے صوفے پر رکھ کر بے زاری سے پوچھا۔

"تُو کیوں اتنا ڈل ہو رہا ہے؟" ایبک نے بھی بیگ نیچے مسہری کے ساتھ ہی رکھ دیا اور اس کا مرجھایا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔ "سارا دن گرمی میں باہر پھر پھر کر کہیں تجھے بھی تو تاپ نہیں چڑھ گئی؟"

"آہ......" اس نے ایک مجنونانہ قسم کی ٹھنڈی سانس بھری اور ڈھیلے ڈھالے انداز سے صوفے پر ڈھے گیا۔ "پتا نہیں کیا بات ہے، واپس جانے کے خیال سے دل بھاری سا ہو رہا ہے۔"

"رئیلی؟" ایبک نے تعجب سے اسے دیکھا۔ "کہیں تُو نے یہاں کسی مٹیار سے دل تو نہیں لگا لیا؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"آہ......" اور پھر دوبارہ آہ۔ اب کی بار مراد نے باقاعدہ چھت کی جانب دیکھ کر ڈبل آہ بھر کے نجانے کیا جتانا یا بتانا چاہا تھا ایبک کو، اس نے کیا خاک سمجھنا تھا الٹا اس پر ناراض ہو کر کہنے لگا۔

"او بھائی!" اب یہ اپنے ڈرامے بند کر اور جلدی سے کچھ سوچ...... کچھ سوچ کہ وہاں جا کر مام، ڈیڈ کو انجو کے بارے میں کیا کہنا ہے۔ دراصل میں اس بار ان کے سامنے اپنا کچھ ایسا موقف پیش کرنا چاہ رہا ہوں جسے سن کر وہ نہ صرف ناراض ہوئے بغیر میرے نقطہ نظر کے قائل ہو جائیں بلکہ مزید اصرار کرنا بھی ترک کر دیں۔" وہ بولتے بولتے اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔

"اچھا!" مراد نے شدید اکتائے لہجے میں کہا۔ "سوچتے ہیں کچھ...... فی الحال تو میری جان چھوڑ کر وہاں بستر پر بیٹھ جا اور مجھے سونے دے۔" اس نے کہتے ساتھ ہی صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے اپنی ٹانگیں بھی پھیلا لیں تو ناچار ایبک کو وہاں سے اٹھنا ہی پڑا۔

"یہ کون سا وقت ہے سونے کا؟" مگر اٹھتے اٹھتے طنزیہ انداز سے کہنا نہیں بھولا تھا مگر مراد نے اسے کوئی بھی جواب دینے کے بجائے صوفے کا کشن نکالا اور سر پر رکھ کر سوتا بن گیا۔

"ہیں......" ایبک اچنبھے میں پڑ گیا۔ "اسے کیا ہوا؟" اس نے حیران ہو کر خود کلامی کی پھر بستر پر بیٹھ کر اپنی معاون زوبی کو کال ملا کر اپنی کل آمد کے بارے میں بتاتے ہوئے ضروری ہدایات دینے لگا۔

☆......❁......☆

اور اپنے تئیں اس گاؤں میں اپنی آخری شب گزار لینے کے بعد، جب وہ کسی کے بے طرح بے صبری سے دروازہ کھٹکھٹانے پر جس دم ہڑبڑا کر بے دار ہوا، اس کے سان و گمان میں بھی کہیں اس صورت کی یہاں، اس جگہ موجودگی کا امکان نہیں تھا کہ جو دروازہ کھولنے پر اسے دکھائی دی تھی۔

"مام...... آ آ...... آپ...... یہاں......" آن واحد میں نیند کا سارا خمار اڑن چھو ہو گیا۔

"ہاں میں...... کیوں سسرال ہے میرا، کیا میں یہاں نہیں آ سکتی؟" کسی بھی قسم کی مسکراہٹ یا سلام دعا سے نوازے بغیر اسے خاصے روکھے انداز میں جتا کر، ہنوز دروازے کے فریم میں ایستادہ ایبک کو ہاتھ سے کنارے دھکیلتے ہوئے وہ اندر داخل ہوتی چلی گئیں۔

"ڈیڈ...... ڈیڈ کہاں ہیں...... مام بتائیں نا، سب خیریت تو ہے نا؟" وہ ان کے پیچھے پیچھے آتا ہوا پریشان آمیز جھنجلاہٹ سے پوچھے گیا۔

"تمہیں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت ہیں۔" وہ اس کی جانب گھوم کر لتاڑنے والے لہجے میں بولیں۔ "سب خیریت...... اور چوہدری صاحب بھی ساتھ ہی آئے ہیں میرے۔" اسی اثنا میں ان کی تکرار سن کر مراد بھی بے دار ہو گیا تھا اور منہ اٹھائے بنا کوئی سوال جواب کیے صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مگر کچھ پتا تو چلے کہ آخر آپ لوگوں کی اس طرح اچانک یہاں آمد کا کیا مطلب ہے؟" سوچ سوچ کر اس کا دماغ بند ہوا جا رہا تھا۔

"اوہ......" پھر وہ یک دم ہی بری طرح چونک پڑا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ لوگ زبردستی میرا نکاح انجو سے پڑھوانے کے لیے یہاں تشریف لائے ہوں۔" اس نے غصہ، جھنجلاہٹ، تشویش جیسے ملے جلے تاثرات سے مہر النساء کا خفا، سنجیدہ جمع کچھ کچھ رنجیدہ چہرہ دیکھا۔

مراد بھی ایبک کے اندیشے پر چوکنا ہو کر بیٹھ گیا، مہر النساء کے تاثرات ایسے تھے کہ کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ ہوئی وگرنہ زبان تو پھڑکنا شروع ہو چکی تھی۔

"بہت افسوس ہے مجھے تمہاری احمقانہ سوچ پر ایبک!" وہ متاسف لہجے میں بولیں۔ "اگر یوں زور زبردستی کرنا ہی مقصود تھا تب تمہیں یہاں بھجوانے کا کیا مطلب تھا؟" وہ خفگی سے کہے گئیں۔ "بہر حال! ان باتوں کا وقت گزر چکا، اب تو فیصلے کی گھڑی ہے۔ جاؤ جا کر ہاتھ منہ دھو کر آؤ اور میرے ساتھ بڑے کمرے میں چلو، وہاں ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔"

☆......❁......☆

اور ٹھیک پندرہ منٹ بعد جب وہ مہر النساء کے ہمراہ ہال کمرے میں داخل ہوا، کمرے کی فضا اور جملہ حاضرین جن میں چوہدری عبد الکریم جو اس وقت سفید براق کھڑکھڑاتے شلوار کرتے میں واقعی روایتی چوہدری دکھائی دیتے تھے کے علاوہ چاچی صغراں اور بے بو کو از حد سنجیدہ بلکہ خوف ناک حد تک سنجیدہ چہرے بتا رہے تھے کہ بات بہت گمبھیر اور غیر معمولی ہے۔ ایبک جوں ہی صوفے پر آ کر بیٹھا، سر جھکائے ملول و متفکر سے بیٹھے چوہدری صاحب نے سر اٹھا کر بے ساختہ اسے خوں خوار نگاہوں سے دیکھا۔

"السلام علیکم ڈیڈ!" اس نے زبردستی مسکرا کر ڈرتے ڈرتے سلام جھاڑا۔

"سلام کے بچے!" وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی پوری قوت سے چلا کر بپھرے انداز سے بولے۔ "نہ تجھے اس لیے بھجوایا تھا ادھر کہ تُو ساری برادری میں ہماری عزت کا تماشا بناتا پھرے۔" ان کے نتھنے پھڑکنے لگے۔

"وے کریمے...... ہولا ہو جا، جوان پتر ہے۔" بے بو نے سرزنش کی۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آخر میں نے یہاں ایسا کیا کیا ہے جو آج یوں یہ عدالت لگائی گئی ہے میرے لیے۔" ایبک نے بگڑ کر پوچھا۔ معاملہ اب اس کی سمجھ میں کچھ کچھ آ رہا تھا یقیناً ان لوگوں تک اس کی کچھ ایسی شکایات پہنچائی گئی تھیں جس کے نتیجے میں وہ لوگ اس وقت یہاں موجود تھے۔

"میں بتاتی ہوں......" اسی لمحے سفید سیدھے پاجامے کے اوپر گہری نیلی تھری ڈی پرنٹڈ آدھی

آستینوں والی لمبی قمیص پر خوب لمبا کاٹن کا سفید ہی دوپٹا سلیقے سے اوڑھے، گھنے کالے تراشیدہ بالوں کو اونچی سی پونی میں قید کیے کوئی دلکش، پراعتماد اور اسٹائلش سی لڑکی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے صاف اور واضح آواز میں بولی تو سب ہی نے بے ساختہ چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''میں آپ کو بتاتی ہوں مسٹر ایبک چوہدری کہ آپ نے کیا کیا ہے اور دراصل آپ یہاں کیا کرنے اور کس مقصد سے آئے تھے؟'' وہ پُراعتماد چال چلتی ہوئی آئی اور آ کر بے بو کے برابر چارپائی پر براجمان ہوگئی۔

''آپ کون؟'' ایبک نے بہت الجھی الجھی نگاہوں سے اس کا شناسا سا چہرہ دیکھا۔

''میں وہی..... اجڈ، جاہل، گاؤں کی گنوار، بارہ من کی دھوبن انجمن! جو آپ کے خیال میں آپ سے شادی کرنے کے لیے مری جارہی تھی۔'' اس نے استہزائیہ لہجے میں کہتے ہوئے گویا دھماکا کیا تھا۔ باقی سب تو یوں ہی بیٹھے تھے مگر ایبک وہ ششدر رہ گیا۔

''مگر تم تو..... وہ تو.....'' مارے تحیر کے اس کے منہ سے بے ربط سے جملے نکلے۔ ''پھر وہ کون تھی جسے میں نے پہلے دیکھا تھا۔''

''وہ وہی تھی جسے آپ دیکھنے کی خواہش اور سوچ لیے یہاں آئے تھے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے کچھ ناپسندیدگی، کچھ ناسمجھی سے اس کی جانب دیکھ کر استفسار کیا تب انجمن نے ایک لحظہ کچھ سوچ کر جملہ حاضرین جو ظاہر ہے کہ اسی کی جانب متوجہ تھے کے چہروں پر جانچتی نظر ڈالنے کے بعد کہنا شروع کیا۔

☆......۞......☆

اگر ایبک چوہدری اپنے والدین کا لاڈلا تھا تو وہ بھی اپنے ماں باپ کی نازوں پلی تھی بلکہ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جاتا تو ماں سے زیادہ اسے باپ نے نخریلا بنا رکھا تھا۔ لاڈ بھی وہی زیادہ کرتا تھا، دادی جی اکلوتے پوتے کے فراق میں ہوکے بھر بھر کے اکلوتی پوتی ہی پر جان چھڑک لیا کرتی۔ الغرض اس کی پرورش، تعلیم و تربیت بہت اچھے انداز اور پنڈ کے دیگر گھرانوں کی بہ نسبت بہتر ماحول میں کی گئی۔ پڑھائی میں بہت اچھی تھی، ہر جماعت میں امتیازی نمبر لے کر پاس ہوتی۔ والد کی مکمل سپورٹ حاصل ہونے کی وجہ سے میٹرک بہت اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد فیصل آباد کے گرلز کالج میں داخلہ لے لیا اور وہیں گرلز ہاسٹل میں رہائش اختیار کرلی۔ صغراں متردد تھی اور متفکر بھی مگر عبدالسلام نے اسے سمجھا بجھا کر قائل کر ہی لیا۔ وہ بھی اکلوتی بیٹی کے اچھے مستقبل کی خاطر خاموش ہوگئی اور ابھی انجمن کو کالج جاتے محض آدھا برس ہی بیتا تھا کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ یہ ان دونوں ہی کے لیے بڑا صدمہ تھا، صغراں کا تو بہت ہی برا حال تھا۔ ممکن تھا کہ انجو ان کی تنہائی اور برادری کے خیال سے اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ ہی دیتی مگر اس موقع پر تایا جی نے اس کی بھرپور ہمت افزائی کی۔ اسے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے اس معاملے میں بھرپور امداد بلکہ ہر طرح کی ''مورل'' اور فنانشل سپورٹ کی بھی مکمل یقین دہانی کروائی اور یہی وہ وقت تھا جب اس کے اور ایبک کے مابین موجود رشتے کو جلد ہی کسی مضبوط بندھن میں باندھنے کے عزم کا ازسرنو دونوں فریقین کی جانب سے اعادہ کیا گیا۔ اسے معلوم تھا اس رشتے کے بارے میں کہ بچپن سے سنتی آرہی تھی اسے اس نام سے انسیت تو بہرحال تھی مگر سچی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں فی الحال کوئی جذبہ محسوس نہیں کیا کرتی تھی لیکن اسے اس رشتے پر اعتراض بھی کوئی نہیں تھا کہ اسے اپنی دادی محترمہ کی خواہش اور والد مرحوم کی عزت کا پاس بھی تھا اور احساس بھی۔

بہرحال یوں ہی تین، چار سال کا عرصہ گزر گیا، انجمن نے جی سی یونیورسٹی سے اپنا بی ایس مکمل کرلیا تب صغراں نے بذریعہ بے بو عبدالکریم تک اپنا پیغام پہنچایا کہ اب وقت آگیا ہے کہ امانت، امانت دار

کے سپرد کردی جائے اور انہیں بھلا کیا اعتراض تھا اور اس مرحلے سے ایبک چوہدری کی طرف کی کہانی شروع ہوئی۔ انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ اس بات پر اس طرح کا اور اتنا شدید ردعمل ظاہر کرے گا، الغرض جب وہ کسی صورت بھی ان کی بات ماننے کو تیار نہ ہوا تو عبدالکریم نے اپنی معاملہ فہم شریک حیات کے سمجھانے پر حکمت سے کام لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے اسے یہاں بھجوانے کا ارادہ کیا۔ مہرالنساء ہی نے صغراں تک اپنا مدعا مناسب ترین لفظوں میں پہنچاتے ہوئے ان سے بس اتنا ہی کہا۔

''اور تو کوئی بات نہیں بس ایبک ذرا شادی سے پہلے ایک بار کچھ وقت وہاں آکر گزارنا چاہتا ہے، اچھا ہے نا..... یوں دونوں ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیں گے۔ شادی سے پہلے ایک ملاقات ہوجائے تو ہرج ہی کیا ہے؟'' انہوں نے ہنستے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا مگر صغراں یہ سن کر پریشان سی ہوگئیں۔ کیسے نہ ہوتیں آخر لڑکی کی ماں تھیں، مہرالنساء کے لیے یہ شاید اتنی بڑی اور اہم بات نہ ہو مگر ان کے نزدیک تھی۔ وہ الجھ گئیں، متفکر ہو کر بے بو سے مشورہ کیا، اس موقع پر ایسی بات کا کیے جانا ان کے لیے بھی اچنبھے اور ناپسندیدگی کا باعث تھا مگر کچھ سوچ کر انہوں نے بس اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا کہ۔

''منڈا آنا چاہتا ہے تو آنے دے..... آخر اس کے چاچے کا وی تو گھر ہے نا اور پھر انجو کون سا ادھر کلی ہوگی، ہم سارے وی تو ادھر ہی رہندے نے۔'' یوں صغراں کچھ مطمئن ہوگئیں مگر یہ بات جب انہوں نے اپنی سپتری کے گوش گزار کی تو اس کا ردعمل ہرگز بھی حوصلہ افزا نہیں تھا۔

''اتنے سالوں میں تو کبھی یہاں آیا نہیں، اب کیا کرنے آرہا ہے؟'' اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''سمجھا کر انجو!'' صغراں تھکے تھکے سے لہجے میں بولیں۔ ''میں جانتی ہوں ادھر آنے کا تو خالی خولی بہانہ ہی ہے، ملنے دراصل وہ تجھ سے ہی آرہا ہے۔''

''مگر یہ کون سا موقع ہے ملاقات کرنے کا؟'' اس نے برہمی سے کہا۔

''آپ کو سنتے ہی صاف منع کردینا تھا۔''

''میں تیری ماں ہوں یا تو میری۔'' اس کے بحث کرنے پر صغراں بھڑک ہی تو اٹھیں۔ ''ہاں نہیں تو.....'' ایک تو وہ پہلے ہی خاصی پریشان تھی اوپر سے اس پڑھی لکھی انجو کی جرح..... ''تو مجھے یہاں کھڑی ہو کر مشورے دے رہی ہے تو..... اور کان کھول کر سن لے تو اچھی طرح..... اگر تو نے اس کے سامنے کوئی پٹھی سیدھی بات کی تو اچھا نہیں ہوگا۔'' اب اس کے سوالات اور بحث و تمحیص سے بچنے کا یہی ایک راستہ تھا کہ وہ اپنے ماں ہونے کا رعب جماتیں اس پر، لہٰذا انہوں نے وہ ہی کیا اور اس وقت تو خیر وہ خاموش ہوگئی مگر دل ہی دل میں مختلف اندازے لگانے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کی یہ بے موقع آمد بے سبب نہیں..... تو پھر وجہ تھی کیا آخر؟

اور یہ جاننے کے لیے اسے نہ زیادہ تردد کرنا پڑا نہ انتظار.....

☆......۞......☆

''ہاں تو فکر کر کے کیا کروں؟'' بند دروازے کے عقب سے کسی مرد کی بے زاری سے بھرپور، نخوت زدہ سی آواز گونجی۔

''اس جاہل، گنوار اجڈ انجمن سے شادی؟'' وہ بے بو کے ہمراہ بس ابھی ابھی ہی گھر میں داخل ہوئی تھی، صغراں کا شہری داماد اس کے گھر پہنچ جانے کی اطلاع اسے وہیں کوثری کے گھر مل چکی تھی۔ مارے اشتیاق اور تجسس کے، اس کے ساتھ اس وقت آنا تو صائمہ بھی چاہتی تھی کہ اس کا دل یوں بھی اپنے گھر کے بجائے صغراں خالہ کے ہاں اور انجو کے ساتھ زیادہ لگتا تھا مگر ماں نے جھڑک کر وہیں روک لیا کہ شادی والا گھر تھا۔

بہرحال! انجو نے دیکھا کہ صغراں باورچی خانے میں بیٹھی، شوکیس سے مہمانوں کے لیے نکالے جانے والے شیشے کے خوب صورت و نفیس کپوں میں

چائے چھان رہی تھیں، اس پر نظر پڑی تو مصروف سے انداز میں بولیں۔

"اچھا تو تُو آ گئی، چل شاواشے، ذرا یہ چائے تو دروازہ بجا کر ایبک کو دے کر فوراً آ۔" وہ منہ بنا کر انکار کرنا چاہتی تھی مگر پھر نجانے کیا سوچ کر ٹرے تھام لی، صغراں اب پانی سے بھرا گھڑا چولہے پر چڑھا رہی تھیں۔

یوں وہ بادل ناخواستہ چائے لیے اس کمرے کے باہر کھڑی تھی اور اب سوچ رہی تھی کہ اچھا ہی ہوا جو صغراں چائے لے کر نہ آئیں۔ اندر ایک سو ساٹھ کی رفتار سے چلتی ایبک کی زبان اس کے بارے میں ہتک آمیز جملے کہنے میں مشغول تھی۔ انکار خود اسے کرنا تھا اور یہاں دراصل وہ انجو کا کندھا استعمال کرنے آیا تھا۔ تین منٹ سے بھی کم عرصے میں انجو اس کے ارادوں اور عزائم سے باخبر ہو چکی تھی۔ مارے طیش کے اس کے پورے وجود پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔

یعنی کہ اس قدر گھٹیا سوچ رکھتا تھا وہ اس کے لیے...... اور مستزاد اس کا توہین آمیز انداز گفتگو...... اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ابھی اور اسی وقت کمرے میں داخل ہو اور اس مغرور انسان کا گریبان پکڑ کر پوچھے کہ آخر اس کی ہمت کیسے ہوئی اس کے بارے میں اس طرح کی سخت زبان استعمال کرنے کی...... وہ نہ تو کوئی گری پڑی لڑکی تھی اور نہ ہی اس جیسے شہزادے گلفام سے شادی کے لیے مری جا رہی تھی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اپنے جیون ساتھی کے حوالے سے اس کے کچھ خواب تھے، جو وہ پس پشت ڈال کر اپنے بڑوں کے فیصلے پر سر جھکائے ہوئے تھی کہ کہیں اس کی تعلیم و تربیت اور مرحوم شفیق باپ کی عزت و توقیر پر کوئی حرف نہ آ جائے...... اور یہ موصوف ایبک چوہدری......

اور اس وقت...... وہیں کھڑے کھڑے ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتے ہوئے اس نے ایک فیصلہ کیا تھا کہ نہ ہی وہ اس ایبک کے سامنے آئے گی اور نہ ہی اس سے کوئی ملاقات ہی کرے گی۔ وہ ہوتا کون ہے اسے دیکھنے کے بعد مسترد کرنے والا؟

اور اسی لیے وہ اس کے سامنے نہ جانے کے اپنے ارادے پر سختی سے کاربند رہی اور کاربند ہی رہتی اگر جو اس روز اتفاقاً کوثری کی شادی میں ان دونوں کا سامنا نہ ہو جاتا۔

اس روز والا وہ "آئٹم" اس نے اور صائمہ نے محض تفریحاً کیا تھا۔ وگرنہ عقل کی بات تو یہ ہے کہ عام زندگی میں کون اتنے چمکیلے، بھڑکیلے لاچے کرتے پر بھاری جیولری پہن کر اور چڑیلوں والا میک اپ کر کے شادیوں میں شریک ہوتا ہے آج کل...... گاؤں، دیہات میں بھی کوئی نہیں ہوتا...... مگر ایبک کے چہرے کے تاثرات سے تو لگتا تھا کہ جیسے اسے انجو کے بارے میں اپنے اندازوں کی صداقت پر مزید یقین آ گیا ہو...... جب کہ انجمن اسے یوں خود پر مسلسل نظریں جمائے دیکھ کر خفت زدہ سی ہو کر فی الفور منظر سے غائب ہو گئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ انجو کو ایبک کی نگاہوں سے جھلکتے تمسخر نے شدید رنج پہنچایا تھا حالانکہ خود اس نے بھی یوں روبرو ایبک کو اس عرصے میں پہلی بار ہی دیکھا تھا، مگر اسے اپنے دل میں کوئی اور جذبہ محسوس نہ ہوا، سوائے ناپسندیدگی کے اور اس کے دل میں جنم لیتی یہ ناپسندیدگی درحقیقت خود ایبک کے ناروارویے کی دین تھی۔

پھر اس "دیدار" کے بعد جب ایبک نے بلاواسطہ اس سے بالمشافہ ملاقات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تب تک وہ خود ہی اس چوہے بلی کے کھیل سے تنگ آ چکی تھی۔ صغراں کی ناراضی اور سوال و جواب نے الگ اسے پریشان کر رکھا تھا۔ پس یہ ہی سوچ کر کہ اب جو ہو دیکھا جائے گا۔ اس نے ایبک سے پہلی اور آخری ملاقات کرنے کی ٹھان ہی لی تھی۔

☆......❁......☆

"میں نہیں جانتی تھی کہ آپ میری ذات سے اتنے لاعلم کیوں رہے...... یا رکھے گئے؟" کمرے پہ طاری گہرے سناٹے میں ایک مرتبہ پھر انجو کی ہموار آواز گونجی۔ "بہرکیف! معاملہ جو بھی تھا...... آپ میرے متعلق جس شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار تھے میں نے اسے دور کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ آپ کو اگر اس رشتے پر اعتراض تھا، تب تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ بجائے یہاں آ کر میرا کندھا استعمال کرنے کے آپ وہیں اپنے والدین کے سامنے اپنے انکار پر ڈٹ جاتے، مگر افسوس کہ آپ نے کم ہمتی اور کم ظرفی کا مظاہرہ کیا اور میری ذات کو مشق ستم بنانے کی خاطر یہاں چلے آئے...... اور جناب ایبک صاحب!" اس نے ایک طنز آمیز مسکراہٹ اپنا "سچ" جاننے کے بعد منہ کھولے ہک دک سے بیٹھے ایبک کی جانب اچھالی۔ "آپ مجھ سے رشتے سے کیا انکار کریں گے۔ میں آج خود سب کے سامنے آئندہ زندگی میں آپ جیسے بزدل اور سطحی انسان کا ساتھ قبول کرنے سے انکار کرتی ہوں۔" اس نے پھنکارتے لہجے میں گویا دھماکا کیا۔

"یہ کیا بکواس کر رہی ہے تُو انجو۔" اتنی دیر سے گم صم بیٹھیں، اس کی تقریر سنتی صغراں نے دہل کر اسے دیکھا۔

"کڑی ٹھیک کہہ رہی ہے وے صغراں!" سنجیدہ سے لہجے میں بے بو نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "ساس تو تیری گزر گئی۔ اس کا ارمان اپنی جگہ پر جب منڈا ای تیار نہیں تے زور زبردستی نال اس رشتے نوں جوڑنے دا کی فیدہ۔" ان کا لہجہ گہرا تھا۔ صغراں ان کی بات پر، منہ پر دوپٹا رکھ کر بے اختیار سسک اٹھیں۔ مہرالنسا کی آنکھیں بھی چھلک اٹھیں، اچھا شرمندہ کروایا تھا آج ان کی اولاد نے انہیں سب کے سامنے، اب وہ روتی نہ تو اور کیا کرتیں۔ چوہدری عبدالکریم الگ شرمندہ، ملول، رنجیدہ و دل گرفتہ سے سر نیہوڑائے بیٹھے تھے۔

"اماں اور تائی جی پلیز...... آپ دونوں یوں مت روئیں۔" انجو نے بے چین ہو کر ملتجی لہجے میں کہا۔ "آپ سب کے سامنے ان حقائق سے پردہ اٹھانا ناگزیر تھا...... ورنہ یہ ایبک تو مجھ پر کوئی بھی الزام لگا کر آپ سب کی نظروں میں مجھے ہمیشہ کے لیے گرا سکتا تھا، ان فیکٹ، یہ تو یہاں کرنے یہ ہی کام آیا تھا۔" اس کا لہجہ چٹخنے لگا۔

"ایسی انتہائی بات مت کرو انجمن۔" اس تمام عرصے میں ایبک نے پہلی بار خود پر کوئی "الزام" لگتا محسوس کیا تو بے ساختہ تیز لہجے میں اسے ٹوک بیٹھا۔

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" مگر انجو نے اس کے احتجاجی لہجے کا کوئی خاص نوٹس نہ لیتے ہوئے اب کی بار براہ راست عبدالکریم کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

"پیارے تایا جی...... امید ہے، میں آپ کی ناراضی مول لیے بغیر اپنا نقطہ نظر وضاحت کے ساتھ آپ تک پہنچانے میں کامیاب ہو چکی ہوں اور سچ کہوں تو مجھے ایسا کرنے پر شرمندگی بھی محسوس ہو رہی ہے، مگر مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی دادی اور آپ کی خواہش پوری نہیں کر سکوں گی۔" اس کی آواز بھرانے لگی تھی، تب ہی وہ اپنی بات کے اختتام پر بہت تیزی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلتی چلی گئی۔

عبدالکریم ہنوز چپ بیٹھے رہے اور اب بھی لب کشا ہوئے...... بے بو ٹھنڈی ٹھار سانس بھر کر دور خلاؤں میں نہ جانے کون سے غیر مرئی نقطے کو تکنے لگیں۔ صغراں اور مہرالنسا کا "شغل" تا حال جاری تھا، جب کہ ایبک...... اس کی ٹھوڑی اب سینے سے جا لگی تھی۔

☆......❁......☆

تو نے مجھ سے بھی ویر جی کی "اصلیت" چھپائی انجو۔" انجو اس وقت سیدھی وہاں سے نکل کر صائمہ کے گھر چلی آئی تھی۔ اس کا دل اتنا بھرا ہوا تھا کہ بنا صائمہ کے کچھ پوچھے اس کے کندھے پر سر رکھ کر خوب روئی اور اس کے یوں بکھر بکھر کر رونے پر متوحش سی صائمہ کے تشویش سے پوچھنے پر سارا ماجرا بھی کہہ سنایا۔ "کم از کم مجھے بتاتی تو سہی...... میں ایویں ای تجھے غلط سمجھ کر انہیں خواہ مخواہ عزت دیتی رہی۔" وہ سخت برانگیختہ تھی۔

”تجھے کیا بتاتی صائمہ۔“ ڈھیر سارا رو چکنے کے بعد اب اس کا من ہلکا ہو چکا تھا۔ تاہم چہرے سے پژمردگی اور وجود سے اضمحلال ضرور ظاہر ہو رہا تھا۔ ”اس کے میرے لیے خیالات اور جملے اتنے سخت تھے کہ مجھے تو وہ سب اکیلے میں بھی دہراتے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔“

”چل دفع کر......“ صائمہ لعنت بھیجنے والے لہجے میں منہ بنا کر بولی۔ ”تو نے بھی اچھا کیا نا جو اپنی تائی اور تایا کو سامنے بلا کر ان کے بیٹے کے کرتوت اور منصوبے انہیں بتا دیے اور پھر تجھے کون سا لڑکوں کی کمی ہے ادھر...... لاکھوں میں ایک صورت، اتنی پڑھی لکھی...... تو دیکھنا کوئی شہزادہ تجھے جلد ہی بیاہنے آ جائے گا اور بعد میں ساری زندگی پچھتاتے پھریں گے وہ بک بک چوہدری صاحب۔“ وہ اس کی دل جوئی کی خاطر زور و شور سے بولی تو انجو یک دم ہنس پڑی...... ہاں دل دکھا ضرور تھا...... مگر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ جوگ ہی لے لیتی۔

☆......❁......☆

”واہ رے پیارے بک بک چوہدری۔“ اور مراد جو اس وقت دانستہ اس خالصتاً خاندانی اور نجی اہم ”میٹنگ“ میں شریک نہیں ہوا تھا، اب وہاں سے واپسی پر ایبک کی زبانی ساری کتھا سن لینے کے بعد بے ساختہ اش اش کر اٹھا۔ ”یہ تیری محترمہ انجو تو ہم سے بھی زیادہ ہوشیار نکلی...... واہ! کیا شان دار طریقے سے الو بنا کر تجھے سب کے سامنے ایکسپوز کیا ہے...... بھئی واہ مزا آ گیا۔“ اس نے چٹخارہ لے کر کہا۔

”تو آج مجھے بتا ہی دے؟“ ستے ہوئے منہ والے ایبک نے بہت سنجیدگی سے اس کی جانب دیکھ کر استفسار کیا۔ ”تو دراصل مجھے مروانے ہی کے لیے یہاں لے کر آیا تھا نا...... دیکھ سچ بول دے...... کچھ نہیں کہوں گا تجھے۔“ اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

”پاگل ہو گیا ہے کیا تو؟“ مراد نے اسے گھور کر دیکھا۔ ”میں کیوں مروانے لگا تجھے...... دراصل مروا تو، تو نے مجھے دیا ہے، اب دیکھ نا یار! تیرے دوست ہونے کے ناطے یہ لوگ مجھے بھی تیری ہی طرح کا تصور کر رہے ہوں گے۔ اپنے ساتھ ساتھ تُو نے تو میرا کیس بھی خراب کروا دیا اور اب یہاں بیٹھ کر مجھے الزام دے رہا ہے۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”تیرے مکرنے سے سچائی بدل تو نہیں جائے گی اور سچ تو یہ ہے کہ یہ سارا ”کھلارا“ تیرا ہی ڈالا ہوا ہے، یہاں آ کر یہ سارا ڈرامہ کرنا تیرا ہی تو مشورہ تھا۔“ ایبک نے برہمی سے کہا تو مراد اس بات پر یوں اچھلا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

”آ...... ہاہا...... ہا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور لڑاکا عورتوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کر دایاں ہاتھ نچاتے ہوئے چمک کر بولا۔ ”وڈا آیا ننھا کاکا! ایسا بھولا ہی ہے نا، تو کہ میں تجھے دریا میں چھلانگ لگانے کہوں گا تو، تو باؤ دیکھے گا، نہ تاؤ اور جھٹ دریا میں کود پڑے گا۔“

”باؤ یا تاؤ نہیں، آؤ یا تاؤ ہوتا ہے۔“ ایبک نے بےزاری سے تصحیح کی۔

”جو بھی ہوتا ہے، ہوتا ہوگا۔“ وہ بھڑک کر بولا۔ ”بہر حال انجمن کا جو نقشہ تُو نے میرے سامنے کھینچا تھا، اس پر تو وہی مشورہ بنتا تھا جو میں نے دیا اور تجھے تو یوں بھی اس سے کسی بھی طرح چھٹکارا ہی چاہیے تھا نا...... وہ تو بالآخر مل ہی گیا تجھے، پھر اب میرے سامنے یہ رونا کیوں ڈالا ہوا ہے تُو نے؟“ وہ طیش آمیز اکتاہٹ سے بولتا گیا۔

ہاں بھئی...... بات تو اس کی سولہ آنے درست تھی...... تب پھر اس نے واقعی یہ نحوست کیوں پھیلا رکھی تھی اب؟ اس کی لتاڑ پر ایبک یک دم خاموش سا ہو کر گومگو انداز سے مراد کا تنا ہوا چہرہ دیکھے گیا۔ اس کے چبھتے سوال کا خاطر خواہ اور تسلی بخش جواب تو فی الحال خود اس کے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا تو اسے کیا دیتا؟

☆......❁......☆

”شادی نہیں کرنی تھی...... نہ کرتا...... مگر یوں گھٹیا منصوبے بنا کر یہاں تو نہ آتا...... مہرو! تیرے

بیٹے نے سب کے سامنے میری عزت دو کوڑی کی کر کے رکھ دی۔“ اس محفل سے تو چوہدری صاحب یوں ہی بنا کسی سے کچھ کہے یا مزید سنے انجو کے جانے کے بعد، شرمندگی سے اٹھ کر اپنے لیے مختص کمرے میں چلے آئے تھے...... مگر کمرے میں آنے کے بعد مہر النسا کے سامنے وہ لاوے کی طرح ابل پڑے۔

”اجی آپ نے کس قدر آسانی اور بے پروائی سے کہہ دیا کہ شادی نہیں کرنی تھی تو نہ کرتا۔ واہ چوہدری صاحب!“ ملول، رنجیدہ خاطر اور شرمندہ تو خود مہر النساء بھی تھیں، مگر جو بات صحیح تھی وہ صحیح تھی اور اسی لیے وہ دبنگ لہجے میں بولیں بھی۔ ”اگر یہ ہی رویہ آپ اس وقت اپنے اکلوتے لاڈلے بیٹے کے سامنے روا رکھتے تو میرے خیال سے وہ یہ انتہا درجے کی حماقت کرنے کی کبھی سوچتا بھی نہ...... مگر نہیں...... آپ نے تو کرنی ہوتی ضد اور دھونس، زبردستی...... اور یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔“ وہ بے لاگ انداز میں جتا گئیں۔

”ہاں سارا کیا دھرا میرا ہی ہے۔“ وہ خود کو کوسنے والے لہجے میں بولے۔ ”میں تو ہوں ہی سدا کا کیڑے لگا آدمی...... مگر تو نے تو بڑے پیار سے اسے سمجھا بجھا کر ادھر بھیجا تھا نا، اس نے تو تیرا مان بھی نہیں رکھا۔“

”ہاں نہیں رکھا۔“ وہ دھیمی پڑ کر یاسیت سے بولیں۔ ”میں یہ کب کہہ رہی ہوں کہ اس کا طرز عمل مناسب تھا۔ میں تو صرف آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اس معاملے میں غلطی ہم سے بھی ہوئی ہے...... اس کے بچپن میں آپ کی مرحومہ والدہ نے اسے ایک زبانی کلامی رشتے میں باندھ دیا۔ یہ بات ہم بڑوں کے درمیان رہی۔ مگر ہم نے کبھی اس بات کا بطور خاص تذکرہ تک ایبک کے سامنے نہیں کیا۔ ذہن میں یہ ہی تھا کہ وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ پھر ہم لوگوں کے درمیان رابطوں کا بھی فقدان رہا اور سچی بات تو یہ ہے کہ عبدالسلام کے انتقال پر انجو سے ملنے سے پہلے تک مجھے بھی اس رشتے پر بہت سے اعتراضات تھے۔“ ان کی اس بات پر عبدالکریم نے چونک کر انہیں دیکھا، تاہم بولے کچھ نہیں۔ جب کہ مہر النساء کی بات جاری تھی۔

”لیکن انجو سے ملنے کے بعد میرا دل مطمئن ہو گیا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک اچھی لڑکی تھی، مگر افسوس کہ ہم ایبک تک یہ بات نہ پہنچا سکے۔ ہم سے چوک ہو گئی...... اور وہ بھی ایسا احمق نکلا کہ بجائے ہم سے صاف صاف پوچھ لینے کے...... الٹے سیدھے مفروضات کو اپنا یقین بنا کر بنا کچھ کہے سنے یہاں یہ تماشا کرنے چلا آیا۔“ وہ اتنا کہہ کر گویا تھک کر خاموش ہو گئیں...... بات ان کی معقول تھی...... مگر جو کچھ ہو چکا تھا، وہ ہونا نہیں چاہیے تھا۔

”جو بھی تھا۔“ اور یہ ہی بات اب زخم خوردہ سے لہجے میں چوہدری صاحب بھی کر رہے تھے۔ ”بات تو خراب کروا ہی دی نا تیرے منڈے نے...... میرے بے بے کی خواہش تو ادھوری رہ ہی گئی نا اور انجو بیٹی!“ ان کا لہجہ نم ہو گیا۔ ”کیسی ہیرا لڑکی کو گنوا دیا تیرے جاہل پتر نے اپنی حرکت کے ہاتھوں۔“ وہ گہرے تاسف میں گھر گئے۔ اب وہ مزید کیا کہتیں کہ چوہدری صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ بس اسی لیے لب بھینچے یوں ہی خاموش و اداسی سے بیٹھی رہیں۔

☆......❁......☆

اور آج اترنے والی یہ شب...... اس گھر میں موجود نفوس کے لیے رت جگے کا سندیسہ لائی تھی۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ کسی گہری سوچ اور نامعلوم اداسی کی لپیٹ میں تھا۔

کیا ہوا...... کیوں ہوا اور کیسے ہوا، جیسے سوالات بے معنی تھے، بلکہ اب تو ”کیا ہوگا؟“ والا مرحلہ درپیش تھا۔ ”کیا واقعی یہ رشتہ ٹوٹ چکا تھا؟ بچپن سے ایبک کے نام لگی تھی انجو...... ساری برادری تو کیا...... سارا اینڈ یہ بات جانتا تھا اور اب اگر یہ رشتہ ٹوٹ گیا تو وہ کس کس کو انجو کی صفائی دیتی پھریں گی؟ لوگ تو یہ

ہی کہیں گے نا کہ انجو ہی میں کوئی عیب دیکھ لیا ہوگا لڑکے نے جو یہاں آ کر رشتہ توڑ گیا ہے۔ پھر کون اٹھانے آئے گا اس کی ڈولی...... انجو تو یوں بھی اپنے ”اتھرے“ مزاج...... زیادہ ”تعلیم“ اور ”سیانی“ باتوں کی وجہ سے برادری میں بہت سے لوگوں کے لیے ناپسندیدہ تھی...... ”ہائے اور با! ایہہ کی ہو گیا...... اب کیا ہوگا۔“

چارپائی پر بے چینی سے کروٹیں بدلتی صغراں ہول کر اب باقاعدہ اٹھ بیٹھیں...... حالانکہ فضا میں ٹھیک ٹھاک خنکی تھی، مگر انہیں نہ جانے کیوں گھٹن سی محسوس ہونے لگی اور جاگ تو خیر ان کی برابر والی چارپائی پر لیٹی انجو بھی رہی تھی، اس نے جو ماں کو یوں اٹھ کر بیٹھنے کے بعد اپنا سینہ مسلتے دیکھا تو گھبرا کر خود بھی اٹھ بیٹھی۔

”کیا ہوا امی...... طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اس نے متوحش لہجے میں پوچھا۔ ”صغراں اس کی آواز پر اپنے پراگندہ خیالات سے چونکیں، پھر نروٹھے پن سے بولیں۔

”کچھ نہیں...... میری فکر چھڈ...... تو آرام نال سوجا۔“ انجو ان کی ناراضی بھاپ کر بجھ سی گئی۔

”آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“ اس نے بچوں کی طرح پوچھا۔ اس کے لہجے کی لڑکھڑاہٹ باوجود اندھیرے کے صغراں کو اس کی نم آنکھوں کا پتا دے گئی۔

”نہ...... نہ......“ وہ دل گرفتی سے بولیں۔

”بہت خوش آں۔ میری دھی رانی سے پڑھ لکھ کر خوب پیو داناں روشن کیتا اے۔“

”تو پھر میں اور کیا کرتی؟“ وہ انہیں ناخوش دیکھ کر بے بسی سے سسک اٹھی۔

”میں نے تیری طرح چودہ جماعتیں تو نہیں پڑھیں۔“ وہ اسے بلکتا دیکھ کر غم زدہ سے لہجے میں بولیں۔ ”مگر زندگی کو پڑھا ہے، برتا ہے اور زندگی نے مجھے یہ ہی سبق سکھایا ہے کہ درگزر کرنے ہی میں بھلائی ہوتی ہے اور پھر ایک عورت کو تو یہاں بہت کچھ سہہ کر، صبر شکر کے ساتھ جینا پڑتا ہے جھلیئے...... اور تو ہے کہ اس ذرا سی غلط فہمی کو اپنا انا کا مسئلہ بنا کر بیٹھ گئی۔“

”یہ آپ کی نظر میں ذرا سا مسئلہ ہے؟“ وہ رونا دھونا ترک کر کے احتجاجاً بولی۔

”میں نے کہا نا......“ صغراں نے چڑتے ہوئے کہا۔ ”میں تیری طرح سیانی نہیں، اس لیے میری نظر میں یہ ذرا سا ہی مسئلہ تھا، تجھے اگر اس کے خیالات کا پتا لگ ہی گیا تھا تب تو اس کی غلط فہمی دور کر کے معاملہ سلجھا بھی سکتی تھی مگر ناں جی! تو نے بھی آگے سے اس کے غلط یقین کو پکا کرنے کے لیے ڈرامے شروع کر دیے مگر میں یہ سب تجھ سے کیوں کہہ رہی ہوں جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا حق ہا......“ وہ ایک سرد آہ بھر کے دوبارہ بستر پر لیٹ گئیں۔

”ہاں...... ان کی بات شاید صحیح ہو مگر اس نکتے چوہدری کو سبق سکھانا بھی تو بہر حال ضروری تھا نا......“ جو اس نے سکھا بھی دیا مگر اب صغراں کا یوں ملول ٹوٹا بکھرا انداز بھی اسے سخت اذیت سے دوچار کر رہا تھا وہ اپنے طرز عمل کے درست ہونے پر انہیں ہزار ہا دلائل دے سکتی تھی، مگر جانتی تھی کہ انہوں نے قائل نہیں ہونا تھا اور اس لیے وہ مزید کچھ نہیں بولی۔ بس یوں ہی بیٹھی بے آواز نیر بہاتی رہی۔

☆......۞......☆

”اوہ مائی گاڈ! اور جاگ تو اپنے کمرے میں ایبک بھی رہا تھا، شرمندگی تھی، ندامت تھی، خجالت تھی، افسوس تھا۔ پشیمانی تھی یا پتا نہیں کون سا احساس تھا، جس کے بوجھ تلے دبا اس کا وجود بہت مضطرب تھا اور وہ یہاں سے وہاں ٹہل ٹہل کر بس یہی ایک بات سوچے چلا جا رہا تھا کہ یہ اس نے کیسی حماقت کر دی۔ وہ اپنے تئیں انجو کو کیا سمجھتا رہا اور وہ کیا نکلی۔

دراصل سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے کبھی اپنی اس دور دراز بسنے والی انتہائی قریبی کزن کو اتنا اہم سمجھا ہی نہیں تھا کہ اس کے بارے میں تفصیلات جاننے کا خواہاں یا متمنی ہوتا بلکہ حد یہ تھی کہ اس کے

ذہن سے تو وہ رشتے والی بات تک محدود ہو چکی تھی اس کی اپنی زندگی، اپنی ترجیحات اور مصروفیات تھیں اور ایسے میں چوہدری صاحب کا اسے جابک دے مارنا کہ اس کی شادی ہر حال میں وہیں ہوگی کہ جہاں بچپن سے اس کا رشتہ طے ہے۔ ظاہر ہے یہ صورت حال اس کے لیے ناقابل قبول تھی اور اسے بدکنا ہی تھا، اسے حالات نے کچھ ایسے الجھا دیا تھا کہ اسے ایک بار بھی انجو کے بارے میں معلومات لینے کا دھیان تک نہ آیا بلکہ الٹا اس لڑکی سے انجانی سی چڑ ہو گئی جس کی خاطر اس کے ہٹلر والد اب ہلاکو خان کا روپ دھار چکے تھے مگر اب اسے رہ رہ کر یہ احساس کچوکے لگا رہا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ واقعی زیادتی ہو گئی۔

”تف ہے تم جیسے نام نہاد، روشن خیال پڑھے لکھے انسان پر ایبک چوہدری!“ وہ ٹہلتے ٹہلتے بالآخر تھک کر صوفے پر گر سا گیا اور خود کو ملامت کرنے لگا۔

”یہ تو اتفاق ہوا کہ انجو تمہارے خیالات کے برعکس نکلی اگر بالفرض وہ کوئی روایتی سی دیہاتی لڑکی ہوتی تب بھی تمہیں اسے حقیر سمجھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ لوگوں کے تن سنوارنے کے لیے کتنی محنت کرتے ہو تم، ذرا سی مشقت اٹھا کر اپنے من کا پھٹیچر لباس بھی رفو کر لو بلکہ ممکن ہو تو اسے تبدیل ہی کر ڈالو۔“ وہ جتنا سوچ رہا تھا اس قدر شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترا جا رہا تھا پھر معاً اس کی نظر سامنے بستر پر بے فکرے انداز سے پورے ہاتھ پیر پھیلا کر سوتے ہوئے مراد پر پڑی تو یک بیک اس کے وجود میں اشتعال ابھرنے لگا۔

”اپنے الٹے سیدھے مشوروں سے اسے ان حالوں تک پہنچا کر خود کس قدر مزے سے میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہا تھا یہ مراد وحید کا بچہ...... مگر نہیں!“

شاید وہ اتنا قصور وار نہیں تھا جتنا خود ایبک تھا...... اور اگر خطا وار وہ خود تھا، تب ازالہ بھی اسی نے کرنا تھا اور اب اسے کچھ بھی کرنے کے لیے کسی کے مشوروں کی احتیاج نہیں تھی، بس صبح کا انتظار تھا۔



”صغراں چاچی!“ اور اگلی صبح جب وہ سارے صحن میں بیٹھے ابھی ناشتا کر ہی رہے تھے تب وہ پٹڑے پر بیٹھ کر گرم گرم پراٹھے اتارتیں صغراں کے نزدیک زمین پر دوزانو بیٹھ کر شرمندہ شرمندہ مگر واضح اور ہموار لہجے میں انہیں مخاطب کر کے بولا۔

”انجانے میں مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گی، بڑا دل دکھایا ہے میں نے آپ کا لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ بہت اعلا ظرف ہیں، کیا آپ مجھے معاف کر سکیں گی؟“ وہ پرامید نظروں سے ان کا ہکا بکا چہرہ دیکھنے لگا۔

چارپائی پر بیٹھے ملائی پراٹھا کھاتے چوہدری عبد الکریم کا نوالہ منہ تک لے جاتا ہاتھ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ ان کے نزدیک بیٹھ کر گلابی پھول دار سفید کپ میں چائے پیتی مہر النساء بھی اپنی جگہ منجمد ہو گئیں اور تو اور ماضی کا کوئی قصہ دہرانی بے بو بھی یکدم خاموش ہو کر اسے ہی دیکھے گئیں۔ مراد اندر کمرے میں پڑا تا حال محو خواب تھا ورنہ اس کے لیے بھی یہ منظر دلچسپی سے خالی نہ ہوتا۔

”بولیے نا چاچی! جواب دیں...... باخدا میں کسی کے پریشرائز کرنے پر آپ سے معافی نہیں مانگ رہا۔ مام ڈیڈ سامنے بیٹھے ہیں آپ ان سے پوچھ سکتی ہیں، کل سے اب تک ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔ آپ کی طرح میں نے اپنے والدین کا بھی بہت دل دکھایا ہے، وہ بھی ناراض ہیں مجھ سے اسی لیے مجھ سے بات کرنا تو در کنار میری طرف دیکھ تک نہیں رہے۔“ اس کی آواز بھرانے لگی اور صغراں کے ضبط کا یارا نہ رہا، وہ پراٹھا یوں ہی توے پر چھوڑ کر پھپک کر رو پڑیں۔

واقعی! انجو کے بارے میں، انجو ہی کی زبانی اس کے خیالات جان کر دل تو ان کا درد سے ٹوٹ کر چور چور ہو گیا تھا مگر وہ یہ بات انجو کو یہ نہ بتا سکیں، بتا کر اس کی ایبک کے لیے شدید ناراضی اور تنفر میں

اصافہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

''اوہ پلیز چاچی!'' ایبک بوکھلا گیا۔ ''اب آپ کیوں رو رہی ہیں، مام!'' اس نے مہر النساء کی جانب دیکھا۔ ''آپ سمجھائیں نا انہیں، اوہ نو! آپ تو خود رو رہی ہیں بھئی...... اب میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟'' وہ باری باری شدید پریشانی میں مبتلا ہو کر آنسو بہاتی دونوں خواتین کا چہرہ دیکھے گیا۔

''وے صغراں!'' بے بو نے جھاڑنے والے لہجے میں آواز لگائی۔ ''تُو بیٹھی رو رہی ہے، دیکھو ساری روٹی کوئلہ ہوگئی۔'' واقعی وہ سچ ہی کہہ رہی تھیں، توے پر ڈالی گئی روٹی اب سیاہ ہو کر دھواں دے رہی تھی۔

''اوہو...... ہو؟'' صغراں چہرے سے دوپٹا ہٹا کر جلدی سے وہاں متوجہ ہوئیں اور سرعت سے جلی ہوئی روٹی اتار کر چولہے کے ساتھ ہی رکھ دی۔

''چاچی!'' ایبک نے پھر پکارا تو اس بار وہ اس کی جانب دیکھ کر دھیرے سے مسکرائیں۔

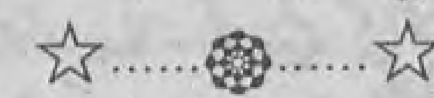
''تجھے معافی شافی مانگنے کی کوئی لوڑ نہیں پتر!'' انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کھلے دل سے کہا۔ ''مجھے تجھ سے کوئی شکوہ نہیں، ہاں دل کو تھوڑا درد ہوا تھا مگر اب تُو نے معافی مانگ ہی لی ہے تب اسے بھی قرار آگیا۔ اب جا وہاں بیٹھ جا بھرجائی کے پاس اور آرام سے ناشتا کر۔ میں تیرے لیے ساگ نکالتی ہوں، جانتی ہوں تجھے بہت پسند ہے۔'' وہ سادگی سے بولیں مگر ایبک مزید شرمندہ سا ہو کر وہاں سے اٹھ کر سیدھا چوہدری عبد الکریم کی چارپائی کے پاس آکر مجرمانہ انداز سے سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ نوالہ تو خیر وہ پہلے ہی رکھ کر یوں ہی تنے اعصاب کے ساتھ بیٹھے تھے، اس کے اپنے پاس آنے پر اندر ہی اندر سخت بے چین ہوگئے۔ وہ اس سے واقعی سخت ناراض تھے، کوئی بات، کوئی باز پرس، سرزنش، غصہ ناراضی کچھ بھی نہیں جتانا چاہتے تھے اور ایسا پہلی بار تھا کہ وہ اسے خاموش رہ کر بھی بہت کچھ کہہ گئے تھے اور یہ ہی احساس ایبک کی روح کو عجیب طرح سے گھائل کیے چلا جا رہا تھا اور اسی لیے اب وہ ان کے سامنے کھڑا اعتراف کرنے والے انداز سے کہہ رہا تھا کہ......

''ڈیڈ...... میں نے جو کچھ کیا وہ سب مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا...... آئم سو سوری۔'' اکلوتے بیٹے میں جان تھی ان کی، بظاہر وہ جتنے بھی سخت رہے ہوں مگر ان کے دل میں اس کے لیے محبت و شفقت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا، ابھی بھی وہ اندر ہی اندر بھیگنے لگے مگر جب بولے تو لہجہ پتھر مار ہی تھا۔

''میرا کیا ہے...... میں تو تجھے معاف کر ہی دوں گا مگر اصل ذلالت تو تُو نے انجو کے ساتھ کی ہے، جا...... جا کر اس سے معافی مانگ۔''

''اوہ یعنی آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔'' وہ آن واحد میں کھل اٹھا اور بڑے والہانہ انداز سے ٹھس بیٹھے چوہدری عبد الکریم کو کھڑے ہی کھڑے گلے سے لگا کر بولا۔ ''آئی لو یو ڈیڈ!''

پاس بیٹھیں مہر النساء بھی اس کی بچگانہ حرکت پر نم آنکھوں سے مسکرا دیں جب کہ اپنے گھر سے تازہ مکھن بڑی سی کٹوری میں لے کر آئی صائمہ نے خاصے تعجب سے یہ منظر دیکھا تھا۔



''کیا سوچ رہی ہے تُو انجو!'' گنے کے کھیت سے ذرا فاصلے پر بہتی نہر کنارے پیر لٹکائے گم صم سی بیٹھی انجو سے اس کے نزدیک ہی براجمان مزے سے پیر جھلاتی صائمہ نے اس کی گہری اور مسلسل خاموشی سے اکتا کر سوال کیا۔ دراصل گزشتہ شب تو یوں ہی لامتناہی سوچوں میں گھر کر گزر گئی تھی، سر بھاری سا محسوس ہو رہا تھا جب کہ آنکھیں الگ سرخ ہو کر رت جگے کی چغلی کھا رہی تھیں اور ایسے میں وہ خود کو کسی کا بھی دوبارہ سامنے کرنے کے لیے خود کو ہرگز بھی تیار نہیں پا رہی تھی اسی لیے روشنی پھیلتے ہی وہ صائمہ کی طرف چلی آئی تھی۔ پیچھے اس کے گھر میں کیا کہانی چلی؟ وہ اس سے یکسر لاعلم تھی۔ ہاں صائمہ اپنی والدہ کے کہنے پر مکھن کا پیالہ دینے گئی تھی مگر اس نے بھی انجو کو واپسی پر کوئی خاص بات نہ بتائی سوائے اس کے کہ سارے صحن میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ اس کا دل عجیب مکدر اور اچاٹ سا ہو رہا تھا ہر طرف سے، اسی لیے صائمہ کے کہنے پر بلا چوں چراں اس کے ساتھ نہر پر چلی آئی اور واقعی...... یہاں آکر کچھ دیر بیٹھنے سے اس کی طبیعت خاصی تر و تازہ سی ہوگئی تھی اسی لیے صائمہ کے استفادہ پر وہ ملائمت سے بولی۔

''کچھ نہیں۔''

''پھر اتنی چپ چپ سی کیوں ہے؟'' بے چینی سے گھاس نوچتی صائمہ کا دوسرا سوال۔

''بس یوں ہی......'' اس نے نہر کے سبک رفتار، ٹھنڈے میٹھے آنکھوں کو تراوٹ بخشتے پانی پر نگاہیں جما کر پھر مختصراً جواب دینے پر اکتفا کیا۔

''ویسے سچ بتا......'' صائمہ نے پھر کھوجتے لہجے میں پوچھا۔ ''جو کچھ بھی ہوا اگر ویر جی اس پر تجھ سے معافی مانگ لیں...... تو کیا تب تُو انہیں معاف کردے گی؟'' اس کی بات پر انجو نے بے ساختہ گردن موڑ کر اس کا چہرہ سنجیدہ نگاہوں سے دیکھا اور اس کے اس طرح دیکھنے پر بے چاری سیدھی سادی صائمہ اپنی زندگی کی پہلی چال بازی پر پوری جان سے گڑبڑانے لگی۔

''ہائے او ربا! ویر جی کتھے پھنسا دیتا مینوں۔'' اس نے من ہی من دہائی دی۔

''اپنی غلطیوں پر شرمندہ اعلاظرف لوگ ہوتے ہیں صائمہ! جب کہ مجھے ایبک سے ایسی کوئی امید نہیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''حالانکہ تم جیسی ایجوکیٹڈ لڑکی بخوبی جانتی ہی ہوگی کہ مایوسی کو کفر کہا گیا ہے۔''

''ہیں...... یہ کون بولا......؟'' انجو نے بری طرح چونکتے ہوئے اپنے عقب سے اچانک سنائی دینے والی آواز کی سمت گھوم کر دیکھا اور سامنے جو چہرہ نظر آیا اس نے اسے یک لخط اپنی جگہ ساکت کردیا۔

موقع غنیمت جان کر اس کے ساتھ بیٹھی صائمہ اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑی ہوئی اور وہاں سے سرپٹ دوڑ لگا دی مگر جلد ہی اسے ٹھہر جانا پڑا کیونکہ سامنے ہی دل و جان سے اپنی بتیسی کی نمائش کرتا مراد ایستادہ تھا۔

جب کہ دوسری طرف ایبک ہموار قدموں سے چلتا ہوا، انجو سے تھوڑے فاصلے پر مگر اس کے نزدیک ہی آکر بیٹھ گیا۔

''میں جانتا ہوں۔'' اس کی بات یا وضاحت گمبھیر لہجے میں جاری تھی۔ ''کہ تم مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہو رہی ہوگی، تمہاری حیرانی اپنی جگہ درست بھی ہے مگر میں تمہیں بتا دوں کہ میرے بارے میں تم نے جو امیج بنالیا ہے وہ بالکل بھی درست نہیں۔ میں ایسا بالکل بھی نہیں ہوں جیسا کہ تم نے مجھے سمجھ لیا ہے۔''

''صائمہ سے تم نے کہا تھا مجھے یہاں لے کر آئے؟'' اور انجو نے ایبک کی ساری تمہید نظر انداز کرتے ہوئے شدید مشتعل ہو کر پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے بہت سکون سے جواب دیا تھا۔

''جب کہ ہمارے بیچ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔'' وہ سخت بھنائے لہجے میں چیخ کر بولی۔ ''تو پھر اس حرکت کا مطلب؟''

''ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا انجمن!'' وہ انجو کے برعکس رسانیت سے بولا۔

''ابھی تم نے میری وضاحت کہاں سنی ہے؟''

''مجھے تمہاری وضاحت سننے سے دلچسپی ہے بھی نہیں۔'' وہ تڑخ کر بولی۔ ''میں جو کچھ سن چکی ہوں وہی کافی ہے۔''

''نہیں...... وہ کافی نہیں ہے انجو؟'' اس نے اس بار بھی خاصے تحمل سے کہا۔ ''انسان سے اگر انجانے میں کوئی غلطی ہو جائے تو اسے اپنی صفائی کا پورا موقع ملنا چاہیے۔''

''اچھا؟'' وہ زہر خند سا مسکرائی۔ ''میرے بارے میں وہ اہانت آمیز، گھٹیا باتیں اپنے دوست کے سامنے تم انجانے میں غلطی سے کر رہے تھے؟''

''تم مانو یا نہ مانو۔'' وہ تیز ہوکر بولا۔ ''حقیقت بہر حال یہ ہی ہے اور پھر تم ایک لمحے کے لیے خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو تو سہی...... زندگی بھر میرے مام ڈیڈ نے مجھے من مانی کرنے کی اجازت دی اور میری زندگی کا اتنا اہم اور بڑا فیصلہ کرتے ہوئے مجھ سے رائے لینا تو در کنار، مجھے اس معاملے میں لب کشائی تک کی اجازت نہ دیتے ہوئے اچانک ہی بس فیصلہ سنا دیا گیا کہ ایک ذور دراز کے گاؤں میں پلی بڑھی لڑکی کو میری زندگی میں شامل کیا جارہا ہے تب میں اور کیا کرتا؟''

''مگر تم جانتے تھے کہ ہمارا رشتہ بچپن سے طے تھا۔'' وہ نہ ماننے والے لہجے میں بولی۔ ''تو پھر یہ تمہارے لیے غیر متوقع تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''ہاں۔'' اس نے کہا۔ ''دادی نے میرے گلے میں اپنا سونے کا تعویز ڈالا تھا۔ اس وقت وہاں موجود سارے لوگ رو بھی رہے تھے، ان کے درمیان کچھ باتیں بھی ہوئیں، ان سارے واقعات کا دھندلا سا عکس میرے ذہن میں موجود رہا مگر ان باتوں کا مفہوم و مقصد کیا تھا ایک چھ سال کا بچہ کیسے جان سکتا تھا اور یہ بات تو تم اچھی طرح جانتی ہو گی کہ ایک لڑکے کی زندگی، لڑکی سے ہر طرح سے مختلف ہوتی ہے۔ اسٹڈیز، گیمز، دوست...... سیر سپاٹے، لڑائی جھگڑے، جم، مویز...... گانے...... میری زندگی میں اتنی ہنگامہ خیزی تھی کہ یہ بات میرے ذہن کے کسی نہاں خانوں تک میں محفوظ نہ رہ سکی۔''

''کبھی تایا یا تائی نے بھی نہیں بتایا؟'' وہ طنزیہ نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

''تو اور اتنی دیر سے تمہیں کیا بتا رہا ہوں میں؟'' اس کے طنز کرنے پر وہ از حد برا مانتے ہوئے بولا۔

''یہ بات تو نہیں بتائی۔'' اس نے کندھے اچکا کر کہا۔

''تو اب سن لو۔'' وہ چڑ کر بولا۔ ''ہاں ان دونوں ہی نے مجھ سے کبھی پہلے تمہارے یا تم سے جڑے میرے رشتے کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہاں چاچا کے انتقال کے بعد مام نے تمہاری تصویر مجھے ضرور دکھائی تھی، کچھ تعریف وغیرہ بھی کر دی تھی مگر میں نے اتنا دھیان نہیں دیا۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا...... کچھ دیر کے لیے دونوں کے مابین معنی خیز خاموشی کا وقفہ در آیا، دونوں ہی اپنی اپنی جگہ گہری سوچ میں گم ہو گئے۔

''اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' چند ثانیے بعد اس خاموشی کو انجو کی پر سوچ آواز نے توڑا۔

''میری وجہ سے تم بہت ہرٹ ہو گئی ہو؟'' اس نے اس بار سیدھ میں دیکھنے کے بجائے گردن موڑ کر براہ راست انجو کا اترا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور کوئی میری وجہ سے دکھی ہو تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔''

''تو پھر......؟'' انجو نے عینک کے شیشوں سے جھانکتی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اس کے مدعا سے یکسر انجان بنتے ہوئے سوال داغا۔

''تو پھر یہ کہ آئم سو سوری......'' وہ بھی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بلا جھجک پورے اعتماد اور روانی سے کہہ گیا۔

''دل تو تم نے اور سب کا بھی دکھایا ہے۔'' وہ بجائے اس کی معذرت قبول کرنے کے ترنت بولی۔ ''پھر معافی صرف مجھ ہی سے کیوں مانگ رہے ہو؟''

''دل میں نے نہیں......'' وہ رد کرنے والے لہجے میں بولا۔ ''یہ بات سب کو بتا کر تم نے سب کا دکھایا تھا لیکن بہر حال میں پھر بھی سب سے اپنے رویے کی معافی مانگ کر تمہارے پاس آیا ہوں۔''

''وہاں تو کیوں نہ بتاتی میں؟'' وہ چمک کر بولی۔ ''سب کو آگاہ کرنے ہی کی وجہ سے تو تمہیں تمہاری غلطی کا احساس ہوا ہے نا ورنہ تمہارا کوئی بھروسا تھا؟''

''کتنی شکی لڑکی ہو تم۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ تمہارے شکوک و شبہات دور کرنا میرے بس کی تو بات نہیں، ہاں مگر اتنا ضرور بتا دو کہ کیا تم نے میری معذرت قبول کر لی؟'' وہ پر امید نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''ہاں تمہیں معاف کر دوں؟'' وہ چڑ چڑے سے لہجے میں بولی۔ ''تا کہ گھر والے ہمارا ٹوٹا رشتہ جوڑنے کے لیے پھر سے سرگرم عمل ہو جائیں۔''

''ہاں۔'' اب کی بار ایبک نے کندھے اچکا کر بے پروائی سے کہا۔ ''تو ہونے دو، اس میں مسئلہ والی تو کوئی بات نہیں۔'' اس کے بے پروائی سے کہنے پر انجو نے بے ساختہ حیران ہو کر اس کا مطمئن چہرہ دیکھا۔ ہاں یہ بات درست تھی کہ وہ اپنے رویے کی وضاحت اسے دے چکا تھا۔ اس کا دل دکھانے پر معافی کا خواستگار بھی تھا اور اس کی شفاف نگاہیں بتا رہی تھیں کہ اس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں، لہجے میں کوئی بناوٹ اور لڑکھڑاہٹ نہیں اور شاید اسی لیے انجو اس کی وضاحت سے مطمئن بھی ہو چکی تھی لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ وہ یہ تعلق دوبارہ جوڑنے پر راضی تھی، اسی لیے عجیب سے لہجے میں اسے ٹوک بیٹھی۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو ایبک! جب کہ نہ میں تمہارے آئیڈیل کے قریب ہوں اور نہ ہی تمہیں مجھ سے محبت ہی ہے تب پھر تم یہ ٹوٹا تعلق دوبارہ جوڑ کر کیا حاصل کر لو گے؟''

''محبت تو خیر تمہیں بھی مجھ سے نہیں ہے۔'' وہ دلکشی سے مسکرا دیا۔ ''اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میں خود بھی تمہارا آئیڈیل ہوں یا نہیں ہاں البتہ اتنا تمہیں ضرور بتا دوں کہ میرا کوئی آئیڈیل وائیڈیل نہیں تھا بس ایک خواہش تھی کہ میری لائف پارٹنر ایجوکیٹڈ، کانفیڈنٹ اور سمجھ دار ہو اور جہاں تک میں تمہیں جان پایا ہوں۔ تم میں یہ کوالٹیز موجود ہیں اور اگر اب میں غور کروں تو میرا بنیادی اعتراض تمہاری ذات پر یہ ہی تھا۔'' وہ رسانیت سے بولتا رہا، انجو سر جھکائے سنجیدگی سے سنے گئی۔

''اور سوچو تو اس بات سے فرق بھی کیا پڑتا ہے انجمن!'' وہ کچھ دیر توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔ ''کہ ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہے یا نہیں لیکن ہم سے وابستہ رشتوں کو تو ہم سے بلا شک و شبہ محبت ہے نا اور ان کی ناراضی سے ہمیں بہر حال فرق پڑتا ہے تو کیا ہمارے لیے یہ مناسب نہیں کہ ہم اپنی اپنی حماقت سے توڑ دیے جانے والے ان کے دلوں کو دوبارہ جوڑنے کی خاطر آئندہ زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ کو قبول کر لیں؟''

وہ اس کی ہی جانب دیکھ رہا تھا، اس نے اس بار بات ہی ایسی کر دی تھی کہ انجو چپ کی چپ رہ گئی، واقعی کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہا تھا اور خود اسے بھی بے شک ایبک سے کوئی طوفانی قسم کا عشق نہ سہی مگر اس نام کے ساتھ جڑے رہنے کے باعث فطری لگاؤ اور انس تو بہر حال تھا ہی پھر صغراں کی فکر مندی...... تایا، تائی کا ملال، ایبک کی پشیمانی اور معذرت......

وہ کچھ دیر یوں ہی بیٹھی اپنے لب اضطراری انداز سے کچھ بولنے کے لیے کھولتی اور پھر بند کرتی رہی۔ ایبک یقیناً اس کی شش و پنج والی کیفیت سمجھ رہا تھا تب ہی دانستہ دوسری جانب دیکھنے لگی۔

''دیکھو ایبک!'' پھر چند لمحوں بعد وہ جب لب کشا ہوئی تو لہجہ ہر طرح کے تردد سے پاک تھا، ایبک فی الفور اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''میں آج کے دور کی تعلیم یافتہ، باشعور لڑکی ہوں۔'' وہ مضبوط و پر اعتماد لہجے میں کہنے لگی۔ ''مجھے اپنے جائز حق کے لیے بولنا آتا ہے، اپنے درست موقف کے لیے اسٹینڈ لینا بھی جانتی ہوں۔ اپنی ذات کے وقار پر سمجھوتا بھی نہیں کر سکتی لیکن ساتھ ہی تعلیم یافتہ ہونے کے ناطے میں خود سے جڑے ہر رشتے کا احترام خود پر لازمی سمجھتی ہوں اور انہیں زیادہ بہتر انداز سے نباہنے پر بھی یقین رکھتی ہوں اور ایسی صورت میں، میں اگر تمہاری ساری وضاحت اور معذرت کو محض انا کا مسئلہ بنا کر قبول نہ کرتے ہوئے اتنے سارے لوگوں کی دل شکنی کر دوں تو یہ......'' اتنا کہہ کے بعد وہ دانستہ ٹھہر گئی۔

''یہ......؟'' اسے دھیان سے سنتے ایبک سے فوراً پوچھا۔

''یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔'' بالآخر اس نے

اعتراف کر ہی لیا تھا۔

"تھینک گاڈ! ایبک کو یکا یک اپنے کندھے ان دیکھے بوجھ سے آزاد ہوتے محسوس ہوئے اور اس نے ایک پرسکون سانس خارج کی۔

"تھینک گاڈ کہ تمہیں میری بات سمجھ میں آ گئی۔" وہ واقعی کھل اٹھا تھا کہ اپنے پیاروں کو دکھ اور تکلیف دینے کا خیال ہی اس کے لیے سوہان روح تھا کجا کہ واقعی ایسا کر گزرتا......

"ہاں ایبک......" وہ بھی دھیرے سے مسکرا کر تائیداً سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں واقعی سمجھ گئی ہوں کہ عافیت اسی میں ہے۔"

"تب تو تم فوراً سے پیشتر یہ پہن لو۔" ایبک نے جلدی سے اپنی کلائی میں موجود اپنے برانڈ نیم کا بریسلیٹ...... جو وہ عموماً پہنے رکھتا تھا، اتار کر انجو کو دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں؟" انجو نے جھجکتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

"اوہ یار! اب کوئی انگیجمنٹ رنگ وغیرہ تو میں ساتھ لایا نہیں تھا۔" اس نے زور دے کر کہا۔ "تو اب اسی سے کام چلا لو تاکہ ہماری منگنی دوبارہ ہو جانے کا کوئی ثبوت تو ہم اپنے گھر والوں کے آگے پیش کر سکیں۔" یہ عجیب سی منطق تھی مگر انجو نے بڑے مدبرانہ انداز سے سر ہلا کر تسلیم کر لی اور ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر بریسلیٹ تھامنا بھی چاہا مگر ایبک اس سے زیادہ ہوشیار تھا۔ اس نے کمال پھرتی سے انجو کی نازک کلائی تھامی اور بریسلیٹ پہنا کر ہک لگا دیا۔

وہ اس کی جرأت پر ہکا بکا رہ گئی، سرخ چہرے کے ساتھ مارے تلملاہٹ کے کچھ بولنا بھی چاہا مگر ایبک کے شریر چہرے پر سجی مسکراہٹ دیکھ کر محجوب سی ہو گئی۔



یوں سونے کی تاویتری سے شروع ہونے والا یہ قصہ بالآخر برانڈڈ بریسلیٹ تک پہنچ ہی گیا۔ یہ دو عملی قسم کے انسانوں کے مابین محبت کا نقطہ آغاز تھا۔

"ویر جی! بس اب بہت ہو گئی۔" اور ابھی جب وہ دو انٹلکچوئیل انسان پوری طرح اس ودیعت کردہ لمحے سے محظوظ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ تب ہی دو شدید قسم کے غیر "انٹلکچوئیل" انسانوں نے اس پرفسوں منظر میں داخل ہو کر ماحول پر چھایا سارا طلسم درہم برہم کر ڈالا۔

"آپ سمجھا لیں اپنے اس پٹھے نام والے مراد وحید کو، اتنی دیر سے صرف آپ کی اور انجو کی وجہ سے اس پاگل شخص کو ادھر برداشت کر رہی تھی کہ چلو اچھا ہے آپ دونوں کے درمیان سب کچھ چنگا ہو جائے مگر نہ جی......" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس نے قسم کھا رکھی ہے مجھے پریشان کرنے کی، بس اب مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو ادھر چلی آئی ورنہ قسم سے میں نے اس کے بوتھے پر وہ چپڑیں مارنی تھیں کہ اسے اپنی نانی نے یاد آ جانا تھا۔" صائمہ سخت آگ بگولا تھی، اس کے پیچھے پیچھے بے طرح بوکھلایا ہوا سا مراد بھی چلا آیا۔

"اوہ یار!" ایبک اپنی جینز جھاڑتا ہوا پریشانی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "مگر پتا تو چلے کہ آخر ہوا کیا ہے؟" انجو بھی بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی اور الجھی نظروں سے صائمہ کا لال بھبوکا چہرہ دیکھتے ہوئے معاملہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"آپ کا یہ دوست......" صائمہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں، خوں خوار نظروں سے معصوم دکھائی دینے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے مراد کو گھورتے ہوئے شکایتاً بولی۔ "اتنی دیر سے میرے ساتھ نجانے کون کون سی بکواس کیے چلا جا رہا ہے۔"

"کیوں مراد؟" ایبک نے بے ساختہ کڑے تیوروں سے مراد کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہے صائمہ! کیا بدتمیزی ہے یہ؟"

"اوہ یار میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں۔" وہ ایبک کی شکی نظروں سے خائف ہو کر جلدی سے بولا۔ "میں نے اس سے کچھ نہیں کہا سوائے اس کے کہ میں تم سے پنجابی سیکھنا چاہتا ہوں۔"

"سراسر بکواس......" ایبک نے بے مزا ہو کر اسے گھر کا۔ "اردو تو تمہیں ٹھیک سے بولنا آتی نہیں، پنجابی کیا خاک سیکھ سکو گے؟"

"یہ جھوٹا ہے ویر جی!" صائمہ پھر چلائی۔ "اس سے پوچھیں...... یہ مجھ سے کچھ اور بھی کہہ رہا تھا۔"

"کیا کہہ رہا تھا؟" انجو نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم خود کیوں نہیں بتا دیتیں؟"

"کچھ سمجھ میں آتا تو بتاتی نا۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"کیا کہا تھا مراد؟" ایبک نے متنبہ کرنے والے لہجے میں استفسار کیا۔ "تم جانتے ہو بے ہودگی مجھے پسند نہیں۔" اس کا انداز درشت تھا۔

"اوہ بھائی!" مراد نے جلدی سے وضاحتی لہجہ اختیار کرتے ہوئی بالآخر صاف صاف بات کرنے کی ٹھانی۔ "میں نے اس سے کوئی غلط بات نہیں کی، ہاں بس اتنا ضرور کہا تھا......" یہاں پہنچ کر اس کا لہجہ پست ہو گیا۔ "کہ تم مجھے پسند آ گئی ہو...... کیا تم مجھے اپنی فرزندی میں لینا قبول کرو گی؟"

"واٹ......" ایبک سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ "تم نے اس سے یہ کہا؟"

"ہاں بس یہی کہا تھا۔" وہ جھینپ کر شرمندہ شرمندہ سے لہجے میں بولا۔ "مگر یار تو خود بتا کیا کسی خوب صورت لڑکی کو پرپوز کرنا کوئی قانونی جرم ہے؟"

"سن لیا......" صائمہ جتاتی نظروں سے ایبک کو دیکھ کر روہانسے لہجے میں بولی۔

"خدا کی پناہ!" انجو نے بے ساختہ کہا۔ "تم نے ان الفاظ میں اسے پرپوز کیا تھا مراد؟"

"مگر میرے بھائی!" ایبک نے اپنی بے ساختہ امڈ آنے والی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے ازحد ہمدردانہ لہجے میں اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تجھے ان الفاظ میں صائمہ کو پرپوز کرنے کی سوجھی کیا تھی؟"

"تو پھر اور کن الفاظ میں کرتا؟"

"یہ پاگل ہے کیا؟" معاملہ کچھ کچھ اب انجو کی سمجھ میں آتا جا رہا تھا اسی لیے وہ بھی بے ساختہ ہنس پڑی۔

"اسے ڈانٹنے کے بجائے تو ہنس رہی ہے انجو؟" صائمہ سخت خفا ہو گئی۔ "مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔"

"یعنی کہ یہاں بھی...... "یہی والی" صورت حال ہے؟" اس بار ایبک نے اپنے قہقہے کا گلا گھونٹنے کا چنداں تکلف نہ کیا۔

"ہاں کہہ سکتے ہو۔" انجو بھی بدستور مسکراتی ہوئی بولی۔

"پھر تو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے احمق دو۔"

"اچھا۔" صائمہ تو ان دونوں کا باہمی اتحاد دیکھ کر اپنا غم بھول بھال انگشت بدنداں رہ گئی تھی، مراد ہی تنک کر بول اٹھا۔

"یعنی کہ تم دونوں کے درمیان اچانک ہی اتنی دوستی ہو گئی کہ اب مل کر ہمارا مذاق اڑا رہے ہو؟"

"آہو۔" صائمہ بھی جھٹ ناراضی سے اس کی ہاں میں ہاں ملا کر بولی۔

مگر وہ دونوں اپنے ان دو عدد جگری احمقوں کی خفگی کا جواب دینے کے بجائے یوں ہی اونچا اونچا ہنستے رہے۔

مراد اور صائمہ نے ایک دوسرے کی جانب بے بسی سے دیکھا اور ناسمجھی سے کندھے اچکا دیے۔ بھلے سے ان دونوں کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو مگر انجو اور ایبک ان دونوں کا مسئلہ بخوبی سمجھ چکے تھے۔ ان کے وقت پر بساط بھر یہ دونوں ان کا ساتھ دے چکے اور اب یہ قرض لوٹانا ان کا فرض بنتا تھا نا؟

ہاں تو انہیں کب انکار تھا؟

بس ذرا ان کی ہنسی تھمنے دیجیے...... پھر دیکھیے گا!

☆☆

مقابل ہے آئینہ

مدیحہ کرن

ادارہ

س: "اصلی نام کیا ہے، گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟"

ج: "مدیحہ کرن" پورا نام ہے، گھر والے پیار سے کرن ہی کہتے ہیں۔"

س: "آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟"

ج: "آئینہ تو جی یہ ہی کہتا ہے ماشاء اللہ سے خوب صورت چہرہ ہے مگر ہاں! میں آئینے سے ایک بات ضرور کہتی ہوں کہ جیسی میری شکل خوب صورت ہے اللہ پاک سیرت اس سے زیادہ خوب صورت بنا دے، آمین۔"

س: "حسین صورتیں دیکھ کر دل میں کیا خیال آتا ہے؟"

ج: "یہ ہی خیال آتا ہے کہ اس کاریگر نے کتنے پیار اور مہارت سے تخلیق کیا ہے۔"

س: "اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو......؟"

ج: "پیسوں، موبائل اور آئی ڈی کارڈ کے علاوہ کچھ بھی نہیں ملے گا۔"

س: "بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟"

ج: "سچ بتاؤں شاید کوئی یقین نہ کرے، میں نہیں ڈرتی بھوتوں سے کیونکہ میری امی بھی نہیں ڈرتیں، باقی بہنیں بہت ڈرتی ہیں۔"

س: "مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟"

ج: "مہمان تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہیں، سب ہی اچھے لگتے ہیں۔ بہت خوش ہوتی ہوں کسی کے بھی آنے پر۔"

س: "کھانے میں کیا پسند ہے؟"

ج: "امی کے ہاتھ کے کھانے سب ہی پسند ہیں، ان میں سب سے زیادہ بریانی، بھرے ہوئے قیمہ کریلے، آلو کی بھجیا اور حلیم ہیں۔"

س: "اگر آپ کو ایک دن کی حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟"

ج: "میں چھوٹی سی جان اور حکومت کی اتنی ذمہ داریاں...... مجھے تو معاف ہی رکھیں جی، کیا کیا کر لوں گی بھلا ایک دن میں۔"

س: "پسندیدہ شاعر؟"

ج: "ہر وہ شاعر پسند ہے جس کے لفظوں میں گہرائی ہو۔"

س: "مزاجاً لڑاکا ہیں؟"

ج: "نہیں جناب! لڑاکا نہیں ہوں، بہت فرینڈلی ہوں۔"

س: "کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟"

ج: "اپنے ابو جی کی طرح کے خالص، منافقت سے پاک، ملنسار، درگزر کرنے والے...... بس یہ ہی ہیں میرے نزدیک اچھے لوگوں کی کوالٹیز۔"

س: "اگر لوڈشیڈنگ نہ ہوتی تو؟"

ج: "تو بہت سکون ہوتا، ہم بھی سمجھتے ہیں کہ ہمارا ملک بھی ترقی یافتہ ممالک میں شمار ہونے کی کوشش میں کامیاب ہو جائے گا۔"

س: "اللہ پاک کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟"

ج: "ویسے تو ہر وہ لمحہ جب بھی اللہ کو یاد کیا جائے بہترین ہی مگر فجر کا وقت اور تہجد کا وقت بہترین ٹائم ہے اپنے خالق سے باتیں کرنے کا۔"

س: "آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟"

ج: "الحمدللہ کفایت شعار ہوں۔"

س: "کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟"

ج: "میرے خیال میں نہیں۔"

س: ''آپ کسی سنسان راستے سے گزر رہی ہوں اور کتا پیچھے لگ جائے تو؟''

ج: ''اول تو اکیلی سنسان راستے سے گزروں گی نہیں، مگر مزے کی بات یہ ہے کہ ویسے بھی کہیں سے گزرتے ہوئے کتا نظر آجائے تو احتیاطی تدابیر کے طور پر پہلے سے ہاتھ میں پتھر اٹھا لیتی ہوں۔''

س: ''کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟''

ج: ''اللہ کے بعد اپنے والدین کی بہت احسان مند ہوں کیونکہ انہوں نے بہترین تربیت دی۔ زندگی کے مشکل حالات کا کانفیڈنس سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیا، ہر معاملے میں اپنی اولاد پر اعتبار کر کے خود اعتمادی پیدا کی۔''

س: ''ڈرامے دیکھتی ہیں؟''

ج: ''ہاں جی، دیکھتی ہوں ڈرامے، ٹی وی کے بھی اور لوگوں کے بھی...... (ہاہاہا)۔''

س: ''پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور اور مطمئن کر دیا ہو؟''

ج: ''ماسٹر مکمل ہونے کی خوشی، رزلٹ کی کامیابی۔''

س: ''حقیقی خوشی کب ہوتی ہے؟''

ج: ''جب میری ذات سے کسی کو کسی بھی طرح سے فائدہ پہنچے اور وہ خوش ہو تو میں بھی خوش ہوتی ہوں اور اپنی امی کو خوش دیکھ کر اللہ کو یاد کر کے خوش ہو جاتی ہوں۔''

س: ''اگر دوست ناراض ہو جائے تو کیسے مناتی ہیں؟''

ج: ''اگر میری غلطی ہو تو معافی مانگ لیتی ہوں اور منانے کی کوشش کرتی ہوں۔ غلطی دوسرے کی بھی ہو تو بھی ناراض نہیں رہ سکتی زیادہ دیر کسی سے بھی۔''

س: ''آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟''

ج: ''ابو جی کی وفات کے بعد میری امی میری سب سے قیمتی ملکیت ہیں اور اپنے اللہ پر بھروسا کہ وہ کسی بھی حال میں مجھے تنہا نہیں چھوڑتا۔''

س: ''اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟''

ج: ''بہت سے ایسے لمحے ہیں، امی کی بیماری کے ایام، 2017ء کے بہت سے ایسے دن جنہیں میں بیان بھی نہیں کر پاؤں گی۔ سب سے دشوار لمحات 3 نومبر 2017ء جب میری جان سے زیادہ عزیز میرے ابو جی ہمیں چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے۔''

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

س: ''وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے ہوئے خیال آتا ہے، دنیا کیا کہے گی؟''

ج: ''ویسے تو دنیا کا کام ہے کچھ بھی کہہ دیتی ہے، اچھا کرو تب بھی اور برا کرو تب بھی...... مگر پھر بھی کوئی ایسا کام نہیں کرتی جس سے میرے والدین کی تربیت پر کوئی غلط بات کرے، نظر انداز کرتی ہوں۔''

س: ''کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہے؟''

ج: ''اپنے گناہ، قبر کا اندھیرا...... اور یہ بات کہ میں جوانی میں ہی اللہ کے گھر کی زیارت کروں یہ ہمیشہ یاد رہتی ہے۔''

س: ''کوئی آخری بات؟''

ج: ''ویسے تو دم آخر تک کوئی بھی بات آخری نہیں ہے پھر بھی یہ ہی کہوں گی کہ اپنے والدین کا بہت خیال رکھیں، نجانے کب اجل کا بلاوا انہیں آپ سے دور لے جائے۔ اس دنیا میں اللہ کے بعد مخلص اور بے غرض رشتے یہ ہی ہیں اور ان کا کوئی نعم البدل نہیں۔''



شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

القرآن

بس، حکمت والے قرآن کی قسم۔ بے شک تم۔ سیدھی راہ بھیجے گئے ہو۔ عزت والے مہربان کا اتارا ہوا۔ تاکہ تم اس قوم کو ڈر سناؤ جس کے باپ دادا نہ ڈرائے گئے۔ تو وہ بے خبر ہیں۔ بے شک ان میں اکثر پر بات ثابت ہو چکی ہے تو وہ ایمان نہ لائیں گے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق کر دیے ہیں کہ وہ ٹھوڑیوں تک ہیں تو یہ اوپر کو منہ اٹھائے رہ گئے۔ اور ہم نے ان کے آگے دیوار بنادی اور ان کے پیچھے ایک دیوار اور انہیں اوپر سے ڈھانپ تو انہیں کچھ نہیں سوجھتا۔

(سورۃ یٰسین: آیت 1 سے 9)

سرکہ کی اہمیت

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سرکہ کتنا اچھا سالن ہے (مسلم۔ مشکوٰۃ)
ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:
وہ گھر غریب نہ ہوگا جس میں سرکہ موجود ہو (ترمذی)

اگر میں ایسا کر لیتا...... تو ایسا ہو جاتا

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:
اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ جائے تو یہ نہ کہو ''اگر میں ایسا کر لیتا تو ایسا ہو جاتا'' البتہ یہ کہو کہ اللہ کی تقدیر یوں ہی تھی اور انہوں نے جو چاہا کیا کیونکہ ''اگر'' (کا لفظ) شیطان کے کام کا دروازہ کھول دیتا ہے (مسلم۔ منتخب احادیث)

حضرت لقمان علیہ السلام

1۔ جب خلقت کے پاس آؤ تو زبان کی نگہداشت کرو۔

2۔ جو بات دشمن سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہو وہ دوست سے بھی پوشیدہ رکھو ہو سکتا ہے کبھی وہ بھی تمہارا دشمن بن جائے۔

3۔ حکمت و دانائی مفلس کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔

4۔ جس نعمت میں شکر ہے اس کو زوال نہیں اور جس نعمت میں کفران ہے اس کو بقا نہیں۔

5۔ ہر شخص کو اس کے ہنر و جوہر کے مطابق جگہ دینی چاہیے۔

ثنا شہزاد...... کراچی

موت سے کوئی تدبیر نہیں بچا سکتی

جالینوس نے موت کے وقت اپنے دوستوں کو دو گولیاں دی اور کہا ''میرے مرنے کے بعد ایک کو لوہے پر ڈال دینا اور دوسری کو پانی کے مٹکے میں۔ اور پھر مٹکا توڑنا۔'' لوگوں نے ایسا ہی کیا لوہا تو اس گولی سے پگھل گیا اور پانی جم گیا اس وقت کے حکما نے کہا کہ ''جالینوس نے یہ دکھایا ہے کہ پانی کو جمانے اور لوہے کو گلانے کی قدرت رکھتا تھا مگر پھر بھی اپنے آپ کو موت سے نہ بچا سکا۔''

سعدیہ وحید سعدی...... اسلام آباد

روایت

روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوبؑ پر وحی بھیجی۔

''تم کو معلوم ہے میں نے تمہارے لخت جگر یوسف کو تم سے جدا کیوں کیا تھا؟''
عرض کی۔ ''نہیں، میں نہیں جانتا۔''
ارشاد ہوا۔ ''کیونکہ تو نے اس کے بھائیوں سے کہا۔
''ڈرتا ہوں کہ اس کو بھیڑیا کھا جائے اور تم بے خبر رہو۔''
''تم نے بھیڑیے کا خوف کیوں کیا۔ مجھ سے توقع کیوں نہ رکھی۔'' پھر ارشاد ہوا۔ ''تم کو معلوم ہے میں نے یوسف کو تم پر واپس کیوں کر دیا'' ''معلوم نہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔
''جب تم نے مجھ سے توقع کی اور کہا'' شاید اللہ لے آئے یوسف کو میرے پاس'' اور یہ بھی کہا جاؤ میرے بچو! تلاش کرو یوسف کو اور اس کے بھائی کو، اور اللہ کے فضل سے ناامید مت ہو۔''
تم نے مجھ سے توقع رکھی تو میں نے تمہاری توقع پوری کی۔
تم مجھ سے ناامید ہو گئے یا مجھے بھول گئے تو میں نے بھی اپنا کرم اٹھا لیا۔ (امام غزالی۔ احیاء العلی)

کنول شاہین قیصر...... تلہ گنگ

ماڈرن عشق

اور بھی چیزیں لٹ چکی ہیں دل کے ساتھ
یہ بتایا دوستوں نے عشق فرمانے کے بعد
اس لیے کمرے کی اک اک چیز چیک کرتا ہوں میں
اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

چائے دنیا کی نظر میں

1۔ کیا چائے کے ایک کپ سے بہتر کوئی چیز ہے؟ (ونسٹن چرچل)

2۔ چائے کا کپ ہی زندگی ہے۔ (گریٹ گرانڈ ماجبول)

3۔ اگر چائے کا ایک کپ نہ ملے تو اس بڑی اور کوئی تکلیف نہیں۔ (برنارڈ پال)

4۔ اگر آپ سرد مزاج ہیں تو چائے آپ میں جوش پیدا کر دے گی۔ اگر آپ نسبتاً گرم مزاج ہیں تو یہ آپ کو ٹھنڈا، اگر آپ پریشان ہیں تو آپ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دے گی۔ (گلیڈ اسٹون)

5۔ جس ملک میں چائے ناپید ہو وہاں زندہ رہنا مشکل ہے۔ (نوئل کوارڈ)

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران...... گجرات



الف سے...... اللہ پر یقین رکھنے والا
ن سے...... نبی ﷺ کی اطاعت کرنے والا
س سے...... سلامتی چاہنے والا
الف سے...... امیر بالمعروف کرنے والا
ن سے...... نہی عن المنکر کرنے والا

شازیہ ہاشم میواتی...... کھڈیاں خاص

وجہ پریشانی

ایک دفعہ جہانزیب، محبّ سے ملنے ان کے دفتر گئے۔ ابھی محبّ نے ان کے لیے چائے منگوائی ہی تھی کہ بارش شروع ہو گئی۔ جہانزیب بڑے مضطرب سے نظر آئے۔ محبّ کے کچھ پلے نہ پڑا کہ بارش شروع ہونے سے جہانزیب اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ بالآخر محبّ نے پوچھ ہی لیا۔
جہانزیب صاحب نے کہا: ''آپ کی بھابھی صدر گئی ہوئی ہیں اور بارش شروع ہو گئی۔''
''تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے وہ کوئی بچی تو نہیں ہیں کہ بارش میں بھیگ جائیں گی۔ بارش سے بچنے کے لیے کسی نہ کسی شاپنگ مال میں چلی جائیں گی۔'' محبّ نے رائے دی۔
''یہ ہی تو پریشانی کی بات ہے۔'' جہانزیب نے جیب پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ملیحہ زہرا...... کراچی

تین سوال

ایک مرتبہ ایک بادشاہ نے اپنے وزیر کو تین سوالوں کے جواب دینے پر آدھی سلطنت دینے کو کہا اور نہ دینے پر سزائے موت کی سزا۔

سوال نمبر 1۔ دنیا کی سب سے بڑی سچائی کیا ہے؟

سوال نمبر 2۔ دنیا کا سب سے بڑا دھوکا کیا ہے؟

سوال نمبر 3۔ دنیا کی سب سے میٹھی چیز کیا ہے؟

وزیر نے ملک کے دانشوروں کو جمع کیا لیکن کسی ایک جواب پر سب متفق نہ ہو سکے اور وزیر ان کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔

پھر وہ موت کے خوف سے فرار ہو گیا اور اسے ایک جگہ ایک کسان نظر آیا، کسان نے وزیر کے سوالات کے جواب کچھ اس طرح دیے

دنیا کی سب سے بڑی سچائی موت ہے

دنیا کا سب سے بڑا دھوکا زندگی ہے

تیسرے سوال کے جواب کے لیے کسان نے کہا مجھے کیا ملے گا۔ وزیر نے اسے بیس گھوڑوں کی پیشکش کی کسان نے جواب دینے سے انکار کر دیا۔

وزیر جانے لگا تو کسان نے کہا کہ ”بھاگ جاؤ گے تو ساری زندگی بھاگتے رہو گے اور پلٹو گے تو مارے جاؤ گے۔“ وزیر یہ سن کر رک گیا۔ اتنے میں ایک کتا آیا اور پیالے میں رکھے ہوئے دودھ میں سے آدھا پی کر چلا گیا۔ کسان نے وزیر سے کہا۔ ”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ بس تم اس بچے ہوئے دودھ کو پی لو تو میں تمہارے تیسرے سوال کا جواب دے دوں گا۔“

”وزیر نے دودھ پی کر کسان کی طرف دیکھا تو کسان نے کہا۔“

”دنیا کی سب سے میٹھی چیز انسان کی غرض ہے جس کے لیے وہ ذلیل ترین کام بھی کر جاتا ہے۔“

افشاں سمیع...... کراچی

خیالات کی مہک

☆ تعلیم زیادہ تر ان باتوں پر مشتمل ہوتی ہے جنہیں ہم بھول چکے ہوتے ہیں۔ (مارک ٹوین)

☆ جب باپ بیٹے کو دیتا ہے تو دونوں ہنستے ہیں۔ جب بیٹا باپ کو دیتا ہے تو دونوں روتے ہیں۔ (ولیم شیکسپیئر)

☆ ایمان ایک پرجوش وجدان کا نام ہے (ولیم ورڈزورتھ)

☆ ایک گھنٹے کے کھیل میں آپ کسی شخص کے بارے میں ایک سال کی گفتگو سے زیادہ جان سکتے ہیں (افلاطون)

☆ ہر کامیابی کا پہلا قدم امید ہے (نپولین ہل)

شازیہ اعجاز...... فیصل آباد

نظم

یہ واقعہ ہے
کہ ہمیں تم سے محبت ہے
یہ سانحہ ہے
کہ تم نے ہمیں نہیں جانا
یہ حادثہ ہے
کہ موڑ آگیا جدائی
یہ پوچھنا ہے
کہ کیا اب کبھی نہ آؤ گے؟

حنا کرن...... پتوکی

بشریٰ محمود



کرن، کی سالگرہ کے موقع پر
مریم ماہ منیر کا خراجِ تحسین

میں ناچیز قلم ہاتھ میں لیے
اس سوچ میں ہوں اے کرن
تیری سالگرہ ہے اس ماہ
تحفہ کیا نذر کروں تجھ کو
جو ہو سب سے جدا، منفرد، الگ
ہم سے پہلے لکھاریوں نے
تیری انگلی تھامے تجھے چلنا سکھایا
پھر تیرے لڑکپن میں ہم تیرے دوست ہوئے
تیرا ہاتھ پکڑے شعور زندگی کے کئی در کھولے
قدم قدم تیری ہمراہی میں چلے تھے ہم
تیرے سنگ خوشیوں کے گیت ہونٹوں پہ لیے
غم کے آنسوؤں سے پلو بھگوئے
تو نے آج تک اپنی زندگی کے اتنے سال
ہمیں دیے اعلا اقدار کے اعلا سبق
جنہوں نے اس قوم کی بیٹیوں کی تربیت کی
انہیں دیا ہے معاشرے میں انوکھا مقام
خدا تجھے تیری آن بان لیے سلامت رکھے

دانیہ عامر، کی ڈائری میں تحریر
امجد اسلام امجد کی نظم

سالگرہ

بڑھتے کیک پہ جلتی ہوئی شمعوں کے بجھا دینے سے
کب بجھیں گے یہ شب و روز مہ و سال کے انگارے
جنہیں
چھو نہ سکا

وقت کا سیل رواں

وقت کا سیلِ رواں جس کے خم و پیچ میں گم ہم
اور تم
ہم اور تم سے ہزار لاکھوں گم صم آج کی رات
میں نے ہر سال اسی طور سے کاٹی ہے جیسے کوئی
قید خانے میں کرے عہد اسیری کا حساب
کرچیاں ہوتے ہوئے خواب چنے اور سنے
دشت احساس میں آہٹ کے سراب
کون، کب، کون سی منزل پہ ملا
کس طرح بچھڑا، کہاں پر بچھڑا
دوست کس طرح ہوئے دشمن دیا
عنبر کس طرح ہوئے سانس کی خوشبو جیسے
کسی کو فرصت ہے کرے، ان کا حساب
اور اگر ہو بھی تو اس کام میں رکھا گیا ہے
آخر وہی سیل رواں ہو گا جواب
وقت کا سیل رواں
جس کے اس پار کہیں رکھی ہے
گمشدہ عمر کے لمحوں کی کتاب
اور اس پار، فقط، خواب ہی خواب
جو بھی رت آئے کھلا کرتے ہیں
تیری یادوں کے کنول، تیری جدائی کے گلاب

عروج رشید، کی ڈائری میں تحریر
ناصر کاظمی کی نظم

اپنی دھن میں رہتا ہوں
میں بھی تیرے جیسا ہوں
او پچھلی رت کے ساتھی

اب کے برس میں تنہا ہوں
تیری گلی میں سارا دن
دُکھ کے کنکر چُنتا ہوں
مجھ سے آنکھ ملائے کون
میں تیرا آئینہ ہوں
میرا دیا جلائے کون
میں تیرا خالی کمرہ ہوں
تیرے سوا مجھے پہنے کون
میں تیرے تن کا کپڑا ہوں
تو جیون کی بھری گلی
میں جنگل کا رستہ ہوں
آتی رُت مجھے روئے گی
جاتی رُت کا جھونکا ہوں
دریا ہوں اور پیاسا ہوں

نمرہ عاقب، کی ڈائری میں تحریر
عارف جعفری کی غزل

عشق میں اور لذت سی آنے لگے
کوئی روٹھے تو کوئی منانے لگے

تجھ کو جی بھر کے میں دیکھ لوں تو سہی
شوقِ دیدار کو اک زمانہ لگے

غم، اُداسی، پریشانیاں اور میں
آپ کو دیکھ کر مسکرانے لگے

اپنی تکلیف کس سے کروگے بیاں
اپنے ہی لوگ جب دل دکھانے لگے

آئینہ آئینے جیسا ہے یا نہیں
جتنے پتھر تھے سب آزمانے لگے

عائشہ، تحریم، کی ڈائری میں تحریر
وصی شاہ کی غزل

تماشا نہ بنا،

بارہا تجھ سے کہا تھا مجھے اپنا نہ بنا
اب مجھے چھوڑ کے دُنیا میں تماشا نہ بنا

نہ دکھا پائے گا تُو خواب میری آنکھوں کے
اب بھی کہتا ہوں مصوّر میرا چہرہ نہ بنا

اک یہی غم میرے مرنے کے لیے کافی ہے
جیسا تُو چاہتا ہے مجھ کو میں ویسا نہ بنا

ایک بات اور بتے کی میں بتاؤں تجھ کو
آخرت بنتی چلی جائے گی دُنیا نہ بنا

یہ خدا بن کے رعایت نہیں کرتے ہیں وصی
حسُن والوں کو کبھی قبلہ و کعبہ نہ بنا

اقصیٰ ناصر، کی ڈائری میں تحریر
سلیم فوز کی غزل

کبھی اچھا بُرا سوچا نہیں ہے
محبت عقل کا سودا نہیں ہے

میں پتھر ہوں مگر سچ بولتا ہوں
وہ آئینہ ہے اور سچا نہیں ہے

کہیں موجود ہے وہ اب بھی مجھ میں
وہ بچھڑا ہے مگر کھویا نہیں ہے

صراطِ مستقیم پر مڑ کر نہ دیکھو
پلٹنے کا کوئی رستہ نہیں ہے

ابھی آنکھوں میں بینائی ہے باقی
ابھی میں نے تمہیں دیکھا نہیں ہے

وہی بے خوابیوں کے سلسلے ہیں
جنہیں میں نے ابھی سمجھا نہیں ہے

شگفتہ سلیمان



رفعت جبیں ________ ملتان
تمہاری سالگرہ پر دُعا ہے یہ میری
کہ ایسا روز مبارک بار بار آئے
تمہاری ہنستی ہوئی زندگی کی راہوں میں
ہزاروں پھول لٹاتی ہوئی بہار آئے

مسرت فاطمہ ________ کراچی
تمہاری سالگرہ کے دن یہ دُعا ہے میری
جتنے ہیں چاند تارے، اتنی ہو عمر تمہاری

دانیہ عامر ________ کراچی
نئے برس کا آغاز ہو چلا جاناں
تمہیں مبارک ہو سالگرہ کا دن اپنا
سدا رہو محبتوں اور مسرتوں کے بیچ
یہی دُعا ہے، یہی آرزو، یہی سپنا

یاسمین ملک ________ چکوال
ہر پل تُو خوشبو میں کھلے
چمکیں صدا دن رات تیرے
خود کو کبھی تنہا نہ سمجھنا
میری دُعا ہے ساتھ تیرے

انوش انصار ________ قائداعظم یونی ورسٹی
رفعتیں اور بلندی بھی تجھ پہ ناز کرے
تیری یہ عمر خدا اور بھی دراز کرے
حسین چہرے کی تابندگی مبارک ہو
تجھے یہ سالگرہ کی خوشی مبارک ہو

شازیہ ہاشم میواتی ________ کھڈیاں خاص
شام سورج کو ڈھلنا سکھا دیتی ہے
شمع پروانے کو جلنا سکھا دیتی ہے
گرنے والے کو تکلیف تو ہوتی ہے مگر
ٹھوکر کھا کر انسان کو پھر چلنا سکھا دیتی ہے

نادرہ سلطانہ ________ امریکہ
مصلحت کے دھاگوں نے ہونٹ سی دیے میرے
ورنہ اپنے ٹوٹنے کا کس کو غم نہیں ہوتا

کنول شاہین قیصر ________ تلہ گنگ
بہت ہی دلربا سا مشغلہ ہے
محبت امتحاں بننے سے پہلے
بہت ہی عام سا اک شخص تھا وہ
ہمارا رازداں بننے سے پہلے

سیدہ لوبا سجاد ________ کہروڑ پکا
مکمل ہو گیا دورِ محبت
مجھے اب خود سے نفرت ہو گئی ہے

صدف عمران، افاطمہ اشرف ________ کراچی
پھر یوں ہوا کہ ضبط کی انگلی پکڑ کے ہم
اتنا چلے کہ راستے حیران رہ گئے

فوزیہ ثمر بٹ ________ گجرات
کبھی تو روئے گا وہ بھی کسی کی باہوں میں
کبھی تو اُس کی ہنسی کو زوال ہونا ہے
ملیں گی ہم کو بھی اپنے نصیب کی خوشیاں
بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے

ثمینہ اکرم ________ لیاری
خالی ہاتھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز
لوگ کس طرح لکیروں سے نکل جاتے ہیں

فضہ نور ________ رو ہڑی
حاصلِ زندگی حسرتوں کے سوا کچھ بھی نہیں ! !
یہ کیا نہیں، وہ ہوا نہیں، یہ ملا نہیں، وہ رہا نہیں

رباب سرفراز ________ پھول نگر
خود پرستی میں رہوں تو مٹی سے بھی کھیلتا ہوں
انا پرستی میں آجاؤں تو چاند کو بھی نظرانداز کر دوں

حور عین فاطمہ ــــــــــ آزاد کشمیر

تلاش کر میری کمی کو اپنے دل میں
درد ہو تو سمجھ لینا رشتہ اب بھی باقی ہے

سونیا ربانی ــــــــــ موڑھ دھمیال

دل نے آج پھر تیرے دل کی خواہش رکھی ہے
اگر فرصت ملے تو خوابوں میں آ جانا

شہنیلا ملک ــــــــــ اوکاڑہ

اس آخری نظر میں عجب درد تھا منیر
اس کے جانے کا رنج مجھے عمر بھر رہا

گل مینا خان ــــــــــ مانسہرہ

آئینہ دیکھ ذرا کیا میں غلط کہتا ہوں
تو نے خود سے بھی کوئی بات چھپا رکھی ہے

ہانیہ ملک ــــــــــ فیصل آباد

میں تہی دست کہاں یاد بھی دے پایا اسے
وہ تو کچھ دے ہی گیا، رنج جدائی ہی سہی

فوزیہ ثمر بٹ ــــــــــ گجرات

زبان خاموش ہو جائے تو چہرہ بات کرتا ہے
محبت کے مراحل میں عجب موسم گزرتا ہے

مقدس آصف ــــــــــ رائیونڈ ضلع لاہور

محبت کے بعد محبت ممکن نہیں
ٹوٹ کے چاہنا صرف ایک بار ہوتا ہے

سیدہ لوبا سجاد ــــــــــ کہروڑ پکا

تم میرے لیے کوئی الزام نہ ڈھونڈو
چاہا تھا تمہیں یہی الزام بہت ہے
اک بار ملو تم سے پھر آگے تیری مرضی
جینے کے لیے ہم کو بس اک شام بہت ہے

تحریم مقدم ــــــــــ کراچی

ہزاروں کا ہجوم ہے دل کے آس پاس
دل پھر بھی دھڑکتا ہے ایک ہی نام سے

زینب فاطمہ ــــــــــ تونسہ شریف

یوں تو کوئی بھی تنہا نہیں ہوتا
چاہ کر کسی سے جدا نہیں ہوتا
محبت کو مجبوریاں لے ڈوبتی ہیں
ورنہ خوشی سے کوئی بے وفا نہیں ہوتا

مدیحہ جبیں ــــــــــ کوئٹہ

ہمارے بن بہت ادھورے تم رہو گے
ملیں گے بہت لیکن کوئی ہم سا نہ ہو گا

کنزا استصال ــــــــــ سیالکوٹ

ممکن نہیں کہ وہ مجھے بھلا دے گا
وہ تو ہر پل ہر دم مجھے دعا دے گا
پیار دیکھے اس قدر اس کو میں نے
کس طرح وہ کسی کو میری جگہ دے گا

وجیہہ شمس ــــــــــ ملتان کینٹ

اُسے کہو کہ اپنی مصروفیت کم کر دے
سُنا ہے بچھڑنے کی یہ پہلی نشانی ہوتی ہے

حرا آصف ــــــــــ گوجرانوالہ

یہی سزا ہے میری اب جو میں اکیلا ہوں
کہ میرا سر تیرے آگے بھی خم نہیں ہوتا
وہ بے حسی مسلسل شکست دل سے منیر
کوئی بچھڑ کے چلا جائے، غم نہیں ہوتا

فضہ طارق ــــــــــ علی پور

آج تنہائی کسی ہمدم دیرینہ کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب ابھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

ایمن ساجد ــــــــــ میرپور خاص

کبھی تقدیر کا ماتم کبھی محبوب سے شکوہ
اے منزل محبت تیرے ہر موڑ پہ رونا آیا

لبنیٰ خاور ــــــــــ فیصل آباد

یہ قیام کیسا ہے راہ میں
تیرے ذوق عشق کو کیا ہوا
ابھی چند کانٹے چبھتے نہیں
تیرے سب ارادے بدل گئے

مدحہ مریم ــــــــــ جھنگ

بات کہنے کی نہیں مگر کہہ دیتا ہوں
وقت کے سائے میں حالات بدل جاتے ہیں
یہ حقیقت ہے میرے دل میں تم آج بھی ہو
دل بدلتے نہیں جذبات بدل جاتے ہیں

روبینہ شریف



ناگن

بیوی مزے مزے سے گول گپے کھا رہی تھی۔ 20 سے 25 کھا لیے تو پھر اپنے شوہر سے پوچھا۔

"10 اور کھا لوں......؟"

شوہر نے کہا "ناگن! کھالے"

بیوی نے غصے سے چیخ کر کہا۔ "ناگن کس کو بولا؟"

شوہر نے پیار سے کہا۔ "نا...... گن، کھالے جتنا دل کرتا ہے۔"

عروج...... بہاول نگر

دور جدید

ایک لڑکے نے اپنی گرل فرینڈ کو کال کی مگر موبائل اس کے باپ نے اٹھالیا۔

"ہیلو...... کون بول رہا ہے؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "ہیلو سر...... میں ٹی وی چینل سے بول رہا ہوں۔ آپ کی بیٹی کی فرینڈ اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہے اور ایک سوال کے جواب میں آپ کی بیٹی کی مدد چاہتی ہے۔"

باپ نے فوراً اپنی بیٹی کے ہاتھ میں موبائل دے دیا۔

"سوال یہ ہے کہ آج شام آپ کہاں ملیں گی؟

اے :- مارکیٹ، بی :- پارک، سی :- ڈسکو، ڈی :- ریسٹورنٹ

لڑکی نے کہا "اوپشن ڈی"

حنا کرن...... پتوکی

باعث اطمینان

بس میں خواتین کے کمپارٹمنٹ کے عین قریب دو غیر ملکی سیاح بیٹھے جوش و خروش سے انگریزی میں مسلسل باتیں کیے جا رہے تھے کہ اچانک ایک سیاح کو کھانسی آ گئی۔ اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خواتین میں سے ایک نے گہری سانس لے کر دوسری سے کہا۔

"کمبخت مارے یہ لوگ اتنی دیر سے انگریزی میں گٹ پٹ کیے جا رہے تھے ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ لیکن شکر ہے کہ یہ کھانستے تو اردو میں ہیں۔"

ہانیہ عمران...... گجرات

تصدیق

ایک مفلوک الحال پروڈیوسر بڑی مشکلوں سے اپنی فلم مکمل کر رہا تھا۔ ایک روز اسے کسی شخص سے ہیرو کی لڑائی کا منظر فلم بند کرنا تھا۔ اس نے سوچا کہ کسی دوسرے شخص کو کاسٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے ہیرو سے کہا۔ "وہ سامنے بس اسٹاپ پر جو شخص غالباً اپنی بیوی کے ساتھ کھڑا ہے کسی طرح اس جھگڑا شروع کر دو۔ ہم جھگڑے کا منظر فلم بند کر لیں گے۔"

ہیرو اس شخص کے قریب پہنچا اور اپنے آپ کو گھونسے اور تھپڑ کھانے کے لیے تیار کرتے ہوئے بولا۔

"یہ تمہاری بیوی ہے...... ایسی منحوس اور چڑیل نما عورت کے ساتھ کوئی ایک لمحے کے لیے بھی کھڑا ہونا پسند نہیں کرے گا۔"

اس شخص کے چہرے پر بجائے ناراضی کے رونق سی آ گئی۔ بیوی کی طرف مڑتے ہوئے وہ بولا۔

"دیکھا......! جو بات میں برسوں سے تم سے کہتا آ رہا ہوں، اب تو وہ بات دنیا بھی کہنے لگی ہے۔"

صوفیہ کامران...... راولپنڈی

ٹی بیگ

گاؤں کے لڑکے کی شہری لڑکی سے شادی ہوگئی، شادی کے اگلے دن ہی وہ اپنی بیوی سے جھگڑا کررہا تھا۔

باپ نے آکر لڑائی کی وجہ پوچھی تو بولا۔ "اے میری چائے وچ تعویز ملایا اے"

بیوی روتے ہوئے غصے سے بولی۔

"وہ تعویز نہیں ٹی بیگ ہے۔"

اسما کریم...... جھنگ

سسٹر

ایک آدمی کی شادی نرس سے ہوگئی۔

دوست نے پوچھا۔ "سناؤ یار! بھابھی کے ساتھ کیسی گزر رہی ہے؟" آدمی نے بے زاری سے جواب دیا۔

"یار میں تو عذاب میں پھنس گیا ہوں۔ جب تک سسٹر نہ کہوں سنتی ہی نہیں۔"

دانیہ عامر...... کراچی

قابل دید

بارش میں بھیگتے ہوئے ایک صاحب نے دور سے ایک ٹیکسی دیکھی تو لپک کر بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر اسے اشارے سے روکا۔ لیکن اس وقت ان کے غصے کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے عقب سے ایک خاتون نے آگے بڑھ کر ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیور کے برابر بیٹھ گئی۔

"یہ تو بڑی ڈھٹائی ہے۔" وہ صاحب بڑے غصے سے بولے۔ ٹیکسی کو میں نے پہلے روکا تھا۔

"ضرور روکا ہوگا۔" وہ خاتون مسکرا کر بولیں۔

"لیکن اس ڈرائیور سے شادی دو سال پہلے میں نے کی تھی۔"

فوزیہ ثمر بٹ...... گجرات

انوکھی خواہش

ایک وکیل نے اپنے دوست کو اپنی زندگی کے پرلطف واقعات سناتے ہوئے ایک مقدمے کا ذکر کیا، جس میں ایک عورت نے نان نفقہ کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! مجھے اپنے شوہر سے کچھ نہیں چاہیے...... میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ میرا شوہر مجھے اسی حالت میں چھوڑ دے، جس میں اس نے مجھے پایا تھا۔"

"اور وہ حالت کیا تھی؟" جج نے پوچھا۔

"میں بیوہ تھی......!" عورت سر جھکا کر بولی۔

عروج علی...... شکار پور

متفق

ایک سیاسی لیڈر دوسرے لیڈر سے کہہ رہے تھے۔ "بھئی تم خواہ مخواہ اپنی تقریر پر اتنی محنت کرتے ہو۔ اتنے لوگوں سے لکھواتے ہو۔ ردوبدل کرتے ہو۔ پھر فائنل مسودہ تیار کرکے اسے یاد کرتے ہو مجھے دیکھو مجمعے کے سامنے جاتا ہوں اور بغیر سوچے سمجھے بولنا شروع کردیتا ہوں۔"

"آپ کی تقریر سننے والے آپ کے خیال سے بالکل متفق ہیں۔" دوسرے سیاسی لیڈر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

افشاں سمیع...... کراچی

سبق

ایک نوجوان اپنی بیوی کو گھونسوں سے مار رہا تھا اور بیوی زبان چلائے جارہی تھی، اسی دوران ادھر سے ایک دانا بزرگ کا گزر ہوا۔ یہ ماجرا دیکھ کر نوجوان سے کہا:

"پتر! عورت کو گھونسوں سے نہیں بلکہ عورت سے مارا جاتا ہے۔ (یعنی عورت پر عورت "سوتن" لاکر)

تو نوجوان نے مارنا بند کردیا۔ عورت نے بابے سے مخاطب ہوکر کہا:

"چل اوئے بابے! جا کیتے ہور جا یہ ہم دونوں میاں بیوی میں آپس کا معاملہ ہے۔"

پھر پیار سے خاوند سے بولی۔

"سرتاج مارے نا۔"

اقراء نمرہ۔ کراچی ☆☆

دھوکا

دنیا میں کم عقل بے وقوفوں کو عقل والوں کے لیے امتحان بنا کر بھیجا گیا ہے۔ نالائقوں کو قابلوں کے لیے، جیسے اندھوں کو آنکھوں والوں کے لیے۔

کوئی کسی کو دھوکا دے کر کیا پالے گا۔ کیونکہ ہر دھوکا پلٹ کر آتا ہے۔ اور جو چیز پلٹ کر آتی ہے۔ وہ دہری تہری ہو کر آتی ہے۔ دہرا اخراج لے کر جاتی ہے۔ اگر کبھی کوئی تمہیں دھوکا دے تو سمجھ لینا تمہارا فائدہ مقصود تھا۔

(رہ نوردِ شوق...... سمیرا حمید)

عابدہ سعید...... چکوال

پیمانہ

جب کوئی کسی کو الو کہے تو اس پر غصہ کرنا ہے یا اس کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ الو کو سمجھتا کیا ہے؟

ہمارے گوجرانوالہ کے حاجی گلو جب الیکشن میں کھڑے ہوئے تو مخالفوں نے نعرے لگانے شروع کردیے "ایک الو سو گلو" حاجی صاحب کو بہت غصہ آیا۔ انہوں نے جاکر اسے گھیر لیا اس سے پہلے کہ ان کی ٹھکائی شروع کرتے ایک صاحب بولے۔

"حاجی صاحب! آپ ایسے ناراض ہو رہے ہیں دراصل ہم تو آپ کی عقل مندی کی تعریف کررہے ہیں۔ امریکا میں الو عقل و دانش کی علامت ہے۔ وہاں لائبریریوں کے باہر بھی الو کی تصویر لگی ہوتی۔"

حاجی صاحب یہ سن کر بولے، "تو پھر یہ نعرہ لگاؤ" سو الو ایک گلو۔"

(ڈاکٹر محمد یونس بٹ...... بٹ پارے)

صائمہ مشتاق...... بھاگٹانوالہ سرگودھا

فطرت کا قانون

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

"زندگی بھی گاڑی کی طرح ہوتی ہے۔ کبھی کبھی پریشانیوں کے کسی جھٹکے سے رک جاتی ہے اور ہمیں لگتا ہے کہ یہ کبھی چلے گی ہی نہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ کوئی بھی موسم چاہے وہ مایوسی یا قنوطیت کا ہی کیوں نہ ہو، اسے بدلنا ہی ہوتا ہے۔ یہ ہی فطرت کا قانون ہے۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "اور پتا ہے کہ غیر موافق حالات بھی اسپیڈ بریکر کی طرح ہوتے ہیں کبھی کبھی تو اچانک سامنے آجاتے ہیں، وقتی طور پر جھٹکا ضرور لگتا ہے لیکن کچھ دیر بعد زندگی کی سڑک بھی ہموار ہوکر رواں دواں ہوجاتی ہے۔"

(صائمہ اکرم چوہدری...... موسم گل حیراں ہے)

شازیہ ہاشم میوانی...... کھڈیاں خاص قصور

میڈیکل سائنس کی ترقی

اب تو میڈیکل سائنس کی ترقی کا یہ حال ہے کہ روز ایک نیا مرض ایجاد ہوتا ہے۔ آپ نے گاندھی گارڈن میں اس بوہری کو کار میں چہل قدمی کرتے دیکھا جو کہتا ہے کہ میں ساری عمر دمے پر اتنی لاگت لگا چکا ہوں کہ اب کسی اور مرض میں مرنا پڑا تو خودکشی کرلوں گا۔

(مشتاق احمد یوسفی)

حافظ رملہ مشتاق...... حاصل پور

خون کے رشتے

یہ جو پیسہ ہے نا اس کی گنتی اربوں کھربوں تک جاتی ہے بلکہ اس سے بھی آگے...... جو چیز اربوں کھربوں تک جائے اس کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ ویلیو اس کی ہوتی ہے۔ جو انگلیوں کی پوروں سے شروع ہوکر پوروں پر ہی ختم ہوجاتی ہے۔ جیسے خون کے رشتے بہت بھی ہوں تو بس دونوں ہاتھوں کی پوریں ہی بھرپاتی ہیں۔ ایک آدمی کے پاس پیسہ

کھربوں ہوسکتا ہے۔ رشتے اربوں کھربوں نہیں ہوسکتے۔ تو بس یاد رکھنا جو چیز کم تعداد یا مقدار میں ملے اس کی ویلیو زیادہ ہے۔ جو ڈھیروں کے حساب سے ملے اس کی ویلیو کم۔

(عمیرہ احمد ...... من وسلویٰ)

سعدیہ وحید سعدی ...... اسلام آباد

انسانیت کا درجہ

انسان کے دماغ میں اچھے اور برے طرح طرح کے خیالات آتے رہتے ہیں، یہ قدرتی بات ہے۔ مگر انسان کی اصل انسانیت یہ ہے کہ وہ اپنے خیالوں کی تطہیر اور تہذیب کرتا رہے۔ اگر انسان اپنے ذہن میں آنے والے خیالات کو جوں کا توں ظاہر کرلے گا تو انسانیت کے درجے سے گر جائے گا۔

(منشی فیاض علی ...... شمیم)

نوشی اقبال نوشی ...... گاؤں بدر مرجان

گیلی مٹی

انسان شخصی ارتقا کے ابتدائی ادوار میں "گیلی مٹی" کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا "کمہار" تربیت کے "چاک" پر دھرتا ہے اور بازار حیات کی "مانگ" کو مدنظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی "انگلیاں" ہر "برتن" کے بدن پر ریتوں، رواجوں، مذہب، سیاست، جذبوں، خوابوں اور سرابوں کی ان گنت پیچیدہ تحریریں رقم کرتی ہیں۔ گیلی مٹی کے یہ "سانچے" حالات کے "آوے" میں ڈھلتے ہیں۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہر برتن کا "ظرف" اور "نصیب" اس کے ہیئت کا تعین کرتا ہے۔ کچھ "سفال گر" کی بے توجہی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ کچھ اس کے اناڑی پن کی نظر ہوتے ہیں۔ کچھ "آوے" کی "دہک" برداشت نہیں کرپاتے اور تڑخ جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو بازار تک پہنچتے ہی مگر کوئی "خریدار" میسر نہیں آتا اور بازار اسلوب یا "ظرف" کا مقام طے کرتا ہے۔ گل دان اور پیکدان میں ساخت کا فرق بھلے نہ، مگر نصیب کا فرق ضرور ہوتا ہے۔

(بشریٰ سعید ...... سفال گر)

کنول شاہین قیصر ...... تلہ گنگ

حق

میں نے انسان کو شہر بساتے اور حق مانگتے دیکھا ہے۔ جان لو صاحبو! جب بھی سڑک بنتی ہے۔ اس کے دائیں بائیں کا حق ہوتا ہے۔ جو مکان شہروں میں بنتے ہیں، باپ کے مرتے ہی وارثوں کا حق بن جاتے ہیں۔ میرے ساتھ چلو اور چل کر دیکھو، جب سے انسان نے جنگل چھوڑا ہے، اس نے کتنے حق ایجاد کرلیے ہیں۔ رعایا اپنا حق مانگتی ہے، حکومت کو اپنے حقوق پیارے ہیں، شوہر، بیوی سے اور بیوی، شوہر سے حق مانگتی ہے، استاد شاگرد سے اور شاگرد استاد سے اپنا حق مانگتا ہے۔ اصلی حق کا تصور اب انسان کے پاس نہیں رہا، کچھ مانگنا ہے تو اصلی حق مانگو...... جب محبت ملے گی تو پھر سب حق خوشی سے ادا ہوں گے، محبت کے بغیر ہر حق ایسے ملے گا جیسے مرنے کے بعد کفن ملتا ہے۔

(بانو قدسیہ ...... راجا گدھ)

فاخرہ بتول ...... موڑہ دھمیال

غلامی

غلامی کی بے شمار قسمیں اور طرح طرح کی شکلیں ہوا کرتی ہیں، مگر اہی غلامی کی بدترین صورت ہے اگر آزاد ہونے کے بعد بھی صحیح راستہ کا پتا نہ چلے اور اگر چلے تو اس پر چلنے کی ہمت نہ ہو تو یہ صورت غلامی سے بدرجہا بدتر ہوتی ہے۔

(مختار مسعود ...... سفر نصیب)

ثنا شہزاد ...... کراچی

☆☆

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال وجواب شائع کیے جارہے ہیں۔

ذوالقرنین



زینب میر ...... شہداد پور

س: "اگر آپ کو خلیج کی جنگ کے محاذ پر بھیج دیا جائے تو کیا آپ جائیں گے؟ ویسے آخری خواہش بتا کر جائیے گا۔"

ج: "اگر بھیجا گیا (خود سے جانے کا سوال جو دراصل میرا نہیں ہو) تو آخری خواہش یہ ہوگی کہ مستقبل کے شہید کی بیوہ لاؤں۔"

شبانہ میمن ...... میرپور خاص

س: "فرض کرو کہ اگر سگریٹ پینے پر پابندی لگ جائے تو تم تصویریں کیسے کھنچوایا کرو گے کیونکہ تمہاری تصویریں تو سگریٹ کی بنا ادھوری ہوتی ہیں۔ کہیں گنڈاسا تو نہیں پکڑلو گے؟"

ج: "تمہارا مشورہ اچھا ہے، عمل کرنے کی سوچیں گے۔"

ناصرہ عفت ...... کراچی

س: "یہ تو سب کو پتا ہے کہ جب انسان کو بے تحاشا غم ملتا ہے تو وہ رودیتا ہے مگر جب کوئی خوشی میسر ہوتی ہے تو تب بھی یہ آنکھیں کیوں بھیگ جاتی ہیں؟"

ج: نازک آنکھیں، برداشت کا مادہ کم جو ہوتا ہے ان میں۔"

طاہرہ گل تاس ...... کلر سیداں

س: "ذوقی بھائی! یہ بتائیں کہ جو درد ملتا ہے ہمیشہ اپنوں سے ہی کیوں ملتا ہے؟"

ج: "کیونکہ پھر غیروں سے شکایت کون کرے۔"

ماریہ محمد اسماعیل ...... کراچی

س: "نین بھیا! رات کو بھابی میرے پاس آئی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ تمہارا بھائی مجھ کو بہت مارتا ہے۔" "کیوں بھائی! آپ بھابی کو کیوں مارتے ہیں جلدی سے جواب دو؟"

ج: ماریہ واقعی تم اپنے بھائی کو سمجھاؤ، یہ گری ہوئی حرکت نہیں کرنا چاہیے انہیں۔"

مسز ذکریا ...... کراچی

س: "ایک نو آموز سائیکل سوار کے لیے دشوار ترین مرحلہ کیا ہے؟"

ج: "معلوم نہیں۔"

زریں فرزانہ ...... شاہ پور صدر

س: "شادی والے دن دولہا بے چارے کو کس بات کی مبارکباد دی جاتی ہے؟"

ج: "اس کے حوصلے کی۔"

مدیرہ کرن

نامے میرے نام

مقدس آصف......رائیونڈ لاہور

آداب! اس ماہ کا ٹائٹل زبردست تھا۔ سب سے پہلے فیورٹ ''مہجور نشیمن'' پر چھلانگ لگائی۔ سمجھ میں نہیں آرہا کن لفظوں میں تعریف کی جائے کہ پڑھنے کا حق ادا ہوسکے۔ مصباح جی آپ نے ہمیں کہانی کی سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ پلیز سب کی غلطیوں کی سزا روائیہ اور حنبل کو نہ دیجیے گا۔ اب ان دونوں کو ملا دیجیے۔ اور رابی اور عدن پلیز دونوں بچے روائیہ کے پاس ہی رہنے دیں۔ ''من مورکھ'' کو نہ پاکر دل اداس ہوگیا۔ ''مہرباں ہوا'' بہت اچھا لکھا آپ نے عنبرین جی اور ہمیں کافی معلومات بھی ملیں کہ مرگی کا آپریشن کے ذریعے علاج ہوسکتا ہے۔ نگہت جی اس بار بھی چھا گئیں اور زبردست لکھتی ہیں آپ۔ اس بار سب سے بیسٹ افسانہ ''اٹس او کے'' لگا واقعی کبھی کبھی ہم کچھ لوگوں کو روبورٹ ہی سمجھ لیتے ہیں کہ ان کی کوئی زندگی یا مرضی نہیں ہے۔ عالیہ نے بہت اچھا فیصلہ کیا اپنی ماما کے لیے کئی بار اپنا آپ مارنے سے بھی آپ کو وہ عزت نہیں ملتی جس کی آپ مستحق ہوتی ہیں۔ سدرہ جی کا مکمل ناول واقعی میں ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ کہیں کوئی کمی یا بوریت محسوس نہیں ہونے دی آپ نے۔ زینب نے بہت اچھا کیا جو شہریار کو معاف کردیا ''کسی اجنبی سے دیار میں''۔ شمائلہ جی آپ نے ہمیں گھر بیٹھے شیخ اور پاکستانیوں کی ایسی داستان لکھی کہ ہمارے تو رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ عرب میں یہ سب ہوتا ہے۔ اور وقاص ایسے شخص کو زندہ چورا ہے پر لٹکانا چاہیے کہ دوسرے بھی نصیحت پکڑیں۔ ''فیصلہ'' ہم اپنے بزرگوں کو دو ٹائم کا کھانا دے کر سمجھتے ہیں کہ بس ان کی ضرورتیں ختم۔ دو گھڑی ان کے پاس نہیں بیٹھتے یہ نہیں سوچتے کہ کل کو یہ ٹائم ہم پر بھی آنا ہے۔ پاپا جی نے اچھا فیصلہ کیا شادی کرنے کا۔ ان کی تکلیف اور تنہائی تو ختم ہوئی۔ ام ایمان جی آپ نے اچھا کیا کہ پروشہ اور سارب کو ملا دیا۔ اور مسز ملک کو بھی سیدھے راستے پہ لے آئیں۔ ''وفا کے کوہ گراں میں'' شکر ہے شہربانو کو کچھ کھونے سے پہلے ہی عقل آگئی کہ محبت یا اچھی صورت کے بغیر تو گزارہ ہوسکتا ہے لیکن عزت کے بغیر نہیں۔ کرن کرن خوشبو تو ماشاء اللہ سے سارا زبردست تھا۔ بہت لمبا ہوگیا لیٹر اب اجازت دیجیے۔

ج: مقدس جی! آپ یقین مانیں جب آپ قارئین اتنی جذباتی ہوکر تبصرہ کرتی ہیں کہانیوں پر تو ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے کہ کہانیوں کے کرداروں سے اتنی محبت ہوگئی ہے آپ سب کو۔ کرن کی پسندیدگی کا بہت شکریہ۔

خدیجہ مسکان......داؤد والا، تلمبہ

کرن کو پڑھتے ہوئے تقریباً مجھے 5 سال ہوگئے ہیں۔ کئی دفعہ خط لکھنے کی کوشش کی پر قلم نے میرا ساتھ نہ دیا۔ کرن مجھے بہت پسند ہے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے اس دفعہ 14 فروری کو کرن ملا۔ راتوں رات پڑھ کر تبصرہ کردیا۔ حمد و نعت کے بعد تمام انٹرویوز اچھے لگے اس کے بعد میں نے اپنا پسندیدہ ناول ''مہجور نشیمن'' پڑھا تو دل کو سکون ملا کیسے تیسے حنبل اور روائیہ کے ملنے کے آثار پائے گئے۔ مصباح آپی حنبل اور روائیہ کو جدا مت کیجیے گا پلیز! مصباح آپی آپ کو میری طرف سے ایکسی لینٹ اور سلام اور ڈھیروں ڈھیر دعائیں نگہت عبداللہ کا ناول ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' کافی ہٹ جارہا ہے۔ سب ناول ایک سے بڑھ کر ایک قصے، افسانوں کے تو پھر کیا ہی کہنے مسکراتی کرنیں انہوں نے تو واقعی ہی مسکرانے پر مجبور کردیا۔ تمام تمام قاری اور رائٹر بہنوں کو میری طرف سے محبت بھرا سلام

ج: خدیجہ جی! یہ کیسے ممکن ہے کرن کی قارئین ''نامے میرے نام'' کی محفل میں شرکت کریں اور ہمیں اچھا نہ لگے۔ ہمیں بہت اچھا لگا بلکہ خوشی بھی ہوئی کہ آپ نے شرکت کی اس محفل میں۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں گی۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران......آمنہ رئیس...... گجرات

ماڈل بہت پیاری لگی۔ میک اپ اور افسانوی انداز اچھا لگا اور دل کو چھو گیا۔

''آواز کی دنیا'' سے اس ماہ کی شخصیت سپر ہٹ لگی۔ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کا نصیب العین کام بس کام ہوتا ہے۔ آسیہ مرزا نے انتظار انتظار کی سیڑھی پر لٹکا دیا چلو کوئی گل نہیں۔ اللہ پاک ان کو صحت عطا فرمائے۔ آمین

''مقابل ہے آئینہ'' بھی ٹھیک ٹھاک لگا۔ مطلب پازیٹو جوابات تھے۔

سب سے پہلے ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' اس بار چاروں اقساط اکٹھی پڑھی ہے۔ لگتا ہے نگہت جی کی تحریر بھی اور تحریروں کی طرح دلوں میں ایک مقام بنالے گی۔ ریکا اس اسٹوری کی ہاٹ کریم ہے۔

''مہجور نشیمن'' روائیہ اور حنبل دونوں پہ ترس آرہا ہے کیسے گھر اور دل برباد ہوگئے۔ پلیز! ہیپی اینڈنگ کیجیے گا۔ آئمہ کو تو چلو اپنے کیے کی سزا مل گئی۔ مگر جو اس سارے پلان کی ماسٹر مائنڈ تھیں۔ اس کے لیے کیا سزا سوچی ہے۔

اسمتھ اور میرڈین کا سین تحریر میں ایسے ہی جیسے روتے روتے کوئی ہنس دیے دونوں کی لڑائی۔ کہانی میں کبھی خوشی کبھی غم کا تاثر دے رہی ہے۔ ورنہ تو ٹریجڈی ہی ٹریجڈی ہے۔ زینب کے کردار کی بھی وضاحت کرنا لازمی۔

دوسرا مکمل ناول ''دل کو ہم نے سمجھایا بہت'' یہ ظالم چیز کب سمجھنے سے سمجھتی ہے (دل) اسٹوری اچھی تھی۔ شائلین کا کردار پاورفل لگا۔ بے چاری نے انا کا مسئلہ نہیں بنایا خود ہی پیچھے ہٹ گئی۔ ناول ''کسی اجنبی سے دیار میں'' اچھی کہانی تھی اور منفرد بھی۔ منفرد اس لیے کہ عرب کی لائف اسٹائل کے بارے میں بتایا تھا۔ پڑھ کر مزا آیا۔

ماں باپ کو بھی چاہیے بیٹی کے اچھے مستقبل کے لیے بغیر کسی تحقیق کے رشتہ نہ طے کیا کریں۔

افسانے سب ہی اچھے تھے ''مثبت سوچ'' اے ون رہا۔ باقی کا کرن ابھی پڑھنا باقی ہے۔ ان شاء اللہ زندگی رہی تو نیکسٹ ٹائم پورے کا پورا پڑھ کر تبصرہ کروں گی۔

اس ماہ کی شاعری لاجواب تھی۔ سارے کے سارے مختصر ڈائری میں محفوظ کرلیے۔ کرن کا دسترخوان اچھا سجایا ہوا تھا۔ دیکھ دیکھ کر منہ میں پانی آتا رہا۔ میک اپ کے متعلق پوری انفارمیشن دیں کہ بیس کے بعد پف پاؤڈر کب لگانا ہے پھر کب آئی لائنر یوز کرنا ہے۔

ج: فوزیہ جی ''کچھ موتی چنے کے لیے اقتباس ہمیں ''علیحدہ صفحات پر بھیجیں۔ آپ کے خط سے حقیقت پسندی ظاہر ہوتی ہے جو ہمیں بہت اچھی لگتی ہے۔ آپ کی فرمائش ان شاء اللہ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

کنول شاہین قیصر......تلہ گنگ

السلام علیکم!

میں آپ کی اور پیارے سے ''کرن'' کی جتنی بھی شکر گزار ہوں، اتنا ہی کم ہے کہ آپ نے نو سال کے طویل ترین عرصے کے بعد بھی جب میں نے آپ کے اس خوب صورت ترین سلسلے ''نامے میرے نام'' میں دستک دی تھی تو نہ صرف آپ نے فوراً دستک کے جواب میں در کھولا بلکہ بہت ہی اچھے اور محبت بھرے انداز میں مجھے خوش آمدید بھی کہا۔

اپنا نام اور اپنا خط ''نامے میرے نام'' میں جگمگاتا ہوا دیکھ کر دل و دماغ خوشی و طمانیت سے مالا مال ہوگئے۔ تھینکس اے لاٹ جی۔

مارچ کا شمارہ ''سالگرہ نمبر'' ہوگا جس میں قارئین کا سروے بھی شامل ہوگا سالگرہ نمبر کے حوالے سے جس میں شرکت تو نہیں کرسکی۔ مگر میری طرف سے ''کرن'' کو اس کی سالگرہ پر بہت ساری مبارکباد۔

حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبولؐ بہت ہی

پیاری تھیں۔ فائزہ افتخار کے لکھے گئے ڈرامہ سیریل ''شاید'' کی ہیروئن ''سعدیہ خان'' سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ ''میری بھی سنیے'' میں ''فیروز خان'' کی سنی۔ ''آواز کی دنیا سے'' میں ''شاکر حسین شاکر'' بہت ہی ادبی اور سلجھی ہوئی شخصیت کے مالک لگے۔ ایک اچھے ڈی جے بننے کے جوگر شاکر صاحب نے بتائے۔ ان میں ایک یہ بھی کہ اس کا تلفظ بہت اچھا ہونا چاہیے۔ اٹس رائٹ۔

اب بات ہوجائے کہانیوں کی۔ سب سے پہلے میں نے ''سدرہ حیات'' کا مکمل ناول ''دل کو ہم نے سمجھایا بہت'' پڑھا۔ گو کہ ٹاپک تو بہت پرانا تھا مگر سدرہ جی نے لکھا اچھے انداز میں۔ اور اینڈ پر زینب کا بچوں کی خاطر اپنے گھر جانے کا فیصلہ دل کو بہت ہی بھایا۔ ''فارہ نیم'' بہت عجیب سا لگا۔

ناولٹ میں ''شمائلہ دلعباد'' کا ''کسی اجنبی سے دیار میں'' بہت ہی الگ سے ٹاپک پر ''شمائلہ دلعباد'' کی بہت خوب صورت اور یادگار تحریر لگی کہ جس میں متحدہ عرب امارات میں جو کچھ ہورہا ہے اس کو بہت خوب صورتی سے شمائلہ جی نے اجاگر کیا۔

''عائشہ تنویر'' کا ''تیری چاہ میں'' وہی روایتی جاگیرداروں اور وڈیروں کے پس منظر میں لکھی جانے والی عام سی اسٹوری تھی۔

افسانوں میں ''منعم علی'' کا ''کہو اک دن'' 14 فروری ویلنٹائن ڈے جیسے فضول سے تہوار پر بہت ہی اچھے انداز میں لکھی جانے والی تحریر تھی۔ سو نائس اینڈ کیپ اٹ اپ منعم علی صاحبہ۔

دوسرا مکمل ناول ''ام ایمان قاضی'' کا ''مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے'' بہت ہی پیارا سا ناول تھا۔ بہت ہی اچھی تحریر تھی ام ایمان قاضی کا۔

''وفا کے کوہ گراں میں''، ''قراۃ العین سکندر'' کا بہت اچھا افسانہ لگا۔ نئی رائٹرز بہت ہی اچھا لکھ رہی ہیں۔ اللہ زور قلم بڑھائے۔

اب بات ہوجائے کرن کی آن، بان اور شان ''کرن'' کے مستقل سلسلوں کی تو ''کرن'' کے سارے سلسلے ہمیں بے حد پسند ہیں۔

اس دعا کے ساتھ اجازت کہ اللہ کریم ''کرن کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی عطا کرے (آمین ثم آمین)

ج: کنول جی! ہمیں خوشی ہے کہ نو سال بعد آپ نے ''کرن'' کے تمام سلسلوں میں بھرپور شرکت کی۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی کرن کے سلسلوں کو اپنی شرکت سے چار چاند لگائیں گی۔ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ خیرا۔

سدرہ مرتضٰی......کراچی

بہت مہینوں بعد کرن کی محفل میں شرکت کر رہی ہوں۔ ان شاء اللہ کوشش کروں گی کے اب زیادہ لمبے عرصے کے لیے کرن کی محفل سے غائب نہ ہوں۔ شاہین رشید بہت دکھ ہوا آپ کے ماموں اور ان کے داماد کی وفات پر۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے آمین، ''من مورکھ کی بات نہ مانو'' کی آخری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ پلیز بابر اور حوریہ کو ملوا دیں۔ نگہت عبداللہ اپنے روایتی انداز میں آئی ہیں۔ اور چھا جاتی ہیں۔ بہت مزے کی تحریر ہے ہر کردار نے اپنے سحر میں جکڑا ہوا ہے۔ ''مہجور نشیمن'' کی تو کیا بات ہے۔ مصباح جی آپ تو ہر قسط میں دل کی رفتار جیسے روک سی دیتی ہیں۔ روائیہ کو پلیز کہیے گا کہ معاف کردے حنبل کو اور جندب کی بھی شادی کروا دیں۔

سدرہ حیات ایک نیا اور اچھا اضافہ ہے۔ جو بھی لکھتی ہیں اچھا لکھتی ہیں۔ ام ایمان قاضی نے ایک بہترین بیٹے کا جو نقشہ کھینچا وہ بہت خوب لکھا۔ ناولٹ تو اس بار کے تینوں بہترین رہے۔ شمائلہ دلعباد نے بدر کی ماں اور ان جیسی ماؤں کے لیے اچھا سبق دیا۔ ''تیری چاہ میں'' ایک ہلکی پھلکی تحریر تھی جس نے ذہن کو تازہ دم کردیا۔ اف...... ''مہرباں ہوا'' کا تو پلاٹ تو کیا بات ہے۔ ایک ایسی بیماری کو جس کو ہمارے معاشرے میں چھوت کی بیماری سے بھی بڑی بیماری سمجھا جاتا ہے، مرگی پر اتنی تفصیلی کہانی شاید زندگی میں پہلی بار پڑھی ہے۔ اب آتی ہوں افسانوں کی طرف کاش کہ میں کسی ایک افسانے کو بہترین کہہ سکتی۔ سارے افسانے ہی اپنے طرز کے منفرد تھے باقی مستقل سلسلے بہترین تھے۔

ج: پیاری سدرہ! ہم نے آپ کی کمی بہت محسوس کی —— امید کرتے ہیں اب آپ اتنے لمبے عرصے کے لیے غائب نہ ہوں گی۔ آپ نے اچھا تبصرہ کیا تمام کہانیوں پر۔ امید ہے آئندہ بہترین تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔

ہانی......چارسدہ

اس ماہ کے شمارے میں ایک سے بڑھ کر ایک کہانی تھی۔ ''مہجور نشیمن'' تو خیر کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ برسوں نقش رہنے والی کہانی، سدرہ حیات کا ناول بہت اچھا لگا۔ بلکہ یہ کہوں اس بار کمال ہی اس ناول کا تھا۔ ناولٹ میں ''تیری چاہ میں'' بہت ہی خوب صورتی سے لکھا گیا کیا کہنے، نہ صرف مصنفہ کا انداز پسند آیا بلکہ الفاظ کا چناؤ اور انہیں استعمال کرنے کا فن کسی کسی کو آتا ہے جو عائشہ تنویر نے سمو دیا۔ بیسٹ آف لک۔ ام ایمان قاضی کے مکمل ناول میں گاؤں کی خوبیاں بتانے کے ساتھ جو چیز حیرت میں ڈالی گئی کہ ماں باپ کیسے سنگ دل ہوتے ہیں پہلے اپنی پریشانی کی وجہ سے اپنی اولاد کو کسی کو دے دیا اور جوان ہونے پر ماں حق جتانے آگئی۔ افسانے سب اچھے تھے ''فیصلہ'' نے زیادہ انسپائر کیا۔ سالگرہ نمبر کا شدت سے انتظار ہے۔

ج: پیاری بہن ہانی! ہماری دعا ہے کہ سالگرہ نمبر آپ کی توقع پر پورا اترے۔

سدرہ......فاروق آباد

دل گرفتگی کا اگر کوئی ماہر ہے تو اس میں ملکہ حاصل کرگئیں مصباح علی سید ''مہجور نشیمن'' کی اس قسط کے بعد سمجھ میں آنا مشکل ہے کہ کیا ہوگا۔ پلیز حنبل کو کچھ نہ ہو۔ دوسرا ناول پڑھا سدرہ حیات کا بہت مزے کا لگا ویری گڈ! ام ایمان قاضی نے ہمیشہ کی طرح دو بھائیوں کی کہانی لکھی مگر اچھی لگی۔ افسانے بس زیادہ اچھے نہیں لگے۔ ''وفا کے کوہ گراں'' میں زیادہ لفاظی لیکن شہر بانو کا اتنا غرور اور بے چارہ صابر، اچھا لکھا ویلڈن۔

منعم ملک کے افسانے پر معذرت کے ساتھ اعتراض کروں گی کہ ویلنٹائن ڈے کا اگر موضوع چنا ہی تھا تو کتنا اچھا ہوتا فیملی بھی کرسچن چن لیتیں۔ پتا نہیں کیوں اس دن کی ذرا سی پروموشن مجھے اچھی نہیں لگتی۔ ''فیصلہ'' کا موضوع بھلے پرانا تھا لیکن پڑھ کر مزا آگیا۔ مجھے بزرگوار کا فیصلہ بہت پسند آیا۔ باقی اللہ کرن کی روشنی مزید پھیلائے۔ آمین

ج: پیاری بہن سدرہ! کرن پر تبصرہ کرنے کا بے حد شکریہ۔ منعم ملک کے افسانے پر آپ نے اعتراض کیا ہے آپ نے غور سے شاید پڑھا نہیں یہ افسانہ ویلنٹائن ڈے کی حمایت پر نہیں مخالفت پر ہی لکھا گیا ہے۔

عابدہ منظور......قصور

کرن نے جانے کیوں جاتی سردی کی جما دیا ہے میں چھ رسالے لیتی ہوں کسی رسالے کا ایسے انتظار نہیں کرتی جیسا مصباح کرن کا کرواتی ہیں۔ ویل ڈن! مصباح کہیں ربط نہ ٹوٹا۔ ہمارا دل تو حنبل اور روائیہ کے ساتھ دھڑکنے لگا ہے پلیز ویسے ہی آپ کی کہانی برسوں یاد رہے گی آپ حنبل کو مار کر اسے امر کرنے کی کوشش نہ کریں مہربانی ہوگی۔ دوسری کہانی جو بہت دل چسپی سے پڑھی ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' گو کہ مصنفہ جانی پہچانی ہیں تو تعریف کی محتاج نہ الفاظ کی غلام۔ دیکھتے ہیں ہوائیں رخ بدلنے میں کب تیز ہوتی ہیں۔ ''من مورکھ'' کا تو سرسری سا ہی اختتام رہتا ہے۔ شمائلہ دلعباد کا ناولٹ ہی ٹھیک ہی تھا بہت زیادہ متاثر نہیں کرپایا۔ مکمل ناول دونوں سبق کی طرح لکھے گئے۔ ام ایمان قاضی سے یہ کہنا ہے کہ کوئی بدل کر ٹاپک لائیں ان کی اسی طرح کی تحریر ہوتی ہے۔ افسانوں میں ریما نور رضوان کا بہت اچھا لگا۔ منشا محسن علی، منعم ملک، قراۃ العین سکندر سب کے افسانے اچھی کوشش تھی۔ ارے ہاں عنبرین ولی کا ناولٹ بہت مزا دے گیا۔ مستقل سلسلے سارے اچھے ہیں خاص کر ''مقابل

آئینہ" آپ اس میں رائٹرز اور ادارے والیوں کو بھی لے کر آئیں۔ اچھا لگے گا۔

ج: پیاری عابدہ! "مقابل ہے آئینہ" آپ قارئین بہنوں کے لیے ہے رائٹرز اور ادارے والیوں کو پھر کسی سلسلے میں جانیے گا۔ کرن پر تبصرہ کرنے کا شکریہ۔

مہوش، نازیہ، طوبیٰ...... گوجرانوالہ

ہمارے یہاں تو موسم بدل کر پھر سرد رخ دکھانے لگا کہ فروری کا کرن بھی لحاف میں لپٹ کر پڑھا۔ ایک سردی کی کپکپی دوسری کرن کی ماڈل کی اداؤں نے چڑھادی۔ اوہ یہ کیا "من مورکھ" کی آخری قسط نہیں آسیہ جی بس جلدی سے حوریہ کو بابر کا کردیں۔ "ہوائیں رخ بدل گئیں" ابھی بتایا تو ہے بڑ ڑڑڑڑی ٹھنڈ ہے۔ افسانوں میں بہترین لگا۔ "اٹس او کے" منشا محسن علی نے بہت پیارا لکھا۔

عنبرین ولی کے ناولٹ کا دوسرا حصہ پہلے سے بہتر لگا کہانی واضح ہوئی تو سمجھ میں ہی آگئی۔ رشتوں کی اہمیت بتاتا ریما نور رضوان کا افسانہ ویری نائس "مجبور نشیمن" کی تعریف کرنے کے لیے الفاظ کم پڑتے ہیں۔ مصباح سے مودبانہ عرض ہے باوجۂ خاص انسیت مقبل اور روائبہ کو محترمہ ان میں جدائی مت ڈالیے گا۔ وہ آپ کے ریڈرز سے قطعاً برداشت نہ ہوگی ایسا نہ ہو آپ کے فین آپ کے ہیٹر میں تبدیل ہو جائیں ایسا ہوا تو ہم سب کزنز اردو بازار کراچی میں دھرنا دینے کا پورا ارادہ رکھتے ہیں۔ باقی مستقل سلسلے سب فیورٹ ہیں۔

ج: آپ لوگوں کا پیغام مصباح علی سید تک پہنچا دیا گیا امید ہے آپ لوگوں کو دھرنا دینے کا ارادہ ملتوی کرنا ہوگا۔

ثناء شہزاد...... کراچی

"حمد و نعت" ہمیشہ کی طرح لاجواب تھے پڑھ کر روح کی گہرائی میں سکون اتر جاتا ہے۔ "شاید" کی ام ہانی اور رئیل میں "سعدیہ خان" سے ملاقات کی اچھا لگا مل کر۔ آگے بڑھے تو "فیروز خان" جلوہ گر تھے۔ شاہین رشید کے ماموں اور ان کے داماد دونوں کے لیے دعائے مغفرت اللہ پاک جنت میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ آواز کی دنیا میں شاکر حسین سے ملے۔ "مقابل ہے آئینہ" میں فضہ نور کے جوابات پسند آئے۔ اس بار سروے کے سوال پڑھے اور سب سے پہلے ان کے جوابات لکھ ڈالے۔ اپنے پیارے کرن کی سالگرہ کے حوالے سے پھر آگے بڑھے تو "ہوائیں رخ بدل گئیں" پر پہنچے وہاں جا کر اندازہ ہوا کہ ہوائیں سچ میں اب رخ بدلنے والی ہیں۔ تیمور غزنی نے خزینہ کو پرپوز کر ہی دیا۔ لیکن وہ جھوٹ کا سہارا نہ بھی لیتا تب بھی خزینہ نے مان جانا تھا اور یہ کیا بھئی جس کہانی کا شدت سے انتظار تھا وہ تو اس بار غائب تھی۔ "من مورکھ کی بات نہ مانو" پلیز بابر کو کچھ مت کیجیے گا، بہت زیادہ سدھر گیا ہے وہ۔ "مجبور نشیمن" کی اگلے مہینے لاسٹ قسط آئے گی پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور دل اداس بھی ہوگیا کہ اتنی اچھی کہانی اپنے اختتام کو پہنچنے والی ہے۔ مصباح نے ایک سال ہمیں ہنسایا بھی اور رلایا بھی۔ مجھے "اپنے رنگ میں رنگ دو" ام ایمان قاضی کی تحریر پسند آئی۔ "دل کو ہم نے سمجھایا بہت" سدرہ حیات نے بھی کیا خوب لکھا۔ عنبرین ولی کا "مہرباں ہوا" بہت زیادہ پسند آیا۔ شمائلہ دلعباد نے کمال کردیا اتنی زبردست اسٹوری لکھی پڑھ کر مزا آگیا۔ "کسی اجنبی سے دیار میں" واہ بہت خوب۔ ویل ڈن۔ کرن اسی لیے تو ہمیں پسند ہے کہ اس کی ہر کہانی اچھوتی ہوتی ہے جب ہی تو ہم دیوانے ہیں۔ "تیری چاہ میں" عائشہ تنویر نے بھی اچھا لکھا ہے۔ افسانے اس بار چھ تھے اور سب کے سب بہت اچھے تھے ریما نور رضوان بھی آ ہی گئیں کرن کی رونق بڑھانے۔ ان کا افسانہ پسند آیا۔ اس کے علاوہ پورا کرن ہی بہت اچھا تھا کرن کے تمام سلسلے بہت پسند آئے۔ میری دعا ہے اس پاک پروردگار سے کہ وہ ہمارے پیارے کرن کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے آمین۔

ج: ثمہ آمین، اللہ تعالیٰ آپ کی دعا قبول فرمائے۔ اور آپ ہمیشہ کرن کو اسی طرح دعا دیتی رہیں۔ کرن کو پسند کرنے کا بہت شکریہ!